ماہنامہ
حکایت
اپنے اپنے مفاد کا کھیل......!
ستمبر 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ حکایت لاہور
سالانہ چندہ
رجسٹرڈ ائیرمیل
پاکستان 800 روپے
1
7000 روپے
سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی
2
7000 روپے
آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا
غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے ”وقاص شاہد“ کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
خط وکتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔
نوٹ تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔
26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور- فون: 042-37356541

نورِ مبین

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی اور سب اپنی نماز اور تسبیح (کے طریقے) سے واقف ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں (سب) خدا کو معلوم ہے (۴۱) اور آسمان اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے لئے ہے اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (۴۲)

(سورۃ النور)

جلد: 44 | ستمبر 2014ء سالگرہ نمبر | شمارہ: 01

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

قیمت -/100 روپے

ہیڈ آفس
26- پٹیالہ گراؤنڈ لنگ میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے:
Monthly_hikayat@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اهم اعلان

فیچر رائٹر ساقی چیمہ کو ''حکایت'' رائٹرز گروپ سے الگ کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ان کی کوئی تحریر شائع نہیں کی جائے گی۔ ماہنامہ ''حکایت'' کی مجلس مشاورت نے یہ فیصلہ ان کے عامیانہ اور غلط رویے کی وجہ سے کیا ہے۔ معزز قارئین کے ساتھ نہایت بدتہذیبی سے گفتگو کرتے اور گالی گلوچ پر اُتر آتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر یہ شکایات درست پائی گئیں۔

قارئین کرام اور ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اب ساقی چیمہ کا ادارہ ہذا سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور ان سے کسی قسم کا لین دین کرنے والا اپنے نفع نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔

(ادارہ)

نوٹ: پرچے کی ترسیل میں کسی قسم کی رکاوٹ، شکایت یا معلومات کے لئے شعبہ سرکولیشن سے رابطہ کریں۔ براہِ کرم ایڈیٹر کو اس معاملے میں فون نہ کریں۔

شعبہ سرکولیشن

فضل الرزاق : 0343-4300564

عرفان جاوید : 0322-4847677

فون آفس : 042-37356541

انقلاب نہیں، احتساب کی ضرورت ہے!

طاقت کی یہ کیمسٹری ہے کہ جب اسے باہر سے کوئی چیلنج نہ ہو تو اُس کے اندر سے تضادات جنم لینے لگتے ہیں۔ ایسے میں وہ طاقت جو آپ ووٹ، عوام، آئین اور جمہوریت سے کشید کریں اور استعمال کریں اُسے مغلیہ شہنشاہوں کی طرح تو پھر حادثات ایسے ہی جنم لیتے ہیں جس کا شکار آج کل یہ پاک سرزمین ہے۔ ہر کوئی اپنے گریبان میں جھانکنے کی زحمت سے بچنے کے لئے اپنا کام آسان کرتے ہوئے دوسرے کے گریبان میں جھانکنے میں عافیت سمجھتا ہے۔

رہنما عوام کے لئے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ اُن کے رویے عوام کے لئے مثال بنتے ہیں۔ عوام اُن کی تقلید کرنے میں بڑائی محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہمارے رہنماؤں کا حال احوال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک دوسرے پر ذاتی حملے، اپوزیشن کے لئے بے معنی اور غلط الفاظ کا بے جا استعمال، ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنا اور ٹانگ کھینچنا سیاست میں حکمت عملی کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔

قوموں کے درمیان حسد، تفرقہ، کھینچاتانی، نفرت اور دشمنی اُس روز سے چلی آ رہی ہے جس روز یہ اشرف المخلوقات ''انسان'' قوموں کی صورت میں تقسیم ہوا اور یہ تمام حالات اُس وقت تک سرسبز و شاداب رہیں گے جب تک انسان زندہ ہے۔ حسد، تفرقہ اور کھینچاتانی کی بجائے نفرت اور دشمنی نے قوموں کو زندہ رکھا۔ تاریخ نے صرف اُس قوم کو پہچانا اور سینے سے لگایا جس نے اپنے دشمن کو پہچانا اور اُسے نیچا دکھا کر پُروقار زندگی گزارنے اور آزاد فضا میں سانس لینے کا عزم کیا۔

1947ء اور 1965ء کے شہداء کیوں سالہا سال گزرنے کے بعد بھی اپنی حقیقت کو قائم رکھے ہوئے ہیں؟

کیوں تاریخ نے سنہری حروف سے اُن کے نام کندہ کئے ہوئے ہیں؟

آج بھی وہ کیوں اٹھارہ کروڑ عوام کے دلوں کی دھڑکن ہیں؟ کیوں آج بھی ان کی برسی اُسی عقیدت و احترام کے ساتھ منائی جاتی ہے؟

وجہ...... وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کی دشمنی اور اُن کی نفرت صرف اُسی قوم اور اُن کفار کے ساتھ تھی جس کو اللہ عزوجل اور اُس کے رسولؐ نے ناپسند فرمایا۔ جس کے ساتھ انہوں نے جہاد کا حکم دیا اور پھر جس میں اُن کی شہادت کو ''زندہ'' کا درجہ دیا گیا۔

جو قومیں پُر وقار زندگی کا عزم کرلیں وہ دنیا کے نقشہ پر اپنا مقام بنالیتی ہیں۔ چین اس کی زندہ مثال ہے۔ افیون کی ماری ہوئی نشے میں دھت اس قوم نے جب اپنا سر اٹھانے کا عہد کیا تو پھر سر اٹھاتے ہی چلے گئے۔ صرف چند ایک گمنام افراد نے دلوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کر کے باقی نیم مردہ قوم کو جینے کا سلیقہ سکھایا۔ دشمنوں نے اُن کے بے ضمیر ذہنوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر طریقے سے انہیں کچلنے کی کوشش کی، قریب تھا کہ وہ ریاست ختم ہو جاتی اچھی قیادت اور قومیت نے اپنے دشمن کو پہچانتے ہوئے چین سے آخری دشمن کو بھی نکال باہر کیا۔ سربراہ مملکت سے لے کر ادنیٰ فرد تک کدال اور ہل اٹھا کر آزاد چین کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

حکومت چین نے اپنے لٹریچر سے غزلیں، افسانے اور فلمی ایڈیشن خارج کر دیئے۔ قوم کو اصل تصویر دکھانے اور حقائق سے روشناس کرانے کے لئے ادیبوں نے حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنالیا۔

اُن کی ہر کہانی، ہر مضمون اور ہر نظم دشمن کے خلاف زہر اگلتی تھی۔ اُس میں ہر اُس زیادتی، حملے اور نقصان کا ذکر نمایاں ہوتا تھا جس سے وہ قوم دوچار رہی۔ لفظ دشمن اور اُس کی حرکات وسکنات کو قوم کے ذہنوں پر نقش کر دیا۔

اُن کی قیادت سیاست کے اسرار و رموز سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتی تھی۔ تھیوری اور علمی باتوں سے ناآشنا تھی۔ قوم نافرمانی کا سوچنے سے قاصر تھی۔ ایسی افیون زدہ قوم کو دنیا کے نقشے پر چمکتا دمکتا ستارہ بنانے میں اُس قیادت کا ہاتھ تھا جس کا ہاتھ اُس کی کرسی پر مضبوط ہونے کی بجائے قوم کی پژمردہ نبضوں پر تھا۔

ہمارا فلسفۂ حیات کرسیٔ اقتدار سے شروع ہو کر کرسیٔ اقتدار پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اجارہ داری ہمارا نصب العین بن گیا ہے۔ خارجہ پالیسی اور اقتصادی امور پر گرفت کمزور پڑ گئی ہے۔ ہم نے 1947ء، 1948ء، 1965ء اور 1971ء کی جنگوں سے بھی کچھ سبق حاصل نہیں کیا۔ ملکی سیاست نے ساس بہو کی لڑائی کی جگہ لے لی۔ آج بھی جو تماشا گزشتہ کئی روز سے تپتی سڑکوں اور کھلے آسمان تلے جاری ہے کیا وہ اقتدار کی تبدیلی کے لئے نہیں؟ انہیں کوئی غرض نہیں کہ ایک عام انسان کیسے جیتا اور کیسے روز روز مرتا ہے۔

کیا موجودہ حکومت کے مستعفی ہونے اور نئے لوگوں کے اقتدار میں آنے سے غریب کا ٹھنڈا چولہا گرم ہوگا؟

کیا ہمارا نوجوان روزگار حاصل کر سکے گا؟

کیا ہماری رکی ہوئی معیشت کا پہیہ رواں ہوگا؟

کیا ہمیں پانی مہیا ہوگا؟ صاف یا گندا ہونا بعد کی بات ہے۔

کیا بجلی بے بہا اور غیر ضروری ٹیکسوں کے بغیر چوبیس گھنٹے مل سکے گی؟

کیا اشیاء ضروریہ ہماری پہنچ میں ہوں گی؟

کیا ہمارا بچہ اچھی خوراک اور اچھی تعلیم حاصل کر سکے گا؟

کیا ہمارے ملک میں علاج معالجہ بہتر ہونے کا امکان ہے؟

کیا ہمارا نیم مردہ وقار بحال ہو سکے گا؟

کیا ہماری آزاد فضا غیر ضروری اقتدار کی آلودگی سے صاف ہو سکے گی؟

نہیں...... کچھ بھی نہیں ہوگا...... سب ہارے ہوئے جواری باری باری ایک نئے قحبہ خانے میں نئی قیادت کا نام دے کر شامل ہو رہے ہیں۔ سب رہزن ہیں۔ سب کو عوام کی جیبیں اور ملکی خزانے کو لوٹنے کے چور راستے معلوم ہیں۔

کسی کو کسی شہید اور کسی کو کسی غازی سے سروکار نہیں۔ سب ٹوپی ڈرامہ ہے جس کا اب ڈراپ سین ہونے والا ہے۔

خدا کے لئے اپنی کرسی کے لئے، وقتی اقتدار کے لئے، عوام کے کندھوں کا سہارا نہ لیں۔ اُن کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔

اُن کی معصومیت سے کھلواڑ نہ کریں۔ اپنی صفوں کو سیدھا کریں اور اپنے دشمن کو امن کی آشا دینے کی بجائے اُسے پہچانیں۔ سانپ سانپ ہی ہوتا ہے، وہ کبوتر نہیں بن سکتا۔ ایک نیا پاکستان بنانے کی بجائے ایک بنی بنائی ریاست کو احسن طریقے سے بچائیں۔ انقلاب نہیں احتساب کریں۔ انقلاب خود ہی آ جائے گا۔

صالحہ شاہد بنت عنایت اللہ

ابدال بیلا

دیکھو! یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ جتنا کسی کے پاس دنیاداری کا زیادہ حصہ ہوگا، اتنا ہی اندر سے وہ سہما ہوا، ڈرا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جب بھی کسی کے پاس کچھ ہوتا ہے تو اسی لمحے اسے اس سب کے چھننے کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ تجھے پیٹ بھرنے کے لئے جینا ہے تو تُو دنیا والوں میں ایسے لوگ ڈھونڈ جنہوں نے اپنے حصے سے زیادہ دنیا لوٹی ہوئی ہے لیکن ان کا پیٹ نہیں بھرا۔

گرو اپنے چیلے کو سمجھا رہا تھا۔

چیلا اپنے خالی پچکے پیٹ کو چھونے کے بعد ہاتھ جوڑ کے بولا سرکار! آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی، مگر پیٹ نہیں بھرا۔ آپ نے کہا بانسری بجانا سیکھ، میں نے سیکھ لی، بجاتا رہا، کوئی ہیر چوری لے کر نہیں آئی، آپ نے بولا الغوزہ سیکھ، وہ بھی سیکھ لیا، ایک رتی غوزہ نہ ملا، سارنگی بھی آپ کے کہنے سے بجائی، وہ منتیں کرتی رہی، مگر اس پکارتی التجائیں بھی کسی کان کے دل تک نہیں پہنچیں، طبلے اور ہارمونیم تک میں کمال حاصل کرلیا۔ پورا میراثی بن گیا، میراث کچھ نہ بنی۔ پیٹ بھرنے کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا۔ اب آپ لوگوں میں "ڈر" ڈھونڈنے کا سبق دے رہے ہیں۔ اسے ڈھونڈ بھی لوں تو کیا بجاؤں؟

بین بجاؤ۔

سرکار بین بجانی بھی سکھادیں۔

گرو نے سکھادی، چیلا جب بین بجانے میں ماہر ہوگیا تو گرو نے پاس پڑی ایک پٹاری اسے تھمادی۔ بولا یہ اب ساتھ رکھ۔ اس پٹاری میں کالا ناگ ہے۔ ڈر نہ، سانپ کے دانت نکالے ہوئے ہیں۔ اسے صرف فراٹا مارنا آتا ہے۔ کاٹنے سے یہ معذور ہے۔ تو چار دن گھر میں اس کی سیوا کر۔ اسے بین پہ نچانے کے نرت سیکھ۔ جب یہ ترے ساتھ گھل مل گیا تو سمجھ تیرے اچھے دن آ گئے۔

وہ کیسے حضور؟

تُو نے پھر ایک کام کرنا ہے۔ سانپ کو پٹاری میں ڈال کے بین لے کر ہر روز گھر سے نکلنا ہے۔ ہر شام تُو مالا مال ہو کے لوٹا کرے گا۔

سرکار! کیا چوک میں مجمع لگا کے سانپ کا تماشہ دکھایا کروں گا؟

ہے نا بے وقوف۔ تماشہ دکھانے کے لئے بین بجانے والے کی جھولی میں تو ناکارہ آنے دو آنے کے سکے آتے ہیں۔ میں نے تجھے بین بجانی ایسے بے دام کام کے لئے تھوڑی سکھائی ہے۔ تُو نے تماشہ نہیں دکھانا۔ بین بجا کے تماشہ دیکھنا ہے۔

وہ کس طرح سرکار؟

دیکھ تُو نے پہلے ایک کام کرنا ہے۔ کسی بڑے شہر جانا ہے۔ شہر میں جا کے امیر لوگوں کی بستی ڈھونڈنی ہے۔ اس بستی میں بھی ایسا گھر ڈھونڈنا ہے جو اپنے خد و خال میں خوب بنا سنورا ہو۔ جس کی اونچی ممٹیاں ہوں۔ دریچوں میں شیشوں کے چوڑے پٹ لگے ہوں۔ جدھر کھلا وسیع ولایتی گھاس اور گھنے پھولوں کے تختوں سے مزین باغیچہ ہو۔ گھر کے اندر لمبی لمبی چمکتی موٹریں کھڑی ہوں۔ گھر والے بچے بدیسی لہجے میں دیس کی زبان بولتے ہوں۔ صاحب اس گھر کا خود کو لاٹ صاحب سمجھتا ہو۔ بیگم صاحبہ خود کو میم بنائے رکھتی ہو۔ بس تسلی کر لینا کہ وہ گھر ایسا ہو جس میں سونے چاندی کے انبار لگے ہوں۔ ہن برستا ہو۔

ایسا گھر تو نے تاڑ لینا ہے۔

سمجھ جانا یہ وہی گھر ہے جس میں ڈر اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے۔ جب اس گھر کے باسیوں کے پاس اتنا کچھ ہے تُو ان سب کے دلوں میں ملے خزانوں کے چھننے کا ''ڈر'' لازمی ہے۔ تو نے اور کچھ نہیں کرنا۔ بس اس گھر کے پھولوں اور پھلوں بھرے باغیچے میں چپکے سے اپنا پالا ہوا سانپ چھوڑ دینا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسی گھر کے چوڑے دروازے پر لگی گھنٹی بجا دینی ہے۔ گھر سے جو نکلے، اسے کہنا ہے۔ عالیجاہ! میں سات پشتوں سے چلا آتا سپیرا ہوں۔ سانپ کی خوشبو دو کوس سے سونگھ لیتا ہوں۔ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ آپ کے خوش رنگ باغیچے میں کوئی کالا ناگ ہے۔ کسی بچے بڑے کو ڈس گیا تو کہرام مچا دے گا۔ اجازت ہو تو بین بجا کے پکڑ لوں۔ اب بتا، کون تجھے روکے گا۔

وہ تو دست بستہ تجھے بین بجانے کو کہیں گے۔ تُو بین بجانا۔

تیرا اپنا پالا ہوا سیکھا سانپ ادھر ہونا ہے۔ تھوڑی دیر بین سن کے جھومتا ہوا تیرے سامنے اس نے آ جانا ہے۔ تُو نے ہاتھ بڑھا کے اسے پکڑ لینا ہے۔ پھر دیکھنا وہ گھر والے تجھے کیسے مالا مال کرتے ہیں۔

چیلے کے دن پھر گئے۔

جتنا وہ کبھی سال بھر میں تماشے کر کے کمایا کرتا تھا، اتنا وہ ایک دن میں کمانے لگا۔ بے شمار شہر تھے۔ ہر شہر میں ان گنت چمکتی مہنگی بستیاں ہر بستی میں سجے سجائے گھر۔ وہ روز کسی نہ کسی لشکارے مارتے بڑے مکان کے باغیچے میں جا اپنا سانپ چھوڑتا۔ گھنٹی بجاتا، مدعا بیان کرتا اور بین بجانے لگتا۔ اس کا سانپ پھولوں بھرے تختوں کے نیچے سے سرکتا ہوا باہر نکل کے اس کے سامنے جھولنے لگتا۔

ایک دن عجیب تماشہ ہو گیا۔

اس نے بین بجائی، بین سن کے ایک کی بجائے دو سانپ نکل آئے۔ دونوں ایک جیسی شکل و صورت والے، کالے سیاہ ناگ۔ سپیرا تو اپنے دانت نکلے سانپ کو پکڑنے کا عادی تھا۔ اس کے سامنے اسی روپ کے دو ناگ آ گئے تو اس کی سیٹی گم ہو گئی۔ وہ بین بجا رہا تھا مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دل دھڑکتا سینے سے با[illegible]

نکلنے کو زور مار رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ بین بجتی بجتی بے سُری ہوگئی۔ وہ خوف سے بین بجاتے بجاتے کھسکتا کھسکتا پیچھے ہٹتا گیا۔ پیچھے دیوار آ گئی۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ سانپ دونوں جھولتے جھولتے اس کے سامنے پھن پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔ پیچھے ہٹنے کو جگہ ہی نہ بچی۔ جب موت کا خوف اس کی بین سروں سے سرک کے اس کے نتھنوں میں بجنے لگا تو اس نے بین چھوڑ کے ہاتھ جوڑ لئے۔ گھر والوں سے بولا سرکار گھر والا سانپ آپ پکڑ دیں۔ اپنے والا سانپ میں خود پکڑ لوں گا۔

گھر والے حیران، یہ سپیرا کیا کہہ رہا ہے؟

دنیا بھی ان دنوں اسی گھر والوں کی طرح حیران ہوئی بیٹھی ہے۔ دنیا بھر کے امیر گھروں کے خوش رنگ باغیچوں میں دنیا کی حکمرانی کا زعم رکھنے والا، سانپ چھوڑ کے بین بجا رہا ہے۔ مگر وہ خود انسانوں اور سانپوں کے پالنے والے خدا کی قوتوں سے بے خبر ہے۔ وہ خود جو سب تدبیر کرنے والوں سے بڑا تدبیر کرنے والا ہے۔ جو جب چاہے سانپوں اور سنپولیوں کی سرکوبی کے لئے کسی سوٹی کو سانپ بنا کے جہاں چاہے چھوڑ دے۔ اب اپنی ہی منتخب کی ہوئی جگہوں پہ اپنے سانپ چھوڑ کے پکڑنے کو پہنچا ہوا بین بجانے والا بھی کپکپاتا ہوا دیوار سے لگا بیٹھا ہے۔ اب کون اٹھے اور اپنے ہی گھر کی اپنے ہی ہاتھوں لگائی گھاس سے نکلا ہوا زہریلا سانپ پکڑے؟

سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔

گھر میں گھاس لگائی ہے تو وقت پہ اسے کاٹتے رہیں۔ اگر گھر میں جنگل بن گیا اور اس میں کوئی سانپ آ گھسا تو سانپ چھوڑ کے سانپ پکڑنے والا سپیرا بھی اسے کیسے پکڑے گا؟

***

غزل

خادم حسین مجاہد

چاہت کا اِکرام کیا ہے
دل کو بس اِہرام کیا ہے

ہر چڑھتے سورج کو پوجا
کتنا نادر کام کیا ہے

اُف! یہ ظالم دنیاداری
جاہل کو بھی سلام کیا ہے

ہم نے چھوڑ کے سازِ غزل کو
دولتِ خرد کو عام کیا ہے

جوگ کے روگ کو پالا پوسا
خود کو پسِ آلام کیا ہے

چہرے پہ مسکان سجا لی
یوں غم کو ناکام کیا ہے

خواب، محبت، آنکھ کے جگنو
سب کچھ تیرے نام کیا ہے

سچ بولا اور دار پہ لٹکے
زیست کا یوں انجام کیا ہے

مدت سے ہماری قوم بھینس بنی، لاٹھی والوں کے ہاتھ میں رکھیل بنی ہوئی ہے۔ جدھر لاٹھی مارنے والے ہانکتے ہیں، اُدھر ہنک جاتی ہے۔ ان لاٹھی والوں کے عجیب حلیے ہیں۔ ان کی لاٹھیاں بھی جدا جدا ہیں۔ کچھ لٹھ بردار دیکھنے میں نہتے ہیں، خالی ہاتھ لگتے ہیں مگر ہیں ان کے ہاتھ بہت لمبے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لاٹھی کی جگہ پر لاٹھی کی ماں پکڑی ہوئی ہے۔

پیسہ۔

جس سے دنیا بھر کی لاٹھیاں اور بھینسیں خریدی جاتی ہیں۔ ان کے پاس پیسوں کی بوریاں بھری ہیں۔ یہ ہماری بھولی بے بس لاچار اور بھینس جیسی موٹی عقل کی قوم کو اپنے نوٹوں کی خوشبو سے گھسیٹے لئے پھرتے ہیں۔ جیسے پرانے وقتوں میں چالاک عیار چور بھینس چراتے سمے لاٹھی لے کر واردات نہیں کرتے تھے، ہاتھ میں چارے کی مٹھی پکڑ کر بھینس کو چُرا لے جاتے تھے۔

ہماری قوم کا بھی برس ہا برس سے یہی حال ہے۔

ایک مٹھی چارے کی کشش میں یہ کشاں کشاں گھسٹتی پھر رہی ہیں۔

جمہوریت کے نام پر الیکشن ہوں تو عجیب طرح کی سلیکشن ہوتی ہے۔

ایک قیمے والے نان کے عوض یہ بھولی قوم اپنے نصیب کی ریکھا پر کالی مہر لگا دیتی ہے۔ پانچ سال کے لئے اپنا نصیب گنوا دیتی ہے۔

کوئی موٹریں لے کر انہیں پسوؤں کی طرح اس میں سوار کر کے کانجی ہاؤس پہنچا دیتا ہے۔ کانجی ہاؤس کا نام انہوں نے ووٹنگ سینٹر رکھا ہے۔

کہیں ذات پات کا سکہ چلتا ہے۔

برادری بازی کے نام پہ بازی گر، بازی لے جاتے ہیں۔

کہیں مذہب کے نام پہ اس بھینس کو ہانک لیا جاتا ہے۔

کہیں علاقائی، لسانی یا صوبائی لاٹھیوں سے اس بھینس کا رخ موڑا جاتا ہے۔

کبھی کبھار، کچھ لٹھ بردار بیچ کی لاٹھی لے کر بھینس پہ آوارد ہوتے ہیں اور لاٹھیوں سے اسے مار مار کے ادھ مُوا کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے اس کا آدھا جسم ہی معطل کر دیا۔ کاٹ کے الگ پھینک دیا۔

یہ سارے حربے، سارے طریقے صرف اس لئے آزمائے جاتے ہیں کہ بھینس کے جسم میں جو تھوڑی بہت ہڈیاں ہیں وہ چبالی جائیں۔ جو گوشت، ماس اور چھیچھڑے بچے ہیں انہیں بھنبھوڑ لیا جائے۔ جو تھوڑا بہت خون بچ گیا ہے، اسے ڈریکولا کی طرح اپنے نوکیلے دانتوں سے نچوڑ لیا جائے۔

پون صدی ہونے کو آئی، بھینس قوم کو ہانکنے والوں نے طریقہ نہیں بدلا۔

ہماری بھینس قوم نے بھی یہ سارے گڈریے دیکھے، سمجھے، پرکھے، مگر پوری قوم ذہنی طور پہ بھینس کے ذہن سے آگے نہیں بڑھی۔ اُسے دو ہاتھ سامنے دکھائی جانے والی چارے کی مٹھی اپنے برس ہا برس کے سنہرے نصیب سے ہمیشہ

خوش کن نظر آئی۔ ذرا سا لالچ، چھوٹے چھوٹے ذاتی، علاقائی مفاد اور قوم بک گئی۔ لوگوں نے اپنا مستقبل بیچ دیا۔

یہ قوم جسے لٹھ برداروں نے بھینس بنا کے ہنکایا ہوا ہے، اصل میں بھینس نہیں ہے۔ یہ اقبالؒ کے خواب کا وہ شاہین ہے جسے رزق کے لالچ میں اپنی پرواز نیچے رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ وہ قوم ہے جسے اقوام عالم میں اپنی عقل و خرد اور اعلیٰ حکمت عملی سے ایک ممتاز ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ شاید اسی ڈر سے مفاد پرست پرانے آقاؤں کے ٹوڈی پیسہ ور پیشہ وروں نے اس شاہین قوم کے پر کتر دیئے ہیں، چونچ کی جگہ پہ تھوتھنی چڑھا دی ہے، پنجے اتار کے چھپا دیئے ہیں۔

وہ قوم جو اصل میں شاہین فطرت ہے، اُسے ان بدفطرت لوگوں نے اپنے ڈیرے کی مرغی بنا کے صرف انڈے دینے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔

کبھی کبھی تو یہ ایک انڈے کا بھی انتظار نہیں کرتے اور چھری لے کر اس کی گردن کاٹنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

انہیں بس اس سونے کے انڈے دیتی مرغی سے انڈے نکالنے ہیں۔ مرغی کو دانہ روٹی بھی نہیں دینی۔ بس اپنا پیٹ پالے جانا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اپنی قوم کے حصے کا سارا دھن، سارا سونا غیروں کی تجوریوں میں جا جا کر ذخیرہ کرتے رہنا ہے۔

قوم کے جسم سے انہوں نے اس بدتہذیبی سے گوشت نوچا ہے کہ اس کی ہڈیاں ننگی کر دی ہیں۔

اس شاہین قوم کو کاٹ کتر کے مرغی بنا کے بھی اُن کا پیٹ نہیں بھرا۔

یہ ڈیرے دار ایک بات بھولے بیٹھے ہیں کہ شاہین کے ہر انڈے سے ہر حال میں شاہین ہی پیدا ہوتا ہے۔ پرانی کئی نسلیں اسی خواب کی تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھ گئیں کہ کبھی کوئی شاہین ایسا آئے جو اپنے چار دن کے منہ کے مزے کے لئے اس قوم کو، اپنی دھرتی ماں کو غیروں سے لئے چند نوالوں کے عوض نہ بیچے۔

ہنوز یہ خواب باقی ہے۔

کٹے پر، ٹوٹی چونچ اور بندھے پنجوں والے شاہین کا حلیہ ڈیرے میں بلیوں سے ڈر کے بھاگتی مرغی جیسا ہو گیا ہے۔ اقوام عالم کو فہم و ادراک کا سبق دینے والی قوم بھینس بنی لاٹھی سے ہنکائی جا رہی ہے۔ خیال آیا، جہاں بیسیوں کتابیں، کہانیوں اور ناولوں کی شکل میں لکھ لکھ کے اس سوئی قوم کو اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس بار سیدھا بین لے کر بجاتا ہوں، شاید یہ قوم جاگے۔ شاہین کی آنکھ میں روشنی اُبھرے۔ اس کے کٹے بازوؤں کو بال و پر ملیں۔ بھینس بھینس نہ رہے۔ قوم پھر سے شاہین بن جائے اور ہمارے لٹھ برداروں کا بنایا ہوا یہ محاورہ غلط ثابت ہو کہ بھینس کے آگے بین بجاؤ۔

ابدال بیلا

14 دسمبر 2012ء

اپنے اپنے مفاد کا کھیل

جس دن روٹی، کپڑا اور مکان کو ترسے ہوئے دس کروڑ
بھوکے ننگے عوام سڑکوں پر نکل آئے، وہ اصلی انقلاب کا دن ہوگا

افضال مظہر انجم ---------- 0305-4758284 ----------

ملک میں بالآخر لانگ مارچ، دھرنوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو 67 سالہ جبر، عوام کو ہی تختہ مشق بنانے، انہی کو ظلم و ستم کا شکار رکھنے، مسائل میں گرفتار کرنے اور سیاسی اور فوجی حکومتوں کی ہر قیمت پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کا نتیجہ ہے لیکن اس ملک کے کرپٹ، ملک لوٹنے والے، بنکوں کے قرضے ہڑپ کرنے والے سیاسی عناصر اور مذہبی جماعتوں کے منافق ایک طرف اور انقلاب کے دعوے دار لیکن کرپشن میں ملوث، ملکی خزانے لوٹنے والے، بھتہ خور، ٹارگٹ کلر دوسری طرف ہیں۔

''حکایت'' کے قارئین اس بات کے گواہ ہیں کہ میں عرصہ دراز سے ''حکایت'' کے صفحات پر اسی قسم کے اٹھنے والے طوفانوں کا ذکر کرتا رہتا تھا کیونکہ کسی معاشرے میں جب کرپشن، لوٹ مار، اقربا پروری ظلم و ستم، غربت، ناانصافی سمیت ہر برائی انتہا کو پہنچ جائے، کسی کو عوام یعنی جمہور کی پروانہ ہو اور وہ 18 کروڑ عوام کو نظرانداز کر کے اپنی ہی من مانیوں میں لگا رہے۔ عوام کے مسائل کو پس پشت ڈالا جا رہا ہو بلکہ ان کے مسائل کئی

سو فیصد بڑھا کر انہیں صرف اور صرف روٹی روزی کے چکر میں ہی جکڑ دیا جائے۔ زور آوروں کی بالادستی ہو۔ روپے پیسے سے ہی ہر چیز اسمبلیاں انصاف، رکنیت اسمبلی خریدا جارہا ہو، ایک طرف تو ملک کے دس کروڑ عوام کو دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہورہی ہو، دوسری طرف ایک ہی وقت میں ہزاروں روپے صرف کھانوں پر ہی اڑانے والا طبقہ، ایک گاڑی سے دوسری گاڑی، ایک مکان سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا لینے والا طبقہ، 100، 100 کروڑ کے پلازے اور 5، 5 ارب کی فیکٹریاں بنا کر ٹیکس چوری کرنے والا طبقہ ہے۔

مئی 2013ء میں اس ملک میں الیکشن ہوئے جس میں کافی دھاندلی بھی ہوئی۔ تحریک انصاف ایسی جماعت تھی جس کو عوام نے پہلی مرتبہ 75 لاکھ ووٹ دے کر اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ عوام پرانے لٹیروں نواز شریف اور آصف زرداری کی بجائے کسی تیسری شخصیت کو اس مرتبہ آزمانا چاہتے تھے۔

''حکایت'' کے انہی صفحات پر الیکشن کے نتائج کے بارے میں میرا تفصیلاً تجزیہ چھپا تھا۔ الیکشن سے پہلے مرکز میں پیپلز پارٹی اور پنجاب میں مسلم لیگ (نواز) سندھ میں، پیپلز پارٹی اور پھر پختونخوا میں اے این پی کی، صوبائی حکومتیں تھیں۔ تحریک انصاف کے سربراہ کے سر پر جلد از جلد وزیراعظم بننے کا بھوت سوار تھا کیونکہ ایجنسیوں میں سے کسی ایک شخصیت نے ان کو وزیراعظم بنوانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ اسی لئے وہ جلد بازی میں مارے گئے حالانکہ وہ عرصہ دراز سے اس ملک کے سیاست دانوں، سرکاری افسروں کی کرپشن اور دھاندلیوں کو اپنی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں ان کو سب سے پہلے الیکشن کمیشن کے دھاندلی روکنے کے انتظامات کے علاوہ صوبوں کی کرپٹ انتظامیہ اور سیاسی جماعتوں کے زیر اثر بیوروکریسی کو تبدیل کرانا چاہئے تھا۔ الیکشن چند ماہ تاخیر سے بھی ہو جاتے لیکن دھاندلی کے امکانات کم سے کم کئے جاسکتے تھے۔

دوسرے عمران اس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ بہت زیادہ سیٹیں حاصل کرلیں گے۔ انہی صفحات پر میں نے تبصرہ کیا تھا کہ عمران خان نے اپنے ساتھ مسلم لیگ (نواز) مسلم لیگ (قائداعظم) اور جنرل مشرف کے مسترد شدہ ساتھی ملا لئے تھے جن کو عوام مسترد کر چکے تھے۔ عوام نے اُن کی شخصیت کی وجہ سے اُن کو 75 لاکھ ووٹ تو دے دیئے لیکن اپنے کمزور، نااہل اور نکمے امیدواروں کی وجہ سے اُن کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلم لیگ (ن) کے امیدواروں کی زیادہ تعداد مضبوط حیثیت رکھتی تھی۔ اگر دھاندلی نہ بھی کی جاتی تو مسلم لیگ (ن) ہی زیادہ سیٹیں حاصل کرتی۔ تحریک انصاف مزید 15، 20 سیٹیں لے جاتی لیکن حکومت نہ بنا سکتی تھی۔

عمران خان نے نتائج آنے کے بعد تو دھاندلی کا زیادہ شور شرابا نہیں کیا کیونکہ ایک صوبہ خیبر پختونخوا میں وہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں آگئے تھے اس لئے وقتی طور پر انہوں نے سوچا کہ اس ایک صوبہ کو ماڈل بنا کر پورے ملک کے عوام کے سامنے مزید پذیرائی حاصل کروں گا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ دعووں اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ڈیڑھ سال کوئی تھوڑی مدت میں ہوتی اس عرصہ میں وہ اپنے صوبہ کے لوگوں کے مسائل حل نہیں کر سکے:

☆ کیا وہ غربت دور کرنے کے لئے کوئی عملی اقدامات کرنے میں کامیاب ہوگئے؟

☆ اب بھی دفتروں اور سرکاری محکموں میں رشوت اور سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

☆ کتنے سابق کرپٹ اور ملکی خزانے لوٹنے والے وزرائے اعلیٰ، ایم این اے، ایم پی اے اور سرکاری افسران کو انہوں نے پکڑا ہے؟ کیونکہ 53 سال سے تو وہ کرپشن اور ملک لوٹنے والوں کو سرعام پھانسی دینے کے

بلند بانگ دعوے کرتے نظر آ رہے ہیں۔

جب عمران اپنے صوبہ میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام نہ کرنے کی وجہ سے ناکام ہو گئے تو انہوں نے عوام کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کے لئے دھاندلیوں کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ نواز شریف، آصف زرداری دوسرے لفظوں میں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کرپٹ اور لٹیروں سے بھری ہوئی ہیں لیکن اس تحریک چلانے کے لئے عمران خان اور مولانا طاہر القادری نے جس وقت کا انتخاب کیا وہ نہایت غلط وقت تھا۔ آپریشن ضرب عضب کی وجہ سے وزیرستان سے نقل مکانی کرنے والے آٹھ نو لاکھ افراد کے مسائل حل کرنے اور ان کا سامنا کرنے کی بجائے عمران خان نے لانگ مارچ اور دھاندلیوں کا شوشا چھوڑا کیونکہ ان لاکھوں لوگوں کے گھر بار تباہ ہونے اور روزی روزی ختم ہونے کے بعد ان کی آبادکاری یا مسائل کا حل خیبر پختونخوا حکومت کو ہی کرنا تھی۔ ان متاثرین کی دل جوئی کرنے کی بجائے عمران نے اسلام آباد کی طرف چڑھائی شروع کر دی۔

مولانا طاہر القادری کی شخصیت اور انقلاب

مولانا طاہر القادری مذہبی علمیت کے لحاظ سے تو کافی بھاری بھرکم شخصیت ہیں اور دلوں پر اثر کرنے والی تقاریر کرنے میں نام رکھتے ہیں۔ انہی تقاریر کی وجہ سے ہی ایک مدت سے لاکھوں افراد کو اپنے دامن کا اسیر بنایا ہوا ہے جو اُن کی ہر آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ لوگوں کو شاید یاد ہو گا کہ بے نظیر بھٹو کے دور میں بھی ایک مرتبہ الیکشن میں ایک سیٹ بھی نہیں لے سکی تھی ڈائریکٹ اس ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ وزارت عظمیٰ یا صدر پاکستان کے عہدہ پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح کی دوسری کوشش مولانا صاحب نے فوجی ڈکٹیٹر جنرل پرویز مشرف کے دور میں دہشت گردوں یعنی القاعدہ اور طالبان کے خلاف کھلے بیانات دے کر بھی کی تھی جو ساتھ ہی حکومتیں بنانے ہٹانے والی سپر پاور امریکہ کو بھی ایک اشارہ تھا لیکن جنرل مشرف نے اس موقع پر مولانا کو گھاس نہیں ڈالی اور وہ واپس کینیڈا کی طرف پرواز کر گئے اور دوبارہ مشرف دور میں واپس نہیں آئے۔ تیسری مرتبہ جب آصف زرداری حکومت ختم ہونے کے بعد الیکشن قریب تھے تو انہوں نے پھر قسمت آزمائی کی اور اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کیا جس کے مقاصد آج تک سمجھ نہیں آ سکے کیونکہ اسی حکومت کو یزیدیت قرار دے کر اسی سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اب چوتھی مرتبہ انقلاب کا نعرہ لگا کر اسلام آباد کا گھراؤ کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے ان کی پشت پر کوئی ایسی قوت ہے جو ان کو آگے بڑھا کر اپنا کھیل کھیل رہی ہے۔

مولانا کو اُن کے فرقہ کے علماء بھی شیخ الاسلام نہیں مانتے

مولانا طاہر القادری نے جب اپنا ادارہ بنا کر اور اپنے مریدین میں اضافہ کر کے مذہبی طور پر اپنے آپ کو ایک روشن خیال عالم دین کے طور پر پیش کیا تو ان کے اپنے اہل سنت بریلوی فرقہ کے بڑے بڑے علمائے کرام ومفتیان عظام ہی ان کے خلاف ہو گئے۔ اپنی کتابوں میں بھی انہوں نے ایسے روحانی دعوے کئے جن کو آج تک یہ علمائے کرام تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اب اپنی علمیت کے زعم میں اور ہزاروں مریدین کو اپنے حلقہ ارادت میں لئے مولانا صاحب خود ساختہ شیخ الاسلام بھی بن بیٹھے کیونکہ شیخ الاسلام کا مطلب علمائے کرام میں علمیت کے لحاظ سب سے برگزیدہ شخصیت کو عطا کیا جاتا ہے جو نہ صرف علمیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہو بلکہ کردار کے لحاظ سے بھی مصلحتوں کی پابند نہ ہو اور ایسی شخصیت پر امت مسلمہ کا مشترکہ اعتماد ہو لیکن بدقسمتی سے مولانا صاحب کو دوسرے

فرقوں نے تو کیا تسلیم کرنا تھا اُن کے اپنے فرقہ اہل سنت کے علماء ہی ان کو اس خطاب کے اہل نہیں سمجھتے ۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ لوگوں کو جو بات باور کروانا چاہ رہا ہے اسے کوئی نہ مانے نہ اس کے لئے وہ اسی طرح کے توجہ دلانے والے حربے استعمال کرتا نظر آتا ہے۔

مولانا نے ایمانداروں اور مذہبی لوگوں کو ساتھ کیوں نہیں ملایا؟

مولانا کا ملک میں بنیادی تبدیلی اور انقلاب کے نعرے سے تو کسی کو انکار نہیں ہے لیکن اس کے لئے انہوں نے اچھے اور ایماندار لوگوں اور مذہبی جماعتوں کو ساتھ کیوں نہیں ملایا؟ غلام مصطفیٰ کھر جیسے بدنام زمانہ شخص کو جو گورنر بن کر طوائف ناہید کو ملنے ہیرا منڈی جاتا تھا، کا انتخاب کیوں کیا؟ کرپشن کرنے والے اور قرضے ہڑپ کرنے والے خاندان چوہدری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی اور کرپٹوں کی پارٹی مسلم لیگ (ق) کو کیوں ساتھ ملایا؟ ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری کے علاوہ ہر فوجی حکومت کی کاسہ لیس ایم کیو ایم کو کیوں ساتھ ملایا؟

ایم کیو ایم علامہ قادری کے کندھوں پر سوار ہو کر پنجاب میں داخل ہونا چاہتی ہے

ایم کیو ایم، عوامی تحریک، جنرل پرویز مشرف امریکی اشارے پر طالبان یا مذہبی تنظیموں کے خلاف اتحاد بنانا چاہتے ہیں مولانا طاہرالقادری اور ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین دونوں حضرات بیرون ملک بیٹھ کر طالبان کے خلاف بیانات دیتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ مسلمان مارنے پر اُن کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ طالبان سے اختلاف اپنی جگہ لیکن امریکہ نے دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں پر جو ظلم وستم کیے اُن پر الطاف حسین اور مولانا قادری کی خاموشی چہ معنی دارد؟ دوسرے

ایک ایسے موقع پر جب اس ملک میں بنیادی تبدیلیوں کا عمل شروع ہونے والا ہے اور اسلامی انقلاب کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ امریکہ کے اشارے پر ایم کیو ایم، عوامی تحریک، مسلم لیگ (ق) کو ان سیاسی عناصر کے خلاف نیا محاذ بنانے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ ایم کیو ایم کے مولانا قادری سے گہرے روابط کا مطلب ہے کہ ایم کیو ایم مولانا کی وساطت سے پنجاب میں داخل ہونا چاہ رہی ہے اور علامہ صاحب ایم کیو ایم کی طاقت کی وجہ سے کراچی میں اپنی طاقت بڑھانا چاہتے ہیں۔

3 سیٹیں رکھنے والے سیٹوں والوں کو اسمبلی سے کس طرح سے بے دخل کر سکتے ہیں؟

تحریک انصاف کا لانگ مارچ میں مطالبہ الیکشن کے دوران دھاندلی کر کے حکومت کرنے والی نواز حکومت کے استعفیٰ کا ہے۔ اصولی طور پر اور آئینی یا قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مطالبہ سراسر غلط ہے کہ 35 سیٹیں جیتنے والے قومی اسمبلی، سندھ اسمبلی، بلوچستان اسمبلی اور پنجاب اسمبلی میں جیتنے والوں کو یا ووٹ حاصل کر کے حکومت سنبھالنے والے سینکڑوں ارکان اسمبلی کو حکومت چھوڑنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ الیکشن میں دھاندلی ضرور ہوئی ہے لیکن 20، 40، 50 سیٹوں پر ہوئی ہوگی، مسلم لیگ (ن) کے الیکشن میں زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کی وجہ صرف دھاندلی سے حاصل کردہ سیٹیں نہیں ہیں۔ دوسری جماعتوں کے کمزور امیدواروں کے مقابلہ میں مخالف جماعتوں کے ووٹ بکھرنا بھی اس کی دوسری وجوہات میں شامل ہے۔

عمران کو نواز شریف اور مسلم لیگی وزراء کی کرپشن سامنے لانی چاہیے تھی

عمران خان نے ایک سال بعد دھاندلی ہونے پر

لانگ مارچ کا اعلان کیا حالانکہ اس عرصہ کے دوران اُن کو محنت کر کے اور ثبوت اکٹھے کر کے نواز شریف اور مسلم لیگی امراء کی کرپشن، لوٹ مار اور بنکوں کے قرضے ہڑپ کرنے کا ریکارڈ سامنے لانا چاہئے تھا اور عدالتوں بشمول نیب کے محکمہ پر اپنا زور بڑھانا چاہئے تھا کہ 63-62 کی دفعہ لگا کر ایسے افراد کو ہمیشہ کے لئے سیاست سے آؤٹ کیا جائے تاکہ کرپشن میں ملوث لوگوں کو سیاست سے آؤٹ کرا کر صاف ستھری سیاست کی داغ بیل ڈالی جاسکے۔

عمران بجلی و پٹرول کے نرخ کم کرانے کا نعرہ بلند کرتے تو عوام کی اکثریت ان کے ساتھ ہوتی

الیکشن وغیرہ یا سیاسی مسائل عوام کا مسئلہ نہیں پارٹیوں کا ہے۔ عمران خان بجلی اور پٹرول کے نرخ کم کرانے کے لئے حکومت کو الٹی میٹم دیتے اور اس کے بعد عوام کو کال دیتے تو عوام کی اکثریت اُن کے ساتھ ہوتی۔ جس دن نواز شریف ن بجلی کے نرخ بڑھائے تھے اسی روز ہی تحریک انصاف والے اسمبلیاں چھوڑ کر باہر آ جاتے تو لوگوں کی بڑی تعداد ان کے ساتھ ہوتی۔

50 لاکھ کی پجارو میں بیٹھنے والا لینڈ مافیا، کرپٹ لوگ انقلاب نہیں لا سکتے

عمران خان کے لانگ مارچ میں ایک تو ایم این اے، ایم پی اے کے سینکڑوں امیدوار اپنے حامیوں کے ہمراہ موجود تھے، یہ سب کروڑ پتی افراد اور ان کا تعلق لینڈ مافیا فیکٹری مالکان سے تھا۔ دوسرے نوجوانوں کی کافی تعداد بھی تھی۔ کیا 50-50 لاکھ کی پجارو پر بیٹھنے والے انقلاب لائیں گے؟ یہ سب آئندہ الیکشن کے امیدوار ہیں اور اپنے علاقے سے بسوں لوگوں کو لے کر آئے ہوئے ہیں۔

ہر سیاسی پارٹی اپنے مفاد کی گیم کھیل رہی ہے، مذہبی جماعتیں قادری اور عمران کو نمبر نہ لے جانے کی وجہ سے جمہوریت جمہوریت الاپ رہی ہیں پیپلز پارٹی، مسلم لیگ کے کرپٹ لوگ خوف کی وجہ سے اکٹھے ہیں

ایک طرف انقلاب یا تبدیلی لانے والے کرپٹ اور غلط لوگوں کے ساتھ میدان میں ہیں۔ دوسری طرف برسر اقتدار طبقہ جو بال بال تک کرپشن میں ہمیشہ ہی ملوث رہا ہے ایک فریق بن کر سامنے کھڑا ہے۔ پیپلز پارٹی کے آصف زرداری اور اُن کے سیاسی ساتھی جو ہمیشہ ہی لوٹ مار اور کرپشن میں ملوث رہے احتساب کے خوف سے ایک ہی کشتی پر سوار ہیں اور جمہوریت کو بچانے کے نعرے لگا رہے ہیں حالانکہ جمہوریت کی بجائے یہ لوگ اپنے آپ کے بچاؤ کا بندوبست کرنے میں مصروف ہیں تاکہ کل کو وہ حالات کے بدلنے پر شکنجے کی پکڑ میں نہ آ جائیں۔

اس طرح سے ہمیشہ ہی اسلامی نظام کا نفاذ انقلاب کے ذریعے لانے کا نعرہ لگانے والی منافق مذہبی جماعتیں جمعیت العلمائے اسلام (فضل الرحمان) اور جماعت اسلامی بھی اپنے سیاسی مفاد کے لئے جمہوریت کو بچانے میں نہایت سرگرمی دکھا رہی ہیں اور جمہوریت کے ذریعے تبدیلی نہ آنے کی ماضی میں دعویدار یہ مذہبی جماعتیں جمہوریت کا راگ اس لئے الاپ رہی ہیں کہ وہ عمران خان اور مولانا طاہر القادری کو تبدیلی یا انقلاب لانے کا کریڈٹ نہیں دینا چاہتیں اور کل کو یہ جماعتیں بھی یہی نعرہ لے کر میدان عمل میں آئیں گی یعنی ملک کی ہر سیاسی اور مذہبی جماعت اپنے سیاسی مفادات کا کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کرپٹ عناصر کے خلاف تحریک پر کم از کم ان کو خاموشی ہی اختیار کرنا چاہئے تھی۔

دس کروڑ بھوکا ننگا جس دن سڑکوں پر آئے گا وہ اصلی انقلاب ہوگا

اس ملک میں آئی درجنوں جمہوری اور فوجی حکومتوں نے عوام کا یہ حال کردیا ہے کہ ان کے لئے گھر کا خرچ تک چلانا مشکل ہوگیا ہے۔ روٹی، تعلیم علاج معالجہ کا حصول مشکل ہو چکا ہے اور عرصہ دراز سے اس طبقہ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ وہ اپنے حقوق، غربت کے خاتمہ، مہنگائی کے بوجھ سے نجات اپنے بھوک سے بلکتے بچوں، ایڑیاں رگڑ کر مرتے والدین کو روٹی اور دوائی دے کر مرنے سے بچانے کی خاطر سڑکوں پر نکل سکے لیکن ایسا کب تک ہوگا؟ یہ طبقہ تھوڑی تعداد میں نہیں دس کروڑ کی بڑی تعداد میں پورے ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں موجود ہے جس دن یہ طبقہ مزدوروں، کسان اور ملازم سڑکوں پر آئے گا وہ گریبان سے ہر ایک کو پکڑ لے گا کیونکہ جن لوگوں نے دس کروڑ کے اس طبقے کا جینا حرام کر کے رکھا ہوا ہے اس طبقہ کی قیادت کے پاس نہیں ہوگی اور یہ ایک دفعہ سڑکوں پر آئے گا تو پھر واپس نہیں دے گا۔ اس ملک میں بنیادی تبدیلیوں کا آغاز شروع ہو جائے گا اور ملک کے سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیوں اور کرپشن میں ملوث سیاست دانوں کے سیاست سے آؤٹ ہونے کے بعد ہی عوام کے مسائل حل کرنے کی طرف بھی قدم اٹھایا جا سکے گا جو زندہ درگور ہوکر رہ گئے ہیں۔ وہ وقت جلد آ رہا ہے، سیاست دان، جرنیل، صنعت کار، ٹیکس چور مافیا، سردار اور جاگیردار اگر نوشتہ دیوار پڑھ سکیں تو اُن کے لئے بہتر ہوگا ورنہ وہ خس و خاشاک کی طرح اس ریلے کے آگے بہہ جائیں گے اور ان کا نام ونشان تک بھی نہیں رہے گا۔

***

سازشی تھیوری اور عالم اسلام

امریکہ اور اس کے حلیف ممالک نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ کسی بھی اسلامی ملک میں قرآن وسنت پر مبنی نظام کو چلنے نہیں دیں گے اور جو مسلمان حکمران اس سلسلے میں متحرک ہوگا اور کامیابی کی طرف بڑھنے لگے گا اسے ختم کردیا جائے گا

☆ محمد افضل رحمانی

عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود و ہنود اور نصاریٰ کی سازشیں ایک حقیقت ہے۔ ابتدائے اسلام سے لے کر اب تک یہود و نصاریٰ نے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔ ادارہ "حکایت" نے اس موضوع پر قارئین سے اپنی رائے کے اظہار کی دعوت دی۔ جولائی کے شمارے میں سیّد ریاض الحسن صاحب نے ایک مختصر مگر جامع مضمون تحریر فرمایا ہے جس سے میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں بلکہ اب تو یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ پوری مسیحی دنیا نے امریکہ کی قیادت میں عالم اسلام کے خلاف صلیبی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ امریکہ اور اس کے حلیف ممالک نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ کسی بھی اسلامی ملک میں قرآن وسنت پر مبنی نظام کو چلنے نہیں دیں گے اور جو مسلمان حکمران اس سلسلے میں متحرک ہوگا اور کامیابی کی طرف بڑھنے لگے گا اسے ختم کردیا جائے گا اور جو دینی جماعت اسلامی نظام کے لئے کوشاں ہوگی اور جمہوری انداز میں عوام کے ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہو کر برسر اقتدار آئے گی اسے فوجی ذرائع سے جبراً پیچھے ہٹا دیا جائے گا بلکہ نشانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔ وہ اس طرح کیوں کرتے ہیں اس کی وجہ قرآن کریم نے یوں بیان فرمائی ہے:

ترجمہ: ☆......دل چاہتا ہے بہت سے اہلِ کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر دوبارہ کافر بنا دیں بہ سبب اپنے دلی حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ان پر حق۔
(سورہ بقرہ آیت نمبر 109)

☆......اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تُو تابع نہ ہو ان کے دین کا تو کہہ دے جو راہ اللہ بتلا دے وہی راہ سیدھی ہے۔
(سورہ بقرہ آیت نمبر 120)

☆......اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا عیسائی تو تم پالو گے راہِ راست تو کہہ دے ہرگز نہیں بلکہ ہم نے راہ پا لی ابراہیمؑ کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ شرک کرنے والوں میں۔
(سورہ بقرہ آیت 135)

☆......اور کہا بعضے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر دن چڑھے اور منکر ہو جاؤ آخر دن میں شاید وہ پھر جاویں اور نہ مانیو مگر اسی کی جو چلے تمہارے دین پر۔ (سورہ آل عمران آیت نمبر 72)

ان آیت مبارکہ پر فوائد عثمانی دیکھئے فائدہ نمبر 108۔ ان آیتوں میں اہل کتاب کی چالاکیاں اور خیانتیں ذکر کی جارہی ہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے

کچھ آدمی صبح کے وقت بظاہر مسلمان بن جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور شام کو یہ کہہ کر ہم کو اپنے بڑے بڑے علماء سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی بشارت دی گئی تھی اور تجربہ سے ان کے حالات بھی اہل حق کی طرح ثابت نہ ہوئے۔ اسلام سے پھر جایا کریں نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے ضعیف الایمان ہماری یہ حرکت دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے اور سمجھ لیں گے کہ مذہب اسلام میں ضرور کوئی عیب ونقص دیکھا ہوگا جو یہ لوگ داخل ہونے کے بعد اس سے نکلے۔ نیز عرب کے جاہلوں میں اہل کتاب کے علم وفضل کا چرچا تھا اس بنا پر یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ جدید مذہب اگر سچا ہوتا تو اہل علم اسے رد نہ کرتے بلکہ سب سے آگے بڑھ کر قبول کرتے۔

یوں تو اس موضوع پر قرآن حکیم میں بہت سی آیات ہیں مگر میرا مدعا ثابت کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہود ونصاریٰ شروع دن سے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ بہرحال میں اس وسیع موضوع کو چھوڑ کر ماضی قریب کے چند واقعات لکھ رہا ہوں امید ہے قارئین کرام ان پر غور فرمائیں گے!

امام حسن البنا

یہود ونصاریٰ کی سازشوں کا سلسلہ اس وقت سے زیادہ زور پکڑ گیا جب مسلمان ممالک سامراج کی غلامی سے آزاد ہوئے اور مختلف مسلمان ممالک میں نظام اسلام کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور اس سلسلے میں پہلی کوشش مصر کی طلسماتی شخصیت امام حسن البنا کی طرف سے ہوئی تھی۔ موصوف محترم نے 1946ء میں اخوان المسلمون کے نام سے ایک دینی جماعت قائم کی جس نے اپنے دعوتی عمل اور شب وروز کی محنت سے چند ہی برسوں میں مصر کی دینی اور سیاسی فضا میں انقلاب برپا کر دیا بلکہ ان کی دعوت مصر سے باہر شام عراق اور اردن تک پھیل گئی۔ سوڈان اور شمالی افریقہ کے سارے ہی ممالک اس سے متاثر ہوئے۔ اس سے سامراج نواز برسراقتدار طبقے میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور مصر کے حکمران شاہ فاروق نے امام موصوف کو 1949ء میں قتل کرا دیا۔ اس وقت امام کی عمر صرف 43 سال تھی۔ مگر امام کی شہادت کے بعد حیرت انگیز طور پر اخوان المسلمون کی فکر اور دعوت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور اس نے ایک سیلاب کی طرح مصر کے اردگرد سارے ہی ممالک کے عوام کو مسخر کر لیا۔ 1950ء میں فوج نے مصر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا اور جنرل نجیب برسراقتدار آ گئے لیکن چونکہ یہ دینی مزاج کے حامل تھے اور اخوان المسلمون کے لئے مفاہمت اور یگانگت کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے سامراجی قوتوں نے سازش کی اور کرنل ناصر نے جنرل نجیب کو برطرف کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر لیا اور یہیں سے مصر کے حالات نے المناک صورت اختیار کر لی۔

اور اب یہ بات مختلف ذرائع سے ثابت ہو چکی ہے کہ مصری آمر جمال عبدالناصر کے اسرائیل اور امریکی ایجنسیوں سے بہت گہرے تعلقات تھے چنانچہ جنرل موصوف نے 1953ء میں اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا اور اس کے سارے ہی قائدین اور سرگرم ارکان کو حوالہ زندان کر دیا اور پھر عبدالقادر عودہ اور سید قطب جیسے نابغہ اور بے مثال علماء کو تختۂ دار پر لٹکا دیا اور مصر لمبے عرصے کے لئے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہاتھی کے دانت

امریکہ جو دنیا میں جمہوریت کا چمپئن بنا پھرتا ہے جب اخوان المسلمون نے ووٹ کی طاقت سے اقتدار حاصل کیا تو اسے ایک آنکھ نہ بھایا اور صرف ایک سال بعد جنرل عبدالفتح السیسی نے 3 جون 2013ء کو ایک

جمہوری حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا گویا اسلام پسندوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ تم خواہ جائز اور مروجہ طریقے سے بھی حکومت میں آؤ گے تب بھی تمہیں اقتدار میں نہیں رہنے دیا جائے گا حالانکہ اخوان المسلمون کے رہنما محمد مرسی نے جنرل السیسی کو کئی سینئر جنرلوں کو چھوڑ کر مصری فوج کا سربراہ بنایا تھا لیکن اس احسان فراموش جنرل نے اخوان المسلمون پر ظلم و ستم کا نیا ہولناک ترین دور شروع کر دیا۔ جنرل نے چیف جسٹس کی سربراہی میں عبوری حکومت تشکیل دے کر فوج اور عدلیہ کی آمریت مسلط کر دی لاکھوں مصری عوام اپنی منتخب حکومت کے خاتمے اور جنرل جج آمریت حکومت کے خلاف اکسانے کے الزامات میں درجنوں مقدمات قائم کر دیئے۔ عوام فوج اور عدلیہ کی آمریت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے اور فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے جہاں صدر مرسی کو قید رکھا گیا تھا، پُرامن دھرنا دیا جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مصری فوج نے پُرامن اور نہتے مظاہرین پر وحشیانہ فائرنگ کر دی جس سے تقریباً دو ہزار شہری جہاں بحق ہو گئے اور سینکڑوں گرفتار کر لئے گئے اور پھر فوج اور عدلیہ آمریت نے اخوان المسلمون کے خلاف اپنے بغض و کینہ کا شرمناک اظہار شروع کر دیا۔ مارچ 2014ء میں 529 افراد کو مختصر سماعت کے بعد عدالت نے سزائے موت سنا دی مگر جمہوریت کے دعوے دار مغربی ممالک جمہوریت کے بجائے آمریت کا ساتھ دے رہے ہیں۔

28 اپریل کو اسی عدالت نے اخوان المسلمون کے مرشد عام محمد بدیع سمیت 682 افراد کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ دوسرے روز 29 افراد کو پانچ پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔

امریکہ کا کردار

امریکہ نے سرکاری سطح پر اس اجتماعی قتل عام کی مذمت کرنے کی بجائے حوصلہ افزائی کی 529 افراد کو سزائے موت کا اعلان ہونے کے ایک ہفتے بعد امریکہ نے مصر کی امداد جزوی طور پر بحال کر دی جو صدر مرسی کی منتخب حکومت کے خاتمے پر عائد کی گئی تھی۔ واشنگٹن نے حیرت انگیز طور پر 650 ملین ڈالرز کی فوجی امداد اور 10 اپاچی ہیلی کاپٹرز دینے کا اعلان کیا جس پر آزاد مبصرین اور تجزیہ کار حیران ہیں۔ 682 افراد کو سزائے موت سنائے جانے کے دوسرے ہی دن مصری وزیر خارجہ نبیل فہمی واشنگٹن کے دورے پر گئے۔ امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے دورانِ ملاقات اس غیر منصفانہ فیصلے پر براہ راست ایک لفظ تک نہیں کہا۔ پاکستان میں ملالہ کے واقعہ پر ساری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دینے والے امریکہ نے مصری وزیر سے صرف اتنا کہا کہ عبوری حکومت ثابت کرے کہ وہ جمہوریت لانے میں سنجیدہ ہے انہوں نے اپنے شہریوں کو قتل، گرفتار اور ان پر تشدد کرنے والی مصری عبوری حکومت کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات بھی ظاہر کیں اور جمہوریت کی علم بردار امریکی حکومت نے آمرانہ حکومت، کے لئے 105 ارب ڈالر کی امداد پر پابندی کو جزوی طور پر اٹھانے کا اعلان کیا جو یقیناً ہزاروں مسلمانوں کو جرم بے گناہی اور جمہوریت کی بحالی کے مطالبے پر سزائے موت سنانے کا انعام سمجھنا چاہیے۔

دو انتہائیں

کبھی آپ نے غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ امریکہ اور مغربی دنیا کو مسلمانوں کے اندر سے ایسے بااختیار لوگ کیوں مل جاتے ہیں جو ان کی پالیسیوں اور سازشوں میں ان کے ہمنوا ہوتے ہیں اور وہ مسلمان ممالک میں ان لوگوں کے بل بوتے پر اپنے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو دو واضح حصوں میں بانٹ کر افراتفری اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیتے ہیں اور بھائی کو

بھائی کے ہاتھوں قتل کراتے ہیں ان کو آپس میں گتھم گتھا کرا کے خود محفوظ ہو جاتے ہیں۔ عراق میں مالکی کو اور افغانستان میں کرزئی کو برسر اقتدار لا کر انہیں کے ہاتھوں سے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کو مرواتے ہیں اور یہ ان کی ایک بہت بڑی شیطانی چال ہوتی ہے جسے مسلمان سمجھنے سے قاصر نظر آ رہے ہیں۔ وہ اپنے فوجیوں کو پیچھے رکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کا جانی نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر میر جعفروں اور میر صادقوں سے کام لیتا ہے۔ ہر جگہ ان کا دوہرا معیار ہوتا ہے۔ عراق میں یزیدیوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کی چیخیں تو وائٹ ہاؤس میں اوبامہ کے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں لیکن فلسطین اور کشمیر کے معصوم اور نہتے عوام، بچوں اور عورتوں کی انہیں کوئی پروا نہیں ہے۔ جدید ترین اور مہلک اسلحہ اور دجال میڈیا کے بل بوتے پر وہ جھوٹ کو سچ، ظلم کو انصاف اور رات کو دن ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور کافی حد تک کامیاب جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اس صورتِ حال کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دو انتہاؤں میں بٹے ہوئے ہیں اور جس طرح زمین اور آسمان یا نہر کے دو کنارے آپس میں کہیں نہیں ملتے اسی طرح ہمارے درمیان بھی وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے اور ہماری اسی خامی کی وجہ سے دشمن ہم پر بری طرح سے چھا چکا ہے چونکہ ہر شخص کی سوچ علیحدہ علیحدہ ہو سکتی ہے۔ آپ کو بھی میری اس سوچ سے اختلاف کا حق حاصل ہے لیکن میری رائے کو پرکھنے کے لئے آپ چند منٹ غور تو کر سکتے ہیں۔

دیکھیں، مسلمان آبادی دو واضح حصوں میں بٹ چکی ہے ایک طرف سیکولر ذہن ہے اور دوسری طرف دینی ذہن اور یہ دونوں ہی انتہا پسند ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سیکولر ذہن کے نزدیک دینی ذہن کی سوچ دقیانوسی اور پیچھے کی طرف لے جانے والی ہے اور دینی ذہن کے نزدیک سیکولر ذہن بے دین اور غیر مسلموں کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہے اور اس کی بنیادی وجہ طریقہ تعلیم ہے۔ ان دونوں گروہوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں یہ لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا کہ کسی مقام پر یہ دونوں آپس میں مل جائیں یا کم از کم ایک دوسرے کی رائے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک مدینہ یونیورسٹی کا فارغ ہے تو دوسرا آکسفورڈ کا یا یوں سمجھ لیں کہ ایک طرف راحیل قاضی ہے اور دوسری طرف وینا ملک۔ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے اور یہی سب سے مظلوم اور قابل رحم طبقہ ہے جو خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کو جس کا جی چاہے لے اڑے اس طبقے پر دونوں نے حسب توفیق قبضہ کر رکھا ہے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما جب ضرورت پڑتی ہے اس پر شب خون مارتے ہیں اور حسب منشا اور حسب حال ان کو استعمال کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ استعماری طاقتوں کے لئے سیکولر ذہن گھڑے کی مچھلی اور دینی ذہن کھلے سمندر کی مچھلی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیکولر ذہن انہی کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر آتا ہے اور انہی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، انہی جیسا لباس اور انہی جیسا طرز زندگی اور تقریباً انہی جیسے خیالات کا حامل ہوتا ہے لہٰذا بہت جلد ان کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف دینی ذہن نے جدید تعلیم کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ نہیں پاتے اور بے دین حاکموں سے ڈنڈے گولیاں، کھاتے اور جیل کی سیر کرتے اور اس پر نازاں رہتے ہیں کہ ہم دین کی خاطر سختیاں برداشت کر رہے ہیں جس کا اجر آخرت میں ملے گا۔

اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا

ایسے ہی ایک کردار کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا جس نے 1921ء میں خلافت کا خاتمہ کر کے اقتدار پر قبضہ کر

لیا اور ترکی جیسے اسلامی ملک میں بدترین آمریت قائم کر دی اس نے ترکی سے ہر طرح کے اسلامی آثار کو محو کرنے کا تہیہ کر لیا حتیٰ کہ عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط رائج کر دیا۔ عربی میں اذان دینے پر پابندی لگا دی گئی سارے دینی ادارے اور مدارس خلاف قانون قرار پائے۔ ترکوں کو روایتی لباس پہننے سے منع کر دیا اور خواتین کے پردے کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور جب دینی ذہن نے مزاحمت کی تو دس ہزار علماء کو قتل کر دیا گیا۔

خلافتِ عثمانیہ

قونیہ میں اللہ تعالیٰ نے سلجوقیوں کو عروج بخشا۔ علاء الدین کیقباد قریب تھا کہ تاتاریوں کے سیلاب میں بہہ جاتا کہ ایک ترک سردار سلیمان خاں اپنی معمولی سی جمعیت کے ساتھ سلجوقیوں کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ اب میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ علاء الدین نے ترک سردار کو فوج کا سالار بنا دیا۔ 634ھ میں علاء الدین اور سلیمان دونوں مر گئے اور بالترتیب غیاث الدین اور الطغرل ان کے جانشین ہوئے۔ الطغرل عین عالم جوانی میں مر گیا۔ غیاث الدین نے اس کے بیٹے عثمان خاں کو اپنی افواج کا سالار بنا دیا 699ھ میں غیاث الدین فوت ہوا تو قوم نے عثمان خاں کو اس کا جانشین منتخب کیا۔ یہی عثمان آگے چل کر خلافتِ عثمانیہ کا بانی ہوا۔

بایزید یلدرم

بایزید نے اٹلی، فرانس، انگلستان، ہنگری، پولینڈ، بوسنیا وغیرہ کی متحدہ طاقتوں کو 24 دسمبر 1596ء کو شکست دے کر پچیس عیسائی شہزادوں اور فرمانرواؤں کو گرفتار کیا اور انہیں بروصہ لا کر آزاد کر دیا پھر خود یورپ پر حملہ کیا 800ھ میں یونان کو فتح کیا۔ آسٹریا اور ہنگری کی طرف اپنی فوجیں بھیجیں۔

تیمور لنگ

بایزید برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا کہ قیصر قسطنطنیہ تیمور لنگ سے مدد کا طالب ہوا ہو اس وقت ہندوستان کی فتح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ قیصر نے رہی چال چلی جو عموماً عالم کفر چلتا آرہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کو مرواؤ۔ قیصر نے ایک طویل مراسلہ تیمور لنگ کو لکھا یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر قیصر اس وقت تیمور لنگ سے رابطہ نہ کر سکتا تو سلطان بایزید تمام یورپ کو اسلام کے جھنڈے تلے لے آتا اس کے شاہ سوار برق و باد کی طرح بوسنیا سے لے کر ڈینوب تک تمام ملک اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند چکے تھے کہ اسے تیمور کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ تیمور نے بایزید کے بیٹے طغرل کو جو سیواں کا گورنر تھا شکست دے کر چار ہزار آدمی اس کے ساتھ زندہ درگور کر دیئے۔ ان شرفاء کی مشکیں کسوا کر ان کے سر گھٹنوں کے درمیان پھنسا کر گٹھڑیوں کی طرح بندھوا کر بڑے بڑے گڑھوں میں ڈال کر اوپر سے انہیں پاٹ دیا۔ بہمیت، شقاوت، سنگدلی اور قساوت قلبی کا اس سے بڑھ کر تاریخ عالم میں کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ اب بایزید اپنے گھر میں الجھ گیا اور قیصر کی سازش کامیاب ہوئی۔ 19 ذوالحج 841ھ بمطابق 20 جولائی 1402ء کو انگورہ کے میدان میں تیمور اور بایزید کی مڈبھیڑ ہوئی۔ تیمور کی فوج پانچ لاکھ اور بایزید کی ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ پہلے پہلے بایزید کا پلہ بھاری رہا مگر اس کی فوج کے مغل دستے تیمور سے مل گئے اور یہ فاتح یورپ، شیدائی اسلام معہ اپنے بیٹے موسیٰ تیمور کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

مؤرخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اس موقع لکھتے ہیں کہ انگورہ کے میدان میں اگر تیمور کو شکست ہوتی تو وہ صرف ایک آدمی کی شکست تھی مگر بایزید کی شکست پوری قوم اور پوری ملت کی شکست تھی اگر تیمور اس وقت عیسائی بادشاہ کے اکسانے پر بایزید کے خلاف یہ جنگ نہ کرتا تو آج تمام یورپ مسلمانوں کے قبضے میں ہوتا۔

سلطان محمد خاں اول 806ھ میں تخت نشین ہوا پھر اس کے بعد مراد خاں ثانی اس کے بعد فاتح قسطنطنیہ محمد خاں ثانی پھر بایزید ثانی آخر میں سلطان سلیم جس نے مصر فتح کیا اور وہاں سے عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ الثالث سے ان چند برکات کو جن کو بطور نشان خلافت اپنے ساتھ رکھتا تھا لے کر واپس آیا اور خلیفۃ المومنین ہونے کا اعلان کیا۔ یورپ میں لوتھر اور ہندوستان میں کبیر داس اسی کے زمانہ میں ہوئے آخر میں یہودی ریشہ دوانیوں نے انجمن اتحاد ترقی کی بنیاد رکھ کر مصطفیٰ کمال کو اپنا مہرہ بنا کر 1341ھ میں خلافت اسلامیہ کو ختم کر دیا اور مصطفیٰ کمال نے اسلامی وحدت کے تمام علمی، ادبی، مذہبی، دینی اور ثقافتی نشانات مٹا کر عالم اسلام کی دھڑکنوں کے مرکزی مقام کو ہی سرے سے ختم کر دیا جس کا مداوا آج تک نہیں ہو سکا۔

کمال اتاترک نے ظلم و جبر کا سلسلہ پوری زندگی جاری رکھا اس کی وفات 1938ء کے بعد عصمت انونو نے اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ 1950ء میں نئے انتخابات ہوئے تو عصمت انونو کی ڈیموکریٹک پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کی جگہ ری پبلکن پارٹی کامیاب ہو کر برسر اقتدار آئی۔ نئی حکومت میں جلال بایا صدر اور عدنان مندریس وزیراعظم منتخب ہوئے۔ نئی حکومت نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کمال دور کے کئی جابرانہ اقدامات کو کالعدم قرار دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اذان پر سے پابندی ختم کی گئی تو مساجد سے اذان کی آوازیں سن کر لوگ دیوانہ وار گھروں سے نکل آئے اور روتے ہوئے مسجدوں میں داخل ہو گئے۔ عدنان مندریس نے

حکومت نے دینی اور اخلاقی حوالے سے ترکی کا اسلامی تشخص بحال کرنے کی بھرپور کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ 1957ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے توری پبلکن پارٹی کو پہلے سے بھی زیادہ ووٹ پڑے اور وہ بھاری اکثریت سے پھر منتخب ہوگئی اور عدنان مندریس دوبارہ وزیراعظم بن گئے لیکن اس مرتبہ امریکہ نواز فوج کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور 1960ء میں جنرل جمال گرسل نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ برسراقتدار رہنماؤں پر فوجی عدالتوں میں مقدمے چلے جس کے نتیجے میں وزیراعظم عندنان مندرس کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور صدر جلال بایار کو عمر قید کی سزا دی گئی۔

ترکی میں اسلامی قوتوں کے خلاف یہ خونی ڈرامہ اس کے بعد بھی کئی بار دہرایا گیا 1965ء کے انتخابات میں جسٹس پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی اور سلیمان دیمرل وزیراعظم منتخب ہوئے یہ دینی مزاج کے معتدل حکمران تھے اور انہوں نے ملک میں اسلامی حوالوں سے عوام کو خاصی آسانیاں فراہم کیں جس کے نتیجے میں 1969ء کے انتخابات میں انہیں دوبارہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن پھر وہی سازشیں رنگ لائیں اور 1971ء میں ان کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ 1973ء کے الیکشن میں ترکی کے مشہور اسلامی رہنما پروفیسر نجم الدین اوبکان نائب وزیراعظم بن گئے اور انہوں نے کمال جرأت کے ساتھ ترک فوجوں کو قبرص میں اتار کر شمالی قبرص کو آزاد کروا لیا اور یونان کی سازش سے بشپ میکاریوس سارے قبرص پر قبضہ نہ کر سکا۔ پروفیسر نجم الدین ربکان نے اسلامی حوالے سے متعدد اصلاحات نافذ کرائیں وہ دوبارہ نائب وزیراعظم بنے اور دونوں بار اُن کا کردار بڑا ہی جرأتمندانہ رہا یہی سبب ہے کہ فوج نے بار باران کے خلاف کارروائی کی اور بالآخران کی جماعت خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی کے موجودہ وزیراعظم طیب اردگان کی حکومت کو سکون اور استحکام حاصل ہوگیا ہے لیکن انہوں نے جس دلیری سے فوج میں اصلاحات کی ہیں اور اسرائیل کے خلاف جو غیر معمولی ردعمل ظاہر کیا ہے اسے امریکہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گا اللہ طیب اردگان کی حفاظت فرمائے۔

نائیجریا

نائیجریا کے وزیراعظم سر ابوبکر تفاد ابلیو اور شمالی نائیجریا کے وزیراعظم احمد ومیلو بے مثال کردار کے رہنما تھے خصوصاً احمد ومیلو کا دینی اور دعوتی کردار اتنا شاندار تھا کہ دس لاکھ عیسائی اور لادین افراد ان کی کوششوں سے مسلمان ہوئے اور امکان تھا کہ ان کے اخلاص اور محنت کی وجہ سے نائیجریا اور اردگرد کے ممالک میں اسلام غیر معمولی رفتار سے پھیلتا چلا جائے گا چنانچہ اس خطرے کے پیش نظر 1966ء میں ملک کے عیسائی کمانڈر انچیف یعقوبو گوون نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور متذکرہ دونوں رہنماؤں کو قتل کر دیا گیا اور ملک مسیحی آمریت کے بے رحم چنگل میں پھنس کر رہ گیا۔

شاہ فیصل شہید

1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں سعودی عرب کے شاہ فیصل نے امریکہ اور مغربی ممالک کو تیل کی ترسیل بند کر دی جس کے نتیجے میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ نے شاہ فیصل کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور مارچ 1975ء میں امریکہ میں زیر تعلیم شاہی خاندان کے ایک نوجوان نے شاہ کو ان کے محل کے اندر گولی مار کر شہید کر دیا۔

(جاری ہے)

شبستانِ اسلام سے

ازدواجی زندگی کے مسائل اور طلاق

طلاق دینے کا طریقہ کیا ہے؟ عام طور پر لوگ بیک وقت تین طلاقیں دے کر رشتہ ہمیشہ کے لئے مکمل طور پر ختم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ طلاق کا یہی طریقہ ہے۔

☆ ---------- کے ایچ مجاہد

منطقی:- یہ ہمارے معاشرے میں میاں بیوی کے تعلقات میں اتنی تلخی کیوں آ گئی ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے گھر سے فرار یا قتل، ناجائز تعلقات، آشنا کے ہاتھوں شوہر یا شوہر کے ہاتھوں آشنا کا قتل عام ہو گیا ہے۔ شرح طلاق میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور جہاں کسی وجہ سے طلاق کی نوبت نہیں آتی وہاں گھریلو زندگی جہنم کا نمونہ نظر آتی ہے۔ آخر اس سب کی وجہ کیا ہے؟

فلسفی:- اس کی ایک سے زائد وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادی کے وقت عموماً لڑکے لڑکی کی پسند کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا حالانکہ شریعت نے سختی سے اس کی تاکید کی ہے کیونکہ زندگی ان دونوں نے گزارنا ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ

ان کی پسند نامناسب ہو تو اسے رد کیا جا سکتا ہے لیکن والدین ان کی زندگی کے بارے میں خود سے فیصلہ کر دیتے ہیں اور ان کو اعتماد میں نہیں لیتے، نتیجہ یہ کہ شادی کے بعد ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی جو آہستہ آہستہ تلخی میں بدل جاتی ہے تب تک کچھ بچے بھی ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے ایک دوسرے سے الگ ہونا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس میں کئی قانون اور معاشرتی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سب ہوتا ہے جس کی تم نے نشاندہی کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لڑکا لڑکی جذباتی محبت میں گھر والوں کی مرضی کے خلاف یا بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں، انہوں نے اس جذباتی محبت میں ایک دوسرے سے بلند بانگ دعوے کئے ہوتے ہیں جن پر پورا اترنا حقیقت میں ناممکن ہوتا ہے اور جب حقیقی زندگی میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے جو بعد کے مسائل یعنی طلاق، فرار، قتل وغیرہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کی تیسری وجہ مہنگائی اور معاشی مسائل ہیں۔ بدقسمتی سے ہم چادر دیکھ کر پاؤں نہیں پھیلاتے بلکہ اپنے سے امیروں کو دیکھ کر ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے سے غریبوں کو نہیں دیکھتے خصوصاً عورتوں میں یہ جذبہ زیادہ ہو گیا ہے اور جب مرد اپنی محدود آمدن میں خاتون کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا اور قناعت کا درس دیتا ہے تو بھی تلخیاں اور دیگر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کی چوتھی وجہ ہمارا میڈیا ہے جو پرتعیش اور چکا چوند زندگی کی مصنوعی تصویر پیش کرتا ہے جو ہمارے ملک میں محض 5 فیصد لوگ گزار رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ باقی 95 فیصد لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے پھر جو صبر اور قناعت نہیں کر سکتے وہ جرائم کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی تباہ کر لیتے ہیں اور اگر وہ جرائم کی راہ اختیار نہ کریں تو ان کی زندگی تلخی کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر بعد کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پانچویں وجہ کسی قدر جذباتی ہے کہ یا تو مرد روزگار کے مسائل اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے بیوی کو مناسب توجہ نہیں دے پاتا تو وہ اس سے شاکی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات کہیں اور مراسم قائم کر لیتی ہے یا عورت گھریلو مصروفیات اور بچوں کی وجہ سے پہلے کی طرح بج سنور نہیں سکتی نہ مرد کو پہلے کی طرح توجہ دے سکتی ہے تو وہ باہر کہیں دل بستگی کا مصنوعی سہارا ڈھونڈ لیتا ہے جو کہ آج کل قطعاً مشکل نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں بھی میاں بیوی کے تعلقات میں تلخی اور بعد کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کی آخری اور سب سے بڑی وجہ صراط مستقیم سے ہٹ جانا یعنی دین اسلام سے دوری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے گھروں میں بچوں کی اسلامی تربیت نہیں کی جاتی جس سے وہ شادی کے فریضے کی اہمیت اور اس کو نبھانے کی ضرورت سے آگاہ نہیں ہوتے، نہ ہی وہ اپنے اندر اس قربانی کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں جو اس رشتے کو نبھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مرد عورت صنفی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بناء پر الگ جذبات، خواہشات، نفسیات، فکر، رجحان اور سوچ رکھتے ہیں۔ دو مختلف المزاج و خیال لوگوں کا اکٹھے رہنا ایک امتحان اور آزمائش سے کم نہیں، اس کے لئے اللہ نے ان کے اندر محبت پیدا کی اور دونوں کو ایک دوسرے کا جنسی اور معاشرتی طور پر محتاج بنایا تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔ پھر عورت کو مرد کی خدمت اور رضا کے بدلے جنت کی خوشخبری دی اور مرد کو اہل خانہ سے حسن سلوک اور نان نفقے کے بدلے اجر عظیم کی بشارت دی اور اس کے بدلے ان سے نئی نسل کی ولادت و پرورش کا تقاضا کیا گیا۔ اب ہمارے بچوں کی تربیت تو یہودی میڈیا کرتا ہے، اس کا نتیجہ تلخی، طلاق، قتل، اغوا، ناجائز

تعلقات اور گھروں سے فرار کی صورت میں نکلتا ہے۔

منطقی:۔ کیا اس کا کوئی حل نہیں؟

فلسفی:۔ حل کیوں نہیں، آج بھی ہم صراط مستقیم پر آ جائیں صبر وقناعت سے کام لیں، اللہ کے فیصلوں پر راضی رہیں، شادی کو ایک امتحان کی طرح سمجھیں، قربانی دیں، ایثار کریں تو ایسے مسائل کبھی پیدا نہیں ہوں۔

منطقی:۔ لیکن کسی ایک فریق کی قربانیوں کے باوجود دوسرا فرد قدر نہ کرے تو پھر کیا کریں؟

فلسفی:۔ پہلے تو پوری کوشش کریں کہ حالات ٹھیک رہیں لیکن اگر نبھاہ کی کوئی صورت نہ رہے یعنی اصلاح کی کوئی گنجائش نہ رہے اور اس سلسلے میں میاں یا بیوی اور خاندان والوں کی تمام کوششیں بیکار ہو جائیں تو پھر ایسے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، طلاق دے دی جائے یا خلع لے لیا جائے اور بعد کے معاملات شریعت اور قانون کے مطابق حل کر لئے جائیں تو زیادہ بڑے مسائل پیدا نہیں ہوں ورنہ گھر سے فرار، آشنائیاں یا قتل تک بات پہنچے گی۔ طلاق کے بعد دونوں میاں بیوی پھر سے گھر بسا کر نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔

منطقی:۔ طلاق دینے کا طریقہ کیا ہے؟ عام طور پر لوگ بیک وقت تین طلاقیں دے کر رشتہ ہمیشہ کے لئے مکمل طور پر ختم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ طلاق کا یہی طریقہ ہے۔ اہل علم یہ مسئلہ بتاتے نہیں فروعی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔

فلسفی:۔ یہ طلاق دینے کا درست طریقہ نہیں، اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی بھی گھر ٹوٹے۔ طلاق کی اجازت ناگزیر حالات کی صورت میں ہے اور یہ وہ واحد حلال کام ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ اس میں بھی اسلام نے حکم یہ دیا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی نہ دی جائیں بلکہ وقفے سے ایک ایک کر کے دی جائے۔ پہلی دو طلاقوں کے بعد عدت کا عرصہ رکھا تا کہ میاں بیوی دونوں کو سوچنے کا موقع مل جائے کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وقتی جذبات، غصے یا اشتعال کی صورت میں بندہ طلاق دے تو بیٹھتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے اور بیوی کو واپس لینے کے لئے حیلے ڈھونڈتا ہے، فتویٰ لیتا ہے یا حلالہ کرواتا ہے جو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ کے مطابق نہایت لعنتی عمل ہے۔ اگر انسان شرعی طریقے سے طلاق دے تو اکثر گھر ٹوٹنے سے بچ جاتا ہے اور فریقین سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

منطقی:۔ لیکن اگر کوئی تین طلاقیں دے دے تو کیا طلاق ہو جاتی ہے؟

فلسفی:۔ اگر تو سوچ سمجھ کر اکٹھی تین طلاقیں دی جائیں تو جمہور فقہاء کا مذہب یہی ہے کہ مکمل طلاق ہو جاتی ہے اور میاں بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر اس کے بعد وہ نئے سرے سے گھر بسا لیں اور عورت کا نیا مرد فوت ہو جائے یا اپنی کسی وجہ سے اسے طلاق دے دے تو وہ عدت کے بعد پہلے مرد کے نکاح میں آ سکتی ہے لیکن یہ قدرتی طور پر ہو، منصوبے سے نہیں۔ جیسا کہ حلالہ کے ملعون عمل میں ہوتا ہے۔

منطقی:۔ بعض طبقے تین طلاق کی ایک شمار کر کے پھر سے گھر بسانے کی اجازت دیتے ہیں، یہ کون سی صورت میں ہو سکتا ہے؟

فلسفی:۔ اگر تین طلاقیں سوچ سمجھ کر اور آزاد مرضی سے نہ دی گئی ہوں یعنی انسان وقتی اشتعال، غصے، دباؤ، دھمکی، نشے، خواب یا نیند کی حالت میں ہو اور تین طلاقیں دے بیٹھے تو بعض فقہاء ایسی طلاق کو منعقد نہیں سمجھتے یا صرف ایک طلاق قرار دیتے ہیں جس کے بعد رجوع کی گنجائش ہوتی ہے لیکن یاد رہے کہ آزاد مرضی سے سوچ کر دی جانے والی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اسے ایک شمار کرنے کی گنجائش نہیں جو کہ کچھ طبقے دے دیتے ہیں۔

مغلانی بیگم

رفیق ڈوگر

قسط: 1

تعارف

یہ کہانی بھی ہے اور اصل تاریخ بھی۔ اس کے سارے تاریخی کردار نام مقام اور واقعات بھی اصل ہیں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ ذیل میں درج کتب دیکھ سکتا ہے۔ بیشتر مکالمے اور سوال و جواب بھی وہی ہیں جو قدیم تاریخی کتب میں لکھے ہیں۔ طہماس خان پانچ چھ سال کی عمر میں مغلانی بیگم کے ملازمین میں شامل ہوا۔ اس کے گھر میں پرورش پائی، وہ میر منو کا ذاتی خادم تھا، ہر مرحلہ میں بیگم کے ساتھ رہا، طہماس نامہ اس کی خودنوشت ہے۔

تقریباً سب ہی محققین اور تاریخ لکھنے والوں نے میر منو کی موت کے مقام اور اسباب کے بارے میں غلطیاں کی ہیں حالانکہ طہماس خان نے اپنی خودنوشت میں ایک ایک بات کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بارے میں بھی اصل حقائق بیان نہیں کیے گئے۔ طہماس خان اس جنگ میں شامل تھا، شجاع الدولہ کا ہندو وکیل بھی اس جنگ میں شامل تھا وہ اس کا مشیر اور مرہٹوں سے مذاکرات میں سفیر تھا۔ مرہٹوں نے شجاع الدولہ کو کس طرح دھوکہ دیا، جنگ میں شجاع الدولہ کا کردار کیا رہا یہ سب کچھ اس کے وکیل نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

وہ واحد شخص تھا جو اس رات شجاع الدولہ کے ساتھ تھا جب مرہٹوں کا ایلچی بالک رام آخری پیغام لے کر آیا، وہ اس وقت بھی شجاع الدولہ کے پاس بیٹھا تھا۔ جب شجاع الدولہ کو مرہٹوں کے حملہ کی خبر ملی تب بھی وہ اس کے خیمے میں موجود تھا۔ شجاع الدولہ اس کو ساتھ لے کر احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں کے حملہ کی اطلاع دینے گیا تھا، مرہٹوں کی فوجوں کو دیکھ کر شجاع الدولہ نے جو کچھ کہا اسی اپنے وکیل سے کہا تھا، یہ سب کچھ بھی اس کے روزنامچہ میں موجود ہے۔

اس طرح مغلانی بیگم پنجاب کی اصل تاریخ کے ساتھ ساتھ برصغیر کی اصل تاریخ بھی ہے۔ پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟ سارے اصل اسباب اور واقعات اس کہانی میں موجود ہیں۔ مغلانی بیگم کی کہانی اصل تاریخ کو کہانی کے انداز میں بیان کرنے کی کوشش ہے۔

رفیق ڈوگر

اظہار تشکر!

محترم رفیق ڈوگر صاحب نے چند برس پیشتر اپنی دو کتابیں مدیر "حکایت" شاہد جمیل مرحوم کو پیش کیں کہ انہیں قسط وار "حکایت" کے قارئین کے لئے شائع کیا جائے۔ ان میں ایک "سیرت الامین" (بچوں کے لئے) "حکایت" میں شائع ہوتی رہی۔ اب ان کا تاریخی ناول "مغلانی بیگم" بھی قارئین "حکایت" کی نذر ہے۔ ادارہ محترم رفیق ڈوگر صاحب کی اس فراخ دلی پر ان کا شکر گزار ہے۔

عمر رسیدہ پہریدار چلتا چلتا رک گیا۔ ''ذرا دیکھو تو وہ قندیل بجھتی بجھتی سی دکھتی ہے''۔ اس نے چبوترے کے درمیان میں گڑے اونچے بانس کے آخری سرے پر لٹکتی قندیل کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا۔

''تھوڑی دیر میں سورج نکل آئے گا، قندیل بجھ گئی تو کون سی قیامت آ جائے گی''۔ نوجوان نے اوپر قندیل کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ایسے نہ کہو، حاکم کی قندیل بجھ جائے تو اچھا شگون نہیں ہوتا۔ ملک پر مصیبت ٹوٹتی ہے یا...... اللہ نہ کرے حاکم......''۔ پہریدار نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم تو خواہ مخواہ وہم کرتے ہو، تیل ختم ہو گیا ہو گا''۔

''تم پگلے کیوں ہونے لگے ہو؟ حاکم کی قندیل کا تیل کبھی ختم نہیں ہوتا، یہ لوگ کس لئے رکھے ہیں''۔ اس نے چبوترے پر اونگھتے نگران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پہریداروں کی باتیں سن کر نگران نے لیٹے لیٹے پوچھا۔ ''تم کیا کھسر پھسر کرے ہو یہاں کھڑے؟''

''تمہیں سوتا دیکھ کر وہ تمہاری قندیل بھی اونگھنے جا رہی ہے اور یہ کہتا ہے اس سے ملک میں قیامت آ جائے گی، اٹھو جلدی سے اس کی خبر لو۔ پہلے پنجاب میں کون سی کم قیامت آوے ہے''۔

نگران اچھل کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا، قندیل کو پھڑ پھڑاتے دیکھ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں، وہ قندیل کی طرف دیکھتا پھر اپنی آنکھیں ملنا شروع کر دیتا اور پھر جلدی سے قندیل کو دیکھنا شروع کر دیتا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ دونوں پہریدار اس کے قریب آن کر کھڑے ہو گئے، قندیل کا شعلہ مسلسل مدھم ہوتا جا رہا تھا، نگران کی حالت غیر ہونے لگی، اس نے جلدی سے بانس کے گرد لپٹی ڈوری کھولی اور تیزی سے اسے ڈھیلا چھوڑنے لگا، قندیل اسی رفتار سے نیچے آنے لگی، جب تک اس نے قندیل رسی سے الگ کی شعلہ دم توڑ چکا تھا۔ کاتک کی سرد صبح میں اس کے چہرے پر پسینہ بہنے لگا۔ ''کسی اور نے تو قندیل کا شعلہ تڑپتے نہیں دیکھا؟''۔ اس نے پہریداروں سے پوچھا تو آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

''شعلے کو تڑپتے تو ہم نے بھی نہیں دیکھا صرف بجھتے دیکھا ہے''۔ نوجوان پہریدار نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''داروغہ کو علم ہو گیا تو وہ مجھے پھانسی پر چڑھا دے گا''۔ نگران نے دونوں ہاتھ باندھ کر منت کی۔ ''تمہارے بچوں کا واسطہ دیتا ہوں کسی اور کو نہ بتانا!''۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''دعا کریں، خدا کشورِ پنجاب اور اس کے حاکم کو ہر بلا سے محفوظ رکھے!''

''تم جانو، ہم نے بھی کچھ نہیں دیکھا، ہمارے منہ زبان سے خالی ہیں''۔ عمر رسیدہ پہریدار نے اسے تسلی دی اور آگے چل دیا۔

''تم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ہے، یہ تو خود ہی مرنے جا رہا ہے؟''۔ نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''مت کہو منہ سے کوئی لفظ، دعا کرو اس کشور کے لئے اس کے حاکم کے لئے!''۔ اس کا ساتھی بھی فکرمند تھا۔

''ہمارے خیمے کا دیا تو ہزار دفعہ خود بجھا ہم پر تو کبھی قیامت نہ ٹوٹی''۔ نوجوان نے اس کی فکرمندی نظرانداز کر دی۔

''تم حکام تھوڑے ہو، یہ کشور کی سلامتی اور حکام کی زندگی کی قندیل ہے جو مسافر کو اندھیرے میں راہ دکھاتی

ہے، مصیبت زدہ اور مظلوم کو پناہ دیتی ہے"۔ بزرگ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"میں تو نہ مانوں ایسی باتیں، یہ سب درباریوں کی گھڑی کہانیاں ہیں۔ اگر حاکم ان پر یقین نہ کرے تو ان کی روزی کیسے چلے؟ اگر کبھی میں حاکم بن گیا تو یہ قندیل جلے گی ہی نہیں"۔ نوجوان نے قہقہہ لگایا۔

"حاکم کی بستی کی ہوا کے بھی کان ہوتے ہیں، کسی نے سن لیا تو خیر نہیں رہے گی"۔ بزرگ نے نوجوان کو نصیحت کی۔ "اپنے کام سے کام رکھو، کیا معلوم کل کو کیا ہونے والا ہے!"

پہریدار جا چکے تو شمع کے نگران نے ڈوری بانس کے گرد لپیٹ دی، قندیل اٹھا کر تپائی پر رکھی اور اس میں جھانک کر تیل دیکھنے لگا۔ تیل ابھی کافی باقی تھا اس نے بتی کا جائزہ لیا تو وہ بھی درست تھی۔ "اللہ ہم سب پر رحم فرمائے!"۔ اس کے ہونٹ دعائیہ انداز میں ہلے اور وہ گردن اٹھا کر مشرقی اُفق میں سورج کی پہلی کرنیں تلاش کرنے لگا۔

❁

معین الملک میر منو نے پنجاب کا نظم بحال کر دیا تو سکھوں کے خلاف اس کی سخت پالیسی کی وجہ سے مالیہ کی آمدنی بڑھ گئی اور مسلمان اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے۔ میر منو نے اپنی فوج میں ہندوستانی مسلمانوں کی بھرتی کی حوصلہ افزائی کی اور مقامی کمانداروں کو مغل اور ازبک سرداروں کے مساوی مراعات دے کر ان میں اعتماد پیدا کیا۔ سال کا بیشتر حصہ وہ دارالحکومت سے باہر رہتا تھا۔ امیر الامراء، وزراء، درباری، خزانہ دار سب عمال لشکر کے ساتھ رہتے۔ جس علاقہ میں سکھوں کے اجتماع کی خبر ملتی وہ فوراً وہاں پہنچ جاتا۔ کئی سال کی بدنظمی اور سکھوں کی لوٹ مار کے بعد اس کی حکومت کے پانچ برسوں میں امن اور خوشحالی کا دور واپس آ گیا تھا اور سکھوں کے اکثر جتھیدار جموں کی پہاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ اس وجہ سے میر منو اپنی فوج اور رعایا میں بہت ہردلعزیز تھا۔ کالنور اور بٹالہ کی مہم سے واپسی پر وہ ایک ماہ سے ملک پور کے قریب راوی کے کنارے خیمہ زن تھا، دریا کے کناروں پر دور تک پھیلا جنگل بیلا جموں کی پہاڑیوں تک چلا گیا تھا اور سکھوں کے چھاپہ مار جتھوں کے لئے محفوظ پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ اس بیلے سے نکل کر وہ شمال میں ایمن آباد اور گوجرانوالہ تک اور جنوب میں لاہور کے گرد و نواح میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ میر منو نے راوی کے کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کروا کر ان میں مستقل فوجی دستے متعین کر دیئے تھے۔

سورج کی پہلی کرن کے لشکرگاہ کے قلب میں حاکم خیمہ بستی میں قدم جمانے کے ساتھ ہی چوبدار نے نواب معین الملک کی آمد کا اعلان کیا تو دیوان خاص میں موجود وزراء اور حکام نے کھڑے ہو کر ادب میں سر جھکا دیئے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا اپنی نشست خاص تک پہنچا اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وزراء اور حکام بھی اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ چکے تو میر بخشی نے لشکرگاہ کے انتظامات اور فوج کے بارے میں رپورٹ پیش کی اس کے بعد مختلف حصوں میں متعین مراسلہ نگاروں کے مراسلے پڑھ کر سنائے گئے جن میں انہوں نے اپنے اپنے علاقہ میں امن و امان کی صورت حال اور سرکشوں کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات ارسال کی تھیں۔ نواب نے مختلف رپورٹوں اور علاقوں کے بارے میں امیر الامراء بھکاری خاں کو ہدایات دیں۔ ان رپورٹوں کے مطابق مجموعی طور پر صوبہ کی صورتِ حال تسلی بخش تھی اور کسی جگہ سے سکھوں کے کسی اجتماع کی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔

رپورٹیں ختم ہو چکیں تو بھکاری خاں نے میر منو کو ان کے شکار کے پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''حضور نواب صاحب دوپہر کا کھانا اعوان کے قلعہ میں تناول فرماویں گے۔ حضور کے آرام کے لئے قلعہ میں تمام انتظامات مکمل کر دیئے گئے ہیں۔ حضور کے ساتھ جانے والی پارٹی کے ارکان کے لئے قلعہ کے سامنے کے میدان میں خیمے لگوا دیئے گئے ہیں''۔

''ہم سمجھتے ہیں، اعوان کا قلعہ لشکر گاہ سے کوئی زیادہ دور نہیں، وہاں قیام کی بجائے ہم واپس بھی تو آ سکتے ہیں''۔ میر منو نے قلعہ میں قیام اور انتظام کا سبب پوچھا۔

''حضور کا ارشاد بجا ہے لیکن قلعہ کے کمانڈار کی خواہش تھی کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو حضور کے قیام سے سرفراز فرمایا جاوے۔ اس طرح حضور قلعہ کے انتظامات کا بھی مشاہدہ فرما لیں گے اور وہاں متعین سواروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے حضور کسی ہرن کو تھکانے کے لئے اس کا تعاقب پسند فرماویں اور لشکر گاہ سے دور چلے جائیں، اسی خیال سے یہ اہتمام کیا گیا ہے''۔ بھکاری خاں نے وضاحت کی۔

''ہم سمجھتے ہیں، ہمیں زیادہ ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہوگی، لاہور کی طرف جنگل زیادہ وسیع نہیں''۔

''حضور کا فرمانا بجا ہے لیکن یہ خادم خطرات کو نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں۔ جنگل کے اس حصہ میں بھی چیتوں کا وجود ثابت ہے، اسی لئے خادم نے خواجہ مرزا خان کے ازبک دستہ کو بھی ساتھ رہنے کی ہدایت کی ہے''۔

''ہم سمجھتے ہیں، خواجہ مرزا اور اس کے ازبک ان دریاؤں اور جنگلوں سے واقف نہیں''۔ میر منو نے بھکاری خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اس کشور میں آئے ابھی ایک ماہ ہی تو ہوا ہے''۔

''حضور بجا فرماتے ہیں مگر ان کے لئے اس کشور کے دریاؤں اور جنگلوں سے آشنائی لازم ہے جہاں انہیں سکھوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینا ہوگا۔ اسی خیال سے خادم نے انہیں تیار رہنے کو کہا ہے''۔

''خواجہ مرزا خان اور اس کے ساتھی چیتے اور لومڑ میں تمیز کر سکتے ہیں؟''۔ میر منو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بھکاری خاں کے جواب دینے سے پہلے پس پردہ سے میاں خوش فہم نے بے موقع مداخلت کے لئے معافی کی درخواست کی تو سب نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے تین دفعہ جھک کر فرشی سلامی کیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اپنے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملک سجاول ایسی خبر لائے ہیں جو فوری حضور تک پہنچنا چاہئے۔ خادم امید کرتا ہے کہ اس کی گستاخی معاف کر دی جائے گی!''

''ہم ملک سجاول کے منتظر ہیں''۔ میر منو نے کہا۔

خوش فہم نے ایک بار پھر فرشی سلام کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ میاں خوش فہم نے ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور چہرے کے مردانہ نقوش کے باوجود زنانہ انداز میں بات کرتا تھا۔ وہ میر منو کا سب سے بااعتماد خواجہ سرا تھا اس لئے وزراء اور امرائے دربار سب اس سے خوفزدہ رہتے تھے اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

''ہم ہمیشہ سے میاں خوش فہم کی فرض شناسی کے معترف رہے ہیں''۔ بھکاری خاں نے ذرا بلند آواز میں کہا تاکہ پردہ کے پیچھے کھڑا میاں بھی سن لے۔ ''ملک سجاول لازماً کوئی اچھی خبر لائے ہیں''۔

ملک سجاول خیمے میں داخل ہوئے تو میر منو اور وزراء سب کھڑے ہو گئے۔ ملک نے آداب کے بعد مداخلت کے لئے معذرت چاہی۔ ''حضور! کسی اہم مشاورت میں مصروف ہوں گے لیکن بیلے میں سکھوں کے اجتماع سے حضور کو جلد آگاہ کرنا لازم تھا''۔

بیلے میں سکھوں کے جمع ہونے کی اطلاع پر میر منو

نے بھکاری خاں کی طرف دیکھا۔ ''ہم تو ابھی ابھی ہر جگہ امن اور خوش حالی کی اطلاعات سن چکے ہیں اور مراسلہ نگاروں کو کہیں بھی سکھ دکھائی نہیں دیئے اور اب ہم سنتے ہیں کہ وہ ہم سے ملاقات کے لئے لشکر گاہ کے سامنے جمع ہو رہے ہیں''۔

بھکاری خاں اور وزراء کے علاوہ ملک سجاول نے بھی میر منو کے طنز کو محسوس کیا۔ ''سکھ ہمیشہ مقامی آبادی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کسی سے ڈرتے نہیں اور جموں کی پہاڑیوں تک پھیلے بیلے میں چھپ کر کہیں بھی کارروائی کرنا ان کے لئے کبھی مشکل نہیں رہا''۔

''ہم سمجھتے ہیں، ان کے استقبال کے لئے ہمیں خود جانا ہوگا''۔ میر منو نے ملک سجاول کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''حضور کا غلام شرمسار ہے اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ان سرکشوں کے سر حضور کے قدموں میں ڈال کر اپنی کوتاہی کی تلافی کر دے گا''۔ بھکاری خاں نے نظریں اٹھا کر کہا۔ ''حضور کے شکار کے انتظامات مکمل ہیں، سکھوں کے استقبال کے لئے حضور کے غلام موجود ہیں''۔

''ہم چاہتے ہیں کہ استقبال کی تیاریوں میں وقت ضائع کر کے انہیں کسی کارروائی کا موقع نہ دیا جائے''۔ میر منو نے کچھ سوچ کر حکم دیا۔

''خواجہ مرزا خان اور اس کے تین صد ساتھی اپنے گھوڑوں پر زینیں کس چکے ہیں، حضور کی اجازت کی تاخیر ہے''۔

''نو وارد ازبک سکھوں کے طریق جنگ اور جنگلی راستوں سے ناواقف ہیں، انہیں اس آزمائش میں ڈالنا مناسب ہوگا؟''۔ میر منو نے سوال کیا۔

''حضور دیکھ لیں گے کہ قدرت نے حضور کے غلام خواجہ مرزا خان کی قسمت میں کامیابی کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ ملک صاحب سے التجا ہے کہ وہ اس مقام تک رہنمائی کے لئے اپنے جوان ان کے ساتھ کر دیں!''

''ملک قاسم اپنے سواروں کے ہمراہ باہر موجود ہے، وہ اس مہم میں شامل ہو کر خوشی محسوس کریں گے''۔ ملک سجاول نے بھکاری خاں کی درخواست پر کہا۔

''ڈوگروں کی اپنی زبانوں پر اور ازبکوں کی اپنے دماغوں پر گرفت کمزور ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو جنگل میں کسی کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور شکار ہاتھ سے نکل جائے؟''۔ میر منو نے ملک سجاول کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''خواجہ مرزا خان اور ان کے ساتھی ملک قاسم کے دماغ پر بھروسہ کریں تو ان شاء اللہ کامیابی ہوگی''۔ ملک سجاول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''رستم جنگ ازبکوں کو ہدایت کر دیں تو وہ لازماً ان کے حکم کی تعمیل کریں گے''۔

بھکاری خاں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سکھوں کے خلاف دستہ بھیجنے کی جلدی کا بہانہ کر کے خیمے سے باہر نکل گیا۔

''ہم تو سمجھتے تھے آپ شاہجہان آباد میں ہوں گے، آپ کی موجودگی سے آگاہ ہوتے تو ملاقات میں تاخیر نہ ہوتی''۔ بھکاری خاں کے جانے کے بعد میر منو نے ملک سجاول سے تبادلہ خیال کا آغاز کیا۔

''مجھے ملک پور پہنچے دو یوم سے زیادہ نہیں بیتے''۔ ملک نے جواب دیا۔

''ہماری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ آپ کشور پنجاب میں سرکشی دبانے میں ہمارے ساتھ رہیں۔ پنجاب میں استحکام کے بغیر ہندوستان کی مغل سلطنت کا استحکام ممکن نہیں ہوگا۔ شاہجہان آباد کی نسبت لاہور میں آپ کی زیادہ ضرورت ہے''۔

''یہ خاکسار حضور کی خواہش کے لئے شکر گزار

ہے۔ میرے اپنے معاملات بھی شاہجہان آباد میں قیام کی اجازت نہیں دیتے لیکن جب تک حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی رضا نہ ہو شاہجہان آباد چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتا"۔ ملک سجاول نے اپنی مجبوری کی وضاحت کی۔

"اللہ تعالیٰ حکیم الامت کی مساعی کو کامیاب فرماوے! ہندوستان کی مسلم ملت کے لئے ان کا دم بہت بابرکت ہے"۔

"ہم سمجھتے ہیں روہیلے شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے"۔ میر منو نے رائے دی۔

"ترک امراء کی کوتاہ نظری سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے لیکن حضور کے برادر خانِ خاناں کے ہندوستان کا وزیراعظم بننے کے بعد سے اصلاح احوال کی امیدیں مستحکم ہوتی دکھائی دیتی ہیں"۔

"جس فرض کی ادائیگی میں ہمارے والد نے اپنی جان قربان کی، ہمارے بھائی اس تیموری سلطنت کے تحفظ کے لئے اپنے ذاتی مخالفوں سے مفاہمت پر ہر وقت آمادہ ہوں گے اور شاہ صاحب سے تعاون کریں گے"۔

"تیموری سلطنت کے تحفظ سے بھی زیادہ اہم ہندوستان کی مسلم ملت کا تحفظ ہے اور شاہ صاحب قبلہ کی کوششیں کسی خاندان یا حکمران کے تحفظ کی بجائے ملت کے تحفظ کے لئے ہیں۔ اسی لئے وہ سب فریقوں میں ملی احساس بیدار کرنا چاہتے ہیں اور خانِ خاناں سے تعاون کی امید رکھتے ہیں"۔

میر منو نے ملک سجاول کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے تحفظ کے لئے قلعہ معلیٰ کی طرف دیکھا ہے"۔

"اگر قلعہ معلیٰ اپنے تحفظ کے لئے ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی طرف دیکھتا تو وہ ابتری بھی پیدا نہ ہوتی جو آج ہندوستان کے ہر حصہ میں نظر آتی ہے۔ آج بھی اگر خانِ خاناں قلعہ معلیٰ کے دماغوں میں یہ احساس بیدار کردیں تو یہ سب کے لئے مفید رہے گا"۔

خیمے میں موجود وزراء اور امراء میر منو اور ملک سجاول کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ملک سجاول نے ہندوستان میں ابتری کا سبب قلعہ معلیٰ کا سارے مسلمانوں کی طرف نہ دیکھنے کو قرار دیا تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ سارے ترک و تاتار تھے اور ایک مقامی مسلمان کی طرف سے ترک و تاتار کے تاریخی کردار کو ہندوستان کی مسلم ملت کے زوال کا سبب قرار دینا اور وہ بھی ان کے درمیان میں بیٹھ کر ان کے لئے حیران کن تھا۔

"ہمیں آپ کی واپسی کا علم ہوتا تو آج ہم آپ کو شکار پر ساتھ دیکھ کر خوشی محسوس کرتے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کل کچھ وقت ہمارے ساتھ گزاریں!" میر منو نے اپنے ترک و تاتار وزراء اور امراء کے ردِعمل کا اندازہ کر کے موضوع بدلنا چاہتا۔

"حضور کے حکم کی تعمیل اس خاکسار کا فرض ہے"۔

"ہم اپنی یہ خواہش ایک بار پھر دہراتے ہیں کہ آپ کچھ وقت کے لئے شاہ صاحب قبلہ سے لاہور میں قیام کی اجازت حاصل کریں۔ آپ پسند فرماویں تو ہم خود اس کے لئے شاہ صاحب قبلہ سے درخواست کرنا پسند کریں گے"۔

"یہ حضور کی بندہ نوازی ہے مگر کچھ عرصہ کے لئے اس خاکسار کا شاہجہان آباد میں رہنا لازم ہے"۔ ملک سجاول نے کہا اور رخصت کے لئے اجازت چاہی۔ اس نے محسوس کیا کہ میر منو کو شکار کی مہم پر روانہ ہونا ہے۔

ملک سجاول کے اجازت چاہتے ہی مشاورت منتشر کرنے کا اعلان کردیا گیا۔

میر منو عقبی دروازہ سے حرم کے خیموں کی طرف نکل گئے۔ دربار میں موجود سب ان کے جاچکنے کا انتظار کرتے

رہے اور پھر ایک ایک کر کے خیمے سے باہر نکلنے لگے۔ اپنے اپنے خیموں کی طرف جاتے ہوئے ترک امراء بار بار ملک سجاول کی طرف دیکھتے تھے۔ لمبا قد، نوکیلے نقش، موٹی موٹی روشن آنکھیں ملک سجاول کی وجاہت اعتماد اور بے خوفی نے ان کے دماغوں میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کا کاشتکار اپنے صوبہ کے حاکم اور اس کے امیر الامراء کے سامنے بیٹھ کر ان کی ساری قوم کو اپنا مجرم قرار دینے کی کیسے جرأت کر سکتا ہے؟

❁

''میر معظم! کیا ہم سچ مان لیں کہ سکھوں میں کشور پنجاب کے حاکم کی لشکر گاہ تک پہنچ جانے کی جرأت پیدا ہو گئی ہے؟''

''ہم سچ مان لیں کہ نواب جانی بیگ خان کی صاحبزادی اور نواب عبدالصمد خاں کی نواسی بھی سکھوں سے خوفزدہ ہونے لگی ہے؟''۔ میر منو نے اپنی بیگم کے سوال کا جواب دینے کی بجائے مسکرا کر اس سے سوال کیا۔

''میر معظم نواب جانی بیگ خاں کی بیٹی نے کشور پنجاب اور راوی کے ان کناروں کے کئی روپ دیکھے ہیں جب وہ دردانہ بیگم تھی تو راوی کے یہ کنارے امن اور خوشی کا گہوارہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے ابا حضور کی جاگیر پر یہاں کے کسانوں کے درمیان گزرے ان لمحات کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ دردانہ بیگم خان بہادر نواب زکریا خان کی بھانجی بھی، اس نے اپنے ماموں زاد یحیٰی خان اور شاہنواز خاں کا دور حکومت بھی دیکھا ہے۔ انہیں آپس میں اور سرکش سکھوں کے خلاف لڑتے بھی دیکھا ہے مگر اب وہ دردانہ بیگم سے مغلانی بیگم بن چکی ہے۔ کشور پنجاب کے صوبیدار نواب معین الملک میر منو کی بیگم اس لئے آپ اس کی فکر مندی کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ہم اب زیادہ فکر مند ہیں اور خوف اور فکر میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا''۔

''کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مغلانی بیگم کو میر منو کی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں رہا؟''۔ وہ بیگم کی سنجیدگی اور فکر مندی پر مزید مسکرایا۔

''نواب معین الملک کی جرأت بہادری اور صلاحیتوں کے شہنشاہ ہند اور بادشاہ کابل و قندھار کے علاوہ سرکش سکھ بھی معترف ہیں، ان کی ہمت اور جرأت ہماری زندگی ہے۔ ہم سکھوں سے نہیں حضور کے ترک اور تاتار امراء سے خوفزدہ ہیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہی امراء نے بھائی کو بھائی سے لڑایا، حاکموں کو غلط اطلاعات دیں، سرکشوں کی حوصلہ افزائی کی اور ذاتی مفاد کے لئے اپنے آقا کو دھوکہ دیا۔ اگر ہم شبہ کریں کہ بھکاری خاں حضور کو صوبہ کے حالات اور سکھوں کے بارے میں ٹھیک اطلاعات نہیں فراہم کر رہا تو ہم حق بجانب ہوں گے''۔

میر منو کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ''رستم جنگ ہمارا سالار لشکر اور امیر الامراء ہے، اس کی وفا پر شبہ کر کے ہم اپنی مردم ناشناسی کا اعتراف کریں گے لیکن آپ کو ہم اس شبہ کا حق دیتے ہیں کہ آپ یہ شبہ ہماری اور کشور پنجاب کی بھلائی کے لئے کر رہی ہیں''۔

''میر معظم! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں شبہ کرنے کا حق دیا۔ اگر حضور شبہ کرنے میں ہمارا ساتھ دیں تو کشور پنجاب میں کوئی اور آدینہ بیگ پیدا نہیں ہو سکے گا''۔

میر منو کا نوالہ جیسے حلق میں پھنس گیا ہو بھکاری خاں کے ذکر کے ساتھ ہی آدینہ بیگ کے ذکر پر اس نے جلدی سے دودھ کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ایک گھونٹ پینے لگا۔ مغلانی بیگم کی تلخ بات کا شیریں جواب سوچنے کے لئے اسے وقت چاہئے تھا۔

کنیز ایک بچے کے ساتھ خیمے میں داخل ہوں تو دونوں میاں بیوی کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ سرخ

وسفید پھول سا بچہ قالین کے فرش پر پھدکتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا اور کنیز پیچھے پیچھے ''بسم اللہ، بسم اللہ'' کہتی چلی آتی تھی۔ بیگم نے دونوں بازو بچے کے لئے پھیلا دیئے، اس کی آنکھوں میں خوشی کی روشنیاں چمک اٹھیں۔

''ہم ایک خوش حال اور پُرامن پنجاب اپنے امین الدین کے حوالے کریں گے''۔ میر منو نے گلاس دسترخوان پر رکھ دیا۔

بیگم نے بچے کو دونوں بازوؤں میں لے لیا۔

میر منو بیوی اور بچے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بھکاری خاں کی وفا پر شبہ اور آدینہ بیگ کا ذکر اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

بیگم نے دودھ کا گلاس اٹھا کر بچے کے منہ سے لگا دیا۔

وہ خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہم اس شہد میں پھولوں کی مہک دیکھتے ہیں''۔ بیگم نے شہد میں انگلی ڈبو کر امین الدین کے لبوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم چاہتے ہیں عمدہ بیگم اور وقار بیگم کو بھی چند روز کے لئے یہاں منگوالیں''۔ میر منو نے جیسے تجویز پیش کی ہو۔

''اس کے لئے اماں حضور کی رضا لازم ہے''۔ بیگم نے جواب دیا۔ ''وہ سمجھتی ہیں ہماری صحبت ان کی نواسیوں کی تربیت کے لئے مضر ہے''۔ وہ بیٹیوں کے ذکر پر خوش ہوگئی۔

''اماں حضور کے لئے کل دوپہر کا کھانا یہاں سے جائے گا، ہم عرضداشت ارسال کریں گے کہ وہ چند روز کے لئے ہماری مہمان نوازی قبول فرمالیں''۔ میر منو نے امین الدین کے گلابی رخساروں پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا اور شکار پر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کنیز نے آگے بڑھ کر امین الدین کو اٹھا لیا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر خیمے سے باہر نکل گئے۔

''خدا آپ کو سلامتی سے واپس لائے!''۔ بیگم نے دعا کی اور کنیز کو خیمے کا پردہ ہٹانے کا اشارہ کیا۔

خیمے کے دروازے میں کھڑی وہ اس وقت تک میر منو کو جاتے دیکھتی رہی جب تک حرم کی چاردیواری نے انہیں ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر دیا۔ پھر وہ خیمے سے باہر آ گئی۔ کاتک کی میٹھی میٹھی دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ راوی کی طرف سے آنے والی ہوا اس کی زلفوں سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگی تو اسے ہوا کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ اس نے اوڑھنی پر سنہری کلغی والی ٹوپی درست کی اور اس دروازے کی طرف دیکھنے لگی جس سے میر منو باہر گئے تھے۔

❁

موضع اعوان کے قلعہ کے دروازے کے سامنے سکھوں کے کٹے ہوئے سر ایک لائن میں رکھے تھے اور خواجہ مرزا خان اور ان کے ساتھی ازبک سوار اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے پاس کھڑے تھے۔ وہ بھکاری خاں کی توقعات پر پورے اترے تھے اور میر منو کو اپنی شجاعت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

کاتک کا سورج چوتھی منزل میں داخل ہو چکا تھا، لشکری اور نواب کے ساتھ شکار پر جانے والے سوار آرام کے بعد لشکرگاہ کی طرف واپسی کے لئے تیار ہو چکے تھے اور نواب کے قلعہ سے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ قلعہ کا کماندار باہر آیا اور لشکر کی تیاریوں کا جائزہ لے کر واپس چلا گیا۔ خدام نے نواب کے غسل کے لئے انتظامات مکمل کر کے سبز رنگ کا ریشمی لباس کھونٹی سے لٹکا دیا تھا۔ میر منو دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کے بعد آرام کیا کرتے تھے۔ پھر غسل کر کے نیا لباس پہنتے اور عصر کی نماز ادا کر کے سائلوں کی درخواستوں پر حکم صادر

کرتے اور ملاقاتیوں کو طلب کرتے شکار سے واپسی پر انہوں نے قلعہ میں کھانا کھایا، نماز ادا کی اور آرام کے لئے خواب گاہ میں چلے گئے تھے۔

عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا مگر وہ ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔ قلعہ کے کماندار نے نواب کے خادم خاص طہماس خاں سے درخواست کی کہ وہ نواب صاحب کو نماز کے وقت سے آگاہ کریں تو اس نے پس پردہ جھانک کر دیکھا میر منو پلنگ سے پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھے تھے۔ طہماس خاں نے فرشی سلام کر کے انہیں غسل اور لشکر کی تیاریوں سے آگاہ کیا۔ وہ فرش پر دو زانو بیٹھ کر جوتے پہنانے لگا تو دیکھا کہ نواب کے بازو بند کے قیمتی موتی قالین پر بکھرے پڑے ہیں۔ طہماس نے ایک موتی اٹھا کر پیش کیا تو نواب نے حیرانی سے اپنے بازو کی طرف دیکھا۔ سوتے میں ان کے بازو بند کی ڈوری ٹوٹ گئی تھی۔ نواب نے قلعہ دار کو طلب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے بازو بند کے نو موتی گن کر اسے حکم دیا کہ ان کے نماز سے فارغ ہونے تک انہیں ڈوری میں پرو دیا جائے۔ غسل اور نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے قلعہ میں متعین سپاہ کا معائنہ کیا اور میر بخشی کو انہیں انعامات عطا کرنے کا حکم دے کر گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے باہر آ گئے۔

بھکاری خاں نے دروازے پر نواب کا استقبال کیا اور انہیں خواجہ مرزا خان کی کامیابی کا مژدہ سنایا۔ نواب نے لائن میں رکھے سکھوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے اور ازبک سواروں میں انعامات تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

''آپ نے ملک قاسم کو ہمارے حضور پیش نہیں کیا؟''۔ انہوں نے ازبک سواروں میں انعامات تقسیم کرنے کے بعد بھکاری خاں سے پوچھا۔

''ہمیں بتایا گیا ہے کہ ملک سجاول کے ساتھی سکھوں کی پسپائی کے بعد ملک پور چلے گئے تھے''۔ بھکاری خاں نے جواب دیا۔

''شاید انہیں ہماری غیر جانبداری پر اعتماد نہیں''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہماری خواہش ہے کہ کل صبح انہیں بھی ہمارے حضور پیش کیا جائے ان کی فرض شناسی اور بہادری کا اعتراف ہم پر لازم ہے''۔

بھکاری خاں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

جب میر منو نے گھوڑے کا رخ لشکر گاہ کی طرف موڑا تو سورج کے چہرے پر سرخی پھیلنا شروع ہو گئی تھی انہوں نے اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔

ان کے ساتھیوں کے گھوڑوں کے قدموں کی آواز سے جنگل گونج اٹھا، گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے بعد ایک کھلا میدان تھا جس سے آگے لشکر گاہ کے رنگ برنگ خیمے نظر آ رہے تھے۔ میدان میں گھوڑوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی، لشکری نواب کے گھوڑے کا ساتھ دینے کے لئے اپنے گھوڑوں کو تیز دوڑاتے جا رہے تھے کہ میدان کے درمیان میں اچانک نواب نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ان کا گھوڑا رکتے ہی جو کوئی جہاں تھا وہیں رک گیا۔ نواب نے میر بخشی کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ لشکر کو تھوڑا آگے لے جا کر ان کا انتظار کرے اور خود جلدی سے گھوڑے سے اتر کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ خواجہ سراؤں نے جلدی سے درخت کے نیچے فرش بچھا دیا اور نواب کے چاروں طرف پردے تان کر کھڑے ہو گئے۔

سورج کے چہرے سے سفیدی غائب ہو گئی مگر میر منو پردوں کے پیچھے سے برآمد نہیں ہوئے امراء فوجی سردار اور سوار سب پریشان کھڑے تھے۔ ردہ کی چادریں تاننے والے خواجہ سرا آنکھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے سے اپنے غم اور فکرمندی کا اظہار کر رہے تھے کہ میر منو کی چیخ پر انہوں نے پردہ کے پیچھے دیکھا تو وہ فرش پر پڑے بے ہوش ہو چکے تھے۔

جب میر منو کی پالکی اٹھائے خدام لشکر گاہ میں داخل

ہوئے تو حکام کی خیمہ بستی میں داخلہ کے دروازے کے ساتھ چبوترے کے درمیان گڑے اونچے بانس پر حاکم کی قندیل روشن کی جا چکی تھی اور قندیل کا محافظ اپنی ڈیوٹی پر مستعد کھڑا تھا۔

❁

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، چاند نیلے آسمان پر تاروں کی فوجوں کا معائنہ کرتا ہوا غیر محسوس رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ تیز ہوا کا جھونکا آیا اور لشکرگاہ پر پھیلی چاندنی کی سفید چادر اڑا کر لے گیا، عمر رسیدہ پہریدار چلتا چلتا رک گیا۔ ''دیکھو تو وہ چاند کیا ہوا؟''۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''تم سے ڈر کر بادل کے پیچھے چھپ گیا ہے''۔ دوسرے پہریدار نے چاند کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''یہ بادل کدھر سے آ گیا؟''۔ عمر رسیدہ پہریدار نے غور سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''باقی تو سارا آسمان صاف ہے، کہیں کوئی ایک بھی بدلی دکھائی نہیں دیتی، ہر طرف تارے چمک رہے ہیں''۔

''کہیں سے آ گیا ہوگا راستہ بھول کر اور لشکرگاہ میں روشنیاں دیکھ کر رک گیا ہوگا، ابھی چلا جائے گا''۔ نوجوان نے قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''کہتے ہیں اعوان کے قلعہ میں نواب کے بازوبند کے موتی بکھر گئے تھے، ڈوری ٹوٹ گئی تھی''۔

''نواب کے بازوبند کی ڈوری کچا دھاگا تھوڑی ہے جو ٹوٹ گئی''۔

''ہاں ہاں، ٹوٹ گئی تھی، سچ کہتا ہوں، وہ تو اچھا ہوا سب ہیرے مل گئے ورنہ......''

''ورنہ کیا ہوتا؟ آپ تو پھر پریشان ہوئے جاتے ہیں''۔

''مت کہو یہ! اللہ نے کرم کیا سب ہیرے مل گئے، خدانخواستہ ایک بھی گم ہو جاتا تو......''

''نواب کے پاس ہیروں کی کمی ہے وہ اور ڈال کر نو پورے کر لیتے''۔

''ڈوری ٹوٹنے اور ہیرے مل جانے کا مطلب ہے نواب صاحب ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈوری ٹوٹنا بیماری ہے، آزمائش کی علامت ہے''۔ عمر رسیدہ پہریدار نے نوجوان کے جواب پر غور کئے بغیر کہا۔

وہ خیمہ بستی کے بڑے دروازے کے پاس پہنچ گئے تھے جہاں قندیل کے چبوترے پر بہت سے سپاہی خاموش بیٹھے تھے۔ عمر رسیدہ پہریدار نے نظر اٹھا کر بانس کی چوٹی سے لٹکتی قندیل کی طرف دیکھا اور آہستہ سے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اللہ کا کرم ہے، حاکم کی قندیل کا شعلہ بڑا صاف ہے''۔

میلوں میں پھیلی لشکرگاہ کے تمام خیموں میں شمعیں جل رہی تھیں۔ پیادہ، سوار، سردار، کماندار، سالار، امراء خدام سب ابھی تک جاگ رہے تھے اور بستی کے دیوان خاص میں میر منو ابھی تک بے ہوش پڑے تھے۔ حکیم وید سب اپنے اپنے نسخے آزما چکے تو بھکاری خاں کی اجازت سے نواب کے سر کو لوہے کی گرم سلاخ سے داغا گیا پھر ایک رگ کاٹ کر خون نکالا گیا مگر وہ پھر بھی ہوش میں نہ آئے۔ بھکاری خاں شام سے ان کے سرہانے بیٹھے تھے اور بار بار جھک کر میر منو کی آنکھوں کی پتلیوں کی حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

جراح نے نشتر کو حرکت دی تو نواب کے حلق سے رک رک کر خرخر کی آواز آنے لگی۔ میاں خوش فہم نواب کے چہرے پر جھک گئے۔ حکیموں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آواز بند ہوتے ہی نبض ٹٹولنے لگے۔ انہوں نے نواب کی آنکھیں کھول کر پتلیوں کا جائزہ لیا اور انا للہ کہہ کر اپنے چہرے ہاتھوں میں چھپا لئے۔ میاں فہم نے چیخ ماری اور فرش پر تڑپنے لگا۔ بھکاری خاں اپنا بھاری چوغہ سنبھالتے ہوئے اٹھے اور نواب کے

قدموں سے چمٹ کر رونے لگے۔ حرم کے خیموں سے کنیزوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں تو لشکر گاہ میں ایک سرے سے دوسرے تک اپنے اپنے خیموں میں دعائیں مانگنے والے ہزاروں افراد دھاڑیں مارنے لگے۔ ان کی آہ و بکا راوی اور جنگل کے اس پار رہنے والوں تک پہنچنے لگی۔

قندیل کا نگران آنسو پونچھتا ہوا اٹھا، گردن اٹھا کر قندیل کی طرف دیکھا اور رسی ڈھیلی کر کے قندیل اتار کر شعلہ گل کر دیا۔

عمر رسیدہ پہریدار نے سرگوشی میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اگر اس رات ہم شعلے کے تڑپنے کی بات نہ چھپاتے تو شاید نواب صاحب بچ جاتے''۔

''انسان کی روح قندیل کے شعلے میں تھوڑے ہوتی ہے''۔ نوجوان کی آواز بھی حلق میں پھنس گئی۔

❁

دربار لاہور کے امراء اور فوجی سردار ترک جرنیل امیر الامراء بھکاری خاں کے خیمے میں جمع تھے۔ اس نے انہیں میر منو کی اچانک وفات سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر مشاورت کے لئے بلایا تھا۔ بھکاری خاں کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس مشفق اور سرپرست کی وفات کے غم سے نڈھال ہیں جس نے انہیں اس مرتبہ تک پہنچایا تھا۔ بات کہاں سے شروع کریں اور اپنے دکھ پر کیسے قابو پائیں انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

''ہم آپ سب کے دکھ سے آگاہ ہیں مگر ہمارے دکھ سے کوئی آگاہ نہیں''۔ بھکاری خاں نے خیمے میں موجود امراء اور سرداروں کے چہروں کا جائزہ لے کر بات شروع کی۔ ''نواب مغفور کی موت آپ سب کا نقصان ہے۔ ہم آپ کے چہروں سے آپ کے دکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن ہمارے دکھ کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میر منو نے جس بہادری سے سکھوں کی سرکشی کو کچلا جس دانشمندی سے اس کشور میں نظم بحال کیا ماضی قریب، اس کی مثال پیش کرنے سے معذور ہے۔ ان کی بے وقت موت کی خبر سے سکھوں کو خوشی ہو گی۔ ان سرکشوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے کا شدید خدشہ ہے۔ اس سے وہ نظم برباد ہو سکتا ہے جو میر مغفور نے کئی سال کی کوششوں سے بحال کیا تھا۔ اس لئے لازم ہے کہ شہنشاہ ہندوستان کی طرف سے اس کشور کے لئے نئے حاکم کے تقرر تک کوئی مستحکم انتظام کر لیا جائے۔ ہم چاہتے ہیں نواب مرحوم کو شاہجہاں آباد میں ان کے والد محترم کے پہلو میں سپرد خاک کیا جائے۔ ان کی والدہ اور بھائی شاہجہاں آباد میں ہیں، ہم نواب کے جسدِ خاکی کو شاہجہاں آباد پہنچانے کے انتظامات کے بارے میں اور کشور پنجاب کے نظم کے ضمن میں آپ سے مشورہ چاہتے ہیں''۔

''حضور نواب مغفور کی زندگی میں ان کے نائب تھے۔ مرحوم نے ہمیشہ آپ کی دانش اور بہادری پر اعتماد کیا۔ کشور پنجاب کو آپ کی دانش اور بہادری کی اب پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہو گی''۔ ایک فوجی سردار بھکاری خاں کے بات ختم کرتے ہی بول پڑا۔

نصف درجن سردار بھکاری خاں سے ملت اور کشور پنجاب کی خاطر میر منو کی وفات سے خالی ہونے والے منصب پر فوری طور پر فائز ہونے کی استدعا کر چکے تو دربار لاہور کے ایک رکن نے بھی امرائے دربار کی طرف سے درخواست پیش کی۔ ''نواب مغفور سے وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان کے مشن کو جاری رکھا جائے اور ان کے مشن کو بہتر طریقہ سے وہی شخص جاری رکھ سکتا ہے جو ان کی زندگی میں ان کا دست راست تھا''۔

بھکاری خاں خاموش بیٹھے سن رہے تھے اور حاضرین کا جائزہ لے رہے تھے۔

میر مومن خان نے بات شروع کی تو سب امراء اور

سرادروں نے اپنے اپنے کان ان کی طرف لگا دیئے۔ وہ دربار لاہور میں بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور میر منو ان کے مشورہ کو بہت اہمیت دیتے تھے اس لئے بھکاری خاں انہیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔

''ہمیں میر مغفور کی وفات سے پیدا ہونے والی نازک صورتِ حال کا احساس ہے۔ ہم ان محترم سرداروں اور امرائے دربار کے خیالات اور احساسات کا احترام کرتے ہیں جنہوں نے ابھی ابھی اظہار خیال فرمایا ہے لیکن ہم درخواست کریں گے کہ اس بارے میں کسی جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ میر منو شہنشاہ ہندوستان کی طرف سے مقرر کردہ صوبیدار کشور پنجاب بھی تھے اور بادشاہ کابل و قندھار نے بھی انہیں پنجاب پر حکومت کی سند عطا کی تھی اس لئے ان کے جانشین کا تقرر بڑا نازک مسئلہ ہے اس کے لئے شاہجہاں آباد اور قندھار دونوں کی رضا اور سند درکار ہوگی۔ ایسا نہ ہو ہم کوئی ایسا فیصلہ کرلیں جس کی وجہ سے بادشاہ قندھار ایک بار پھر لاہور پر فوجیں چڑھا دے جو کشور پنجاب اور شاہجہاں آباد دونوں کے لئے خطرناک ہوگا۔ میر مغفور کو کہاں دفن کیا جائے گا اس بارے میں ان کی بیگم کی اجازت اور مشورہ لازم ہے۔ ہمیں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے جو ان کے غم اور دکھ میں اضافہ کرے اور ان کے احترام کے منافی ہو''۔

میر مومن خان کی تقریر سے امراء دو حصوں میں بٹ گئے کچھ میر مومن خان کے مشورہ پر عمل کے حامی تھے اور کچھ فوری طور پر بھکاری خاں کو پنجاب کا ناظم مقرر کر کے میر منو کا جسدِ خاکی شاہجہاں آباد پہنچانے کی حمایت میں دلائل دے رہے تھے۔ فوجی سردار ایک نووارد ترک نوجوان قاسم خاں کے علاوہ سب بھکاری خاں کو فوری طور پر ناظم مقرر کرنے کے حامی تھے۔ امرائے لاہور میں اختلاف شدید ہوا تو بھکاری خاں نے مشاورت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بارے میں مزید غور و فکر کریں''۔

امراء اور سردار بھاری چوغے سنبھالتے ہوئے اپنے اپنے خیموں کی طرف چل دیئے۔

بھکاری خاں خیمے میں ٹہلنے لگے۔

خادم نے خواجہ مرزا خان کی آمد کی اطلاع دی تو وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''نواب مغفور کو امانت کے طور پر اسی خیمے میں دفنا دیا گیا ہے''۔ خواجہ مرزا خان نے آداب کے بعد اطلاع دی۔

''یہ بہت مناسب انتظام ہے''۔ بھکاری خاں نے اطمینان سے جواب دیا۔

خواجہ مرزا خان نے محسوس کیا کہ بھکاری خاں نے اس اطلاع پر اس حیرانی اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا جس کی اسے امید تھی۔ ''مغلانی بیگم نے خزانہ دار کو طلب فرما کر سپاہیوں اور ملازمین سرکار میں تنخواہوں کی تقسیم شروع کرا دی ہے''۔ اس نے مزید بتایا۔

اس بار بھکاری خاں کا ردِعمل اس کے حسب توقع ہوا وہ نشست پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''خزانہ دار کو ہم سے اجازت لینا چاہئے تھی''۔

''میر مومن خان اور چند امرائے دربار تنخواہوں کی تقسیم میں خزانہ دار سے تعاون کر رہے ہیں''۔ خواجہ مرزا خاں نے کہا۔

بھکاری خاں کے لئے یہ خبر اور بھی پریشان کن تھی۔

''ہندوستانی فوج کے سالار کریم بخش نے اپنے کمانداروں کو مشاورت کے لئے بلایا ہے''۔ خواجہ مرزا خان نے بھکاری خاں کو پریشان دیکھ کر اطلاع دی۔

''ہم آج شب ترک سرداروں اور کمانداروں سے مشاورت چاہتے ہیں، ہماری طرف سے سب کو اطلاع کر دی جائے''۔

''خادم حضور کے حکم کی تعمیل کرے گا''۔ خواجہ مرزا خان نے کہا اور باہر جانے کے لئے مڑا۔

''ہم بہادروں اور جاں نثاروں کی قدر جانتے ہیں اور اپنے سرداروں کے مرتبہ سے آگاہ ہیں اس نازک گھڑی میں ان کا اتحاد اور تعاون ان کے اور کشور پنجاب کے فائدہ میں ہوگا اور کسی کو ہم سے کوئی شکوہ نہ ہوگا''۔ بھکاری خاں نے پیچھے سے کہا۔

خواجہ مرزا خان نے مڑ کر دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا۔ ''ہم اپنی جانیں حضور اور پنجاب کے لئے قربان کرنے سے کبھی کوتاہی نہیں کریں گے''۔

خواجہ مرزا خان کے جانے کے بعد بھکاری خاں نشست سے اٹھا اور بے چینی سے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ ریشمی قالینوں کے فرش پر چلتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے زمین تپ رہی ہے۔

❁

آسمان پر ستاروں کی فصل لہلہا رہی تھی، زمین پر چاروں طرف چاند کی روشنی پھیلی تھی اور لشکرگاہ نے خاموشی کی پُر اسرار چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ''معلوم نہیں حاکم کی قندیل کب جلے گی؟''۔ نوجوان پہریدار نے بانس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

''حکمرانوں کی زندگی میں بھی لڑائی اور موت پر بھی لڑائی، اب تو یہ قندیل لڑائی ختم ہونے پر ہی جلے گی''۔ عمر رسیدہ پہریدار نے جواب دیا۔

''سنا ہے بیگم صاحبہ کل صبح نواب مغفور کو لاہور لے جا رہی ہیں انہوں نے تابوت تیار کر لیا ہے''۔

''اسی لئے تو لڑائی کا خطرہ ہے۔ سارے ترک سردار بھکاری خاں کے خیمے میں مشورہ کر رہے ہیں''۔ عمر رسیدہ شخص نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''بیگم صاحبہ نے تو سارا خزانہ لٹا دیا، تین دن سے اشرفیاں بانٹ رہی تھیں''۔

''کوئی بھی ترک سردار بیگم صاحبہ کے بلانے پر آیا نہیں، دیسی فوج والے ہی آئے اور چلے گئے''۔

''دیسی والے ترکوں سے لڑیں گے؟''

''کچھ پتہ نہیں ایسی بات مت کہو''۔

''وہ تو کہتے ہیں نواب مغفور مرے نہیں مارے گئے ہیں۔ ان کا چہرہ اور جسم سیاہ ہو رہا تھا''۔

''جاننے والا بہتر جانتا ہے''۔

''وہ بول بھی تو نہیں سکے، ایسے خاموش ہوئے کہ اپنا درد بھی نہ بتایا''۔

''میں کہتا ہوں مت کہو منہ سے کوئی بات اپنا کام کرو''۔

''اگر لڑائی ہوئی تو ہم کس کا ساتھ دیں گے؟''

''ہم پہرا دینے والے ہیں، پہرا دیتے رہیں گے''۔ عمر رسیدہ پہریدار نے جواب دیا مگر دونوں کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔

ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور خیمہ بستی میں داخل ہو گیا۔

''کچھ ہونے والا ہے، قاسم خاں کو دیکھا ہے کبھی اس طرح بھاگتے؟''۔ نوجوان نے عمر رسیدہ پہریدار سے کہا۔

''اپنا فرض ادا کرو اور خاموش رہو''۔ اس نے جواب دیا مگر آواز کے ساتھ اس کا دل بھی کانپنے لگا۔

وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ترک فوجیوں نے خیمہ بستی کا محاصرہ کر لیا۔ ایک دستہ تیزی سے آیا اور بڑے دروازے سے بستی کے اندر چلا گیا۔ محاصرہ کرنے والوں کا کمانڈار گھوڑے پر سوار خیمہ بستی کے گرد چکر لگا کر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دیتا پھر رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اپنے راستے پر چلتے رہے، انہیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

❁

مغلانی بیگم گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی اور سامنے فرشی شمعدان رکھا تھا۔ وہ شمع دان کے شعلے میں کچھ تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خیمے کے دروازے کے پاس کھڑی گل بنفشہ نے اپنی مالکہ کی طرف نگاہ چرا کر دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں پردے کے پیچھے سے سرگوشی پر اس نے باہر کی طرف دیکھا اور پردہ گرا کر بیگم کے سامنے آ کر دست بستہ سر جھکا دیا۔ ''قاسم خاں حاضری کی درخواست کے ساتھ حضور کے دروازے پر حاضر ہے''۔

بیگم نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ ''ہم اس کی حاضری کے منتظر ہیں''۔

قاسم خاں نے فرشی سلام کیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

''ہم سمجھتے ہیں تم کوئی اہم خبر لائے ہو''۔ بیگم نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سوال کیا۔

''افسوس ہے کہ بندہ حضور کو اچھی خبر نہیں سنا سکے گا''۔ قاسم نے اسی طرح سر جھکائے فرش پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمارا اچھی خبریں سننے کا وقت گزر چکا ہے، نواب مغفور کی موت کی خبر سے کوئی خبر ہمارے لئے زیادہ بُری نہیں ہو سکتی، تم جو بھی خبر لائے ہو بیان کرو''۔

''بھکاری خاں اور ترک سرداروں نے نواب مرحوم کو شاہجہان آباد میں دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

''کسی نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا یا سب ترکوں نے بھکاری خاں کا مشورہ مان لیا؟''۔ بیگم نے پوچھا۔

''کسی فوجی سردار نے ان سے اختلاف نہیں کیا''۔

''اور دربار لاہور کے امراء نے؟''

''جو امراء مشاورت میں موجود تھے وہ سب خاموش رہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ بھکاری خاں سب کو تلوار سے ہانکنا چاہتے ہیں''۔ بیگم کے لہجہ میں تلخی بڑھ گئی۔ ''نواب مرحوم کو کہاں دفن کرنا ہے اس کا فیصلہ ہم کریں گے اور بھکاری خاں اور اس کے خوشامدیوں کو ہم نواب کے تابوت کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیں گے''۔

''وہ چاہتے ہیں کہ حضور میت کے ساتھ شاہجہان آباد روانہ ہو جائیں تو پیچھے بھکاری خاں کے ناظم پنجاب ہونے کا اعلان کر دیا جائے''۔ قاسم خاں نے مزید بتایا۔

''ہم ترکوں کے ارادوں اور خواہشات کا خوب اندازہ کر سکتے ہیں، ہم بھکاری خاں کو اپنے جرائم چھپانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تم کریم بخش تک ہمارا حکم پہنچا دو کہ وہ صبح لاہور کے سفر کی تیاری کریں اور اپنے دستوں کو خبردار کر دیں''۔

گل بنفشہ نے میاں خوش فہم کی آمد کی خبر دی تو مغلانی بیگم نے اسے فوراً حاضر کرنے کا حکم دیا۔

میاں خوش فہم نے فرشی سلام کیا اور بیگم کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اطلاع دی کہ پانچ صد ترک سپاہیوں نے اس خیمے کو گھیر لیا ہے جس میں میر منو کا تابوت دفن ہے اور ترک دستوں نے ان کی خیمہ بستی کا محاصرہ کر لیا ہے۔

''تو بھکاری خاں اپنے مہربان آقا کے تابوت کو ان کے جاں نثاروں کے خون کا نذرانہ پیش کرنا چاہتے ہیں''۔ بیگم نے غصہ سے کہا۔ ''ہم اسے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہمیں نواب مرحوم کی تلوار اور زرہ بکتر پیش کریں اور ہمارے خدام کو حکم دیں کہ وہ ہتھیار لگا کر تیار ہو جائیں''۔

میاں خوش فہم نے حیرانی سے بیگم کی طرف دیکھا اور آداب عرض کر کے تیزی سے خیمے سے باہر نکل گیا۔

''حضور! اس غلام کو اجازت دیں تو میرے قبیلہ

کے ازبک اور کریم بخش کے دستے نواب مرحوم کے تابوت کے تقدس اور حرم کے وقار کے تحفظ میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے''۔ قاسم خاں نے خیمہ بستی کا محاصرہ کرنے والے ترکوں کے خلاف کارروائی کی اجازت چاہی۔

''ہمیں آپ کی وفا اور بہادری پر فخر ہے مگر ہم نہیں چاہتے کہ ترک اور پنجابی فوجیں ایک دوسرے کا خون بہائیں، اس سے بھکاری خاں اور سرکش سکھوں کو فائدہ پہنچے گا اور کشور پنجاب کے محافظ کمزور ہوں گے''۔

''نواب مرحوم کے جاں نثار زندوں ہوں اور حضور تلوار اٹھائیں ہمارے لئے یہ زندگی موت سے بدتر ہو گی''۔ قاسم خاں نے دست بستہ عرض کیا۔

''جو تلوار ہمیں کل اٹھانا ہے آج ہی اٹھا لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ نواب عبدالصمد خاں کی نواسی اور جانی بیگ خاں کی بیٹی کے بازو کمزور ہو سکتے ہیں اس کا عزم کمزور نہیں۔ نواب معین الملک کی وفات پر ان کے سرداروں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں حرم کی چاردیواری سے باہر نکلنا پڑے گا''۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ ''اس وقت ہمیں تمہاری تلوار سے زیادہ تمہاری دانائی کی ضرورت ہے۔ تم ترک سرداروں کے پاس جاؤ اور انہیں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہم اپنے وفاداروں کی قدر کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے جو کوئی بھکاری خاں کے دھوکہ میں آئے گا اسے آخر پچھتانا ہو گا۔ جو اپنے آقا کے جسد خاکی کو لحد میں اتارنے میں ہم سے تعاون کریں گے وہ بادشاہ کابل و قندھار اور شہنشاہ ہندوستان کی نوازشات کے حقدار ہوں گے۔ ان پر واضح کر دیں کہ جو کوئی نواب معین الملک کی میت شاہجہان آباد لے جانے کی کوشش کرے گا اسے مغلانی بیگم کی لاش بھی ساتھ لے جانا ہوگی۔ اگر ان میں اس کی ہمت ہے تو بھکاری خاں کا ساتھ دیں، اگر ایسا نہیں چاہتے تو نماز فجر کے بعد ہمارے حضور حاضر ہو جائیں''۔

''حضور کا غلام اس مہم میں بھی سرخرو ہوگا''۔ قاسم خاں اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ ''اس غلام کو ڈر ہے کہ بھکاری خاں کے سپاہی نواب مرحوم کا تابوت اٹھا کر نہ لے جائیں، تابوت ان کے قبضہ میں چلا گیا تو ترکوں کو ان کے فیصلے سے بدلنا دشوار ہو جائے گا''۔

''جب تک ہم زندہ ہیں نواب مرحوم کے تابوت کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکے گا، ہم چاہتے ہیں تم وقت سے پیچھے نہ رہ جاؤ''۔

قاسم خاں نے سلام کیا اور تیز قدموں سے خیمے سے نکل گیا۔

بیگم اپنی نشست سے اٹھی اور پردہ ہٹا کر خیمے سے باہر آ گئی۔ حرم کے خواجہ سرا اور خادم دروازے کے سامنے جمع ہو چکے تھے اور میاں خوش فہم ان میں تلوار نیزے اور بندوقیں تقسیم کر رہے تھے۔ وہ واپس خیمے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ زرہ بکتر لگا کر باہر آئی تو خدام اور خواجہ سرا تیار کھڑے تھے۔

❁

سورج نے آنکھ کھولی تو ترک امراء اور سرداروں کو بیگم کی دعوت پر ایک جگہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شب کی سیاہی میں وفائیں جفا میں اور جفائیں وفا میں بدل گئی تھیں۔ صرف بھکاری خاں اور خواجہ مرزا خان وہاں موجود نہیں تھے۔ قاسم خاں ترکوں کو بیگم کا پیغام اور بھکاری خاں کا ساتھ دینے کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ مغلانی بیگم خیمے میں داخل ہوئیں تو وہاں جو بھی موجود تھا نگاہیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔ داخلہ کے دروازے کے پاس ایک خالی نشست تھی وہ اس پر تشریف فرما ہو چکی تو سب امراء اور سردار اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے، کسی نے نگاہ اٹھا کر بیگم کی

طرف نہیں دیکھا۔

''آپ کے محبوب آقا تین روز سے منتظر ہیں مگر آپ ابھی تک انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک نہیں پہنچا سکے۔ ہم ان کی روح کے سامنے شرمسار ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے''۔ مغلانی بیگم نے ٹھہر ٹھہر کر اس طرح بات شروع کی جیسے لفظ ان کے ہونٹوں سے جدائی کے صدمہ سے نڈھال ہوں۔

''ہم نواب مرحوم کی روح اور حضور کے سامنے شرمسار ہیں۔ حضور جو بھی حکم فرماویں ہم عمل کریں گے''۔ ایک درباری نے اپنے پاؤں کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''نواب مرحوم کی زندگی میں ان کے دست راست بھکاری خاں رستم جنگ یہاں موجود ہوتے تو ہم ان سے بھی رہنمائی حاصل کرتے۔ ہم نے انہیں پیغام بھجوایا تھا مگر وہ تشریف نہیں لائے مجبوراً ہمیں ان کی عدم موجودگی یں فیصلے کرنا ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ حضرات کا اور رستم جنگ کا تعاون ہمیں اسی طرح حاصل رہے گا جس طرح نواب مرحوم کو حاصل رہا ہے''۔

''بھکاری خاں کا فیصلہ لازماً حضور تک پہنچ چکا ہوگا، شاید وہ اس فیصلے پر مشاورت پسند نہیں فرماتے''۔ ایک اور درباری نے کہا۔

''بھکاری خاں رستم جنگ کے فیصلے کے پیچھے لازماً کوئی مصلحت ہوگی مگر ہماری خواہش ہے کہ نواب مرحوم کو اس شہر میں سپرد لحد کیا جائے جس کے دفاع کے لئے مرحوم نے کبھی تلوار نیام میں نہیں ڈالی۔ اس کشور اور اس کے باسیوں سے نواب مرحوم کو محبت تھی۔ پنجاب اور لاہور کے لوگ ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ بھکاری خاں کی تجویز پر عمل سے لاہور اور پنجاب کے لوگ مرحوم کے جنازہ میں شرکت سے محروم ہو جاتے۔ آپ سب نواب مرحوم کے جاں نثار ہیں، ہمیں مرحوم سے آپ کی عقیدت کا علم ہے، آپ کے جذبات کا احساس ہے مگر ہم لاہور اور پنجاب کے لوگوں کو اس حق سے محروم کرنا پسند نہیں کرتے۔ رستم جنگ نے میت شاہجہان آباد لے جانے کا فیصلہ کرتے وقت ہماری رائے لینا پسند نہیں فرمایا۔ ہم حیران ہیں کہ کسی نے انہیں نہیں بتایا کہ ہم مرحوم کے وارث ہوتے ہیں اور ابھی زندہ ہیں۔ ہم نے کبھی نہ سنا کہ ترکوں میں وارثوں کی اجازت اور منشاء کے بغیر میت اٹھا لے جانے اور تابوت چرانے کی روایت بھی ہے۔ ہماری والدہ اور بیٹیاں لاہور میں ہیں، ہمارے اجداد کے مقبرے اسی شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم اس کی مٹی اور محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ نواب مرحوم کو شاہجہان آباد میں دفن کر کے ہمیں ان کی قبر پر حاضری اور فاتحہ کی سعادت سے بھی محروم کر دیا جائے گا؟ ہم اس پر کیسے یقین کر لیں کہ نواب مرحوم کے جاں نثار ہی یہ ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ ظلم کیسے برداشت کر لیں؟''۔ بیگم کہہ رہی تھی اور سب حاضرین کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ''ہم نے سمرقند و بخارا نہیں دیکھے، ہمیں بتائیں کہ ترک وہاں بیواؤں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے تھے جیسا ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے؟ کیا آپ نے بھکاری خاں کے فیصلہ میں شرکت کر کے اپنے اجداد کی روایت پر عمل کیا ہے؟ ہم نہیں سمجھتے جس قوم سے تعلق پر ہمیں فخر ہے وہ اتنی سنگدل ہے، ظالم ہے''۔

''ہم شرمسار ہیں اور حضور کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین ہیں۔ ہماری جانیں اور تلواریں حضور کے فیصلہ پر عمل کے لئے وقف ہیں''۔ ایک بوڑھے ترک امیر نے کھڑے ہو کر کہا۔

''حضرت ایشاںؒ کے مزار کے احاطہ میں نواب مرحوم کی قبر تیار ہو چکی ہے۔ مقبرہ کی جگہ کے انتخاب تک انہیں وہاں امانت کے طور پر دفن کیا جائے گا۔ ہم دو گھڑی دن گئے تابوت کے ساتھ لاہور روانہ ہو رہے ہیں''۔ بیگم

نے فیصلہ سنا دیا۔
کسی نے ان کے فیصلہ سے اختلاف نہیں کیا، سب سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔
"نواب مرحوم کی موت سے صوبہ کے نظم میں بہت خلل آنے کا خدشہ ہے، آپ سب نے اس نظم کے قیام میں حصہ لیا ہے۔ ہماری خواہش ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ اپنے آقا کی وفات کے بعد بھی آپ پنجاب اور اس کے عوام کی خدمت اسی جذبہ سے کرتے رہیں گے جس جذبہ سے ان کی زندگی میں کرتے رہے ہیں۔ نواب مرحوم شہنشاہ ہندوستان اور بادشاہ قندھار دونوں کی طرف سے کشور پنجاب کے حاکم تھے۔ اب اگر کسی ایک نے بھی نئے حاکم کو پسند نہ فرمایا تو حالات خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لئے کشور پنجاب کا نیا حاکم وہ ہونا چاہئے جو شاہجہان آباد اور قندھار سے سند حکمرانی حاصل کر سکے۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں فیصلہ کرنا پڑا کہ امین الدین پنجاب کا حاکم ہوگا اور میر مومن خان ان کے نائب حاکم ہوں گے"۔ مغلانی بیگم نے اعلان کیا اور درباریوں کا ردِعمل دیکھنے کے لئے رک گئی۔
ساڑھے تین سالہ امین الدین کو حاکم پنجاب بنانے کے بارے میں سن کر سب درباری دم بخود رہ گئے مگر کسی میں اس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ میر مومن خان کی صلاحیتوں اور اثر و رسوخ سے واقف تھے اور اختلاف کر کے اپنے آپ کو بھکاری خاں کے وفاداروں میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔
"بھکاری خاں رستم جنگ نواب مرحوم کی زندگی میں امیر الامراء تھے، وہ اسی منصب پر فائز رہیں گے، ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس کشور اور اس کے عوام کی اسی خلوص اور لگن سے خدمت کرتے رہیں گے"۔
بیگم کا یہ فیصلہ بھی ان کے لئے خلاف توقع تھا۔ بھکاری خاں کی طرف سے کھلی بغاوت کے باوجود بیگم نے اسے اس کے منصب پر برقرار رکھ کر اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کر دیئے اور کسی فوری گروہ بندی اور ردِعمل کی راہ روک دی۔ "نواب امین الدین کی کم سنی کی وجہ سے ہم خود ان کے سرپرست ہوں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ شہنشاہ ہندوستان اور بادشاہ کابل و قندھار بہت جلد نواب امین الدین کے نام کی اسناد حکومت جاری فرما دیں گے"۔
بیگم نے بات ختم کی تو میر مومن خاں نے کھڑے ہو کر بیگم کے اس فیصلہ کو دانش مندانہ اور وقت کی ضرورتوں کے مطابق قرار دیا اور نائب حاکم پنجاب مقرر کرنے پر بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ وہ اور دربار عام میں موجود سب ترک امراء اور سردار میر منو مرحوم کے مشن کو اسی جوش اور خلوص سے جاری رکھیں گے اور نواب امین الدین سے تعاون میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے"۔
وہ اپنی نشست پر بیٹھ چکے تو باقی امراء نے اور ان کے بعد فوجی سرداروں نے بھی مکمل تعاون اور تابع فرمان رہنے کا اعلان کیا۔ مغلانی بیگم نے ان کے جذبہ اور خلوص کو سراہا اور مشاورت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔
دو گھڑی دن چڑھے جب میر منو کی میت کا جلوس لاہور روانہ ہوا تو بھکاری خاں رستم جنگ اور خواجہ مرزا خان اور ان کے ذاتی دستہ کے ازبک سواروں کو چھوڑ کر باقی سب لشکری جلوس کے ساتھ تھے، ترک بھی اور غیر ترک بھی۔

❁

لاہور نے میر منو کی وفات پر بہت سوگ منایا کیونکہ انہوں نے شورشیں دبا کر صوبے میں نظم مستحکم کر دیا تو شہر کی برسوں سے روٹھی خوشحالی اور خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔ سمرقند و بخارا کی راہیں تجارتی قافلوں سے آباد ہو گئی تھیں۔ شاہجہان آباد اور کشمیر کے راستوں پر قافلے

بلاخوف سفر کر سکتے تھے۔ کسانوں کی حالت بدلنے لگی تھی اس لئے جب میر منو کی اچانک وفات کی خبر لاہور پہنچی تو گھروں اور بازاروں میں ہر جگہ دکھ محسوس کیا گیا۔ ان کے جنازہ کے جلوس کی آمد کی خبر سنی تو لوگوں نے دُکانیں اور بازار بند کر دیئے اور جنازے میں شرکت کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔ مغلانی بیگم نے اہلِ لاہور کے دکھ اور عقیدت کے مناظر دیکھے تو اس کے دل کے کسی گوشہ میں سکھ کا احساس پیدا ہوا جب لشکرگاہ میں ترک فوج کے سرداروں کی کھلی بغاوت کے وقت بھی دیسی فوج نے ان کا ساتھ دیا تھا تو وہ ترکوں کے ساتھ اہلِ پنجاب کو بھی شریک اقتدار کرنے کے بارے میں سوچنے لگی تھی مگر اقتدار پر ترکوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اسے کمزور کرنا آسان نہیں تھا۔ شیش محل کے دیوانِ خاص میں بیٹھی وہ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ خادم نے میر مومن خان اور ملک سجاول کی آمد کی خبر دی۔ بیگم انہیں پیش ہونے کی اجازت دے کر نقاب درست کرنے لگی۔ پہلے جو مشورے قلعہ کے دیوانِ خاص میں ہوا کرتے تھے، اب وہ حرم کی چار دیواری کے اندر ہونے لگے تھے۔

میر مومن خان نے جھک کر آداب عرض کیا تو ملک سجاول اور ملک قاسم نے بھی ان کی تقلید کی بیگم سر جھکائے بیٹی رہیں جب وہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تو اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس کی نظریں ملک قاسم کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ لمبی گردن کی آدھی لمبائی تک آراستہ پٹے چھوٹی چھوٹی داڑھی بڑی بڑی مونچھیں تیز نقوش چوڑی پیشانی اور چیتے کی سی چمکدار آنکھیں۔ ''ہم سمجھتے ہیں ہمارا نوجوان مہمان بھی نواب جانی خان مرحوم کے تعلقات کے دائرہ سے متعلق ہے؟''۔ بیگم نے پوچھا۔

اس غیر متوقع سوال پر ملک قاسم نے آنکھیں اور بھی نیچی کر لیں۔

''حضور کا اندازہ درست ہے، نوجوان ملک سجاول کا بھتیجا ہے اور اس کا نام قاسم ہے''۔

مغلانی بیگم نے فوراً موضوع بدل دیا، اسے احساس ہوا کہ جو بات اسے بعد میں پوچھنا چاہئے تھی اس نے پہلے پوچھ کر غلطی کی ہے۔ ''نواب معین الملک کی پُراسرار وفات پر ہم غم کے سمندر میں ڈوبنے لگے تو ہمارے ترک امراء اور سرداروں نے ہمیں ہر سہارے سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ملک سجاول نے نواب جانی بیگم خان سے اپنے بزرگوں کے تعلقات کی جس جرأت اور ایثار سے تجدید کی ہمیں اس سے حوصلہ ملا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ نواب مغفور نے ہمارے کندھوں پر جو بوجھ ڈالا ہے اس کو بٹانے میں بھی ملک سجاول اسی ایثار سے کام لیں گے''۔ اس نے ملک سجاول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مصیبت میں مدد کے لئے اور آزمائش میں تعاون کی درخواست کے لئے ہم نے آپ کو طلب فرمانا لازم جانا''۔

''ہم جو کچھ بھی تھوڑی بہت خدمت کر سکے وہ ہمارا فرض تھا، اس کے لئے ہم کسی شکریہ کے مستحق نہیں۔ مستقبل میں بھی ہم جو خدمت کر سکیں گے وہ کسی پر احسان نہیں ہوگا، ہم اپنا فرض ادا کریں گے''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔ ''حضور نے طلب فرمایا ہم اس عزت افزائی کے لئے شکرگزار ہیں''۔

''اگر آپ کے نوجوان اور سالار کریم بخش کی سپاہ ہمارے عزم کو سہارا نہ دیتے تو شاید ہمارے پاؤں لرز جاتے۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے اور ہم احسان فراموش ترکوں میں سے نہیں''۔

ملک سجاول کی بجائے میر مومن خان ترک نے بیگم کی بات پر اپنی سماعت کا زاویہ بدلنے کے لئے کروٹ بدل لی۔

''جب ترک امراء اور فوجی سردار بھکاری خاں کی ترغیبات اور لالچ کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے تو غیر

ترک سپاہیوں اور سواروں نے لالچ پر فتح حاصل کر کے جو ثابت قدمی دکھائی ہم اس کو بھول نہ سکیں گے۔ ہم اس شام سے سوچ رہے ہیں کہ ہمارے ہم قوم ترکوں نے جن کی کمریں نواب مغفور کے کرم اور نوازشات کے بوجھ سے دوہری ہو رہی ہیں ایسا رویہ کیوں اختیار کیا جس سے ترک اور غیر ترک سپاہ میں تصادم کی صورت پیدا ہوئی۔ اگر ہم آپ کی مدد سے اسے روکنے میں کامیاب نہ ہوتے تو اس تصادم کے بہت خوفناک نتائج سامنے آتے۔ کشور پنجاب میں نظم اور اتحاد کمزور ہوتے اور سرکشوں کو فائدہ پہنچتا''۔

''اس کا سبب نواب مغفور کی کشور پنجاب اور اس کے باسیوں کے لئے قربانیاں اور خدمات کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے''۔ میر مومن خان نے رائے دی۔

''یہ بات کسی حد تک درست ہے مگر ہم اسے بالکل درست نہیں مان سکتے۔ ہم ترک خاندان سے ہیں اور جانتے ہیں کہ ترک اور ازبک دولت اور جاہ و مرتبہ کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں جبکہ مقامی مسلمان اپنے گھروں کھیتوں اور کھلیانوں اور اہل و عیال کے تحفظ کے لئے لڑتے ہیں۔ وہ خواجہ مرزا خان اور ان کے ازبک ساتھیوں کی مانند سمرقند و بخارا واپس نہیں جا سکتے انہیں یہیں رہنا ہے۔ وہ حکمرانی کے لئے نہیں لڑتے، کفر کی غلامی سے بچنے کے لئے تلواریں اٹھاتے ہیں۔ ان کا خلوص انہیں ایثار اور قربانی پر مجبور کرتا ہے''۔ مغلانی بیگم نے کہا۔

''خدا نے کرم کیا تصادم ٹل گیا۔ خدا کرے آئندہ کبھی ایسے تصادم کی صورت پیدا نہ ہو''۔ ملک سجاول نے کوئی رائے دینے کی بجائے دعا کی۔

''ہماری خواہش ہے کہ آپ اس تصادم کو روکنے میں ہماری مدد کریں اور کشور پنجاب میں نظم اور امن مستحکم کرنے میں نواب امین الدین اور میر مومن خان سے تعاون کریں''۔ بیگم نے کہا۔

''بندہ اس عزت افزائی کے لئے حضور کا شکر گزار ہے لیکن شاہجہان آباد سے واپسی تک کوئی وعدہ کرنے کے لائق نہیں''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

مغلانی بیگم نے اس انداز میں ملک سجاول کی طرف دیکھا جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو کہ کوئی دربار لاہور میں مشاورت کا مرتبہ مسترد بھی کر سکتا ہے۔

''نواب جانی بیگم خان کے حوالہ سے بھی ہمارا آپ پر حق بنتا ہے۔ اس نازک مرحلہ میں ہم اپنا خاندانی حق بھی طلب کر سکتے ہیں''۔

''ہمارے پنجاب میں تعلقات کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے اور ہم اس سے سرکشی نہیں کر سکتے۔ نواب مرحوم کو ہمارے والد سے جو تعلق تھا ہم اپنی ہمت کے مطابق اسے نبھانے کی کوشش کریں گے اور میری عدم موجودگی میں میرا بیٹا اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرے گا''۔ ملک سجاول نے ملک قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''حضور جب بھی آواز دیں گے قاسم کہیں بھی ہو سن لے گا''۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ یہ نوجوان کہاں ہوتا ہے تاکہ ہم اسے اس رخ پر آواز دیں''۔ مغلانی بیگم نے قاسم کی رف دیکھ کر پوچھا۔

''رات کا بیشتر حصہ راوی کے کناروں پر جنگل بیلے میں گزارتا ہے مگر طلوع سورج کے بعد ہر صورت گھر پہنچ جاتا ہے''۔ ملک سجاول نے بھی قاسم کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''ہم امید رکھتے ہیں کہ قاسم اپنے بزرگوں کے تعلقات اور راوی کے پانی کی لاج رکھے گا''۔

''میرے بابا کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوئی''۔ ملک قاسم نے بیگم کی بجائے اپنے تایا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ملک سجاول مسکرایا۔

دوآبہ جالندھر کے ناظم آدینہ بیگ کے لاہور میں ایجنٹ بھوانی داس نے کاغذ اکٹھے کر کے ایک طرف رکھ دیئے، وہ اپنے آقا کو دربار لاہور کے تازہ حالات کے بارے میں مراسلہ لکھنے بیٹھا تو شہر اور نواح شہر سے موصول ہونے والے تازہ مراسلے ایک دفعہ پھر پڑھے۔ میر منو کی موت پر لوگوں نے جس دکھ اور افسوس کا اظہار کیا تھا مغلانی بیگم اور کمسن امین الدین کو جس طرح سے حاکم قبول کر لیا تھا اس نے اس کی تفصیل لکھ کر پھاڑ دی۔ وہ آدینہ بیگ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بھوانی داس آدینہ بیگ کے ذریعے سنہری مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا جو نہایت ہوشیاری اور مکاری سے اپنی قوت اور اثر و رسوخ میں اضافہ کر رہا تھا اور بھوانی داس بڑی خاموشی سے آدینہ بیگ کی سازشوں میں بھرپور کردار ادا کر رہا تھا تا کہ پنجاب کا کوئی حاکم کامیاب نہ ہو اور سکھوں کی شورش دبائی نہ جا سکے۔ ابدالی کو ہندوستان کا راستہ آدینہ بیگ کی اسی خواہش نے دکھایا تھا اور اس میں بھوانی داس کی کوششیں بھی شامل تھیں۔

نواب عبدالصمد خان نے پنجاب میں سکھوں کی سرکشی کچل کر امن بحال کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا زکریا خان پنجاب کا حاکم بنا تو اس نے بیگم پورہ میں محل اور حویلیاں بنوانے کی طرف زیادہ دھیان دیا۔ زکریا خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا یحییٰ خان پنجاب کا حاکم بن گیا مگر اس کے چھوٹے بھائی شاہنواز خاں نے آدینہ بیگ کے مشورہ اور مدد سے لاہور پر حملہ کر کے بڑے بھائی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور آدینہ بیگ خاں کو دوآبہ کے فوجی اور انتظامی امور میں خود مختار بنا دیا۔ یحییٰ خاں اپنی پھوپھی مغلانی بیگم کی والدہ کی مدد سے قید سے فرار ہو کر شاہجہان آباد پہنچ گیا جہاں ہندوستان کے وزیراعظم نواب قمرالدین خان تھے جو یحییٰ خاں کے ماموں اور سسر تھے۔ شاہنواز خاں کو خدشہ ہوا کہ وہ اپنے والد کی مدد کریں گے اور مغل افواج لاہور پر حملہ کر کے قبضہ کر لیں گی۔ اس کے محسن اور ماتحت آدینہ بیگ خاں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دے۔ شاہنواز خاں آدینہ بیگ کے ارادوں کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے فوراً احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کے لئے مراسلہ بھیج دیا اور وعدہ کیا کہ اس کی فوجیں شاہجہان آباد پر قبضہ کرنے میں افغانوں کی مدد کریں گی، احمد شاہ ابدالی نے شاہنواز خاں کی دعوت قبول کر لی۔

آدینہ بیگ سکھوں کی خفیہ اور کھلی مدد کرتا رہتا تھا اور روپے پیسے سے جتھے داروں کی مدد کیا کرتا تھا تا کہ وہ ترکوں کو آرام سے حکومت نہ کرنے دیں۔ لاہور اور دربار لاہور کی خبروں کے حصول اور اپنی سازشوں کے جال پھیلانے کے لئے اس نے بھوانی داس کو لاہور میں اپنا ایجنٹ متعین کر رکھا تھا۔

بھوانی داس کو فارسی زبان پر عبور تھا، اس نے آدینہ بیگ کی دولت کے ذریعے دربار کے امراء اور عمال سے گہرے تعلقات قائم کر لئے تھے جس سے اسے دربار کی خبریں حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

''میر منو اور اس کے خاندان کی خدمات کی وجہ سے مغل بادشاہ احمد شاہ نے کمسن امین الدین کے نام سند حکومت جاری کر دی ہے لیکن لاہور کے ترک امراء مغلانی بیگم کی سرپرستی سے خوش نہیں''۔ اس نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔ ''مغلانی بیگم نے بھکاری خاں کی بغاوت کے باوجود اس کا امیر الامراء کا عہدہ برقرار رکھا ہے، وہ اس کی مدد سے صوبہ میں نظم قائم رکھنا چاہتی ہے مگر بھکاری خاں دل سے مغلانی بیگم کے خلاف ہے اور مغل دربار کے امراء اور وزیراعظم انتظام الدولہ کو مغلانی بیگم

کے خلاف مراسلے لکھتا رہتا ہے۔ انتظام الدولہ بھی اپنی بھاوج کے حکمران بن جانے پر خوش نہیں۔ اگرچہ احمد شاہ ابدالی کی وجہ سے انتظام الدولہ نے مکمل کر مغلانی بیگم کی مخالفت نہیں کی لیکن اگر وہ پنجاب میں امن بحال کرنے میں کامیاب نہیں ہوتیں تو انتظام الدولہ بھکاری خاں کو پنجاب کا صوبیدار بنانے کی حمایت کرے گا۔ بھکاری خاں ترک امراء اور درباریوں کو مغلانی بیگم کے خلاف متحد کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک خاتون کا حاکم پنجاب بننا سلطنت اور پنجاب کے تحفظ کے لئے نقصان دہ ہے اور مغلانی بیگم کے اختیار اپنے ہاتھ میں لینے سے میر منو اور اس کے خاندان کے وقار اور احترام کو نقصان پہنچا ہے اور ایک خاتون کے سامنے سر جھکانا ترکوں کی توہین ہے"۔

قلم، قلمدان میں واپس رکھ کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ کی انگلی سر پر لہراتی بودی میں الجھا دی جب اس کی سوچ الجھ جاتی تو وہ اپنی بودی انگلی کے گرد لپیٹ کر گھماتا رہتا تھا، بھکاری خاں اور ترک امراء کا منصوبہ کامیاب ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟ مغل بادشاہ مرہٹوں کی سرکشی سے فارغ ہو کر پنجاب پر توجہ دے سکے گا یا نہیں؟ کچھ سوچ کر اس نے قلم اٹھایا اور پھر سے کاغذ پر جھک گیا۔

"جسا سنگھ کو رقم بھجوا دی ہے، اس کی رسید وہ چند روز میں حضور تک پہنچا دے گا"۔ بھوانی داس نے ایک بار پھر قلم رکھ دیا اور اپنی بودی سے کھیلنے لگا۔ آدینہ بیگ کا ماضی اور سازشیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل گئیں۔

اسی پہلے حملہ کے دوران لاہور پر قبضہ مستحکم کر کے احمد شاہ ابدالی دیوان لکھپت رائے کو پنجاب اور ملتان کا صوبیدار مقرر کر کے خود شاہجہان آباد کی طرف آگے بڑھا تو محمد شاہ بادشاہ کی فوجوں نے سرہند کے قریب اس کا راستہ روک لیا تھا لیکن لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی محمد شاہ بیمار ہوگیا اور فوجوں کی کمان شہزادہ احمد شاہ کے حوالے کر کے واپس شاہجہان آباد چلا گیا تھا۔ مغل اور افغان فوجوں میں دس روز لڑائی ہوتی رہی، دسویں روز وزیر اعظم ہند نواب قمرالدین جب اپنے خیمے میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے تو افغان توپ کا ایک گولا خیمے پر گرا اور وہ ہلاک ہوگئے۔ ان کے بیٹے میر منو نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور بڑی دانشمندی اور بہادری سے لڑائی جاری رکھی اور احمد شاہ ابدالی کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں آدینہ بیگ افغانوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑتا ہوا شدید زخمی ہوگیا تھا جس وجہ سے ترک فوجی سردار اس کی بہادری کے معترف ہوگئے تھے اور شاہجہان آباد میں اس کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی تھی۔

اس فتح کے بعد جب شہنشاہ نے میر منو کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کر کے لاہور بھیجا تو مرکزی حکومت کی کمزوری اور پنجاب میں اقتدار کی لڑائیوں اور سکھوں کی شورش کی وجہ سے صوبے کی انتظامی اور مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی، میر منو صوبے کا نظم بحال کرنے میں لگ گیا۔

چند روز کے بعد محمد شاہ وفات پا گیا، اس کے اکلوتے فرزند احمد شاہ کو شاہجہان آباد کے تخت پر بیٹھے ابھی نو ماہ ہی ہوئے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے ایک بار پھر پنجاب پر حملہ کر دیا۔ جب میر منو کی امداد کی درخواستوں کا شاہجہان آباد سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ فوجیں لے کر لاہور سے نکلا اور سوہدرہ کے قریب افغان فوجوں کا راستہ روکا۔ احمد شاہ ابدالی سرہند کی لڑائی میں میر منو کی بہادری اور صلاحیتوں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ دوسری طرف میر منو کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ دونوں طرف سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی اور احمد شاہ چار پرگنوں سیالکوٹ، ایمان آباد، پسرور اور اورنگ آباد کے محاصل قندھار بھیجنے کے وعدہ پر واپس چلا گیا اور اپنے ایک جرنیل کو کچھ فوج کے ساتھ پیچھے چھوڑ گیا تاکہ وہ محاصل وصول کر کے بھیجتا رہے۔

مسلسل لڑائیوں اور بدامنی سے پنجاب میں کسانوں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ شاہجہان آباد میں صفدر جنگ وزیراعظم بن چکا تھا جسے میر منو کی کامیابی پسند نہ تھی، اسے خدشہ تھا کہ پنجاب میں امن وامان بحال ہوگیا تو میر منو کا عروج اس کے اپنے زوال کا سبب بن سکتا ہے۔ اس نے شاہنواز خاں کو جو احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملہ کے وقت بھاگ کر شاہجہان آباد چلا گیا تھا، ملتان کا حکم بنوا کر ایک فوج کے ساتھ پنجاب روانہ کر دیا تاکہ میر منو کی قوت کمزور کی جائے۔ میر منو اس کی چال کو سمجھتا تھا اس نے اپنے معتمد خاص دیوان کوڑا مل کو شاہنواز کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ اس لڑائی میں شاہنواز مارا گیا تو صفدر جنگ نے افغان بادشاہ کے جرنیل کو ساتھ ملا لیا اور وہ زمینداروں اور کسانوں سے جمع کردہ رقوم لے کر شاہجہان آباد بھاگ گیا۔ جب احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے تین سال کے محاصل کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ افغان حملوں اور پنجاب میں حضور کے دستوں کی موجودگی کی وجہ سے کسانوں کی حالت اس قابل نہیں رہی کہ ان سے زبردستی مالیہ وصول کیا جائے۔ امن وامان کی بحالی کے بعد ان کی حالت بہتر ہوگی تو وہ ان پرگنوں سے وصول ہونے والی رقم قندھار بھیجتے رہیں گے۔ اس جواب سے ناراض ہو کر احمد شاہ ابدالی نے تیسری بار پنجاب پر چڑھائی کر دی۔

میر منو نے دریائے راوی پار کر کے شاہدرہ سے آگے پل شاہدولہ کے قریب افغان فوج کے راستہ میں مورچے کھود لئے۔ دونوں طرف سے توپ خانہ کی گولہ باری اور جھڑپوں کا سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔ میر منو کی درخواستوں کے باوجود اس بار بھی شاہجہان آباد سے کوئی مدد نہ آئی تو اس نے حاکم ملتان دیوان کوڑا مل اور دوآبہ جالندھر کے حاکم آدینہ بیگ کو مدد کے لئے لاہور بلا لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے اوپر جا کر دریائے راوی عبور کیا اور شمال مشرق کی طرف سے لاہور پر حملہ کی کوشش کی۔ میر منو نے نہایت تیزی سے اپنی افواج دریا کے اس پار اتار دیں اور محمود بوٹی سے آگے جا کر مورچے کھود لئے۔ چار ماہ تک دونوں فوجیں ایک دوسری کے آمنے سامنے مورچہ بند رہیں۔ میر منو نے افغان فوج کی برتری کے باوجود انہیں شہر کی طرف آگے نہیں بڑھنے دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے شہر میں باہر سے اناج اور گھوڑوں کی خوراک کی فراہمی کے تمام راستوں پر چھاپہ مار دستے متعین کر دیئے تو شہر میں اناج اور فوج کے گھوڑوں کی خوراک کی شدید قلت ہوگئی اور بازار میں گندم کا ایک سیر آٹا ایک روپے میں بکنے لگا۔ فوجی اپنے گھوڑوں کو گھاس اور چارے کی جگہ جھاڑیاں کاٹ کر کھلانے لگے۔ اس کے باوجود شاہجہان آباد سے کوئی مدد نہ آئی۔ میر منو نے فوج اور اہل شہر کی مشکلات دیکھ کر اپنے امراء سے مشورہ کیا تو دیوان کوڑا مل نے کھلے میدان میں نکل کر لڑائی کی مخالفت کی اور کہا کہ افغان فوج طویل محاصرہ اور لڑائی سے تھک چکی ہے۔ اسے بھی خوراک کی کمی کا سامنا ہے۔ چند روز میں موسم گرم ہو جائے گا تو افغان فوج مجبوراً واپس چلی جائے گی لیکن آدینہ بیگ کے دل میں کچھ اور تھا، اس نے اس کے ساتھیوں نے مورچوں سے نکل کر کھلے میدان میں لڑائی کا مشورہ دیا اور اپنی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

میر منو ترک سرداروں اور آدینہ بیگ کے مشورہ پر کھلے میدان میں صف آراء ہو گئے۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کا رَن پڑا۔ میر منو اور دیوان کوڑا مل کی فوجیں جان توڑ کر لڑ رہی تھیں انہوں نے کئی بار افغان فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا مگر آدینہ بیگ اپنی فوج کے ساتھ ایک طرف کھڑا لڑائی کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک بار میر منو تلوار چلاتا ہوا افغان فوج میں گھس گیا، دیوان کوڑا مل نے نواب کو دشمن کے نرغہ میں دیکھا تو اپنے دستہ کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھا اور افغانوں کا گھیرا توڑ کر نواب کو افغانوں کے

گھیرے سے نکال لیا۔

جب دیوان اگلی صفوں میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا تو ایک افغان سپاہی نے نہایت تیزی سے وار کر کے دیوان کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اپنے سردار کی موت کے بعد دیوان کی فوج پیچھے ہٹنے لگی تو آدینہ بیگ جو لڑنے والوں میں سب سے پیچھے تھا پسپا ہونے والوں میں سب سے آگے دوڑ پڑا۔ میر منو نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور لڑتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا اور رات کے اندھیرے میں کیمپ اٹھا کر شہر اور قلعہ کی فصیل کے نیچے پہنچ گیا۔

اگلے روز احمد شاہ ابدالی نے اپنا کیمپ اٹھایا اور شالامار باغ میں آ مقیم ہوا اور شہر و قلعہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔

میر منو کو کسی طرف سے مدد کی کوئی امید نہ تھی، وہ سوچنے لگا افغان فوج نے لڑ کر شہر فتح کیا تو اہلِ شہر کا کیا انجام ہوگا؟

اس نے ابدالی سے صلح کی بات چیت شروع کرنے کا مشورہ مان لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے بھی شہر کے محاصرہ اور لڑائی پر صلح کو ترجیح دی۔

میر منو نے بات چیت کے لئے امراء کا وفد بھیجنے کی بجائے خود بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی حفاظتی دستہ کے بغیر ایک خواجہ سرا اور جاں نثار خاں کے دو نوجوان بیٹوں کے ساتھ قلعہ سے برآمد ہوا اور گھوڑے شالامار باغ کو جانے والی سڑک پر ڈال دیئے۔

احمد شاہ ابدالی کو خبر ہوئی تو اس نے اپنی فوج کے دو سب سے معزز جرنیلوں کو میر منو کے استقبال کے لئے بھیجا۔ بیگم کوٹ کے قریب افغان دستہ نے میر منو کو اکیلے آتے دیکھا تو افغان جرنیل جہان خان حاکم پنجاب کی بے خوفی پر ششدر رہ گیا اور گھوڑے سے اتر کر میر منو کو خوش آمدید کہا اور افغان لشکر گاہ میں لے گیا۔

شالامار باغ کے پہلے تختہ پر احمد شاہ ابدالی کا شاہی دربار لگا تھا امراء وزراء اور جرنیل اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق مسند شاہی کے سامنے بیٹھے تھے اور چشم تصور سے شکست خوردہ حاکم پنجاب کی فاتح بادشاہ کے حضور پیشی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ حاکم جس نے ایک لڑائی میں ان کے بادشاہ کو شکست دی تھی اور دوسری لڑائی میں انہیں واپسی پر آمادہ کر لیا تھا اور پھر افغان فوجوں کی پنجاب سے واپسی تک محاصل دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس بار چھ ماہ تک انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔

جب افغان جرنیلوں کی معیت میں حاکم پنجاب اکیلا دربار شاہی میں داخل ہوا تو بادشاہ اور درباری اس کی بے خوفی سے بہت متاثر ہوئے۔ میر منو کے چہرے پر کوئی خوف کا نشان تھا نہ کسی پریشانی کے آثار۔ وہ پُر وقار انداز میں چلتا ہوا مسند شاہی تک پہنچا تو بادشاہ خود مسند سے اتر آئے اور اس کی طرف بڑھے سب اہل دربار ادب سے کھڑے ہو گئے۔

میر منو آداب بجا لا چکے تو بادشاہ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور مسند شاہی پر اپنے پہلو میں بٹھا کر ان کی جرأت اور دانائی کی داد دی۔

میر منو خاموش بیٹھے رہے۔

''اپنے آقا کے دربار میں حاضر ہونے میں آپ نے اتنی تاخیر کیوں کی؟''۔ ابدالی منو سے مخاطب ہوئے۔

''میرا ایک اور بھی آقا ہے جو شاہجہان کے تخت پر جلوہ افروز ہے''۔ منو نے جواب دیا۔

''اس آقا نے اس مشکل میں آپ کی مدد کیوں نہ کی؟''۔ ابدالی نے پوچھا۔

''اسے امید تھی کہ میر منو اکیلا ہی آپ سے نبٹ لے گا''۔ منو نے اسی بے خوفی سے جواب دیا۔

''اس لڑائی میں اگر آپ کامیاب ہوتے تو ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''۔ بادشاہ نے

خوفزدہ کرنا چاہا۔

"میں حضور کو آہنی پنجرے میں بند کر کے شاہجہان آباد اپنے آقا کے پاس بھیج دیتا"۔

درباریوں کی نظریں بادشاہ کے چہرے پر جم گئیں۔

"خدا تعالیٰ نے فتح ہمیں بخشی ہے، اب آپ ہم سے کیسے سلوک کی توقع کرتے ہیں؟"۔ ابدالی اس جواب پر بھی طیش میں نہیں آیا۔

"اگر حضور تاجر ہیں تو مجھے فروخت کر دیں، جلاد ہیں تو قتل کر دیں، بادشاہ ہیں تو معاف کر دیں"۔

سادہ دل پٹھان بادشاہ شکست خوردہ حاکم کی جرأت اور بے باکی پر اس قدر خوش ہوا کہ اسے گلے سے لگا لیا اپنی دستار اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔ "اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ آپ رستم ہند ہیں اور آج سے ہمارے "فرزند خاص" ہیں ہم آپ جیسے دانا اور بہادر حاکم کو اپنی پناہ میں لینا پسند کریں گے"۔

پھر انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ میر منو کی طرف بڑھا دیا، میر منو نے بادشاہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔

"اب تک آپ مغل بادشاہ کی طرف سے حاکم پنجاب تھے، آج سے ہماری طرف سے اس کشور کے حاکم ہیں"۔ بادشاہ نے کہا۔

"جس فراخدلی سے حضور نے مجھ سے سلوک کیا ہے میری درخواست ہے کہ حضور اہل لاہور کو بھی اسی فراخدلانہ سلوک سے نوازیں"۔ میر منو نے بادشاہ سے درخواست کی۔

بادشاہ نے اسی وقت تمام گرفتار فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا اور اہل لاہور کے لئے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے حکم دیا کہ کوئی بھی افغان فوجی یا سردار لاہور میں داخل نہیں ہوگا۔ شہر کی نگرانی کے لئے انہوں نے اپنی فوج کے دستے مقرر کرنے کا حکم دیا۔

بادشاہ نے معزز مہمان کے شایان شان سلوک کا حکم دیا اور دربار برخاست کر دیا۔

دوسرے روز جب میر منو افغان کیمپ سے قلعہ کے لئے روانہ ہوئے تو بادشاہ نے انہیں سوا لاکھ روپے کا خلعت اور ہیروں سے مرصع تلوار عطاء کی اور پنجاب دوآبہ جالندھر اور جموں کے کوہستانی علاقہ کو افغان مملکت کا حصہ قرار دے کر میر منو کو ان کی حکومت کی سند جاری کر دی۔

میر منو نے شاہی فوج کی دعوت کے لئے رقم اور بادشاہ کی سواری کے لئے روپہلی ہودج سے آراستہ ہاتھی اور روپہلی زینوں سے سجے اعلیٰ نسل کے گھوڑے شاہی لشکر گاہ بھیجے۔

بادشاہ راوی عبور کر کے مقبرہ جہانگیر میں جا مقیم ہوئے اور شہنشاہ ہندوستان کے پاس ایلچی بھیج دیا۔ مغل شہنشاہ نے ان علاقوں کو درانی کی مملکت کا حصہ تسلیم کر کے سالانہ پچاس لاکھ روپے مالکانہ ادا کرنے سے اتفاق کر لیا۔

زندگی کا المیہ

☆ زندگی کا المیہ یہ ہے کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا ہی بہت دیر سے سیکھتے ہیں۔

☆ ہمارے سانس گنتی کے مقرر ہو چکے ہیں۔ نہ کوئی حادثہ ہمیں وقت سے پہلے مار سکتا ہے اور نہ کوئی حفاظت ہمیں دیر تک زندہ رکھ سکتی ہے۔

☆ دنیا کو اپنی سواری جانو، اگر تم اس پر سوار رہے تو یہ تمہیں منزل تک لے جائے گی اور اگر تم نے دنیا کو اپنے اوپر سوار کر لیا تو یہ تمہارے لئے ذلت و ہلاکت ہے۔

(جواد حیدر-تلہ گنگ)

درانی کیمپ اٹھا کر واپس قندھار چلا گیا۔

آدینہ بیگ کے خواب ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ دوآبہ جالندھر صوبہ پنجاب کا حصہ تھا اور حکام پنجاب شاہجہان آباد اور قندھار کا نمائندہ، لڑائی میں اس کے رویہ کا سب کو علم تھا۔ اس نے حاکم پنجاب کے سامنے منت انکساری اور عاجزی سے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا حلف دہرایا اور ان کے دل سے شبہ کا میل دھونے کے لئے درخواست کی کہ اسے سکھوں کے خلاف جہاد پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جاوے۔ میر منو نے اجازت دے دی۔ سکھ اپنے مذہبی تہوار کے لئے ماکھووال میں جمع ہو رہے تھے۔ آدینہ بیگ نے اچانک حملہ کر کے ہزاروں سکھوں کو تہ تیغ کر دیا مگر اس بار بھی یہ احتیاط کی کہ ان کی طاقت بالکل ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس نے بہت سے سکھوں کو بھاگ جانے کا موقع فراہم کیا اور ان کے ایک سردار جسا سنگھ کلال کو اپنے ساتھ ملا کر سکھوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔

اس شکست کے بعد سکھ لکھی جنگل میں اکٹھے ہونے لگے مگر آدینہ بیگ سیدھا جالندھر چلا گیا۔ میر منو نے ان سکھوں کے تعاقب کے لئے ایک فوج بھیجی۔ حدریائے ستلج کے کنارے کوٹ بڈھا گاؤں کے مقام پر اس فوج سے شکست کے بعد سکھ منتشر ہو گئے۔

آدینہ بیگ نے جسا سنگھ کلال کے ذریعے سکھوں کے جتھے داروں سے رابطہ کیا انہیں مزید روپیہ اور مدد دی اور نواح لاہور میں لوٹ مار کے لئے بھیج دیا۔

آدینہ بیگ سے خفیہ معاہدہ کے تحت سکھ دوآبہ جالندھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ شہنشاہ ہند اور حاکم پنجاب سمجھتے تھے کہ وہ آدینہ بیگ کے خوف سے ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ دوآبہ میں امن و امان کی وجہ سے وہاں سے لگان کی آمدنی بھی کافی ہوتی تھی اس لئے کوئی بھی آدینہ بیگ کو دوآبہ کی حاکمیت سے الگ نہیں کرتا تھا۔ آدینہ بیگ اپنی فوجی قوت میں اضافہ کر رہا تھا اور موقعہ کی تلاش میں تھا کہ جب کوئی اور حاکم کامیاب نہیں ہو گا تو شہنشاہ امن و امان کی بحالی کے لئے اسے پنجاب کا صوبیدار مقرر کر دے گا۔ میر منو کی اچانک وفات اور بھکاری خاں کی بغاوت نے اس کی منزل کو آسان بنا دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا احمد شاہ ابدالی اپنے فرزند خاص کی مدد کے لئے آئے گا؟ اور پنجاب پر افغانوں کی گرفت مضبوط ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟ اور آدینہ بیگ کے ماضی اس کی سازشوں اور بے وفائیوں سے واقف ابدالی کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہو گا؟ بھوانی داس ماضی کے ان جواقعات کا جائزہ لے کر پریشان ہو جاتا۔

"دربار قندھار سے مغلانی بیگم کے بیٹے کے نام سند حکومت ابھی موصول نہیں ہوئی"۔ بھوانی داس نے قلم چلانا شروع کیا۔ "لیکن عام خیال ہے کہ احمد شاہ ابدالی بیگم کی سرپرستی کریں گے، بھکاری خاں بھی ابدالی سے تعلق استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہو سکی۔ مغلانی بیگم اور بھکاری خاں کا جھگڑا بڑھ جانے سے دونوں کی قوت کمزور ہو جائے گی اور حضور کے سوا سکھوں کو دبانے والی کوئی قوت باقی نہیں رہے گی۔ حضور اگر احمد شاہ ابدالی کا اعتماد حاصل کر سکیں تو ترک امراء کو ساتھ ملانا مشکل نہیں ہو گا۔ احمد شاہ ابدالی بھی آپ جیسے تجربہ کار اور بہادر ناظم کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکے گا"۔ اس نے مراسلہ مکمل کر کے اس پر اپنی مہر لگائی اور تہہ کر کے لفافے میں بند کرنے لگا۔

❁

پوہ کی سرد شام شاہی قلعہ کے در و دیوار پر قبضہ مستحکم کر چکی تھی۔ مشعل بردار عالمگیری دروازہ سے دیوانِ عام تک قطار در قطار کھڑے تھے مؤدب لب بستہ امراء، وزراء اور درباری شمعوں کی روشنی میں دیوانِ عام کی طرف چلے جاتے تھے۔ بہت محتاط اور ہوشیار وہ آپس میں سرگوشی کرنے سے پہلے ماحول کا ایسے جائزہ لیتے جیسے

چٹنگوں کے بات اڑا لینے سے خوفزدہ ہوں۔ دیوانِ عام کے صف بستہ ستونوں سے پیوست اور چاروں طرف پھیلے مشعل بردار بار بار تعظیم کے لئے دوہرے ہو ہو جاتے تھے قلعہ کی تند خو فصیل سے پرے شام لاہور مہک رہی تھی مگر دربار میں جو بھی آتا اپنے مقام پر خاموش بیٹھ جاتا۔ امیر الامراء بھکاری خاں رستم جنگ ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ داروغہ دربار نے اہلِ دربار کا جائزہ لیا اور عقبی دروازہ سے باہر نکل گیا۔ حاضرین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال پوچھے لیکن نگاہوں کے جواب دینے سے پیشتر ہی رستم جنگ کی تشریف آوری کا اعلان گونجنے لگا۔ دیوانِ عام میں ایک سرے سے دوسرے تک جو بھی موجود تھا کھڑا ہو گیا۔ رستم جنگ خمیدہ نگاہوں اور نیم خمیدہ جسموں کے درمیان سے چلتا ہوا اپنی نشست تک پہنچا۔ ماحول کا جائزہ لیا اور اپنا لباسِ فاخرہ سمیٹ کر بیٹھ گیا۔

کاتب خاص نے جھک کر اجازت چاہی اور ریشمی زددانوں میں ترتیب سے سجے فرمان اور دستاویزات کھول کر ان کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ اپنے نائبین سے سرگوشیوں میں مشورہ کر رہا تھا کہ داروغہ دربار نے جھانک کر دیکھا اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں۔ ''باادب باملاحظہ ہوشیار سرپرست حاکم کشور پنجاب ذی وقار مغلانی بیگم تشریف لاتی ہیں!''۔ کا اعلان گونجنے لگا۔ جھروکہ کے عقبی دروازہ سے مغلانی بیگم نمودار ہوئی تو دیوانِ عام کے ایک سرے سے دوسرے تک سروں کی فصل ایسے جھک گئی جیسے تیز طوفان میں سرسوں کے کھیت میں پھول مٹی کی مہک سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بیگم جھروکہ میں تشریف فرما ہو چکیں تو حاضرین نے اپنی کمریں سیدھی کیں اور مؤدب بیٹھ گئے۔

چوبدار نے حاکم پنجاب کے اقبال کی سربلندی اور اس کی سرپرست کی سرفرازی کی دعا سے دربار کی کارروائی شروع کرنے کی اجازت چاہی تو مغلانی بیگم نے پاس کھڑے داروغہ کے ذریعہ اجازت عطا فرما دی۔

بھکاری خاں اپنی نشست کے روبرو کھڑا ہو کر سر جھکانے اور اٹھانے کے مراحل مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ مغلانی بیگم کے اشارے پر داروغہ دربار نے چوبدار سے سرگوشی کی، سب نگاہیں بھکاری خاں سے ہٹ کر چوبدار پر مرتکز ہو گئیں، بھکاری خاں خاموش ہو گیا۔

''ہے کوئی مظلوم کوئی خدا کے دشمنوں کا ستایا ہوا، خدا کا بندہ کوئی سائل جو کوئی بھی ہے حاضر ہووے اور انصاف پاوے''۔ اعلان کنندہ کی آواز دیوان عام کے ستونوں اور محرابوں سے ٹکراتی ہوئی قلعہ کی فصیل تک جا پہنچی۔

تین دفعہ اعلان دہرایا جا چکا تو دیوان عام کے آخری کونے میں ایک خاتون اور تین آدمی کھڑے ہو گئے۔ خدام بھاگتے ہوئے ان تک پہنچے اور چاروں کو جھروکہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

مغلانی بیگم کے حکم سے تینوں مردوں کو بٹھا دیا گیا اور بوڑھی خاتون کو جھروکہ کے اور بھی قریب پہنچا دیا۔

''مادر محترم! نہیں معلوم حکام کی غفلت سے آپ کو کتنا سفر کرنا دکھ اور انتظار برداشت کرنا پڑا، ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ آپ بلاخوف اپنی شکایت پیش کریں تا کہ آپ کا دکھ دور کر کے ہم آرام کی نیند سو سکیں''۔ مغلانی بیگم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

خاتون نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''آپ تشریف لائیں ہم پر کرم کیا، اب شکایت بیان کر کے مزید کرم کریں''۔ مغلانی بیگم نے اسے تسلی دی۔

ب بستہ درباری حیران تھے کہ روایتی انداز میں دربار کی کارروائی کی بجائے بیگم نے شکایات سننا شروع کر دی تھیں۔

''حضور! میرا ایک ہی بیٹا تھا جو سکھوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ ایک جوان بیٹی ہے گھر میں، اب کوئی کمانے والا ہے نہ کچھ کھانے اور بیٹی کو گھر سے اٹھانے کو بچا ہے''۔ بڑھیا کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

''رستم جنگ! ہم شرمسار ہیں، خدا کے حضور بھی نواب معین الملک مغفور کی روح کے سامنے بھی اور مادر محترم کے سامنے بھی۔ جس ماں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی ملت پر قربان کر دی، ہم نے اس کے لئے کیا کیا؟''۔ مغلانی بیگم بھکاری خاں سے مخاطب ہوئی۔

''بندہ معافی چاہتا ہے۔ حضور! اس کوتاہی سے درگزر فرماویں۔ کل سورج غروب ہونے سے پہلے مادر محترم کے مصائب خادم اپنے ذمہ لے چکا ہوگا''۔ بھکاری خاں نے ادب کے لئے سر جھکا کر جواب دیا۔

''رستم جنگ! کل بہت دور ہے، مادر محترم کو ابھی ہمارے محل میں پہنچا دیا جائے اور کل سورج غروب ہونے سے قبل ان کی بیٹی کو بھی شیش محل پہنچ جانا چاہئے، وہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ان کی بیٹی کی شادی ہماری ذمہ داری ہے''۔ مغلانی بیگم نے حکم دیا۔

بڑھیا کبھی مغلانی بیگم کی طرف دیکھتی اور کبھی اہل دربار کی طرف اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ خدام آگے بڑھے اور سہارا دے کر اسے عقبی دروازہ سے باہر لے گئے۔

''محترم بزرگ! آپ کو ہم سے کیا دکھ پہنچا؟''۔ مغلانی بیگم نے چیتھڑوں میں لپٹے بوڑھے سے پوچھا۔

بوڑھا بیگم کا سوال سمجھ نہ سکا اور خاموش کھڑا رہا، خدام اسے اور بھی قریب لے آئے۔

''ہم غلط نہیں سمجھے تو آپ طویل مسافت طے کر کے آئے ہیں؟''۔ مغلانی بیگم نے پوچھا۔

''ہم لمبا سفر کر کے حضور کے دربار تک پہنچ سکے۔ ہمارا گاؤں سیالکوٹ سے بھی آگے ہے''۔ بوڑھے نے اپنے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''آپ کو کس نے ستایا جو اتنے طویل سفر کی زحمت گوارا کی؟''۔ بیگم نے پوچھا۔

''ہمارا سب کچھ سکھ لوٹ لے گئے، وہ پہاڑوں کی طرف سے آئے اور سب کچھ چھین لے گئے۔ ناظم نے ہماری حفاظت کی نہ مدد کو پہنچا''۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

''رستم جنگ! کیا ہم نے وہ علاقہ سکھوں کو بخش دیا ہے؟''۔ مغلانی بیگم نے طنز کیا۔

''حضور! پرگنہ سیالکوٹ میں سکھ کبھی کبھی پہاڑوں سے نکل کر لوٹ مار کرتے ہیں اور واپس پہاڑوں میں جا چھپتے ہیں۔ میں نے آج ہی سیالکوٹ کے ضلع دار کو سرزنش کی ہے اور رعایا کے تحفظ کا انتظام کرنے کا حکم دیا ہے''۔ بھکاری خاں نے زردان میں سے ایک فرمان نکال کر پیش کرنا چاہا۔

''رستم جنگ! سنہری الفاظ میں لکھے فرمانوں سے باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی ممکن ہوتی تو بادشاہ اور حاکم فوجیں تیار نہ کیا کرتے خوش نویسوں کی فوجیں بھرتی کیا کرتے۔ اس طرح کے فرمان تو کالے برج کا انچارج بھی جاری کر سکتا ہے۔ ہم امیر الامراء سے مخاطب ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ رعایا کو کب تک ہم سے تحفظ کی امید کرنا چاہئے؟''

''عالیجاہ! حضور کی اجازت سے بندہ لاہور سے ایک فوجی دستہ بھیجنا چاہتا ہے جو ضلع دار کی معاونت کرے گا''۔

''رستم جنگ! کیا رعایا یہ سوچنے میں حق بجانب نہ ہوگی کہ نواب امین الدین پنجاب کی حاکمیت کے اہل نہیں؟ کیا ہم حاکم پنجاب اور اس کی رعایا سے بے انصافی نہیں کر رہے؟''۔ بیگم کے سوال میں ناراضگی تھی۔

''نواب شہید کے خاندان کا ہر فرد اس مسند کے لئے باعث صد افتخار ہے۔ پنجاب کے لوگ اس خاندان کے شکرگزار ہیں''۔ بھکاری خاں نے میر منو مرحوم کا سہارا

لینے کی کوشش کی۔

''ان دونوں شکر گزاروں کو مہمان خانہ پہنچا دیا جائے، کل ذمہ دار حکام ان کے ساتھ جائیں گے، ان کے گاؤں کے سب مظلوموں کو ان کے نقصانات کا معاوضہ ادا کر کے ایک ہفتہ کے اندر اندر ہمیں آگاہ کیا جائے گا''۔

''ارشاد عالیہ کی تعمیل ہو گی''۔ بھکاری خاں نے ایک بار پھر سر جھکا دیا۔

خدام دونوں دیہاتیوں کو مہمان خانہ کی طرف لے چلے۔

''ہماری نظروں نے دھوکہ نہیں دیا تو ہم ایک چوتھا فریادی بھی دیکھ چکے ہیں''۔ بیگم نے کہا۔

خدام نے ایک نوجوان کو پیش کر دیا۔

''ہم دیکھتے ہیں اس جوان کا چہرہ راوی کی لہروں نے اپنے ہاتھوں سے دھویا ہے''۔ مغلانی بیگم نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''حضور! کا اقبال بلند ہو، بندہ قلعہ کے سامنے راوی میں کشتی چلا کر روزی کماتا ہے''۔ جوان نے دست بستہ عرض کیا۔

''راوی کی لہروں کو ہم سے کیا شکایت ہے؟''

''لہروں کو شکایت نہیں حضور بندہ کو شکوہ ہے۔

''ہم اپنے بندہ کا شکوہ سن کر خوش ہوں گے''۔ بیگم ہلکا سا مسکرائی۔

''حضور! بندہ کی کشتی بہت پرانی ہے، آپ حکم دیں کہ بندہ کو رات کے وقت کشتی دریا سے پار لے جانے پر مجبور نہ کیا جائے''۔ نوجوان نے دست بستہ درخواست کی۔

''ہم جاننا چاہیں گے کہ تمہیں رات کے وقت کشتی دریا سے پار لے جانے پر کون مجبور کرتا ہے؟''

''یہی آپ کے لوگ حضور! عام لوگ تو مجبور نہ کر سکتے ہیں''۔

''تم کسی ہمارے لوگ کا نام بتا سکتے ہو جو تمہیں مجبور کرتا ہے''۔

''سب ملاح انہیں شاہی لوگ کہتے ہیں حضور!''

''ہماری اطلاع کے مطابق کوئی شاہی لوگ ہمارے بندوں میں شامل نہیں''۔

''شامل ہیں، حضور! بندہ کی پہچان بہت پختہ ہے، وہ جب بھی آتا ہے کہتا ہے قلعہ سے شاہی لوگ آیا ہے کشتی کھولو''۔

''تم کسی ایسے شاہی لوگ کو پہچان سکتے ہو؟''

''نہیں، حضور! پہچان نہیں سکتا۔ یہاں کوئی بھی شاہی بندہ اس رات والے لباس میں نہیں''۔

''تمہیں معلوم ہے، ہم غلط شکایت پر کیا سزا دیتے ہیں؟''

''بالکل نہیں حضور! بندہ کی شکایت جائز ہے، ہم بات سے پہچان سکتا ہے، بندہ کس جگہ سے آیا ہے''۔

''تمہارے باپ نے تمہارے لئے کیا نام پسند کیا تھا؟''

''حضور! بندہ کا نام کالو ہے''۔

''کالو کو تا برخاست دربار کسی کھردری دیوار کی طرف منہ کر کے ایستادہ رکھا جائے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہم جھوٹ پسند نہیں کرتے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

سپاہیوں نے آگے بڑھ کر کالو کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور باہر کی طرف لے چلے وہ پوری قوت چلایا۔

''حضور بندہ نے جو عرض کیا درست کیا، ہماری بیوی کو بلا کر پوچھ لیں، حضور وہ بھی کبھی جھوٹ نہیں بولتی''۔

سپاہی اسے کھینچتے ہوئے لے گئے۔

''ہے کوئی اور مظلوم یا سائل جسے قلعہ کی اونچی دیواروں نے ہم تک پہنچنے سے روک دیا ہو؟''۔ مغلانی بیگم نے پوچھا۔

''حضور! کا کوئی غلام ایسی گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خادم نے تحقیق کرائی ہے قلعہ کے اندر یا باہر کوئی اور سائل موجود نہیں''۔ قلعہ دار نادر بیگ نے دست بستہ عرض کیا۔

''ہم سمجھتے ہیں سپاہ کو تنخواہ ادا کر دی گئی ہے''۔ مغلانی بیگم بھکاری خاں سے مخاطب ہوئیں۔

رستم جنگ نے تعظیماً سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''حضور! لاہور میں سب سپاہ اور سرداروں کو تنخواہیں ادا کر دی گئی ہیں۔ ایمن آباد میں مقیم سپاہ کو ایک دو روز میں تنخواہ بھجوا دی جائے گی۔

''وجہ تاخیر کیا ہوئی؟''

''حضور! خزانہ دار کے پاس تنخواہ کی مد میں رقم کم پڑ گئی تھی''۔

''خزانہ دار حاضر ہے؟''

خزانہ دار نے کھڑا ہو کر سر جھکا دیا۔

''یہ کتنے سال سے خزانہ دار ہیں؟''

''نواب معین الملک مغفور نے انہیں اس منصب پر سرفراز فرمایا تھا''۔ بھکاری خاں نے بتایا۔

''اس کا نائب کون ہے؟''۔ بیگم نے پوچھا۔

''لدھا رام ہے حضور!''

''لدھا رام حاضر ہے؟''

ایک منحنی نوجوان نے کھڑے ہو کر سر جھکا دیا۔

''خزانہ دار کو کالے برج کے تہہ خانہ میں بند کر دیا جائے۔ آج سے لدھا رام خزانہ دار ہیں''۔ بیگم نے حکم دیا۔

امراء اور درباریوں نے چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بھکاری خاں نے کچھ عرض کرنا چاہا مگر مغلانی بیگم نے اسے موقعہ نہ دیا۔

''ہم سپاہ کو نواب امین الدین سے بدظن کرنے کی دانستہ کوشش معاف نہیں کر سکتے۔ نادر بیگ ہمارے حکم کی تعمیل میں تاخیر کیوں؟''

سپاہی آگے بڑھے اور خزانہ دار کو گرفتار کر کے لے گئے۔

''لدھا رام رقم کم ہو تو ہمیں آگاہ کریں، کل شام تک ایمن آباد میں مقیم سپاہ میں تنخواہیں تقسیم ہو جائیں''۔ بیگم نے نئے خزانہ دار سے کہا۔

''حضور! کے حکم کی تعمیل ہو گی''۔ لدھا رام نے جھک کر فرشی سلام کیا۔

''رستم جنگ! ہمیں ابھی تک آدینہ بیگم کے معاملات سے آگاہ نہیں کیا گیا''۔

''حضور! آج ہی ناظم دوآبہ کا مراسلہ موصول ہوا ہے''۔ اس نے ایک مراسلہ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

''امن وامان کی صورت حال تسلی بخش ہے، سرکشوں کو مکمل طور پر دبا دیا گیا ہے، رعایا حضور کے اقبال کو دعائیں دیتی ہے''۔

''رستم جنگ! آدینہ بیگ کو لکھیں ہمیں رعایا کی دعاؤں سے زیادہ اس کی خوش حالی مطلوب ہے''۔ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم چاہیں گے پرچہ نویسوں کے مراسلے پیش کئے جائیں''۔

رستم جنگ نے اشارہ کیا تو ایک نوجوان تیزی سے آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں بھاری جزدان تھا، جھروکہ کے قریب پہنچ کر وہ آداب بجالایا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں سرسا کے پرچہ نویس کا مراسلہ پڑھ کر سنایا جائے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

نوجوان جزدان میں سے ایک مراسلہ ڈھونڈ کر پڑھنے لگا۔ ''گزشتہ جمعہ کی شب سکھوں کا ایک گروہ قصبہ میں داخل ہوا، ناقص حفاظتی انتظامات نے سکھوں کی مدد کی۔ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے گھر لوٹ کر شب کے اندھیرے میں روپوش ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد سے قصبہ اور قرب و جوار کے دیہات میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے''۔

''آدینہ بیگ کے امن و امان کا نمونہ رستم جنگ

نے سن لیا ہوگا۔ باقی مراسلے سرفراز خاں کے حوالے کر دیئے جائیں، ہم خود پڑھنا پسند کریں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ رعایا ہمارے اقبال کو کیسی کیسی دعائیں دیتی ہے''۔ بیگم نے اشارہ کیا۔

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر مراسلوں کا جزدان وصول کرلیا تو بھکاری خاں نے سر جھکا دیا۔

''ناظم لاہور حاضر ہیں؟''۔ بیگم نے سوال کیا۔

بھکاری خاں کے اشارے پر ایک تنومند ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا ہوگیا۔

''شہر میں غلہ کی صورتِ حال کیسی ہے؟''۔ مغلانی بیگم براہ راست اس سے مخاطب ہوئی۔

''دُکانوں پر ضروریات خوراک وافر ہیں، غلہ خانہ میں دو ماہ کے لئے غلہ موجود ہے''۔ ناظم شہر نے فرشی سلام کے بعد عرض کیا۔

''غلہ خانہ میں چار ماہ کے لئے غلہ ذخیرہ کیا جائے، رستم جنگ سے ہدایات حاصل کریں۔ شہر میں کسی چیز کا نرخ بڑھنا نہیں چاہیے''۔

''بندہ احکام عالیہ کی تعمیل کرے گا''۔ ناظم ایک بار پھر رکوع میں چلا گیا۔

''تم نے گھاس منڈی کا دورہ کب کیا تھا؟''۔ بیگم نے پوچھا۔

''آج صبح بندہ خود گھاس منڈی گیا اور دیکھا کہ گھوڑوں اور مویشیوں کی خوراک مسلسل آ رہی ہے''۔

''فراہمی کے راستے محفوظ ہیں؟''

''کوئی بڑی شکایت سننے میں نہیں آئی''۔

''ہم چھوٹی چھوٹی شکایت بھی جاننا چاہیں گے، کل ہمیں تفصیل سے آگاہ کیا جائے''۔

''بہت بہتر حضور!''۔ ناظم کے جھکنے سے پہلے بھکاری خاں نے سر جھکا دیا۔

''کالو ملاح کو قلعہ کی فصیل پر بٹھا دیا جائے، یہ آج رات راوی کی لہریں گنے گا، صبح اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ ہم ہرگز پسند نہیں کرتے کہ کوئی ہمارے عمال کے بارے میں غلط بیانی نہ کرے''۔ یہ کہہ کر مغلانی بیگم کھڑی ہوگئی تو دیوانِ عام میں موجود سب افراد بھی کھڑے ہو گئے اور جب تک وہ عقبی دروازہ سے غائب نہیں ہوگئی۔ سب سر جھکائے کھڑے رہے، اس کے بعد ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ ان کے لئے یہ انداز درباراری بہت حیران کن تھا۔

بھکاری خاں عمال اور امراء کے جھرمٹ میں اپنی سواری کی طرف چلنے لگا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا، وہ خاموش چلا جاتا تھا۔ اسے خدام اور شمع برداروں کے سلام کا جواب دینے کا ہوش تک نہ تھا۔

قلعہ کے عالمگیری دروازہ کے محافظ دستہ نے سلامی دی تو رستم جنگ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ایک وہ دن تھے کہ دربار لاہور میں اس کے ایک لفظ اور اشارے کا احترام کیا جاتا اور آج بھرے دربار میں اس کی توہین ہوئی تھی۔ وہ بہت افسردہ تھا مگر اس کا دماغ بہت تیز چل رہا تھا۔ میر منو کی وفات پر اس نے پنجاب پر حکومت کے خواب دیکھے تھے مگر مغلانی بیگم کے اختیارات سنبھالتے ہی اس کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ پہلے اس کے مخالف میر مومن خان کو نائب حاکم بنایا گیا اور آج خزانہ دار کو کالے برج میں بند کر دیا گیا اور بھرے دربار میں اس کی تذلیل کی گئی۔ مغلانی بیگم نے کسی معاملہ میں بھی اس کی رائے کو اہمیت نہ دی تھی۔ ''اس رسوائی کو قبول کر لیا جائے؟''۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''ایک ترک جرنیل کے لئے ایسا سوچنا بھی شایان شان نہیں''۔ اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ''میں ایسا جال بنوں گا کہ اس میں یہ ماں بیٹا دم توڑ دیں گے''۔ اس نے اپنے کو تسلی دی۔ ''پنجابی فوج اسے بچا نہیں سکے گی؟ ترک ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے، میں انہیں بتاؤں گا

کہ مغلانی بیگم کی کامیابی کا مطلب ترک اور مغل برتری کا خاتمہ ہو گا۔ حالات اسی انداز میں چلتے رہے تو کسی روز مغلانی بیگم انہیں بھی کسی برج میں قید کروا دے گی"۔

راوی کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے تجربہ کار امیر الامراء کی پیشانی کو بوسہ دیا تو ان کے لب یخ بستہ ہو گئے۔ فصیل شہر کا چکر کاٹ کر جب اس کی سواری اس کے محل کی طرف مڑی تو وہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر چکا تھا اور اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے طریقوں پر غور کرنے لگا تھا، تاریخ کا دھارا مٹھی میں لینے کے طریقے۔ اس لڑائی میں فریق کون ہیں، شاہجہان آباد کا مغل بادشاہ قندھار کا درانی حکمران مغل اور ترک امراء اور سالار، پنجابی فوج اور لاہور کے عوام ان میں سے کون کس کے ساتھ ہے؟ پنجابی فوج اور عوام مغلانی بیگم کے ساتھ ہیں۔ ترک اور مغل امراء کو توڑا جا سکتا ہے؟ احمد شاہ ابدالی نے خود بیگم کے خاوند کو پنجاب کی حکومت کی سند دی تھی کیا وہ بھی امین الدین اور مغلانی بیگم کو سند حکمرانی عنایت کر دے گا؟ ایسا ہو گیا تو ان کی پوزیشن اور مضبوط ہو جائے گی۔ احمد شاہ ابدالی کو اس سے باز رکھا جائے مگر کیسے؟ پھر وہ خود ہی مسکرایا جیسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن نظر آ گئی ہو۔ انتظام الدولہ بھی تو اپنی بھائی سے خوش نہیں، اسے اس کے کارناموں سے آگاہ کران چاہئے۔ اہلِ لاہور وزیر خان کو بھول کیوں نہیں گئے؟ اس کی چشم تصور کے سامنے مسجد وزیر خاں کے بلند و بالا مینار گھوم گئے مگر اس کے لئے وقت اور سرمایہ درکار ہے اور اس کے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ سرمایہ۔ مغلانی بیگم بہت تیز جا رہی ہے اور وقت اس کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے لیکن وہ تو امیر الامراء ہے، کیا وہ اتنا کمزور ہے کہ ایک مسجد بھی نہ بنوا سکے؟۔ میں نے میر منو کو کامیاب بنایا، اس کی بیگم کو بھی ناکام بنا کر دکھاؤں گا"۔

اس نے ہوا میں مکا لہرایا اور اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اس کا محافظ دستہ بھی وہیں رک گیا۔ فصیل بند لاہور اور فصیل سے باہر کے محلات اور باغات سب گہری نیند سو رہے تھے۔ "کسی نے میرا مکا دیکھ تو نہیں لیا؟ کسی نے میرا اعلان سن تو نہیں لیا؟"۔ وہ محافظوں کی آنکھوں میں جواب تلاش کرنے لگا مگر اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"ابھی کتنی رات باقی ہو گی؟"۔ اس نے اپنے محافظ دستہ کے کمان دار سے پوچھا۔

"ابھی تو بہت رات باقی ہے حضور!"۔ اس نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

"ہم سوچ رہے تھے رات کا باقی حصہ سید علی ہجویری کے مزار پر گزاریں"۔ بھکاری خاں نے اس سے اپنی پریشانی چھپانے کے لئے بہانہ بنایا۔

"بہت مقدس خیال ہے حضور!"۔ کماندار نے تائید کی۔

"مگر تم تو کہتے ہو ابھی رات کافی ہے"۔

"وہ تو بلاشبہ ہے حضور!"۔ اس نے اس کی بھی تائید کی۔

"بھکاری خاں نے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور کہا۔ "پھر کسی رات چلیں گے"۔

(جاری ہے)

ضرب حیدری

اسرائیل بمقابلہ مسلم اُمّہ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

☆ --------------- balochsk@yahoo.com --------------- سکندر خان بلوچ

8 جولائی 2014ء سے جو کچھ بے گناہ فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے دیکھ کر اور پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ خدا ایسے حالات سے دشمن کو بھی دو چار نہ کرے۔ اس غیر متوازن جنگ میں اسرائیل نے درندگی کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ ایک ایک دن میں سو سو سے زائد بے گناہ مسلمان شہید کئے جا رہے ہیں اور بے گناہ فلسطینیوں کی لاشیں کوئی اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ تادم تحریر اسرائیل کی طرف سے ظلم و بربریت کی جنگ جاری ہے جبکہ فلسطینی بیچارے جواب دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں۔ یہ تو اسی پرانے کھیل کی مشق بازی معلوم ہوتی ہے جہاں انسانوں کی مشقیں باندھ کر خونخوار درندوں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا۔ پھر بادشاہ سلامت اور امراء سامنے بیٹھ کر اس انسانی چیر پھاڑ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہاں بھی وہی خونی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ امریکہ بہادر اور باقی مغربی طاقتیں آرام سے اس کھیل سے محظوظ ہو رہی ہیں بلکہ خوشی سے تالیاں بھی بجا رہی ہیں۔ معلوم نہیں آخری گولی یا آخری بم تک مزید کتنی لاشیں گریں گی۔ اب تک تقریباً دو ہزار سے زائد بے گناہ لوگ شہید ہو چکے ہیں جن میں زیادہ تعداد بچوں اور خواتین کی ہے۔ مغربی دنیا اور خصوصاً انسانی حقوق کی علمبردار تنظیمیں بھی خاموش ہیں جیسے انہیں کچھ نظر ہی نہ آتا ہو۔ اسرائیل کی اس

وحشیانہ بمباری پر مسلم امہ کی بے حسی بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا تو اپنے مفادات کی وجہ سے خاموش تماشائی بنی ہے لیکن مسلم امہ اسرائیل کی ہٹ دھرمی کے سامنے بے بس ہے۔ شاید تمام مسلم ممالک مل کر بھی اسرائیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مسلمانوں کو ان کی اوقات بتائی جا رہی ہے۔ اسی کا نام ''نیو ورلڈ آرڈر'' ہے۔

یہاں افسوس اس بات کا ہے کہ اسرائیل ایک بہت ہی چھوٹا سا ملک ہے۔ کل رقبہ تقریباً ستائیس ہزار مربع کلومیٹر ہے جو ہمارے سب سے چھوٹے صوبہ کے پی کے سے بھی کم ہے۔ اس رقبے میں بھی 16000 مربع کلومیٹر صحرا ہے جہاں کچھ نہیں اگتا۔ اگر یہ علاقہ نکال دیا جائے تو یہ بلوچستان کے کسی ایک ضلع کی وسعت کے برابر رہ جائے گا۔ اس کی آبادی بھی محض 61 لاکھ ہے جو لاہور شہر کی آبادی سے بھی کم ہے۔ اس آبادی میں بھی صرف 76 فیصد یہودی ہیں باقی عرب اور دیگر مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ اسرائیل میں معدنی وسائل بھی نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ اسرائیلیوں کا شکوہ ہے کہ اردگرد کے تمام عرب ممالک میں تیل ہے لیکن اسرائیل اس علاقے کا واحد ملک ہے جو اس نعمت سے بھی محروم ہے۔ اگر مقابلہ کیا جائے تو اردگرد کے عرب ممالک اسرائیل سے کئی گنا بڑے ہیں۔ قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے بھی اسرائیل پر کئی گنا برتری رکھتے ہیں۔ اگر تمام عرب مل کر تھوک بھی دیں تو اسرائیل ڈوب جائے گا۔ اگر تمام فیکٹر کو یکجا کر کے عرب مسلم ممالک بمقابلہ اسرائیل پرکھا جائے تو یہ شیر اور بلی کا مقابلہ ہوگا اور حیران کن بات یہ ہے کہ بلی شیر کو مار رہی ہے اور شیر جان بچانے کے لئے مختلف سہارے تلاش کر رہا ہے بلکہ بلی کے سامنے بے بس ہے۔ یہی ایک اہم نکتہ ہے جو مسلم امہ اور خصوصاً عربوں کو سمجھنا چاہیے۔ اگر اب بھی مسلمان نہیں سمجھتے تو پوری دنیا میں ہم سے زیادہ بد قسمت قوم کوئی نہ ہوگی اور جو کچھ ہمارے ساتھ اس وقت ہو رہا ہے شاید ہم اس کے مستحق ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ آخر ایسا ہو کیوں رہا ہے۔

عربوں پر اکثر الزام لگایا جاتا ہے کہ عرب اسرائیل کے خلاف متحد نہیں۔ مجھے یہ بات بھی درست نظر نہیں آتی کیونکہ 14 جولائی 1948 کو جب اسرائیل نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا تو اسرائیل میں یہودیوں کی کل تعداد تقریباً 10 لاکھ تھی بلکہ کچھ حوالوں کے مطابق فقط 6 لاکھ تھی۔ اسرائیل کے پاس اس وقت تک کوئی باقاعدہ فوج بھی نہ تھی۔ اس اعلان آزادی کے ساتھ ہی پانچ عرب ممالک نے مل کر اسرائیل پر حملہ کر دیا لیکن اسے ختم کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ اب تک عرب مل کر اسرائیل سے 4 بڑی جنگیں لڑ چکے ہیں اور ہر دفعہ نہ صرف شرمناک شکست سے دوچار ہوئے بلکہ اپنے کئی اہم علاقوں سے بھی محروم ہو گئے۔ ایک دفعہ کسی مغربی عسکری تجزیہ نگار نے لکھا تھا کہ 1967 کی جنگ میں صحرائے سینا کے ''متلا پاس'' میں مصری فوج کی ایک کریک بٹالین دفاع میں تھی۔ جنگ کے دوران اسرائیلیوں کے پاس مین پاور کی کمی ہوئی تو انہوں نے رات کو ایک خواتین کمانڈو بٹالین متلا پاس پر ڈراپ کی اور ان خواتین کمانڈوز نے مصری سولجرز کو رائفلوں کے بٹ مار مار کر مورچوں سے بھگا دیا۔ ہوسکتا ہے یہ واقعہ کسی قدر مبالغہ آمیز ہو لیکن اسرائیلی فوج کی کرشماتی کامیابیوں نے تمام تر فوجی نظریات کو غلط ثابت کر دیا۔ عرب فوجیں کسی بھی جنگ میں کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکیں۔ اسے باعث شرم سمجھا جائے یا باعثِ ذلت؟

موجودہ جنگ کے شروع سے ہی اسرائیلی درندگی، مغربی طاقتوں کی چشم پوشی اور مسلم امہ کی بے حسی پر بہت مئوثر تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ ہر تحریر میں گھوم پھر کر اسرائیل

کے علاوہ مغربی طاقتوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔ اسرائیل کی دہشت گردی کیوں نہیں روکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم اہل یہود و ہنود و نصاریٰ سے رحم کی بھیک مانگنے پر کیوں مجبور ہیں۔ ہم خود اپنے آپ میں اس چھوٹے سے ملک کے سامنے کھڑے ہونے کی صلاحیت کیوں نہیں پیدا کرتے۔ ہماری اس تباہی، ناکامی اور مایوسی کی وجہ کیا ہے؟ کسی کو تو اس ناکامی کی وجہ بھی دریافت کرنی چاہیے۔ اکثر لوگوں کی رائے کے مطابق ہماری ذلت کی وجہ اسلام سے دوری ہے لیکن یہ سوچ بھی درست نظر نہیں آتی کیونکہ دنیا میں تقابلی لحاظ سے مسلمانوں میں مذہبی آگاہی، عبادت گاہیں، علماء کرام، اسلامی مدارس اور حفاظ کی تعداد باقی تمام مذاہب سے کہیں زیادہ ہے۔ ہماری مساجد بھی پوری طرح آباد ہیں۔ تہواروں کے مواقع پر تو مساجد میں نماز پڑھنے بلکہ کھڑا ہونے تک کی جگہ نہیں ملتی۔ لوگ سڑکوں پر نمازیں ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہر گلی محلہ میں ہر دوسرا یا تیسرا گھر مدرسہ بنا ہوا ہے۔ ہر مدرسہ ہزاروں کی تعداد میں حفاظ اور حافظات تیار کر رہا ہے۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم میں بھی ماہر ہیں۔ علماء کی تعداد بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہے لیکن پھر بھی مسلمان دنیا کی کسی طاقت کے سامنے کھڑے ہونے کی سکت سے محروم ہیں۔ آخر کیوں؟

انگلینڈ میں مجھ سے ایک دفعہ ایک غیر مسلم نے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا: ”تمہارے کروڑوں علماء اور حفاظ مل کر اسرائیل کو ختم کیوں نہیں کر دیتے“؟ میرے خیال میں اس کے طنز میں کافی وزن ہے کیونکہ جہاں کہیں اسلام کی بات ہوتی ہے ہم بہت زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں اور جذبات کی رو میں بہہ کر کچھ ٹھوس حقائق بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے مذہب اور عبادات کو صرف آخرت کی بخشش سے جوڑ کر اسے مساجد تک محدود کر دیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود فرمایا ہے کہ: ”اور دنیا میں سے اپنا حصہ فراموش نہ کرو“ (سورۃ القصص:77)

اسلامی تعلیمی نظام سے سائنس اور سائنسی تحقیق کو مکمل طور پر خارج کر دیا گیا ہے اور عدم برداشت کا کلچر پروان چڑھایا ہے۔ بعض اوقات تو سائنسی ایجادات اور سائنسی خیالات کو بھی کچھ علماء کرام حرام یا ابلیسی سوچ قرار دیتے ہیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں سائنسی تحقیقات اور سائنسی تعلیم کی سوچ ہی فروغ نہیں پا سکی۔ نتیجتاً قرآن، فقہ، احادیث اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے باوجود مسلمان دنیا کی طاغوتی طاقتوں کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے؟ اور تو اور ہم ان چند لاکھ یہودیوں کو بھی شکست نہیں دے سکتے۔

معذرت سے عرض گزار ہوں کہ میں ایک گنہگار انسان ہوں۔ اسلامی علم پر بھی دسترس نہیں رکھتا۔ میری محدود سوچ کے مطابق نماز، روزہ، تلاوت یا دیگر اسلامی عبادات جن کی تعلیم ہمارے مدارس میں دی جاتی ہے محض اسلام کا ایک پہلو ہے لیکن اسلام کا اصل پہلو جو ہمیں اس دنیا میں عزت و سرفرازی عطا کرتا ہے۔ جس نے بڑی بڑی سلطنتوں کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ جس کی پیغمبر اسلام نے خود بھی پیروی کی اور اپنے پیروکاروں کو بھی عمل کرنے کا حکم دیا۔ وہ اصول ہماری اسلامی تعلیم میں شامل نہیں۔ آئیں ذرا ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضور کریمؐ ایک عملی سولجر اور بہترین جرنیل تھے۔ وہ خود جنگوں میں شریک ہوتے اور اپنے پیروکاروں کی بھی رہنمائی فرماتے۔ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران حضور کریمؐ نے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر 35 جنگوں میں شرکت یا راہنمائی فرمائی اور کوئی جنگ نہ ہاری۔ یعنی مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ہر سال اوسطاً 3.5 جنگیں

لڑیں۔ اس طرح حضور کریمؐ نے ہر تین ماہ بعد جنگ لڑی اور وہ بھی اپنے سے کئی گنا بڑے دشمنوں کے ساتھ۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کبھی بھی کوئی جنگ تیاری کے بغیر نہیں لڑی جاسکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ جنابؐ نے نہ صرف جنگوں کی مکمل تیاری کی بلکہ جنگوں کے لئے مطلوبہ جنگی ہتھیار بھی حاصل کئے۔ ان کے قریبی صحابہ کرام حضورؐ کے ساتھ اور حضورؐ کے بغیر بھی اسلامی جنگوں میں شریک ہوئے اور سب سے آگے ہو کر لڑے۔ کچھ صحابہ کرام دنیا کے بہترین جرنیل ثابت ہوئے۔ حضور کریمؐ نے بار بار مسلمانوں کو تاکید کی کہ: ''جنگ کے لئے ہر وقت اپنے گھوڑے تیار رکھو یہاں تک کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے دشمنوں کے دل دہلا دو'' (سورۃ انفال۔۶۰) جس کی مثال حضور کریمؐ کی اپنی ذات مبارکہ تھی۔ سورۃ الحدید 25 میں مزید فرمایا: ''اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے'' آخر ہم اس لوہے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے جبکہ غیر مسلم اٹھا رہے ہیں۔ قرآن کریم مسلمانوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ ایک عملی کتاب ہے اور اس پر عمل کرنے میں ہی ہماری نجات ہے لیکن ہم نے اسے سمجھنے اور عمل کرنے کی بجائے اسے حفظ کرنے میں ہی تمام مسائل سے نجات کا حل ڈھونڈ لیا۔ اپنے اس رویّے پر ایک ہندو شاعر شنکر دیا شرما کے خیالات ملاحظہ فرمائیں اور اپنے رویّے پر غور کریں:

عمل کی کتاب تھی، دعا کی کتاب بنا دیا
سمجھنے کی کتاب تھی، پڑھنے کی کتاب بنا دیا
زندوں کا دستور تھا، مُردوں کا منشور بنا دیا
علم کی کتاب تھی، اسے لاعلموں کے ہاتھ تھما دیا
تسخیر کائنات کا درس دیتی تھی، مُردوں کا نصاب بنا دیا
مُردہ قوموں کو زندہ کرنے کی کتاب تھی
مُردوں کو بخشوانے پر لگا دیا
ارے مسلمانو! یہ تم نے کیا کیا؟

اس سے بڑا سبق بھلا مسلمانوں کے لئے کیا ہوگا کہ جب سردار دو عالمؐ اس دنیا سے روپوش ہوئے تو جنابؐ کے کپڑوں پر پیوند لگے تھے اور جوتے پھٹے ہوئے تھے لیکن گھر کی دیوار پر نو تلواریں لٹک رہی تھیں۔ مدینہ منورہ اور گرد و نواح میں رہنے والے تمام امیر اور طاقتور یہودی قبائل شکست کھا کر مسلمان ہو چکے تھے یا علاقہ چھوڑ چکے تھے اور یہ شکست آج تک یہودی نہیں بھول پائے۔ اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میئر نے 1973 کی جنگ میں اپنی اسمبلی میں یہی مثال پیش کر کے قوم کو تیار کیا اور جنگ جیتی۔ اس سے دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اول: جنگ کے لئے مسلسل تیاری اور دوم: بہترین ہتھیاروں کا حصول۔

دوسری بات جس پر حضور کریمؐ نے بہت زور دیا تھا وہ تھا حصول علم جو انہوں نے تمام مسلمان مرد و زن پر فرض کر دیا اور صرف اسلامی تعلیم ہی نہیں بلکہ دنیاوی تعلیم بھی فرض قرار دی گئی جس کے حصول کے لئے چین تک جانے کی ہدایت فرمائی اور ظاہر ہے چین میں اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا حکم تو نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حضورؐ نے مسلسل تحقیق یعنی چاند ستاروں تک کو سمجھنے کا حکم دیا۔ معزز قارئین! یہی وہ اصول ہیں جنہیں ہم نے بھلا دیا اور اسرائیل (یہودیوں) نے اپنا لیا۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر ہمارے اسلامی مدارس میں قطعاً توجہ نہیں دی جاتی۔ باقی سب عبادات اپنی جگہ مستحسن ہیں لیکن میری نظر میں ان کا فائدہ للہ سے زیادہ ذات کو ہوتا ہے۔ صرف آخرت کی بخشش ہی نہیں ہمیں اس دنیا میں بھی عزت و احترام سے زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ایک سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی نے ٹھیک کہا تھا: ''مجھے بے شک آخرت میں 60 حوریں نہ دیں لیکن مجھے اس دنیا میں تو باعزت طور پر زندہ رہنے دیں''۔ قرآن کریم کی ہدایات اور حضور کریمؐ کی عملی زندگی پر عمل کرنے

سے ذات کے ساتھ ساتھ ملت کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ آئیں تجزیہ کرتے ہیں کہ اسرائیل نے ان اصولوں پر کس طرح سو فیصد عمل کر کے مسلمانوں کو بے بس کر دیا۔

آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے تک موجودہ اسرائیل اور فلسطین کے علاقے میں "اسرائیل اور جودا" نام سے دو طاقتور یہودی سلطنتیں قائم تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام انہی سلطنتوں پر حکمران رہے۔ یہ سلطنتیں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئیں تو یہودی یہاں سے بھاگ کر جہاں کہیں پناہ ملی چلے گئے۔ یہ لوگ 2800 سال بے وطن ہو کر پوری دنیا [illegible] میں پھرتے رہے۔ ان دوران انہوں نے پوری دنیا کے علوم کا مطالعہ کیا اور علم و فن خصوصاً تحقیق و ایجادات میں خصوصی کمال حاصل کیا لیکن ان کا اصل مقصد حضور کریمؐ کی زندگی کا مطالعہ تھا جس نے بے سرو سامانی کے باوجود اس وقت کے طاقتور یہودی امراء کو شکست دی۔ حضورؐ کریم کی زندگی اور ترقی یافتہ دنیا کا بغور مطالعہ کیا تو دو اصول اپنائے۔ اول فوجی طاقت اور دوم حصول علم خصوصاً سائنسی تحقیق۔ انہیں شدت سے احساس ہوا کہ اگر ان کے بازو میں طاقت ہوتی۔ اگر وہ اہل تلوار رہتے تو یوں انہیں وطن نہ چھوڑنا پڑتا۔ دوسرا مسلمانوں کے پیغمبر کے فرمان کے مطابق علم ہی وہ طاقت ہے جس سے وہ اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کر سکتے تھے۔

انیسویں صدی کے شروع میں انہیں اپنا ایک علیحدہ وطن قائم کرنے کا احساس ہوا۔ نظریں موجودہ اسرائیل کے علاقے پر جا ٹھہریں جو اس وقت فلسطین تھا۔ لہٰذا کچھ یہودی ہجرت کر کے فلسطین آئے اور فلسطینیوں سے زمینیں خرید کر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔ جو زمینیں ان لوگوں نے خریدیں وہ بنجر اور غیر آباد تھیں جنہیں آباد کرنے کے لئے 1870 میں مکوہ جیوئش ایگریکلچر سکول قائم کیا گیا جس نے یہودیوں کی زرعی ترقی میں اہم

کردار ادا کیا۔ ڈرپ اریگیشن سسٹم ایجاد کیا اور زمینیں آباد ہونا شروع ہو گئیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی خوشحالی دیکھ کر مختلف ممالک سے مزید یہودی بھی آنا شروع ہو گئے۔ 1912 میں ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ قائم کیا جو اسرائیل کے مشہور Technion انسٹیٹیوٹ کی بنیاد بنا۔ 1925 میں ہبرو HEBREW یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس دوران یہودیوں کے خلاف پوری دنیا میں نفرت کی تحریک چلی تو یہ لوگ چھپ چھپ کر اسرائیل آ گئے اور وقت کے ساتھ ساتھ مختلف تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لئے ایک پرائیویٹ گارڈ تیار کی جسے ''ہگانہ'' کا نام دیا گیا۔

14 مئی 1948 کو جب اسرائیل آزاد ہوا تو اسرائیل کے پہلے وزیراعظم بن گورین نے سب سے پہلا حکم ایک مضبوط فوج قائم کرنے کا دیا اور ''ہگانہ'' نئی اسرائیلی آرمی کی بنیاد بنی۔ دوسرا حکم یہ دیا کہ بیرونی دنیا سے ہتھیار خرید کر آزادی قائم نہیں رکھی جا سکتی لہٰذا جدید ہتھیاروں میں خود کفالت حاصل کرنا عظیم مقصد ٹھہرا۔ اس مقصد کے لئے Rafael Advanced Defence System کی بنیاد رکھی گئی جس کا موجودہ بجٹ تقریباً 2 بلین ڈالرز ہے اور اس کی ایکسپورٹ تقریباً 180 ملین ڈالرز ہے۔ اسرائیل تمام جنگی ہتھیاروں میں خود کفیل ہے اور اسرائیلی جنگی ہتھیار پوری دنیا میں سب سے زیادہ معیاری اور قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ امریکہ اور بہت سے مغربی ممالک بھی اپنے سیکورٹی مقاصد کے لئے بہت سے اسرائیلی ہتھیار درآمد کرتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں بھارت نے بھی اسرائیل سے تین بلین ڈالرز کے ہتھیار خریدے۔ اس وقت اسرائیل پوری دنیا میں اپنے GDP کا سب سے بڑا حصہ (دس فیصد) سائنسی ریسرچ اور ڈیولپمنٹ پر خرچ کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی تیکنیکی ماہرین کی ٹیم (ٹیکنیشن، سائنسدان اور انجینئرز) اسرائیل ہی کی ہے۔ ہر دس ہزار افراد کے لئے 140 تیکنیکی ماہرین موجود ہیں جبکہ امریکہ میں یہ تعداد 85 اور جاپان میں 83 ماہرین ہیں۔ اسرائیل ٹیکنیکل مین پاور کے لحاظ سے دنیا میں نمبر ون ہے۔ اس وقت تقریباً 78 سائنسی تحقیقاتی ادارے کام کر رہے ہیں جن میں 13 ادارے صرف دفاع کے لئے مخصوص ہیں۔ اسرائیل کی چھ یونیورسٹیاں دنیا کی سو اہم یونیورسٹیوں میں شامل ہیں۔ لٹریسی ریٹ 99.5 فیصد ہے۔ اسرائیل دنیا میں دوسرا بڑا تعلیم یافتہ ملک ہے اور سائنسی ترقی کے لحاظ سے دنیا کا چوتھا اہم ملک ہے۔ اسرائیل پوری دنیا کی اہم تحقیقات اور اہم ایجادات پر مسلسل نظر رکھتا ہے۔ یونیورسٹیوں سے منسلک بیس اہم تحقیقاتی ادارے بیس مختلف ممالک کی سائنسی ترقی اور ایجادات پر نظر رکھتے ہے جن میں تمام اہم ممالک شامل ہیں۔ مسلمان ممالک سے ایران کی قم یونیورسٹیاں اور پاکستانی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔

1,05,000 طلباء اس وقت مختلف لیولز پر ریسرچ میں مشغول ہیں۔ دنیا کی 50 اہم ملٹی نیشنل کمپنیوں اور کئی اہم یونیورسٹیوں کے کیمپس بھی موجود ہیں۔ دنیا کی 64 ٹاپ کلاس ایجادات اسرائیل کی ملکیت ہیں۔ اسرائیل کی برآمدات 20 بلین ڈالرز سے زیادہ ہیں جس میں زیادہ تر برآمدات انڈسٹریل پراڈکٹس بمعہ الیکٹرانک سامان اور جنگی ہتھیار ہیں۔ اسرائیلی ساختہ ایجادات زندگی کے ہر شعبے میں ٹاپ کلاس مانی جاتیں ہیں۔ اس وقت 1800 ہائی ٹیک انڈسٹریز کام کر رہی ہیں۔ دو سو پچاس ملین ڈالرز سالانہ صرف ریسرچ پر خرچ ہو رہے ہیں۔ مقامی پروجیکٹس کے علاوہ 2000 ریسرچ پروجیکٹس بین الاقوامی کمپنیوں کی مدد سے مکمل کئے جا رہے ہیں۔ سائنسی تحقیق کی وجہ سے اسرائیل کے پاس ایک درجن نوبل انعام یافتہ افراد موجود ہیں جبکہ

پوری یہودی دنیا جس کی کل تعداد 1,37,000 ہے کے پاس 110 سے زائد نوبل انعامات ہیں اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ پوری مسلم لتہ میں کل 10 افراد کو نوبل انعام ملا جن میں 6 افراد کو امن کی کوششوں کی وجہ سے یہ انعام ملا۔ سائنسی تحقیق میں شاید ایک ہی انعام ہے اور وہ تھے مرحوم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب جنہیں ہم پاکستانی قبول بھی نہیں کرتے۔

اسرائیل کا تمام زیرزمین پانی استعمال کے قابل نہیں لہٰذا اسرائیلیوں نے اپنی ٹیکنالوجی کی مدد سے سمندری پانی قابل استعمال بنا کر زراعت اور روزمرہ استعمال میں لے آئے۔ بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کے لئے جنوبی افریقہ تک سے سمندری جہاز مٹی سے بھر کر لائے گئے جن سے بنجر زمینیں سونا اگلنے لگیں۔ اس وقت کھجور اور مالٹے اسرائیل کی پہچان ہیں۔ اسرائیلیوں کو اپنی ان پروڈکٹس پر اتنا ناز ہے کہ اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان اپنے دور حکومت میں سرکاری مہمانوں کی تواضع تازہ مالٹوں کے رس سے کیا کرتا تھا۔ کوک اور پیپسی ڈرنک کی مثال ہی لے لیں۔ دونوں کمپنیاں یہودیوں کی ملکیت ہیں اور شرم کی بات یہ ہے کہ ان دونوں ڈرنکس کی سب سے زیادہ فروخت مسلمان ممالک میں ہوتی ہے۔ ہماری کوئی پارٹی، لنچ، ڈنر ان ڈرنکس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہو پاتا۔ PEPSI کا تو مطلب ہی Pay Every Penny For Safety Of Israel ہے۔

اسرائیلیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ: Desert Oasis into Technolgical Oasis They have turned اور ان حالات میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیوں کوئی اسرائیل کی مذمت نہیں کرتا۔ اسرائیل ایک معاشی اور فوجی طاقت ہے۔ اس لئے کوئی مسلمان مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ پھر بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی پوری دنیا کے 80 فیصد سونے پر یہودی قابض ہیں دنیا کے تمام بڑے بینکس، بزنس اور الیکٹرانک انڈسٹری وغیرہ بھی یہودیوں ہی کے دائرہ اختیار میں ہے۔ تمام دنیا کے بینکس یہودی بینکس ہی ریگولیٹ کرتے ہیں۔ پوری دنیا کا تعلیمی نظام اور اہم یونیورسٹیوں کی تعلیم پر بھی قابض ہیں۔ IMF اور ورلڈ بنک بھی انہی کے کنٹرول میں ہیں۔

اب آئیں مسلم لتہ کی طرف۔ 57 ممالک اور 1.5 ارب آبادی ہے لیکن کسی مسلمان ملک میں کوئی قابل ذکر سائنسی تحقیقاتی ادارہ موجود نہیں جو بین الاقوامی طور پر اپنی پہچان رکھتا ہو۔ کوئی بھی ملک عسکری یا معاشی طور پر بھی خودکفیل نہیں۔ فلسطین کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ آج بھی گدھا ریڑھی پر سفر کرتے ہیں۔ اردگرد کے عرب ممالک کو اپنی عیاشیوں سے ہی فرصت نہیں کہ وہ فوجی طاقت بننے کے انداز میں سوچیں۔ اپنی حالت ہی دیکھ لیں کہ دعویٰ ایٹمی طاقت ہونے کا ہے لیکن سوئی اور پیپر پن تک چین سے منگواتے ہیں۔ زرعی ملک ہیں لیکن خوراک باہر سے منگواتے ہیں۔ GDP کا صرف 2 فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ ریسرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ معمولی چھوٹے ہتھیاروں کے سوا تمام اہم جنگی ہتھیار باہر سے لیتے ہیں۔ عالم اسلام کو سمجھنا چاہیے کہ کمزور اور بزدل اقوام کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ظالم کا ہاتھ صرف طاقتور روک سکتا ہے اور یہ طاقت اس وقت پوری مسلم لتہ میں موجود نہیں ہے۔ یہاں یہ امر بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا میں کبھی کوئی مظلوم کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا۔ انسانی حقوق یا انسانی اصول سب فضول ڈھکوسلے ہیں اور حیران کن بات ہے کہ ان کی پشت پر بھی یہودی ہی ہیں۔ ہم جتنے مرضی آئے جلوس نکال لیں۔ تقریریں کر لیں۔ سینہ کوبی کر لیں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگے گی۔ یہاں یہ امر بھی قارئین کے لئے باعث حیرانگی ہو کہ یہودیوں نے جو عالمی حکومت جسے وہ Super

Govt of the World by Jews قرار دیتے ہیں قائم کر چکے ہیں۔ اگر کسی کو بھی شک ہو تو انٹرنیٹ پر The Protocols Of The Learned Elders Of Zion پڑھ لیں۔

یہودی منصوبے کے مطابق موجودہ دور میں مسلم امہ کو قابو میں رکھنے کے لئے پانچ اصول اپنائے گئے ہیں۔ اول: مسلمانوں میں ایسے علماء داخل کئے جائیں جو فرقہ واریت اور عدم برداشت کے کلچر کو ہوا دیں اور یہ لوگ آپس میں ہی لڑ کر مریں۔ دوم: اسلام کے نام پر ایسے جہادی گروپس پیدا کئے جائیں جو غیر مذاہب کی بجائے مسلمانوں کو ختم کریں (داعش، آئی ایس آئی ایس، طالبان اور القاعدہ وغیرہ شاید اسی منصوبے کا نتیجہ ہے)۔ سوم: اسلامی ممالک میں اتنے زیادہ اسلامی مدارس بنا دیئے جائیں جہاں علماء مسلمانوں کو صرف آخرت کی بخشش کی طرف راغب رکھیں تاکہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف سوچیں ہی نہیں اور نہ ہی ان کی انڈسٹری ترقی کرے۔ چہارم: مسلمان ممالک کو IMF اور ورلڈ بنک کے ذریعے ہمیشہ مقروض رکھا جائے اور پنجم: مسلمان حکمرانوں کو کرپٹ، بدکردار اور عیاش بنایا جائے تاکہ ان کی دولت یہودی بینکوں میں جمع رہے اور عیاشی کے لئے ہمیشہ اہل مغرب (یہودیوں) کے محتاج رہیں۔ اس منصوبے کو سامنے رکھ کر مسلمان اپنی ترقی اور آزادی کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ان حقائق کے مدِنظر عالمی ضمیر یا عالمی انصاف کی بات کرنا بے وقوفی کے علاوہ کچھ نہیں۔ کشمیر ہو، فلسطین ہو، بوسنیا ہو یا کوئی اور مسلم ملک دنیا کی کوئی بڑی طاقت انصاف پسندی کی بنیاد پر ہماری مدد کو نہ آتی ہے اور نہ آئے گی۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون سا مسلم ملک اسرائیلی سائنسی ترقی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسرائیل، چین ... یا ہم سے بعد میں آزاد ہوئے لیکن آج وہ معاشی اور عسکری طاقتیں ہیں اور ہم آج بھی بھکاری ہیں۔ حضورؐ کریم نے خود ہی تو فرمایا تھا: ''کیا جاہل اور باعلم ایک جیسے ہو سکتے ہیں'' (الزمر، 9)۔ یاد رہے کہ ہمارا لٹریسی ریٹ محض 54 فیصد ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسرائیل نے جو کچھ حاصل کیا اپنی عقل، محنت اور زور بازو سے کیا اور یوں گدا سے بادشاہ بن گئے۔ مسلمانوں نے جو کچھ کھویا اپنی نااہلی، کاہلی اور ترکِ جہاد سے کھویا۔ حضورؐ کی عملی زندگی سے دوری کی وجہ سے کھویا اور یوں بادشاہت سے گداگری پر آ گئے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ تمام عرب ممالک کے بیشتر امراء اور حکمران طبقہ کی بیگمات یہودی یا عیسائی ہیں۔ مشہور فلسطینی لیڈر جناب یاسر عرفات کی زوجہ محترمہ کا تعلق بھی عیسائیت سے تھا جس نے سلو پوائزنگ سے مسلم امّہ کو اس عظیم راہنما سے محروم کر دیا۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے تقریباً تمام مغل شہنشاہوں نے بھی ہندو خواتین ہی سے شادیاں کی تھیں اور انجام ہمارے سامنے ہے۔

میں اسرائیل کی وحشیانہ بربریت کی پُرزور الفاظ میں مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے کہیں زیادہ پُرزور الفاظ میں اپنی جہالت اور نااہلی کی مذمت کرتا ہوں۔ جس دن ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا لیا اہل سیف ہو گئے۔ حضورِ کریمؐ کی عملی زندگی پر عمل کرنا شروع کر دیا اس دن کشمیر بھی آزاد ہو جائے گا اور فلسطین بھی۔ ورنہ امن اور انصاف کی بھیک مانگنا اور انسانی حقوق سے انصاف کی توقع رکھنا ہماری نااہلی کا دوسرا رخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود فرمایا: ''انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے'' (النجم۔۳۹)۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

قسط: 6

محمد افضل رحمانی

داستان ایک عامل کی

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میرا دل چاہا یہاں سے بھاگ جاؤں
لیکن کسی نادیدہ طاقت نے مجھے جکڑ لیا تھا میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی کہ وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں۔ میں نے تمام کمروں میں جھانکا حتیٰ کہ مزار کے اندر بھی گیا لیکن ان کا سراغ نہ مل سکا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ رکھا مجھے دور سے آتا دکھائی دیا لیکن وہ اکیلا ہی تھا سہتی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جب وہ خانقاہ میں داخل ہوا تو میں نے اس سے پوچھا رکھے تُو کہاں چلا گیا تھا اور سہتی کدھر ہے؟

''قریبی گاؤں میں ایک آدمی کو سانپ نے ڈس لیا تھا''۔ رکھے نے بتایا۔ ''وہ میرے پاس آئے اُن کی بات سن کر مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ جانا پڑا لیکن سہتی تو یہیں تھی دیکھ کہیں قضائے حاجت کے لئے کسی کھیت میں گئی ہو گی''۔

''نہیں رکھے مجھے آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے''۔ میں نے کہا۔ ''اور میں تمام کمروں حتیٰ کہ مزار کے اندر تک کی تلاشی لے چکا ہوں لیکن وہ مجھے کہیں سے نہیں ملی''۔

رکھا بھی پریشان ہو گیا آخر رات ہو گئی لیکن سہتی واپس نہ آئی۔ اگلے دن بالو کنجری ایک آدمی کے ہمراہ خانقاہ پر آئی اور کہنے لگی سرکار میں سہتی سے ملنے آئی ہوں ذرا ملا دیجئے میرا دل اس سے اداس ہو گیا تھا، میں اسے لینے کے لئے نہیں آئی۔ مہینہ پورا ہونے سے پہلے وہ آپ کے پاس ہی رہے گی۔ رکھے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بالو کنجری جہاندیدہ عورت تھی کہنے لگی سرکار آپ گھبرائیں نہیں میں نے کہہ دیا ناں کہ میں اسے واپس لینے نہیں آئی صرف ملنے کے لئے آئی ہوں۔ ظاہر ہے اس بات کو زیادہ دیر چھپایا نہیں جا سکتا تھا آخر رکھے نے سچی بات کہہ دی۔ بالو کنجری بندریا کی طرح کود کر کہنے لگی میں جانتی ہوں میری بیٹی کو تم لوگوں نے فروخت کر کے بڑی رقم حاصل کر لی ہے۔

''دیکھ بالو!'' رکھے نے کہا۔ ''ہم اللہ لوک ایسا دھوکہ نہیں کر سکتے میں نے جو بات تمہیں بتائی ہے اس پر یقین کر لے''۔

''تم اللہ لوک ایک کنجری کے ساتھ رات گزار سکتے ہو تو ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟'' بالو کنجری نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تھانے میں رپٹ درج کراتی ہوں تم بہت جلد سب کچھ اُگل دو گے''۔ تھانے کا نام سن کر رکھے کی ٹانگیں جواب دے گئیں لیکن وہ ایک جادوگر اور خرانٹ شخص تھا وہ پہلے ہی اس شک میں مبتلا تھا کہ یہ سب بالو کنجری نے کیا ہو گا وہ غصے میں آ گیا اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا تو ایک سفید رنگ کا بہت بڑا اژدھا تیزی سے خانقاہ میں داخل ہوا اور بالو کنجری کے سامنے پھن پھیلا کر زمین سے دو تین فٹ بلند ہو گیا اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے بالو کنجری بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی جبکہ اس کے ساتھ والا آدمی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ ذرا دیر بعد اژدھا غائب ہو گیا۔ بالو کنجری کو جب ہوش آیا تو وہ چیختی ہوئی رکھے کے قدموں میں گر پڑی۔

''سرکار! مجھے معاف کر دیا جائے سہتی میرے پاس ہے میں نے کل ایک آدمی کو بھیج کر آپ کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پاس بلا لیا تھا پرسوں بھی وہ آدمی آیا تھا لیکن اس دن اسے موقع نہ مل سکا''۔

''نہیں بالو ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے ہم تمہیں وہ سزا دیں گے کہ تُو ساری زندگی یاد رکھے گی۔

''نہیں سرکار!'' بالو رکھے کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''ٹھیک ہے بالو لیکن ہم تمہیں دھوکہ دہی اور چوری کے الزام میں حوالہ پولیس کریں گے''۔

''ناں سرکار! صرف ایک دفعہ معاف کر دیں ساری زندگی آپ کی لونڈی بن کر گزاروں گی''۔

''اچھا ٹھیک ہے ہم ایک شرط پر تمہیں معاف سکتے ہیں''۔ رکھے نے مکاری سے کہا۔ ''آج رات ادھر

ہماری ٹہل سیوا کرواور صبح سہتی کو واپس لے کر آؤ ہم اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں کہ ایک ماہ بعد ہم اُسے تمہارے حوالے کر دیں گے''۔

''ٹھیک ہے سرکار! جیسا آپ کا حکم''۔ رات رکھے نے بالو کو اپنے حجرے میں رکھا۔ میں رکھے کی پیشکش کے باوجود اس کے قریب بھی نہ گیا مجھے اس سے اتنی نفرت اور کراہت ہوگئی تھی کہ اس کا خیال آتے ہی مجھے گھن سی آنے لگتی تھی۔ رکھا اس گندی اور ناپاک عورت کے قرب کی وجہ سے جلد ہی نار فارسی (بادفرنگ) میں مبتلا ہو گیا کئی ماہ تک وہ اس موذی مرض میں مبتلا رہا اس نے کئی مسہل لئے اور مختلف دھوڑے اور مرہمیں بنائیں اور پھر کہیں جا کر اس کے کچھ زخم مندمل ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد بیماری دوبارہ نمودار ہو جاتی ساری ساری رات درد کی ٹیسوں سے تڑپتا اور بلکتا رہتا۔

جو آدمی بھی محتاط زندگی نہیں گزارتا اور صرف اپنی عورت تک محدود نہیں رہتا وہ اس بیماری کا ضرور شکار ہو کر رہتا ہے۔ خاص کر ان عورتوں کی قربت جو کسبی اور زناکارہ ہوتی ہیں۔ ایسی عورتیں چلتی پھرتی ناگنیں ہوتی ہیں وہ ظاہری طور پر جتنی خوبصورت نظر آتی ہیں اندر سے اتنی ہی زہریلی اور ناپاک ہوتی ہیں۔ ان میں کوبرا سانپ سے بھی سخت زہر ہوتا ہے بلکہ سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں کیونکہ سانپ کا ڈسا تو مر گیا جان چھوٹی لیکن ایسی عورتوں کا ڈسا قسطوں میں مرتا ہے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس کی سب سے بڑی تمنا صرف اور صرف موت ہوتی ہے۔ خدائی قانون سے بغاوت کوئی مذاق نہیں ہے وہ استدراجاً پکڑتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔

بالو کنجری کو شعبدہ دکھا کر رکھے نے ایک بار پھر قابو کر لیا تھا۔ صبح بالو کو سامنے بٹھا کر کہنے لگا۔ بالو اِدھر دیکھ جب بالو نے رکھے کی طرف دیکھا تو رکھے نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا لیکن جلد ہی اس سے نظریں ہٹا لیتا اس نے کئی بار اس کے ساتھ ایسا کیا بالو کے دماغ کی چولیں ہل گئیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر رکھے کے قدموں پر گر پڑی سرکار مجھے معاف کر دیا جائے میں آپ کی نوکر اور زرخرید غلام ہوں اور پھر وہ چلی گئی۔ اگلے دن سہتی کو ایک آدمی ہماری خانقاہ میں چھوڑ گیا۔ رکھا اپنی طبیعت کو سمجھ چکا تھا اس نے مجھے اسی دن بتا دیا تھا کہ نذیر بالو کنجری عورت نہیں زہریلی ناگن ہے تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے لیکن اب میں سہتی کے قریب بھی نہیں جاؤں گا ورنہ وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جائے گی اور اگر تم اس کے قریب گئے تو تم بھی اس بیماری کے مریض ہو سکتے ہو۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ تم اس بیماری میں مبتلا ہو جاؤ۔ سہتی صرف تمہارے لئے ہو گی۔

انقلاب

میں دن رات سہتی کے ساتھ رہنے لگا۔ سہتی نے مجھے اپنی دنیا کے واقعات سنائے تو میں حیران رہ گیا۔ میرے خیال میں اس سے بے غیرت اور دیوث شخص پیدا ہی نہیں ہوا جو ان کنجریوں، رنڈیوں کے پاس جاتا اور اپنی خاندانی شرافت و نجابت کو ان گندی اور ناپاک نالیوں میں پھینک کر چلا آتا ہے۔ وہ انہی نوابوں اور شریفوں کے خون کو اپنی ناپاک کوکھ میں سے جنم دے کر انہیں پالتی پوستی اور برائی و بے حیائی کے راستے پر چلاتی ہیں۔ کنجروں کا تو یہ پیشہ ہے لیکن انہیں خام مال مہیا کرنے والے یہی عیاش لوگ ہوتے ہیں۔

کنجروں کے بارے میں وارث شاہ نے کیا خوب کہا ہے:

کنجر ہوئی جو غیرتوں باجھ ہووے جویں بھابڑا بن اشنان ہووے

وارث کے خیال کے مطابق جس میں غیرت ہے وہ کنجر نہیں اور جو کنجر ہے اس میں غیرت نہیں ہو سکتی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

دل، مال دیئے لکھ کنجری نوں دلوں
او محبوب نہ تھیندیاں نی
اک دن پکڑیاں جان گیاں حاکماں تے
پرائی سیج جو نت چڑھیندیاں نی

یعنی کنجری کو دل، مال بے شک دے دیویں لیکن وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتی ایک دن آئے گا جب خدا کے حضور پیش ہوں گی اور پھر پکڑی جائیں گی عذاب میں۔

مہینہ پورا ہونے پر بالو کا آدمی آیا اور سہتی کو لے گیا۔ رکھے نے جاتی دفعہ اُسے کافی رقم دی جو اس نے ایک شان بے نیازی سے لے لی۔ (یہاں پر میں نے نذیر کے کافی واقعات جو اس نے سہتی سے سنے تھے حذف کر دیئے ہیں کیونکہ وہ اس قدر گندے تھے کہ انہیں مناسب الفاظ میں ڈھالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ (راقم)

سہتی کے جانے کے بعد کئی دن تک میں پریشان سا رہا اس کے ساتھ میں نے پورا مہینہ بہترین وقت گزارا تھا۔ وہ تفریح کا بہترین ذریعہ بھی تھی میں اور رکھا فارغ وقت میں اس کے ڈانس اور گانے سے بھی محظوظ ہوا کرتے تھے۔ بالو کنجری نے چالاک بننے کی کوشش کی تھی لیکن رکھے جیسے خرانٹ آدمی نے اسے چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ وہ رکھے کے کرتوتوں سے سمجھ چکی تھی کہ رکھا اولیائی کے لبادے میں سودائی ہے۔ لہٰذا سہتی کی گمشدگی کے بہانے رکھے سے مزید دولت سمیٹی جائے لیکن رکھے نے شعبدہ بازیوں سے اسے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس دفعہ رکھے نے بالو کو زر خرید غلام بنا لیا تھا اور اب بالو کی معرفت اعلیٰ سے اعلیٰ مال کسی بھی وقت میسر ہو جاتا تھا۔ (نذیر کی بے راہ روی اور شیطانی کرتوتوں کا ذکر بھی حذف کر رہا ہوں تاکہ ایڈیٹر صاحب قینچی چلانے کی مشقت سے بچ جائیں---راقم)

جمعرات کا دن، نیاز چڑھانے والی عورتوں کا جھرمٹ جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا تھا کہ دو ملازموں کے ہمراہ رابعہ گھوڑی سے اتری ایک ملازم گھوڑی کے پاس رہا اور دوسرے نے رابعہ کے بچے کو گود میں اٹھایا اور آگے آگے چلنے لگا۔ رابعہ اپنی مخصوص چال چلتی ہوئی خانقاہ میں داخل ہوئی اس کی ڈیل ڈول اور حرکات و سکنات سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی بڑے خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ میں نے دور سے ہی پہچان لیا تھا کہ رابعہ آ رہی ہے۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو ملازم سے بچہ لے کر خود اٹھا لیا اور ملازم کو حکم دیا کہ واپس گھوڑی کے پاس چلا جائے پھر میرے قریب آئی اور بچہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”نذیر! دیکھو تو بالکل تم پر گیا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے مجھے خاوند اور بھائی کی قربانی دینی پڑی ہے اگر ہماری طرح ہر کسی کو اپنے گناہوں کی شامت اسی دنیا میں بھگتنی پڑتی تو جتنی زیادتیاں انسان کرتا ہے پوری خدائی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ وہ ستار العیوب خدا اپنی حکمت بالغہ سے ہمارے اکثر گناہوں پر اپنی ستاری کی چادر پھیلا دیتا ہے ورنہ اس دنیا میں کئی نذیر اور رابعائیں موجود ہیں جو نظام خداوندی میں مداخلت کی مرتکب ہوتی ہیں لیکن وہ بردبار اور تحمل والا خدا انہیں ڈھیل بھی دیتا ہے اور دنیاوی نعمتوں سے محروم بھی نہیں کرتا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان سے کبھی بازپُرس ہو گی ہی نہیں۔ یہ لابدی امر ہے کہ ایک دن آئے گا جس دن رائی کے دانے کے برابر نیکی اور بدی اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی اور پھر اس دن وہ ذاتِ مقدس ستار سے غفار بن جائے گی۔ دنیا میں گناہوں پر پردہ ڈالتا رہا آخرت میں گناہوں کو معاف کر دے گا“۔

”رابعہ! تُو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”نذیر! میں میاں جی سے قرآن مجید کا روزانہ

درس لیتی ہوں"۔ اس نے کہا۔ "وہ مجھے ترجمہ اور تفسیر پڑھاتے ہیں"۔

"رابعہ! تُو ایسا کر کہیں نکاح کر لے"۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"۔ اس نے کہا۔

"لیکن تیرے بغیر کسی اور سے نکاح نہیں کروں گی اور خدا سے میری صرف یہی ایک دعا ہوتی ہے کہ اے اللہ اپنی بے شمار مخلوق میں سے ایک نذیر مجھے دے دے، تیری خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔

رابعہ کے الفاظ سن کر میرا سویا ہوا عشق دوبارہ جاگ پڑا، میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ چل حجرے میں چلتے ہیں۔

"حجرے میں جانے کا رب کوئی فائدہ نہیں کیا حجرے میں خدا موجود نہیں ہے؟" رابعہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "بس میں تمہیں آخری بار ملنے کے لئے آئی ہوں، آئندہ میری امید مت رکھنا اور اگر خدا نے میری دعا سن لی تو پھر تم سے محبوب مجھے دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے سالانہ میلے کا خرچ اٹھانے کا تم سے وعدہ کیا تھا بول کتنا خرچ آیا ہے؟"

"رابعہ! دیکھ خرچ سے کہیں زیادہ آمدنی ہوئی ہے"۔ میں نے اس سے کہا۔ "تیری نیت صاف اور پاک ہوتی ہے تُو اس رقم کو کسی صاف اور پاک جگہ پر خرچ کر دینا اپنی حلال کی کمائی کو یہاں ضائع نہ کر"۔

"ٹھیک ہے میں سب جان چکی ہوں لیکن مجھے صرف اپنے وعدے کا پاس تھا"۔ رابعہ نے کہا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں، اگر تُو برا محسوس نہ کرے تو ایک بات کہہ دوں"۔

"ضرور کہہ دو اس میں برا محسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"نذیر پلٹ آ، واپس آ جا"۔ اس نے التجا کی۔

"لیکن رابعہ مجھے اس راستے پر تُو نے ہی ڈالا ہے"۔

"ٹھیک ہے میں مانتی ہوں لیکن اب تو میری بات مان کر واپس آ جا"۔ رابعہ نے کہا۔ "کیا تم بھول گئے ہو کہ تمہاری ایک بیٹی بھی ہے"۔

"ٹھیک ہے رابعہ میں کوشش کروں گا"۔ میں نے کہا۔ اور پھر رابعہ واپس چلی گئی۔ قاری صاحب رابعہ جب مجھے پہلی دفعہ ملی تھی تو اس کی شخصیت مجھ پر چھا گئی تھی لیکن اس وقت اس میں اتنا رعب اور دبدبہ نہیں تھا یقیناً یہ اس کی نیت کی پاکیزگی کی وجہ سے تھا میں مبہوت و حیران کھڑا اسے واپس جاتے دیکھتا رہ گیا۔

ناقابلِ یقین

رابعہ کے ذہن میں جو انقلاب آیا بجائے اس کے کہ میں اس سے کوئی سبق حاصل کرتا الٹا میری حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ برائی کے مواقع اس قدر تھے کہ میرا اس گند سے نکلنا بہت ہی مشکل تھا۔ اُدھر رابعہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی اِدھر شیطان پھر مجھ پر غالب ہو گیا رابعہ کے انکار نے میری خواہش نفسانی کو ابھار دیا۔ میں رکھے کے پاس گیا اور اس کے کان میں کہا۔ رکھے ہے کوئی شکار؟

"کیوں کیا ہوا رابعہ! آئی ہوئی تھی میں تو سمجھا کہ تمہاری من پسند چیز تمہیں مل گئی ہے"۔ رکھے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں رکھے اس کی طرف سے تو بالکل جواب ہو گیا"۔

"وہ کیوں؟"

"بس رکھے! وہ کسی میاں جی کے جھانسے میں آ گئی ہے۔ دراصل یہ لوگ رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں"۔

''ہاں نذیر یہ خطرناک لوگ ہوتے ہیں خود کھیلتے نہیں کسی کو بھی کھیلنے نہیں دیتے''۔

''چل چھوڑ رکھے! جمعرات خالی تو نہیں گزرنی چاہئے روٹ اور مرغ سے پیٹ کی بھوک تو مرجاتی ہے لیکن دوسری بھوک میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے''۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تو اب کسی قابل نہیں رہا بالو کنجری نے مجھے ناکارہ کردیا ہے لیکن ہے وہ لاکھوں میں ایک''۔

''چھوڑ رکھے! وہ مکروہ عورت مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی''۔

''تجھے عورت کی ابھی تک صحیح پہچان نہیں آئی بتا اس میں کیا عیب ہے؟''

''وہ سرتاپا عیب ہی عیب ہے''۔ میں نے کہا۔

''کیا اس نے تجھے ایک خطرناک بیماری میں مبتلا نہیں کر دیا''۔

''یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے جو سکون اس سے ملا ہے آج تک کسی عورت سے نہیں ملا۔ بنو کے بعد بے شمار عورتوں سے واسطہ رہا ہے لیکن بالو میں جو چیز مجھے نظر آئی ہے وہ کسی میں نظر نہیں آئی''۔

''چھوڑ رکھے! مجھے بالو کے خیال کے ساتھ ہی متلی ہونے لگتی ہے تُو میرے سامنے اس کا ذکر نہ کیا کر''۔

''اچھا ٹھیک ہے مگر میں نے اپنے دل کی بات تجھے بتادی''۔ رکھے نے کہا۔ ''اچھا دیکھ ان عورتوں اور لڑکیوں میں سے تجھے کون پسند ہے؟''

میں نے غور سے عورتوں کے مجمع میں نظر دوڑائی مجھے ایک لڑکی جو ابھی جوانی کی سرحدوں میں داخل ہورہی تھی دل کو اچھی لگی میں نے اشارے سے رکھے کو بتادیا۔

''نذیر! اس لڑکی کو رہنے دے کوئی اور لڑکی دیکھ لے''۔

''نہیں رکھے! دل کے معاملات میں دخل اندازی نہ کر''۔

''دیکھ نذیر! یہ لڑکی سیّد زادی ہے''۔ رکھے نے کہا۔ ''اور اس کا باپ ایک بہت بڑا جادوگر تھا لیکن اب وہ فوت ہوچکا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں یہ لڑکی تجھے کوئی نقصان نہ پہنچادے''۔ میں زور سے ہنسا اور رکھے کو مذاق کرنے لگا کہ بھلا یہ لڑکی مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔

''ٹھیک ہے پھر تُو اپنی مرضی کرلے''۔ رکھے نے بے دلی سے کہا۔ اتنے میں وہ لڑکی میرے قریب آگئی۔

''بالک! ادھر دیکھ''۔ میں نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ غیر ارادی طور پر جب اس لڑکی نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے نظروں کے حصار میں لے لیا اور پچھلے قدموں اپنے حجرے کی طرف چلنے لگا وہ لڑکی میری طرف کھنچتی چلی آرہی تھی۔ حجرے میں پہنچ کر میں نے اس لڑکی کا بازو پکڑا تو یہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کا بازو اس کے جسم سے علیحدہ ہوکر میرے ہاتھ میں لٹک گیا۔ میں نے جلدی سے بازو کو چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی بازو زمین پر گر گیا لڑکی باہر کو جانے لگی میں نے حالت اضطرار میں اس کا دوسرا بازو پکڑا تو وہ بھی جسم سے علیحدہ ہوکر میرے ہاتھ میں آگیا لیکن لڑکی کے جسم سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سرایت کرگئی میں نے بازو کو زمین پر پھینکا اور باہر کو بھاگ نکلا اور بھاگتا ہوا رکھے کے پاس پہنچ گیا اور اسے ساری بات بتادی۔

زیادہ تر عورتیں نیاز چڑھا کر جاچکی تھیں اور قریبی گاؤں اور ڈیروں سے لوگ آنے شروع ہوگئے تھے جو نیاز میں آئے ہوئے روٹ بطور تبرک کھایا کرتے تھے۔ رکھا میرے ساتھ چل پڑا جب ہم حجرے کے دروازے پر آئے تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ لڑکی کی دونوں ٹانگیں بھی علیحدہ علیحدہ زمین پر پڑی تھیں اور پیٹ اور سینے کا ایک ٹکڑا علیحدہ پڑا ہوا تھا لڑکی کا جسم پانچ حصوں

میں تقسیم ہو گیا تھا۔

''نذیر! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں''۔ رکھے نے مجھے کہا۔ ''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ یہ لڑکی ایک جادوگر باپ کی بیٹی ہے لیکن تم نے میری بات نہ مانی اب دروازہ بند کر دو اور جلدی جلدی روٹ تقسیم کر کے لوگوں کو یہاں سے چلتا کرو پھر میں اس کا کوئی حل سوچتا ہوں''۔

جب سب لوگ چلے گئے تو رکھا اور میں واپس حجرے کے پاس آئے تو ہماری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ حجرہ خالی تھا اور لڑکی کے جسم کے ٹکڑوں کا نام ونشان بھی باقی نہیں تھا۔

''نذیر! میں نے تجھے منع بھی کیا تھا کہ اس لڑکی سے باز آ جا''۔ رکھے نے غصے سے کہا۔ ''لیکن تُو نے میری بات نہ مانی''۔

''رکھے! مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ آفت کی پرکالی اندر سے کیا ہے''۔

''نذیر! مجھے ایک خطرہ اور بھی ہے''۔

''وہ کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ جس طرح بالو کنجری نے مجھے ناکارہ بنا دیا ہے یہ لڑکی تمہیں بھی ناکارہ نہ کر دے''۔

''وہ کیسے؟''

''تمہیں پتہ چل جائے گا''۔ رکھے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر واقعی ایسے ہی ہوا میں قوتِ مردی سے بالکل محروم ہو چکا تھا بالو کنجری کا بھیجا ہوا تحفہ مجھے رکھے نے دے دیا لیکن بالکل بے حس ہو چکا تھا۔ میں ہیجڑے بھی بدتر ہو گیا تھا رکھے نے مجھے کئی نسخے استعمال کرائے لیکن مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ (دراصل اس لڑکی نے نذیر پر جادو کر دیا تھا بطور تائید ایک دو حوالے پیش کر دیتا ہوں ---راقم)

شیخ وحید عبدالسلام بالی کی تحقیق

اس قسم کے مسحور آدمی کی نشانی یہ ہے کہ وہ جماع پر قادر نہ ہو سکے اور اس کی کیفیت کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ جن انسان کے دماغ میں اس جگہ مورچہ بندی کر لیتا ہے جہاں سے جنسی نظام کو شہوانی ہدایات ملتی ہیں۔ جب انسان ایسا ارادہ کرتا ہے تو جن اس دماغی مرکز کو بے عمل کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ حالت مسحور زدہ عورت پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ یہ عمل اس لحاظ سے زیادہ خطرناک ہے کہ اس سے سحر زدہ شخص پاگل بھی ہو سکتا ہے اور یہ جادوگر کی اپنے فن سے جہالت کے نتیجے میں ہوتا ہے لہٰذا قارئین سے میری گذارش یہی ہوگی کہ کبھی بھی کسی جادوگر کے پاس نہ جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن میں پورا نہ ہو اور الٹا تمہیں خود نقصان پہنچ جائے۔

بندش والے جادو کا حتمی علاج

(1) جماع کرنے سے پہلے رسول اللہؐ کی بتائی ہوئی دعا ضرور پڑھ لیا کریں (یاد رکھیں کہ یہ دعا ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس کی قیمت ہمیں معلوم نہیں)۔

(2) مندرجہ ذیل قرآنی آیات پانی پر پڑھیں:
سورہ یونس کی آیت 81، 82۔ سورہ اعراف کی آیات 117 تا 112 اور سورہ طٰہٰ کی آیت 69۔ مریض دم کیا ہوا یہ پانی چند دن پیتا رہے اور اس سے غسل کرتا رہے ان شاء اللہ جادو ٹوٹ جائے گا۔

(3) بیری کے سات پتے لیں انہیں باریک پیس کر پانی کے بھرے برتن میں ڈال دیں پھر اپنا منہ اس کے قریب کر لیں اور ان پتوں کو اوپر نیچے کرتے ہوئے ان پر آیۃ الکرسی، سورہ اخلاص، سورہ الفلق، سورۃ الناس کی تلاوت کریں۔ اس پانی کو مریض چند دن تک پیتا رہے لیکن اس میں دوسرے پانی کا اضافہ نہیں کرنا اور آگ پر

گرم بھی نہیں کرنا اور اُسے ناپاک جگہ پر نہیں بہانا۔ امید واثق ہے کہ ان شاء اللہ پہلی دفعہ نہانے سے ہی جادو کا اثر ختم ہو جائے گا۔ ویسے چند دن پی لیں اور نہا بھی لیں تو بہتر ہے۔

(4) امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ جادو توڑنے کے لئے یہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ مریض ایک کانٹے دار درخت کے نیچے چلا جائے اور اس کے دائیں بائیں سے کچھ پتے لے کر انہیں باریک پیس لے پھر انہیں پانی میں ملا کر اس پر معوذات اور آیت الکرسی پڑھ لے اور اس سے غسل کر لے۔ (فتح الباری جلد: 10 صفحہ: 233)

جادو، جنسی کمزوری اور نامردی میں فرق کیسے کرے

اگر مریض پر بندش جماع کا جادو کیا گیا ہو تو اس کی اہم نشانی یہ ہے کہ وہ جب تک اپنی بیوی سے دور رہتا ہے اپنے اندر طاقت بھرپور انداز سے محسوس کرتا ہے لیکن جونہی اس کے قریب جاتا ہے اس کے قابل نہیں رہتا جبکہ نامرد خواہ بیوی کے قریب ہو یا دور اپنے اندر قوتِ جماع کو بالکل محسوس ہی نہیں کرتا۔

مقدس لڑکی

سیّدہ قرۃ العین سید سعادت علی المعروف جنوں والی سرکار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ سید سعادت علی ایک نامور سفلی علوم کا ماہر تھا اس کا حیران کن طریقہ کار یہ تھا کہ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگاتا اور پھر وہاں سے کئی میل دور کسی اور کنوئیں سے باہر نکل آتا اگر کوئی سائل اس کے پاس آتا تو اس کا نام اس کی اولاد کے نام والد اور والدہ کے نام بتا دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ تم فلاں کام سے میرے پاس آئے ہو تمہارے گھر کے اتنے کمرے ہیں اور فلاں فلاں طرف ان کے دروازے ہیں اور تمہارے گھر میں فلاں درخت لگا ہوا ہے۔ پھر اس نے یہ علوم قرۃ العین کو بھی سکھائے۔ قرۃ العین اسم بامسمّٰی تھی اسے دیکھ کر آنکھوں میں واقعی ٹھنڈک بھر جاتی تھی۔ وہ اپنے حسن اور شیطانی علم پر مغرور تھی بہت جلد غصے میں آ جاتی وہ جلد باز اور جذباتی لڑکی تھی جب اس نے جوانی کی دہلیز میں قدم رکھا تو ایک رات اس کا والد اچانک فوت ہو گیا۔ والدہ پہلے ہی فوت ہو چکی تھی اب وہ اس دنیا میں اکیلی تھی اسے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اس کے باپ نے کافی رقم اس کے لئے چھوڑی تھی اور وہ خود بھی عاملہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں روپے لوگوں سے وصول کرتی تھی۔ اس نے ایک عمر رسیدہ آدمی اور ایک عورت کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ مشہور تھا کہ عمر رسیدہ آدمی سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں لیکن اس کا کہنا تھا کہ یہ میرے باپ کے برابر ہے اور وہ عمر رسیدہ بھی اسے بیٹی کہہ کر پکارا کرتا تھا لیکن وہ عورت جو ان کے ساتھ رہتی تھی اس کے بقول اس نے کئی دفعہ دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔

رکھے نے اپنی پوری کوشش کر لی لیکن میں ٹھیک نہ ہوا۔ ایک دن رکھے نے مجھے کہا نذیر تمہارا حل صرف اور صرف اس لڑکی کے پاس ہے تم ایسا کرو کہ اس کے پاس جاؤ اور معذرت کر کے اسے راضی کرو مجھے امید ہے کہ اگر وہ راضی ہو گئی تو تم ٹھیک ہو سکتے ہو۔ میرا اپنا ذہن بھی یہی کہتا تھا لہٰذا ایک دن میں دوپہر سے ذرا پہلے اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ جب میں اس کے ڈیرے پر پہنچا تو وہاں سائلین کا رش تھا کافی انتظار کرنے کے بعد میری باری آئی۔ میں جب اس کے مخصوص کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

''نذیر! تمہارا کیا حال ہے؟'' اس نے کہا۔ ''رابعہ تمہیں جواب دے گئی ہے اور اب تم ہر کسی کی عزت خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ رابعہ تمہارے ناجائز بیٹے

کی ماں ہے اور تمہاری اپنی بیٹی بھی تین سال کی ہو گئی ہے۔ رکھے بدمعاش کے ساتھ بے حیائی سے بھی تم باز نہیں آئے۔ سہتی جیسی خوبصورت لڑکی سے بھی تمہارا دل نہیں بھرا خانقاہ پر آنے والی عورتوں اور لڑکیوں کو تم نے رکھے سمیت خراب کیا۔ تمہارے ساتھ جو ہوا ٹھیک ہوا ہے تم اس کے حقدار تھے۔ اب تم ایک ایسے سانپ بن کر رہ گئے ہو جس کا زہر ختم ہو گیا ہے۔ رکھا بھی اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ رکھے نے ہری سنگھ کی بیٹی بنتو کے ساتھ ظلم کیا لیکن اس میں میں رکھے کو زیادہ گنہگار تسلیم نہیں کرتی کیونکہ پہل بنتو کی طرف سے ہوئی تھی۔ رکھا بے پناہ طاقت کا مالک تھا بنتو اپنے عشق کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچی۔ تم رکھے کی اصلیت اور فطرت سے واقف نہیں ہو تمہیں اپنے ساتھ رکھنا اس کی مجبوری ہے ورنہ وہ تم سے پہلے ایک ملنگ کو قتل کر چکا ہے۔ رکھا انسان نہیں شیطان اور حیوان ہے، وہ تمہیں کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتا ہے''۔

قرۃ العین بولتی چلی جا رہی تھی اور میں حیرت زدہ ہو کر اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا وہ کبھی کبھی مسکراتی تو اس کے سفید دانت اس کے سرخ ہونٹوں میں سے ایسے چمکتے کہ میری آنکھیں خیرہ ہو جاتیں وہ قدرت کا ایک حسین شاہکار تھی اس کی ٹھوڑی پر سیاہ رنگ کا تل اس کے سفید اور صاف و شفاف چہرے پر عجیب بہار دے رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے تو رکھے کے کہنے پر میرے پاس آیا ہے''۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں ایمانداری سے کہتی ہوں کہ تیری اس بیماری کا توڑ یا علاج میرے پاس نہیں ہے اگر قبلہ والد مرحوم کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو شاید اس کا علاج بھی بتا دیتے لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ ہاں البتہ میں تمہیں ایک شخص کا پتہ بتا دیتی ہوں جو تمہارا علاج کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ تم رکھے کو چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ گے اور مجھ سے شادی کرو گے، میں تمہیں ایسے علوم سکھاؤں گی کہ تم رکھے سے بھی بڑے عامل بن جاؤ گے۔ بولو تمہیں میری شرط منظور ہے؟''

''دیکھو، قرۃ العین! میں ابھی اسی وقت تو یہ فیصلہ نہیں کر سکتا''۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم مجھے اس شخص کا پتہ بتا دو، جب میں ٹھیک ہو گیا تو تمہیں اپنے جواب سے آگاہ کر دوں گا''۔

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا''۔ قرۃ العین نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''دیکھو نذیر! میں ایک یتیم اور لاوارث لڑکی ہوں، مجھے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں تم سے بہتر اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ تم خوبصورت طاقتور اور تعلیم یافتہ نوجوان ہو اور زمانے کے ستائے ہوئے بھی اور مجھے اچھے بھی لگتے ہو میں تمہاری تمام خامیوں سے درگزر کرتی ہوئی تمہیں دوستی کی پیشکش کر رہی ہوں۔ رکھے سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا زیادہ سے زیادہ تم اژدہے کو حاضر کر سکو گے اس سے آگے رکھے کے پاس اور کچھ نہیں ہے اور اگر تمہیں اس کے بتائے ہوئے فن پر اعتماد ہے تو میں تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوں، تم اپنی کوشش کر کے دیکھ لو تم مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکو گے''۔

میں مزید حیران ہو گیا قرۃ العین میری اس طاقت سے بھی آگاہ تھی۔

''اِدھر دیکھو''۔ قرۃ العین نے بھاری لہجے میں کہا اور پھر میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کھینچ کر اپنے جسم سے علیحدہ کر دیں اور پھر بائیں پاؤں کو کھینچ کر جسم سے علیحدہ کیا اور میری گود میں پھینک دیا۔ ضبط کرنے کے باوجود میری گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی اور غیر ارادی طور پر میں نے پاؤں کو ہاتھ میں پکڑ کر اس کی طرف پھینکا اور جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پُراسرار لہجے میں ہنسنے لگی اس

کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پھر اس نے انگلیوں کو دوبارہ اپنے ہاتھ میں فٹ کر دیا اور پاؤں کو بھی پنڈلی کے ساتھ جوڑ دیا ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دستانے اور موزے پہن رہی ہے۔ اس کا یہ شعبدہ دیکھ کر اس کی شخصیت مجھ پر چھا گئی اور میں احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا لیکن یہ سوچ کر مجھے یک گونہ مسرت اور احساس فخر محسوس ہوا کہ اتنی خوبصورت اور باکمال لڑکی مجھے شادی کی پیشکش کر چکی ہے میں نے اس سے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''قرۃ العین! اس دن جب تُو ہماری خانقاہ پر گئی تھی تو تُو نے اپنا آپ مجھ سے بچانے کے لئے جسم کے ٹکڑے کیوں کر لئے تھے؟''

''تمہاری نیت خراب تھی''۔ وہ خفیف سا مسکرائی اور پھر کہنے۔ ''کیا میں تمہیں اپنی عزت سے کھیلنے کی اجازت دے دیتی اور تم فاتح کی حیثیت سے خود کو ہیرو سمجھنا شروع کر دیتے جب کہ میرے پاس تم سے بچنے کی طاقت موجود تھی تم اب بھی مجھ پر غالب نہیں آ سکتے اگر تمہیں شوق ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو''۔

''لیکن میں تو کسی بھی عورت کے قابل نہیں رہا کوشش کرنے سے کیا فائدہ؟''

''ہاں یہ بات تو میں بھول گئی تھی''۔ اس نے کہا۔ ''ویسے تم اسی قابل ہو تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اب رکھے سے کہو کہ تمہیں ٹھیک کرے وہ ابلیس کا چیلا عنقریب عبرتناک انجام سے دوچار ہو گا اور اُسے اپنے برے اعمال کی سزا تمہارے ہاتھوں سے ملے گی''۔

''میرے ہاتھوں سے وہ کیسے؟'' میں نے متجسسانہ انداز سے پوچھا۔

''دیکھو، ہر بات جاننے والی تو صرف خدا کی ذات ہے''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتی انسان کا علم محدود اور خدا کا علم لامحدود ہے۔ بس میرا یہ اندازہ ہے خیر تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میری پیشکش منظور ہے یا نہیں؟''

''دیکھو، قرۃ العین! تم پہلے مجھے ٹھیک کرو پھر میں تمہیں بتا دوں گا''۔

''لیکن میں نے کہا ناں کہ میرے پاس اس کا توڑ نہیں ہے''۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہیں اس شخص کا پتہ بتا سکتی ہوں جو اس کا توڑ جانتا ہے لیکن پہلے ہاں یا نہ میں مجھے جواب دو''۔

''ٹھیک ہے، قرۃ العین! میں تمہیں جلد ہی بتا دوں گا''۔ میں نے کہا۔

''میں تمہارا انتظار کروں گی''۔

جب میں واپس خانقاہ پر آیا تو رکھے نے بے تابی سے مجھے پوچھا۔ نذیر بتاؤ کیا بنا؟ میں نے پوری تفصیل سے قرۃ العین سے ہونے والی گفتگو اسے بتا دی اور جو شعبدہ اس نے مجھے دکھایا تھا وہ بھی بتا دیا۔ رکھا گہری سوچ میں غرق ہو گیا اور پھر کہنے لگا۔

''یہ فن ایک ہندو جوگی کے پاس بھی تھا وہ اپنے اعضاء کو جسم سے علیحدہ کر لیا کرتا تھا لیکن اس کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس لڑکی سے کبھی شادی نہ کرنا کیونکہ میرے خیال میں وہ اپنے فن میں کامل نہیں ہے، وہ کسی بھی وقت کوئی بھاری نقصان اٹھا سکتی ہے۔ دیکھو جو کچھ اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے اب وہ اس کا توڑ نہیں کر سکتی تو جو اتنا بھی نہیں کر سکتی وہ کسی دن خود بھی ڈوبے گی اور تمہیں بھی ڈبو دے گی''۔

لیکن رکھے! مجھ میں جو عیب پیدا ہو گیا ہے آخر اس کا بھی تو کوئی حل ہونا چاہئے''۔ میں نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں اس بارے میں مَیں سوچوں گا''۔

صوفی برکت اللہ

''دیکھ نذیرا!'' اگلے دن رکھے نے مجھے اپنے پاس

بٹھا کر کہا۔ ”ایک دن کسی مسئلے پر میری ہندو جوگی سے بحث ہو گئی تو اس نے مجھے بتایا کہ رکھشے ہم جتنے بھی عملیات کرتے ہیں ان کا توڑ بھی موجود ہے اور میرا تجربہ یہ ہے کہ تم جس کتاب کی تلاوت کرتے ہو اس میں یہ طاقت موجود ہے کہ تمام سفلی علوم اس کے سامنے پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے اور اس میں ایک اشلوک ایسا ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑا سفلی عامل دم نہیں مار سکتا اور اس کو غالباً کرسی کہتے ہیں۔ (آیۃ الکرسی) کیا تم اس کو جانتے ہو؟“

”نہیں، گورو جی!“ میں نے کہا۔ ”میں مسلمان ضرور ہوں لیکن میں اَن پڑھ ہوں مجھے کرسی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں“۔

”بہرحال اپنے کسی پنڈت (عالم) سے اس کے بارے میں ضرور پوچھنا“۔ اس نے کہا تھا لیکن مجھے ایسا کوئی موقع نہ ملا لیکن اس کی بات میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی عالم سے پوچھنا چاہئے اور میرے خیال میں صوفی برکت اللہ سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہو گا تم ایسا کرو کل ہی صوفی صاحب کے پاس جاؤ اور اس سے اپنی بیماری کا ذکر کرو میرا خیال ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گے“۔

اگلے دن میں صوفی برکت اللہ کے پاس پہنچ گیا وہ باریش صوم وصلوٰۃ کا پابند اور وضع دار انسان تھا بڑے اچھے اخلاق سے پیش آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا برخوردار بتائیں آپ کس کام سے آئے ہیں؟ میں نے پوری صورتِ حال ان کے سامنے رکھ دی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے برخوردار میں تمہارے لئے دعا کروں گا اور ان شاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے لیکن میری ایک شرط ہے“۔

”کون سی شرط؟ صوفی صاحب!“ میں نے پوچھا۔

”شرط یہ ہے کہ تم آئندہ زنا نہیں کرو گے“۔ صوفی برکت اللہ نے کہا۔ ”کیونکہ زنا کرنے سے ایمان کے نکل جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور اس بُرے فعل سے اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے اور قرآن مجید نے زنا کو ایک بُرا راستہ قرار دیا ہے“۔

”ٹھیک ہے، صوفی صاحب!“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں“۔

پھر صوفی صاحب نے قرآن مجید کی مختلف سورتیں اور آیات پڑھ کر مجھ پر پھونکنی شروع کر دیں اور کچھ وظائف مجھے بتا بھی دیئے اور ان کے کرنے کا طریقہ سمجھا دیا۔ دو تین دن بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا لیکن صوفی صاحب سے کیا ہوا وعدہ میں پورا نہ کر سکا۔ شیطانی خواہش پوری کرنا میری مجبوری تھی۔ رکھا کسی کے ساتھ بھی بے حیائی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مختلف دوائیوں سے کبھی اس کی بیماری میں افاقہ ہو جاتا تھا لیکن زخم پھر ہرے ہو جاتے ساری ساری رات وہ آہیں اور کراہیں بھرتا رہتا تھا۔

قرۃ العین کا افسوسناک انجام

ایک رات قرۃ العین کے ڈیرے پر دو لڑکوں نے دھاوا بول دیا وہ رات کے اندھیرے میں اسے باندھ کر گھوڑی پر ڈال کر فرار ہو گئے انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اس کے پاس رہنے والے عمر رسیدہ آدمی اور عورت کو بھی باندھ کر ڈیرے میں چھوڑ دیا تھا۔ کافی تگ و دو اور کوشش کے بعد عمر رسیدہ آدمی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکال کر بوڑھی عورت کو آزاد کیا اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کیا۔ ان کی چیخ و پکار سن کر گاؤں کے کافی لوگ جمع ہو گئے اور پھر قرۃ العین کی تلاش شروع ہو گئی لیکن واردات کو کافی دیر گزر گئی تھی لہٰذا اس کا کوئی سراغ نہ

مل سکا۔ اگلے دن ایک گھوڑ سوار نے آ کر اطلاع دی کہ فلاں جگہ پر ایک لڑکی کے جسم کے اعضاء بکھرے پڑے ہیں۔ جب لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے پہچان لیا وہ قرۃ العین ہی تھی لیکن سب لوگ حیران تھے کہ جسم کے ٹکڑے ہونے کے باوجود وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی پولیس افسر بھی اس انوکھے قتل سے حیران تھا جسم کے پانچ ٹکڑے ہونے کے باوجود خون کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ پولیس افسر نے لڑکی کے پس منظر کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس کا باپ ایک پہنچا ہوا عامل تھا اور یہ لڑکی بھی عملیات کیا کرتی تھی لیکن اس سے زیادہ مزید کوئی کچھ نہ بتا سکا۔

کھوجی کی اطلاع کے مطابق موقع واردات پر گھوڑی کے کھرے اور دو آدمیوں کے پاؤں کے نشانات واضح طور پر نظر آ رہے تھے پھر ایک آدمی گھوڑی پر سوار ہو کر چلا گیا تھا اور دوسرا پیدل گاؤں کی طرف جاتا معلوم ہوتا تھا اس سے پولیس نے اندازہ لگایا کہ ایک مجرم گاؤں کا ہے اور دوسرا کسی دوسری جگہ سے آیا تھا۔ بالآخر پولیس کی کوشش سے گاؤں والا مجرم پکڑا گیا کھوجی نے اس کا کھرا شناخت کر لیا تھا اور پھر دورانِ تفتیش اس نے جرم کا اعتراف کر لیا اور دوسرے ساتھی کا پتہ بھی بتا دیا اسے بھی گرفتار کر لیا گیا ان کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

گاؤں والا لڑکا قرۃ العین کا عاشق تھا لیکن وہ اس کے سامنے اپنے عشق کا اظہار کرنے سے ڈرتا تھا کیونکہ قرۃ العین کے شعبدے دیکھ کر لوگ اس کا احترام کرتے تھے ویسے بھی وہ ایک معروف باپ کی بیٹی تھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ خاندانِ سادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کرامتوں کا چرچا دور دور تک تھا اور قرۃ العین بھی اپنے بعض کمالات کی وجہ سے لوگوں میں ایک مقدس لڑکی کے طور پر جانی جاتی تھی اور لوگ اس کا احترام کیا کرتے تھے۔

ایک دن اس لڑکے نے تعویذ لینے کے بہانے سے قرۃ العین کو اپنی دلی حالت سے آگاہ کر دیا اور اپنے عشق کا اظہار بھی کیا لیکن قرۃ العین نے اس کو کھری کھری سنائیں اور اُسے دھمکی دی کہ اگر اس نے دوبارہ ایسی بات کی تو وہ لوگوں کو بتا دے گی۔ پھر اس نے اس عورت سے بھی اس کا ذکر کیا جو قرۃ العین کے پاس رہتی تھی اور اسے رقم کی پیشکش بھی کی کہ اگر تم قرۃ العین کو منا لو تو تمہیں بڑی رقم دوں گا وہ عورت کہنے لگی کہ پتہ نہیں وہ تمہاری بات کیوں نہیں مانتی حالانکہ میں نے اسے اسی عمر رسیدہ آدمی کے ساتھ کئی دفعہ قابل اعتراض حالت میں دیکھا ہے اگر وہ کوئی پاک صاف لڑکی ہوتی تو اس بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ بے حیائی نہ کرتی بہر حال میں کوشش کروں گی۔

لیکن وہ رام نہ ہوئی۔ عشق میں انسان پاگل ہو جاتا ہے اس لڑکے نے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا ارادہ کر لیا۔

یہاں میں اپنی بچیوں سے ایک گزارش ضرور کروں گا کہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلیں اگر کوئی مجبوری ہو تو جس طرح قرآن پاک میں خالق کائنات نے عورت کو باہر نکلنے کا حکم دیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے باہر نکلیں۔ دیکھیں قرآن۔ ترجمہ: اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اوڑھے رہیں اور اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں۔ (سورہ نور آیت 31)

یاد رکھیں کہ پردہ انسانی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ قوم کی اخلاقی اقدار اور انسانی نسل کی بقا اور تحفظ کا ضامن ہے اگر آپ یہ اہتمام نہیں کریں گی تو کسی انسانی درندے کی نگاہ میں آ جائیں گی اور پھر وہ تمہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

قرۃ العین بھی بے پردگی کا شکار ہو کر ایک درندے کی شقاوت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اپنے آپ کو پردے میں چھپا کر رکھا جائے تاکہ ''ناں کتا دیکھے نہ بھونکے'' آپ روزانہ اخباروں میں بیسیوں واقعات پڑھتے ہوں گے کہ ناکام عاشق کس کس طرح سے انتقام لینے پر تل جاتے ہیں یہاں تک کہ چہروں پر تیزاب تک پھینک دیتے ہیں بلکہ کئی بے غیرت شادی کے بعد معصوم لڑکیوں کے سسرال والوں کو طرح طرح سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی خباثت سے معصوم لڑکیوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ان تمام خطرات سے بچنے کا واحد حل وہی ہے جو قرآن پاک نے تجویز کیا ہے بہتر ہوگا کہ آپ فیشن زدہ چند بگڑی ہوئی عورتوں کی تقلید کرنے کی بجائے فاطمۃ الزہرہؓ کا اسوہ اپنائیں اور جن بے حیا عورتوں کو آپ اپنا آئیڈیل سمجھتی ہیں اُن کی اپنی ازدواجی زندگی بالکل غیر فطری اور غیر تسلی بخش ہوتی ہے۔ ان کی ظاہری ٹھاٹھ باٹھ اور شہرت دیکھ کر یہ مت سمجھ لیجئے کہ شاید حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔

بہرحال گاؤں والے لڑکے نے اپنے دوست کو حالِ دل سے مطلع کیا اور پروگرام کے مطابق قرۃ العین کو رات کے اندھیرے میں اغوا کر کے لے گئے لیکن جب قرۃ العین نے اپنے اعضاء علیحدہ کر لئے تو وہ ڈر کر بھاگ گئے۔ لیکن اُن کے اس بیان سے پولیس مطمئن نہ ہوئی۔ لاش کے ٹکڑوں کو بوری میں بند کر کے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا رپورٹ سے بھی یہ تصدیق ہوگئی کہ لڑکی پر کسی قسم کا تشدد نہیں کیا گیا نہ اس سے جنسی زیادتی کی گئی ہے لیکن لڑکی پاکدامن نہیں تھی بلکہ حاملہ بھی تھی۔ عمر رسیدہ آدمی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی اس نے بھی اقرار کر لیا کہ لڑکی کے ساتھ اس کے ناجائز مراسم تھے لیکن لڑکی اس برے کام کے لئے خود ضد کیا کرتی تھی لیکن یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ لڑکی کے جسم کے ٹکڑے کیسے ہوئے اور کس نے

کئے آخر عاملوں سے رجوع کرنا پڑا تو عاملوں نے بتایا کہ ایسا جادو کے ذریعے ممکن ہے لہٰذا لڑکی کو ابھی دفن نہ کیا جائے۔ پولیس آفیسر تذبذب کا شکار ہوگئے آخر یہ فیصلہ ہوا کہ کل تک دیکھا جائے اگر لڑکی زندہ نہ ہوئی تو پھر دفن کر دیا جائے۔ اگلے دن لاش کے ٹکڑوں کی رنگت تبدیل ہونا شروع ہوگئی جو اس بات کی علامت تھی کہ لڑکی کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے لہٰذا اسے دفن کر دیا گیا۔

میرا تجزیہ

مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ نذیر مجھ سے جھوٹ بول رہا ہوگا کیونکہ اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا ذہن اس واقعے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر نذیر نے زور دے کر کہا قاری صاحب یہ واقعہ سو فیصد درست ہے اور پھر تقریباً ایک سال بعد میری ملاقات اس علاقے کے ایک آدمی سے ہوئی تو اس نے بھی اس واقعے کی تصدیق کی۔ فخر سے نہیں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ میں ایک وسیع المطالعہ شخص ہوں لیکن میرے مطالعے میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں آیا تھا سوائے ایک واقعہ کے اور وہ مولوی گل حسن شاہ صاحب نے ملفوظات میں لکھا ہے جو غوث علی شاہ قادری کے سنائے ہوئے واقعات پر مشتمل ہے اور اس میں بھی انہوں نے جادوگروں کے بارے میں نہیں بلکہ غوث کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب چاہیں اپنے اعضاء علیحدہ کر لیتے ہیں ان کی عبادت من وعن نوٹ کر دیتا ہوں۔

غوث فریادرس کو کہتے ہیں یعنی جو بندگان خدا کے معاملات میں ظاہراً یا باطناً عدل و انصاف فرماتے ہیں ان کی شناخت مشہور ہے کہ جب چاہیں اپنے اعضاء جدا کر لیتے ہیں۔ (تذکرہ غوثیہ صفحہ 173)

لیکن اس حوالہ پر بھی مجھے چند تحفظات ہیں۔ (1) یہ کتاب کوئی زیادہ مستند نہیں ہے۔ (2) فریادرس تو صرف رب کائنات ہی ہو سکتے ہیں کسی کی فریادرسی کرنا مخلوق کے اختیار میں نہیں ہے۔ (3) اعضاء کو علیحدہ کرنا استدراج ہی ہوسکتا ہے اسے کرامت ماننے پر میرا ذہن تیار نہیں۔ لیکن اگر یہ کرامت ہے تو ظاہر ہے کہ کرامت کسی اللہ کے ولی سے ظاہر ہوتی ہے قرۃ العین پاک صاف لڑکی نہیں تھی لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ قرۃ العین جادو کے ذریعے ایسا کرتی تھی لیکن کسی وجہ سے اس کا توڑ نہ کر سکی اور موت کے منہ میں چلی گئی اور جادوگروں کے کئی ایسے واقعات میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان کے پاس جادو کا توڑ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

معجزہ، کرامت اور استدراج

معجزہ نبی کے ہاتھ پر اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتا ہے جو نبی کی نبوت کی صداقت کی دلیل اور مخلوق کے لئے اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے یعنی کوئی ایسی بات جو عقل کی پرواز سے باہر ہو اور انسانی عقل کو عاجز کر دے۔ مثلاً لاٹھی کا اژدھا بن جانا، پہاڑ سے زندہ اونٹنی کا باہر نکلنا، پتھر پر عصا مارنے سے پانی بہہ نکلنا، مردے زندہ کرنا، چاند دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے پانی بہہ نکلنا وغیرہ۔

کرامت ولی کے ہاتھ پر اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی مافوق العقل ہوتی ہے۔ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں:

جان لو کہ معجزوں کے لئے شرط یہ ہے کہ اُن کو لوگوں پر ظاہر کیا جائے اور کرامت کے لئے شرط ان کو چھپانا ہے کیونکہ معجزہ تو دوسروں کے لئے مفید ہوتا ہے اور کرامت صرف صاحب کرامت کے لئے ہی ہوتی ہے۔ نیز صاحب معجزہ کو یہ کامل یقین ہوتا ہے کہ یہ عین معجزہ ہے لیکن ولی قطعی طور پر نہیں جان سکتا کہ یہ کرامت ہے یا

استدراج اور نیز صاحب معجزہ یعنی نبی خدائے عزوجل کے حکم سے شریعت میں تصرف کرتا اور احکام ومنہیات میں ترتیب دیتا ہے لیکن صاحب کرامت یعنی ولی کو نبی کے احکام کو تسلیم اور قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں اس لئے کہ ولی کی کرامت کسی بھی نبی کے شرعی احکام کی مخالفت نہیں کرتی۔

(کشف المحجوب صفحہ 25، 252 از حضرت علی ہجویری)

دوسری بات یہ ہے کہ ولایت کے لئے کرامت کا ظہور ضروری نہیں چنانچہ بعض صحابہؓ سے ساری عمر ایک کرامت بھی ظاہر نہیں ہوئی حالانکہ حضرات صحابہؓ سب کے سب اولیاء تھے بلکہ تمام اولیاء امت سے افضل تھے۔

یہ اس لئے کہ ولایت کرامت کی قطع محتاج نہیں ہے بلکہ فضیلت کا مدار قربِ الٰہی اور اخلاص عبادت پر ہے۔

استدراج کوئی ایسی مافوق العقل بات کسی بے دین، کافر، فاسق و فاجر کے ہاتھ سے ظاہر ہو جائے تو اسے استدراج کہیں گے۔

استدراج اور کرامت کا آسان اور مختصر الفاظ میں تعارف یوں ہوسکتا ہے کسی باشرع پابند صوم صلوٰۃ اور نیک آدمی سے کوئی مافوق العقل کام ہو جائے تو وہ کرامت ہو گی اور اگر کسی بے دین، کافر، مشرک کے ہاتھ سے کوئی ایسا کام ہوجائے تو وہ استدراج ہوگا۔

وہ کام جن میں استدراج کا امکان نہیں

شریعت پر مستقیم رہنا، مکارم اخلاق کا خوگر ہوتا۔ اعمال صالح کا پابندی اور بے تکلفی سے صادر ہونا۔ اخلاقِ رذیلہ مثلاً تکبر، حسد، ریا، کینہ، حب جاہ، حب دنیا، حرص، غضب وغیرہ تمام صفاتِ مذموم سے پاک ہونا اور کوئی سانس غفلت میں نہ جانا گناہوں کا طبعی نفرت تک پہنچ جانا، ہر کام میں بے ارادہ اتباع سنت کا ہوتا وغیرہ ان کاموں میں استدراج کا احتمال نہیں ہے اور یہی ولی اللہ

کی علامات ہیں جس ہستی میں مندرجہ بالا صفات ہوں گی اس سے اگر کبھی کوئی مافوق الفطرت کام ہو جائے تو اسے کرامت کہہ سکتے ہیں۔

وہ کام جن میں استدراج کا امکان ہے

دل کی بات پر مطلع ہو جانا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، ایک ہی وقت میں دو جگہ یا چند جگہوں پر نظر آنا، زمین میں دھنس کر اندر ہی اندر تیر کر اوپر آ جانا۔ ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جانا، بے موسم پھل لا دینا وغیرہ۔ ہاں البتہ ان مذکورہ کاموں میں سے کوئی کام کسی ایسی ہستی کے ہاتھوں سے ہو جو اوپر بیان کئے گئے تو پھر کرامت ہو گی اور اگر بے دین، گمراہ غیر شرعی، تارک صلوٰۃ، کافر و مشرک کے ہاتھوں سے ہو تو استدراج ہو گا چنانچہ یہ سب مذکورہ چیزیں ریاضت سے جوگی وغیرہ غیر مسلموں سے بھی صادر ہو جاتی ہیں اور مسلمان فاسق سے بھی اور یہ کام ریاضت، مسمریزم، فری مسین، ہمزاد، عملیات نقوش، طلسمات، شعبدات، ادویات کی تاثیراتِ عجیبہ، سحر، نظر بندی وغیرہ سے کئے جاسکتے ہیں ان میں بعض محض خیالی چیزیں ہیں اور بعض واقعی بھی ہیں اور اسباب طبیعت خفیہ سے متعلق ہیں۔

عوام الناس کی افسوسناک حد تک بے خبری

افسوس صد افسوس ہے کہ عوام الناس ان باتوں سے بالکل بے خبر ہیں خواہ وہ ان پڑھ ہیں یا تعلیم یافتہ اور بڑا سبب علم دین سے دوری ہے انہیں اگر کوئی شعبدہ باز ذرا سا شعبدہ دکھا دے تو فوراً اس کو پہنچا ہوا بزرگ اور ولی اللہ تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ وہ کرامت اور استدراج کا فرق نہیں سمجھتے اور بہت جلد صیاد کے پھندے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اقبالؒ مرحوم نے کہا تھا۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد
(پنجابی مسلمان از ''ضربِ کلیم'' صفحہ 58)

چنانچہ پنجاب میں ایک اندازے کے مطابق چالیس ہزار خانقاہیں اور اڈے ایسے ہیں جن میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو اپنی شعبدہ بازیوں سے لوگوں کو دھوکا دے کر سلطان العارفین بنے پھرتے ہیں لوگ انہیں پہنچے ہوئے بزرگ اور فنافی اللہ ہستیاں تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی قبروں پر سر بفلک گنبد کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور مرنے کے بعد بھی وہ مشکلیں حل کرتے اور مرادیں بر لاتے ہیں اور ان پڑھ اور اندھے عقیدت مند دل کھول کر نذرانے اور نیازیں چڑھاتے ہیں اور ان کے ناخلف وارث عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رکھا، نذیر اور قرۃ العین اور سعادت علی جو اس کہانی کے اہم کردار ہیں، یہ سب شعبدہ باز اور جادوگر تھے لیکن لوگوں کی نظروں میں یہ مقدس لوگ تھے کیونکہ عام لوگ ان کے شعبدوں کو کرامت سمجھتے تھے اور انہیں ولایت کی گدی پر بٹھا رکھا تھا۔ میں پاکستان میں بعض معروف و مشہور گدیوں کو جانتا ہوں جو بے دین اور بدترین مخلوق تھے لیکن آج ان کے مزاروں کو دربارِ عالیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان کے مزاروں کی تزئین و آرائش پر لاکھوں روپے خرچ کئے گئے ہیں جو عقیدت مند مرید مہیا کرتے ہیں۔

اعصابی جنگ

میری بیگم کا موڈ انتہائی خراب ہو گیا تھا تین دن ہو گئے تھے ہماری بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ رات نذیر کی

آپ بیتی سننے میں گزر جاتی اور دن سونے میں لیکن کھانا حسب منشا اور وقت پر مل جاتا تھا اس دوران میری والدہ مرحومہ مغفورہ میکے سے واپس آ گئیں تو میری بیگم نے جی بھر کر ان کے کان بھرے۔ ظہر کی نماز کے لئے ہم جاگے تو میری والدہ نے مجھے آواز دی۔ افضل ادھر آؤ۔

''جی امی! کیا بات ہے؟''

''مجھے یہ بتاؤ یہ تمہارا مہمان کب رخصت ہوگا؟''

''امی میں کچھ کہہ نہیں سکتا''۔

''اچھا ایسا کرو کہ اسے چلتا کرو''۔

''دیکھو امی! میزبان تو مہمان سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ چلا جائے یہ تو بداخلاقی کے زمرے میں آئے گا''۔

میں نے ادب سے کہا۔ ''ویسے آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟''

''دیکھو، افضل! مہمان تو آتے ہی رہتے ہیں اور مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی صرف مہمان کا ہی ہو کر رہ جائے اور دوسروں کا کوئی خیال نہ کرے''۔

''ہاں، امی! اب میں سمجھ گیا ہوں''۔ میں نے کہا۔

''یہ آپ نہیں بول رہیں بلکہ آپ کی بھتیجی بول رہی ہے''۔ والدہ مرحومہ غصے میں آ گئیں اور اپنی مخصوص گالی سے مجھے نوازا۔ ''موئے دا پتر، اگوں بکواس کری جاندا اے''۔

میں زور سے ہنسا اور دھمکی دی کہ امی اس کا جواب مجھے آتا ہے لیکن بہرحال آپ فکر نہ کریں جلد ہی مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نماز پڑھ کر جب ہم واپس آئے تو ہمارے صحن میں کیکر کے درخت کی چھاؤں مکان کی چھت پر آ چکی تھی میں نذیر کو چھت پر لے گیا اور خود نیچے اتر آیا میری بیگم نماز پڑھ رہی تھی میں نے مذاق سے کہا آج نماز بہت لمبی ہو گئی ہے پھر میں نے بیگم کے چہرے کی طرف دیکھا جو بالکل سپاٹ تھا اس نے سلام پھیرا اور جلدی سے اٹھ کر کمرے کی طرف چل دی۔ میں سمجھ گیا یہ اس کا انداز محبوبی ہے پھر میں سوچنے لگا کہ بیگم کو کس طرح مناؤں لیکن کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے:

خدا روٹھ جائے تو سجدہ کروں
گر صنم روٹھ جائے تو پھر کیا کروں

پھر میں نے ایک مردانہ فیصلہ کیا اور موڈ بنا کر واپس مکان کی چھت پر چلا گیا۔ اب فیصلہ اعصاب پر تھا اور اعصابی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ میاں بیوی میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیں بس اعصاب پر قابو رکھیں بہت جلد فیصلہ ہو جائے گا طرفین میں سے جس کے اعصاب مضبوط ہوں گے وہ کامیاب ہو جائے گا اور جو فریق اعصابی جنگ میں ہار گیا مستقبل میں اس کے لئے خطرات بڑھ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ میری والدہ مرحومہ نے مجھے نیچے آنے کو کہا۔ میں جب نیچے آیا تو والدہ کہنے لگیں افضل صفیہ کہتی ہے کہ مجھے میکے چھوڑ آؤ۔

''تو امی! اس میں کیا حرج ہے یہ کرایہ لیں اور اسے چھوڑ آئیں''۔ میں نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

میری بیگم سمجھ گئی کہ اس کا یہ وار بھی خطا ہو گیا ہے۔ اب اس نے اپنے سب سے بڑے اور خطرناک ہتھیار کو استعمال کرنا شروع کیا وہ تیزی سے پلٹی اور اندر کمرے میں جا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ مرد حضرات یاد رکھیں کہ جو عورت کے اس ہتھیار کے وار کو برداشت کر گیا وہ یقیناً فتح حاصل کر لے گا۔ میرا دل پسیجا کہ اندر جاؤں اور بیگم کی حوصلہ افزائی کروں اور اس سے معذرت کروں لیکن میں نے اعصاب کو مضبوط رکھا اور دل کڑا کر کے واپس مکان کی چھت پر چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم میاں بیوی میں تھوڑی سی ناچاقی پیدا ہوئی تھی لیکن یہ تلخ نہیں تھی بلکہ اس میں ناز و انداز کی چاشنی بھی تھی اور اعصابی طاقت جانچنے

کی مشق بھی اور اس کھیل میں طرفین میں سے کوئی بھی چاروں شانے چت گر سکتا ہے ابھی تک میری پوزیشن مستحکم جا رہی تھی کیونکہ بیگم کا وار الٹا پڑ گیا تھا اگر وہ آنسو نہ بہاتی اور اعصاب مضبوط رکھتی تو میرے دل میں یہ خناس کبھی نہ سماتا کہ میں جیت رہا ہوں اور ایک حوصلہ افزا بات یہ بھی تھی کہ والدہ مرحومہ کی موجودگی میں ایک دوسرے کو پیغام بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً رات کے کھانے کے بارے میں مَیں نے والدہ مرحومہ کو مخاطب ہو کر بلند آواز سے ہدایات دیں لیکن اصل میں یہ پیغام بیگم کے لئے تھا۔ بیگم یوں کہتی پھپھو فلاں چیز نہیں ہے۔ میں سمجھ جاتا اس طرح ہمارا گھریلو نظام بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن عام مرد حضرات کے لئے میرا مشورہ یہ ہوگا کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں کیونکہ بعض دفعہ تدبیریں الٹی بھی پڑ جاتی ہیں اور پھر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ پسپا ہونے میں ہی عافیت ہوتی ہے بہرحال حالات پھر گہری نگاہ رکھیں چھٹی حس پر بہت کم بھروسہ کریں بلکہ حواس خمسہ سے کام لیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مجازی خدا ہونے کے زعم میں بیگم سے صلواتیں بھی سن لیں اور کہنی پر ڈوئی بھی کھالیں کیونکہ بعض بیگمات صرف نام کی صنف نازک ہوتی ہیں ورنہ نازکی اُن کو چھو کر بھی نہیں گزری ہوتی بلکہ منہ پھٹ اور ہاتھ چھٹ ہوتی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ایسا رویہ رکھیں جیسا میرے ایک دوست نے رکھا تھا وہ یوں کہ اس شریف آدمی نے تنگ آئے ہوئے لہجے میں بیوی سے کہا۔ یا تو میں مر جاؤں اور یا پھر...... عورت تیوری چڑھا کر بولی یا پھر کیا۔ وہ جھٹ سے بولا یا پھر بھی میں ہی مر جاؤں۔

بیوی کے معاملے میں یہ کلیہ ہمیشہ یاد رکھیں پہلے تو اسے پرکانے کی کوشش کریں اور اگر محسوس کریں کہ کام نہیں بن رہا تو فوراً خود پرک جائیں لیکن میری باتوں کو حرف آخر نہ سمجھیں۔

میرے ایک دوست کے ساتھ ایک انہونا واقعہ پیش آیا کڑاکے کی سردی یخ بستہ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اندھیری رات بیوی سے کسی معاملے میں تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی بچے کمرے میں تھے بیوی جھٹ سے کمرے میں داخل ہوئی اور اندر سے کنڈی چڑھالی۔ پہلے گیدڑ بھبکیوں سے کام لیتا رہا دروازہ کھول دو ورنہ دروازے کے پٹ توڑ دوں گا لیکن بیوی ٹس سے مس نہ ہوئی پھر خوشامد پر اتر آیا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا آخر میرے پاس آیا اور صورت حال میرے سامنے رکھی۔ میں نے کہا بھئی میں تمہیں چارپائی اور بستر ادے سکتا ہوں لیکن اس سردی میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ کہنے لگا قاری صاحب آپ بھی بس منبر پر بیٹھ کر انسانی ہمدردی کا درس تو دیتے ہو لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کرتے۔

بھئی میں نے تو کہا ہے کہ چارپائی بھی دیتا ہوں اور بستر ابھی۔ لیکن میں نے ابھی کھانا بھی کھانا ہے۔

تو ٹھیک ہے کھانا بھی مل جائے گا۔

"لیکن قاری صاحب! نہ مجھ سے سویا جائے گا نہ میں کھانا کھا سکوں گا"۔

"کیوں بھائی! ایسا کیوں ہے؟"

"قاری صاحب! وہ جیسی بھی ہے لیکن میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہاں اب تم نے صحیح بات کی ہے۔ قاری صاحب میں نے آپ سے پہلے بھی کئی دفعہ گزارش کی ہے کہ کوئی تگڑا سا تعویذ بنا کر دے دیں کہ بس ہر وقت میرے پیچھے لگی رہے لیکن آپ بھی بس تماشہ دیکھنے میں خوش رہتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی سب سے تگڑا تعویذ تمہارا رویہ ہے تم اپنا رویہ درست کرلو تو کسی تعویذ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

"ٹھیک ہے، آپ بس ایک دفعہ میرے ساتھ چلیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ محتاط رہوں گا"۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا مجھے امید تھی کہ میرے کہنے سے وہ دروازہ کھول دے گی۔ میں نے دروازے کے قریب ہو

کر آہستہ سے آواز دی کہ بہن دروازہ کھولو۔ وہ اندر سے بولی۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ آپ کو ہی لے کر آئے گا اور ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھ گیا کہ لڑکی مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔

عصر کی نماز کے لئے ہم مسجد میں گئے اور پھر شام تک چہل قدمی کرتے رہے شام کی نماز کے بعد جب ہم گھر آئے تو نذیر مکان کے اوپر چلا گیا اور میری بیگم نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ہاں بھئی بتائیں کیا بات ہے؟ قاری صاحب میں نے آپ کے لئے آپ کی پسندیدہ ڈش تیار کی ہے۔ کون سی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈرائی فروٹ والا حلوہ۔ صفیہ تم بہت اچھی ہو لیکن سنگل پلیٹ تو نہیں چلے گی۔

ہاں مجھے پتہ ہے مہمان کا انتظام بھی کیا ہے۔

اچھا ٹھیک ہے تم ایسا کرو ابھی ہمیں صرف کھانا دے دو حلوہ ہم عشاء کی نماز کے بعد کھائیں گے۔

قاری صاحب آپ زیادہ ناراض تو نہیں ہو گئے۔

نہیں بھئی میں بالکل ناراض نہیں ہوں البتہ تم ......

بس آپ رہنے دیں غلطی میری تھی وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔ میری والدہ مصلّے پر بیٹھی تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھیں۔

دیکھو بیگم یہ بھوکا بھٹکا آدمی تھا اور اب یہ راہ راست پر آ گیا ہے اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے۔ میں نے بیگم کو سمجھا لیا۔

''یہ کیا کرتا تھا؟'' میری بیگم نے بات بڑھائی۔

''بھئی، اس کی کہانی بہت لمبی ہے کسی وقت تمہیں سناؤں گا بس اتنا سن لو کہ یہ شخص جادوگر تھا میری اور اس کی ملاقات ہماری شادی سے پہلے ہوئی تھی اب یہ توبہ کر چکا ہے۔

''نہیں قاری صاحب! اس نے ابھی توبہ نہیں کی''۔

''کیوں تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''قاری صاحب! قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ جادوگر میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتے ہیں اور یہ کام ابھی بھی یہ کرتا ہے''۔

تمہیں کیسے پتہ ہے؟

وہ زور سے ہنسی اور کہنے لگی ابھی آپ کو تجربہ نہیں ہوا لیکن ہم تو ٹھیک ٹھاک ہیں، ہاں لیکن اس کا توڑ پھپھو نے کیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور آہستہ سے کہا ''پاگل''۔

قبر کشائی

عشاء کی نماز پڑھ کر نذیر نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور کہنے لگا۔ قاری صاحب میرے دل میں دو چیزیں بری طرح کھب گئی تھیں ایک تو سیدہ قرۃ العین کی موت اور دوسرے جنت کا عشق، وقتی طور پر بالو کنجری اور سہتی کی آمد نے کچھ سہارا دیا لیکن ان کے چلے جانے کے بعد دوبارہ میری حالت دگرگوں ہو گئی۔ قرۃ العین جسے عام لوگ سیدہ عینی کے نام سے پکارتے تھے کی شادی کی پیشکش پر میں سنجیدہ ہو گیا تھا اور میرا ارادہ پختہ ہو گیا تھا کہ رکھے کو چھوڑ کر عینی سے شادی کر لوں لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے اپنے ارادے سے مطلع کرتا وہ موت کے منہ میں چلی گئی اور جنت کا عشق تو میری رگ رگ میں سما گیا تھا۔ اگر وہ رکھے کی پھپھو کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اسے حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ اختیار کرتا۔

قاری صاحب انسانی طبیعت بھی عجیب ہے میں کبھی بھی یہ بات نہیں مان سکتا کہ عشق میں انسان کسی ایک منزل پر ٹھہر سکتا ہے بھلا بے حیائی اور بدکاری کی بھی کوئی حد ہے۔ جنت کے بارے میں یہ مختلف منصوبے ذہن میں ترتیب دیتا رہتا تھا لیکن کوئی منصوبہ بھی قابل عمل نظر نہیں آتا تھا۔ صبح رکھے نے مجھے اپنے حجرے میں

بلایا اور کہنے لگا نذیر کوئی نئی بات سنی ہے۔ نہیں رکھے میں نے تو کوئی نہیں سنی۔

"نذیر! عینی کے گاؤں سے ابھی ایک عورت آئی تھی"۔ رکھے نے بتایا۔ "اس نے بتایا ہے کہ اُن کے گاؤں میں سید سعادت علی کا ایک دوست آیا ہے اس کا کہنا ہے کہ عینی مری نہیں بلکہ زندہ ہے اگر یقین نہیں تو قبر کھود کر دیکھ لو اور اگر وہ زندہ نہ ہوئی تو میں اُسے زندہ کر سکتا ہوں۔ عینی نے ان لڑکوں سے بچنے کے لئے اپنے علم کے ذریعے اپنے جسم کے ٹکڑے کر لئے تھے اور یہ بات ہے بھی حقیقت ہم تو اس کے اسی کمال سے واقف ہیں"۔

"ہاں، رکھے یہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں بلکہ اس نے میرے سامنے اپنے ہاتھ کی انگلیاں اور ایک پاؤں اپنے جسم سے علیحدہ کر لیا تھا"۔

"یار! وہ تو بڑے کمال کی لڑکی تھی"۔ رکھے نے کہا۔

"رکھے! تم نے مجھے اس لڑکی سے منع کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ یہ لڑکی جادوگر ہے تمہیں کیسے پتہ تھا؟"

میں اس کے والد سید سعادت کو جانتا تھا اور میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سعادت علی نے کچھ نہ کچھ علوم عینی کو بھی سکھائے ہوں گے لیکن اس کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے مجھے شک تھا کہ یہ لڑکی کسی وقت بھی غلطی کر سکتی ہے اور نقصان اٹھا سکتی ہے۔ خیر تم آج جاؤ اور اس خبر کی تصدیق کر کے مجھے بتاؤ کہ اس عورت نے جو کچھ بتایا ہے آیا وہ سچ ہے یا محض ہوائی خبر"۔

قاری صاحب! جب میں عینی کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ عینی زندہ ہو جائے میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہو گئی کہ شاید سید سعادت علی کا دوست اس جادو کا توڑ جانتا ہو اور پھر مجھے تو پہلے اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ عینی میرے حجرے میں پانچ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور پھر وہاں اس کے جسم کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور اپنے گاؤں میں وہ زندہ سلامت پہنچ گئی تھی۔ میں جب عینی کے گاؤں پہنچا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی سید سعادت علی کا دوست گاؤں کے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو قبر کھود کر عینی کو باہر نکالو وہ زندہ ہے اور اگر مزید تاخیر کی گئی تو پھر اس کی حقیقی موت واقع ہو جائے گی۔ گاؤں کے نمبردار کی اجازت سے عینی کی قبر کھودی گئی تو قبر سے بدبو کے بھبکے آنے شروع ہو گئے۔ عینی کی لاش کے ٹکڑے آسامی میں موجود تھے۔ سعادت علی کے دوست نے کہا کہ ٹکڑوں کو باہر نکالو لیکن لوگوں نے کہا کہ تم تو کہتے تھے کہ عینی قبر میں زندہ ہو گئی ہے لیکن تمہاری بات جھوٹی ثابت ہوئی، اب تم خود ہی قبر میں اترو اور ٹکڑوں کو باہر نکالو۔

وہ عامل قبر میں اتر گیا اور ایک ایک کر کے عینی کے اعضاء باہر رکھ دیئے پھر وہ باہر نکلا اور اعضاء کو اپنے اپنے مقام پر رکھ کر اپنا عمل شروع کر دیا۔ قبرستان کا ماحول عجیب قسم کا خوفزدہ کر دینے والا بن گیا تھا یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اردگرد کے گاؤں میں بھی پہنچ گئی بے شمار لوگ قبرستان میں جمع ہو گئے تھے اور پھر کئی لوگوں کی گھٹی چیخیں نکل گئیں جب سید سعادت علی کے دوست عامل کا سر اس کے جسم سے علیحدہ ہو کر دور جا گرا پھر جلد ہی دھڑ کے ساتھ مل گیا اور پھر اس نے بلند آواز سے کہا۔

"نذیر! ادھر میرے پاس آؤ، جب عینی زندہ نہیں رہی تو تمہیں بھی اب جینے کا کوئی حق نہیں"۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میرا دل چاہا یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن کسی نادیدہ طاقت نے مجھے جکڑ لیا تھا میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ جب مجھے ہوش آیا تو سید سعادت علی کا دوست مجھ پر جھکا ہوا تھا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر میرے جسم پر پھونکیں مار رہا تھا۔

(یہ پُراسرار داستان جاری ہے)

طب وصحت

دستِ شفاء

فریکچر اور Bed Sore میں ہومیوپیتھک ادویات کا کمال!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیوپیتھک ایسوسی ایشن
شعبۂ طب ونفسیات

اس ماہ کا کیس بھی درحقیقت بہت اہم ہے مگر میں چونکہ سادہ یا عام زبان استعمال کرتا ہوں اور اُن کیسوں میں ملاوٹ نہیں کرتا جو حقیقت ہوتی ہے وہ لکھ دیتا ہوں اس لئے کئی لوگ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے جو میں نے لکھی ہوتی ہیں۔ یہ معمولی باتیں نہیں ہوتیں اس لئے اگر ایک بار سمجھ نہ آئے تو پھر دوبارہ یا سہ بارہ پڑھیں خصوصاً میڈیسن کے شعبے سے تعلق رکھنے والے حضرات تاکہ وہ ان تجربات سے کماحقہ فائدہ اٹھاسکیں۔

یہ 24 نومبر 2013ء کی بات ہے، اتوار کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ میں باہر اپنے باغیچے میں پودوں کی دیکھ بھال کررہا تھا جبکہ باقی لوگ کمرے کے اندر ٹی وی دیکھ رہے تھے اور والد صاحب برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر اخبار کا مطالعہ کررہے تھے۔ میرا کام بھی ختم ہونے کے قریب تھا کہ اچانک برآمدے سے ہائے ہائے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ گھر والے بھی کمرے سے نکل آئے اور میں بھی بھاگم بھاگ اندر گیا کہ یا اللہ خیر یہ کیا ماجرا ہوگیا اچانک۔

جب میں اندر گیا تو دیکھا کہ محترم والد صاحب فرش پر پڑے کراہ رہے ہیں اور قریب ہی وہ کرسی بھی زمین بوس ہے جس پر وہ تشریف فرما تھے۔ خیر ہم انہیں اٹھانے لگے مگر معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہوگیا تھا کیونکہ وہ فرش سے اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ پھر ہمسائے بھی آگئے۔ ہمارے ایک قریبی عزیز پوسٹ ماسٹر ہیں وہ کہیں سرکاری دورے سے واپس آرہے تھے وہ بھی اپنے گھر جانے کی بجائے ادھر ہی آگئے۔ پھر 1122 والوں کو کال کی گئی وہ آگئے۔ انہوں نے اور دیگر لوگوں نے مل

کر انہیں ایمبولینس میں ڈالا اور ڈی ایچ کیو لے گئے۔ وہاں پر فوری ایکسرے کروایا تو معلوم ہوا کہ کولہے کی ہڈی (Neck of Fuma) کا فریکچر ہو چکا ہے۔ پھر ان کو سرجیکل وارڈ میں داخل کرا دیا گیا اور آپریشن کا مژدہ سنایا گیا۔ تاہم تین چار دن وہاں رہنے کے باوجود آپریشن سے متعلقہ ٹسٹ نہ ہو سکے اس کے علاوہ وہاں صفائی اور دیگر انتظامات نہایت ہی ناقص تھے۔ بہرحال کئی مریض آتے جاتے رہے اور آپریشن بھی ہوتے رہے تاہم متعلقہ ڈاکٹر صاحب نے جب بتایا کہ آپریشن کے دوران Drilling کا عمل دیکھنے والی مشین اس ہسپتال میں نہیں ہے تو ہم نے سی ایم ایچ لاہور جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ ہم رات کو تقریباً 7 بجے وہاں ایمرجنسی میں آئے۔ فوری طور پر سب test ہوئے اور سرجیکل II میں انہیں داخل کر لیا گیا پھر دیگر ٹسٹ ہوتے رہے۔ متعلقہ کرنل سرجن ڈاکٹر صاحب ایک ہفتے کے لئے کراچی بھی گئے واپس آئے تو پھر 19 دسمبر کو ان کا آپریشن ہوا۔ ہمیں بہت خوشی ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحبان اور دیگر عملہ عمومی طور پر بہت ٹرینڈ، ماہر اور خوش اخلاق ثابت ہوئے۔ ہم بہت خوش تھے مگر بعد کی چند باتوں نے ساری خوشی کرکری کر دی۔ بہرحال میں پہلے ان کی اچھائیاں سپرد قلم کروں گا۔

CMH میں علی الصبح 6 بجے ناشتہ سب مریضوں کو مل جاتا ہے پھر 9 بجے کے قریب کوئی نہ کوئی ڈاکٹر صاحب وزٹ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی حال احوال دریافت کرتا ہے اور حتی المقدور شکایات رفع کرتا ہے (سول کے برعکس)۔ البتہ صرف Bed Patients کو جمعدار خود ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تاہم وہ بھی تعاون کرتے ہیں اور اگر مریض کے لواحقین بھی کچھ تعاون کریں تو مریض پر فدا ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر پٹی اور میڈیسن والا عملہ آتا ہے پھر ایک بجے دوپہر کا کھانا 4 بجے چائے، 6 بجے رات کا کھانا جو کہ بہت مزیدار ہوتا ہے اور ساتھ کوئی فروٹ یا سویٹ ڈش۔ ٹی وی کیبل کی سہولت ہر کمرے میں سارا سارا دن/ رات کے لئے ہے۔ البتہ اخبار خود باہر سے خریدنی پڑتی ہے۔ حجام کی سہولت بھی موجود ہے تاہم یاد رہے کہ اگر وہ کسی کو کٹ (Cut) لگا دے تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اب آپ یہ بتائیں کہ جہاں اتنی سہولتیں ہوں اور وہ بھی فری تو وہاں سے کون واپس آنا چاہے گا۔ تو جناب بالکل ایسا ہی ہے پہلے پہل تو وہاں رہنا مریض اور لواحقین کو قدرے مشکل لگتا ہے مگر پھر اس قدر دل لگ جاتا ہے کہ کسی طور واپس آنے کو دل نہیں کرتا کیونکہ اوّل تو ایسا آرام فرصت اور سہولیات اور کہاں مل سکتی ہیں اور دوم یہ کہ وہاں عملہ مریض اور لواحقین جس طرح شیر و شکر ہو کر وارڈ کے تمام مریضوں کا خیال رکھتے ہیں اس کی مثال دنیا میں اور کسی جگہ پر ملنا محال ہے۔ کبھی کبھار مریضوں کی آپس میں نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے مگر ماحول زیادہ زہر آلود نہیں ہوتا کیونکہ سب کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ چند دن کے مہمان ہیں۔ بہرحال ہر وقت مریض کو فرصت ہی فرصت اور عیاشی ہی عیاشی، اہمیت ہی اہمیت، بات بات پر خدمت گار اور ڈاکٹر و ادویات فری حاضر حتیٰ کہ مریض خود کو VIP اور ان تمام چیزوں کا حقدار سمجھنے لگتا ہے مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی پھر اچانک ایک دن ڈاکٹر صاحب ایکسرے کا حکم دیتے ہیں اور ایکسرے دیکھنے کے بعد مریض کو ڈسچارج کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اب مریض کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں وہ کئی ایک حیلے بہانے کرتا ہے کہ کسی طرح یہ حکم ٹل جائے مگر عملے والے تو بہرحال ڈاکٹر صاحب کے حکم کے پابند ہیں اور وہ بھی سارے کے سارے فوجی ہیں بس ایک بار جو آرڈر ہو گیا سو ہو گیا اس میں کسی طور، کوئی تبدیلی یا کمی بیشی ممکن نہیں۔ اب مریض کسی طرح بھی وہاں رک نہیں سکتا عملے والوں کے نزدیک گویا وہ

ایک شجر ممنوعہ ہے یا ناپسندیدہ شخصیت کہ اس کے پاس جانا بھی منع ہے۔ جو لوگ ہر وقت مریض پر فدا ہوتے تھے، ایک صدا پر دوڑے آتے تھے۔ سب طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں مریض سے اس کی چھت اس کا کمبل بیڈ اور روزی چھین کر اُسے ایک کونے میں بے یارو مددگار چھوڑ کر اپنے کاموں میں یوں لگ جاتے ہیں جیسے وہ اسے کبھی جانتے بھی نہ تھے۔ اگر وہ کرتے ہیں تو صرف یہ کہ چند دن کی ادویات کا نسخہ لکھ کے دیتے ہیں مگر وہ ادویات سٹور سے لینا بھی کسی دل گردے والے (ویلے) پہلوان کا کام ہے۔ اب چاہیں تو دوبارہ ان کے پاس آئیں یا نہ آئیں کسی کو آپ سے کوئی غرض نہیں گویا کہ مردے کو ایک بار دفن کر دیا بس بات ختم اب کوئی قبر پر مٹی ڈالنے بھی نہ آئے گا۔ اب مریض کو اپنی کم مائیگی اور اوقات کا ٹھیک طرح احساس ہوتا ہے یہاں میں اپنا ایک واقعہ لکھتا ہوں کہ میں نے کئی مریضوں کو دیکھا جو معمولی زخموں اور آپریشن کے بعد بھی کئی دن ہائے ہائے کرتے رہتے ہیں یا خاصے ٹھیک ہونے کے بعد بھی "میں ہل نہیں سکتا" کا ورد کرتے رہتے ہیں، میں انہیں اکثر کہتا کہ یار اگر کوئی تمہیں یہ کہے کہ تمہارے بستر کے نیچے بم ہے تو سب سے پہلے تم ہی اپنے پاؤں سے بھاگ کر وارڈ سے دور جا کر کھڑے ہو جاؤ گے اور کئی تو ایسی ایسی حیلے سازیاں کرتے ہیں کہ ان کی باتیں سن کر یقین نہیں آتا کہ یہ پاک فوج کے وہی بہادر لوگ ہیں جن کی داستانیں ہم مزے لے لے کر پڑھتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں کہ وہ بازو کٹنے کے باوجود لڑتے رہے وغیرہ وغیرہ اور وہ تصور جو ہم نے دل میں سجا رکھا ہے میں نے کئی بار پاش پاش ہوتے دیکھا جو میں نے عنایت اللہ صاحب کی کہانیوں اور قومی اخبارات میں اکثر جگہ پڑھا ہے (مگر یہ بات قارئین کو بتانا ضروری ہے کہ یہ صرف ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے، ورنہ ہمارے فوجی اور پولیس والے شیر جوان ابھی بھی کسی سے کم نہیں)۔

بہرحال اب میں اس کے میڈیکل پہلو کی طرف آتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر مریض کو اس ماحول سے نہ نکالا جائے تو وہ شاید ہی کبھی شفایاب ہو اور یہ کہ بیڈ Patient کے ساتھ ڈیوٹی کرنا یقیناً دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جب مریض وہاں سے نکلتا ہے اور صحت مند لوگوں میں جاتا ہے اور خصوصاً جب صحت منداس کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے کیونکہ وہاں فوج کی طرح ہر وقت پکی پکائی نہیں ملتی تو وہ خود اپنے آپ اپنے کام کرنے لگ جاتے ہیں چاہے مجبوری سے یا خوشی سے۔

بہرحال آپریشن کے تقریباً 15 دن بعد ہمیں بھی CMH سے فارغ کر دیا گیا اور 30 دن کے بعد دوبارہ دکھانے کے لئے کہا گیا کہ جناب کرنل ڈاکٹر صاحب کے پاس صبح آٹھ بجے آتا ہے کیونکہ وہ مریض کو صبح 8 بجے سے دوپہر 2 بجے تک دیکھتے ہیں۔ ہم مقررہ دن مبلغ 5,000 میں ایمبولینس لے کر بڑی مشکلوں سے ان ڈاکٹر صاحب کے پاس آ گئے متعلقہ عملے کو بتایا۔ اب باری کے لئے ایک طویل انتظار۔ بہرحال یہاں آ کر ایسا لگا کہ ہم

"رحمٰن" ہے وہ ذات

رحمٰن ہے وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے انسان بنایا۔ وہ ذات تمہارے گناہوں کے باوجود تمہیں ہر روز رزق دیتی ہے، وہ ذات جو تمہاری توبہ پہ تمہارے گناہوں کو بھی نیکی میں بدل دیتی ہے، وہ ذات جو تمہارے راز جانتے ہوئے بھی تمہاری سرکشی کے باوجود انہیں فاش نہیں کرتی، وہ ذات جس نے تم کو فضیلت بخشی، وہ ذات جس نے تمہارے لئے قرآن اتارا تاکہ تم اس کے ذریعے جنت حاصل کرو تو "تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

(مظہر سعید)

دنیا کے بیوقوف ترین انسان ہیں کہ متعلقہ ڈاکٹر صاحب نے اتنے انتظار کے باوجود اندر سے آ کر مریض کو دیکھا تک نہیں اور کچھ ادویات لکھ دیں بہرحال پٹی والے نے ٹانکے نکال دیئے۔ حکم ہوا کہ ایک ماہ کے بعد آنا ہے۔ ہم پھر آ گئے 5,000 کی ایمبولینس لے کر پورا ایک دن ضائع کیا انتظار کیا سخت سردی میں مگر پھر وہی رزلٹ۔

اب اعتراض ہوا کہ

جناب آپ نے میڈیکل کارڈ نہیں بنوایا۔ تو جناب کوئی ہمیں بتاتا تو بنواتے نا۔ اب ان کی عقل ملاحظہ ہو کہ مریض کو داخل بھی کر لیا، ٹسٹ کیے، ایکسرے کیے، آپریشن کیا، ادویات دیں، قیام و طعام سب کچھ، وہاں کوئی اعتراض نہیں اور اب کہ جب سارا کام ان کی ناک کے عین نیچے ہو چکا ہے حتیٰ کہ وارڈ ماسٹر صاحب کو بھی پتہ ہے پھر بھی اعتراض، اب ان کو کون سمجھائے کہ جناب اعتراض کا وقت تب تھا جب مریض کو داخل ہونا تھا۔ اب کیا ضرورت ہے مگر میری ایک بات یاد رکھیں آپ کے ہمیشہ کام آئے گی وہ یہ کہ آپ ایک سول (Civil) محکمے کے عملے یا افسر کو تو ایک بات سمجھا سکتے ہیں یا قائل کر سکتے ہیں مگر فوج کے عملے کو یہ بات کسی طور نہیں سمجھا سکتے کہ ان کے قاعدے کلیے میں Compromise کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ ہم ایک دوسرے شہر سے 5,000 ہزار کی ایمبولینس لے کر آ رہے ہیں، مریض بھی سابقہ فوجی ہے، سی ایم ایچ میں باقاعدہ داخل رہا، آپریشن بھی انہی ڈاکٹر صاحب نے کیا اور اب ایک معمولی ضابطے کے پورا نہ ہونے پر مریض نہیں دیکھتے اور شاید اس میں ہماری بھی کم عقلی تھی کہ انہیں صرف مسیحا سمجھا فوجی ہونے کو بھول گئے اور جو کام اپنے شہر میں 500 روپے میں ہو سکتا تھا اس کے 5,000 خرچ کیے پھر سارا دن خجل ہوئے، مریض کو سردی میں لٹائے رکھا خود بھی دفتر سے چھٹی کی گویا کہ ہر طرح سے نقصان ہی نقصان مگر یہ سب باتیں کرنل ڈاکٹر صاحب کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کوئی جیتا ہے یا مرتا ہے ان کی بلا سے مگر ان کا قاعدہ قانون تو خراب نہیں ہو سکتا ہے نا۔ (نوٹ: یہی فوجی جب ہمارے سول محکموں میں آتے ہیں تو ہم ان کی بے حد قدر اور عزت کرتے ہیں اور جیسے بھی ہو ان کے کام رکنے نہیں دیتے تھے۔ کاش مجھے پہلے ایسا تجربہ ہو گیا ہوتا۔ ایسے حضرات جب سول قوانین کی زد میں آتے ہیں تو پھر ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ شاید فوج میں ضابطوں کی اہمیت زیادہ ہے اور باقی چیزوں کی کم ہے۔ کوئی سول کا ڈاکٹر ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتا حالانکہ اس معاملے میں کل غلطی ان کے محکمے کی ہی تھی۔ اگر وہ غور کریں تو بات سمجھ میں آ جائے گی مگر شاید وہاں وہ چیز نہیں جو سول کے افسروں میں ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا اور اس وجہ سے ہمارے دل میں ان کا وہ بلند مقام نہ رہا جو اس سے قبل تھا حالانکہ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں خود اسی پیشے سے وابستہ ہوں اور ایک سرکاری محکمے کا ملازم بھی ہوں۔ مگر انہوں نے ان باتوں کا ذرہ بھر خیال نہ کیا بلکہ ضابطے کو مقدم رکھا۔

بہرحال اس واقعے کے بعد ہمیں بھی خاصی عقل آ گئی کہ یار دفع کرو سارے معاملے کو جب انہیں ہماری بات کی سمجھ نہیں آتی اور ہمیں ان کی بات کی تو اب ان کے پیچھے نہ پڑیں۔ والد صاحب کو ان کی ادویات چونکہ راس نہیں آتی تھیں میں نے Calc-tab اور Vitamin کے علاوہ سب بند کر دیں۔ پھر میں نے ان کے کیس کے مطابق ہومیو پیتھک ادویات دینی شروع کیں۔ عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ہڈیاں بھی کمزور ہو گئی تھیں لہٰذا بقول ڈاکٹر صاحبان ان کی ہڈیاں اب بھر بھری اور ان کا جڑنا مشکل تھا۔ تاہم اللہ کی مہربانی سے یہ کام بھی ہو گیا۔ تقریباً ڈھائی ماہ یہ ادویات دی گئیں اس کے بعد سلطان ہسپتال سے ان کا Digital X-Ray کرایا

گیا۔ جب، ڈاکٹر صاحب نے X-Ray دیکھا تو بہت حیران ہوئے اور خوش بھی کہ ہڈی بہت اچھی طرح جڑ گئی تھی مگر انہوں نے Stand اور وہیل چیئر کا بھی بتایا کہ یہ لازمی ہیں۔ میں نے ساتھ کچھ ایکسر سائز بھی کرانا شروع کیں شروع میں تو خاصی مشکل تھی مگر پھر وہ خود ہی کرنے لگ گئے۔

اسی دوران چونکہ موسم سرما ختم ہو کر موسم گرما شروع ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اور بستر کی گرمی اور لیٹ لیٹ کر انہیں Bed Sore کی شکایت ہو گئی، کبھی Lose Motion بھی ہو جاتے یخنی کی وجہ سے۔ انہوں نے سٹینڈ کے ساتھ چلنا بھی شروع کیا۔ پھر وہیل چیئر پر نہانے لگے۔ ہاں البتہ نماز انہوں نے کبھی نہیں چھوڑی۔ میری سلیکٹ کی گئی ادویات جاری رہیں اور پھر وہ دن بھی آیا کہ وہ خود ہی بغیر سہارے کے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے لگے۔ تاہم ایک فل ٹائم ہیلپر ان کے ہمراہ ہوتا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ ہڈی جڑ ٹھیک طرح گئی ہو پھر بھی اس پر فوری بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ ایک نارمل آدمی کا قد 5 سے ساڑھے 5 فٹ ضرور ہوتا ہے اور بے شک کتنا سمارٹ ہی کیوں نہ ہو، اس کا وزن 60 کلو سے زیادہ ہی ہوتا ہے لہٰذا ہڈی جڑنے کے فوری بعد کم از کم 2 ماہ تک اس پر پورا وزن ہرگز نہ ڈالیں ورنہ پھر مشکل میں پڑ جائیں گے۔ پھر ایکسرے کرا کر تسلی کریں اور آہستہ آہستہ اس کو نارمل بوجھ کی برداشت کی طرف لائیں اور مریض کو پھسلن والے مقامات اور اونچی نیچی جگہوں سے دور رکھیں۔

بہر حال ہم سب گھر والے بہت خوش تھے کہ اب قبلہ والد صاحب خود چلنے پھرنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان کا خیال تھا کہ بس اب مزید ترقی ممکن نہیں بوجہ Age Factor لیکن یہاں اب ان کے اندر کا پاکستانی فوجی بیدار ہو گیا۔ دوسروں کی عدم موجودگی میں انہوں نے از خود ہی کوششیں شروع کر دیں حتیٰ کہ باہر آنا جانا، باتھ روم جانا اور ایک حیران کن بات یہ کہ ریلنگ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنا اور یہ عمل وہ دن میں کئی بار کرتے ہیں۔ خدا انہیں نظر بد سے بچائے اور بغیر سٹینڈ واکر کے گھر میں بھی روزانہ کئی چکر لگاتے ہیں۔

اس ماہ کے کیس سے مندرجہ بالا باتیں واضح ہوتی ہیں:

1- اگر آپریشن ضروری ہو تو کسی ماہر ڈاکٹر/ سرجن سے کرائیں۔ جہاں تمام سہولیات میسر ہوں۔

2- ایلوپیتھک ادویات ہر مریض کو Suit نہیں کرتیں۔

3- ہڈی جوڑنے کے عمل میں ہومیو پیتھک ادویات نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی طرح Bed Sore کے لئے بھی بہت فائدہ مند ہیں کسی اور دوا کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ان میں بہت اچھی Antibiotic بھی ہیں۔

4- خود مریض کی قوت ارادی اور ماحول + Appresiation اس کی شفایابی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ بہت حیران کن رزلٹ سامنے آتے ہیں۔

5- Bone Fracture کے تمام کیسوں میں مکمل احتیاطیں اور صبر کے ساتھ علاج کرنا بہت ضروری ہے۔

اکثر اوقات ساری ساری رات جاگنا پڑتا ہے اور خصوصاً مریض کے پیشاب و براز کو سنبھالنا اور صفائی رکھنا ایک نہایت مشکل مسئلہ ہے۔ مریض کی خوراک کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ مریض کو بار بار پیشاب وغیرہ کی حاجت نہ ہو ورنہ آپ یا تیماردار سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔

اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ دونوں قیمتی فارمولے بھی قارئین کے گوش گزار کر دوں خصوصاً جو

میڈیسن کے متعلق ہیں تا کہ بوقتِ ضرورت انہیں استعمال کر کے فائدہ اٹھائیں اور دیگر ادویات کے پیچھے وقت اور اپنی قیمتی رقم برباد نہ کریں اور نہ ہی ان ادویات کو معمولی سمجھیں کیونکہ یہ ادویات خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے بے بہا تحفہ ہیں:

(1) ادویات برائے ہڈی جوڑنا

(1)Apis MLF 6 1+1+1

(2)CAL-Flour 12 1+1+1

(3)Ferumm Phos 12 1+1+1

(4)Symphatum 6 1+1+1

(5)Calc Phos 12 1+1+1

یہ سب ادویات کی 2-2 گرین وزن کی گولیاں بنوا لیں اور علیحدہ علیحدہ ڈبیوں میں ڈال کر رکھیں۔ خوراک ایک گولی صبح + دوپہر + شام۔

ڈاکٹر صاحبان مریض کے حالات کے مطابق ڈوز تبدیل کر سکتے ہیں۔ ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ساتھ فروٹ ویخنی زیادہ دیں اور صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ ورزش بھی مریض کی برداشت کے مطابق لازمی کرائیں۔ مریض کو حوصلہ دیتے رہیں یہ بہت ضروری اور اہم بات ہے۔ اگر زخم خراب ہونے کا خطرہ ہو تو اگلا نسخہ بھی ساتھ ہی دیں۔ کسی اور دوا کی ان شاء اللہ ضرورت نہیں رہے گی۔

(2) ادویات برائے Bed Sore

(1)Apis 6 1+1+1

(اگر یہ پہلے ہی دے رہے ہیں تو پھر نہ دیں)

(2)Pyrogen 6 1+1+1

(3)Hepr Sulf 6 1+1

(4) ساتھ Pyodine سے زخم صاف کرتے رہیں اور مناسب وقت پر پٹی تبدیل کرتے رہیں۔ آرام آنے تک استعمال کرتے ہیں۔ بیڈ کے اوپر کوئی موٹی کاٹن کی چادر یا کپڑا 3-4 بار تہہ کر بچھالیں تا کہ نیچے سے فوم وغیرہ کی گرمی مریض کو نہ پہنچے۔

ایک دو ضروری باتیں

(1) جب کبھی کسی صاحب کو ضرورت پیش آئے گی تو پھر ان دو نسخوں کی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ یہ لاکھوں روپے کی ادویات سے بھی بہت بہتر ہیں۔ مگر خیال رہے کہ کسی قابل اعتبار ادارے سے ادویات لیں یا پھر ہم سے منگوالیں۔

(2) کئی لوگ مجھے بار بار فضول قسم کے SMS یا بیکار باتوں کے لئے کال کرتے ہیں۔ ان باتوں سے پرہیز کریں۔ میں ہر وقت فارغ نہیں ہوتا میں بھی انسان ہوں اور ایسی حرکات لازمی باعثِ پریشانی بنتی ہیں۔ کیا وہ لوگ مجھے 10 یا SMS 20 کی بجائے 2-3 منٹ کی کال نہیں کر سکتے۔ ایسی حرکتیں باشعور اور سمجھدار لوگوں کے لئے مناسب نہیں۔

(3) کئی بار لکھ کر گزارش کی ہے کہ ٹائم لینے کے بغیر نہ آئیں مگر اس کے باوجود ہماری قوم کی بدعادت ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اس سے پریشانیاں بڑھتی ہیں اگر میں مریضوں سے بہت تعاون کرتا ہوں پھر میں مریضوں کو انکار کر دیا کروں تو پھر میرے خلاف بولنے لگیں گے مگر عقل سے کام نہیں لیتے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر میں کسی ایمرجنسی کام کی وجہ سے موجود نہ ہوا تو پھر۔ بعض لاپروا لوگ ٹائم لے کر بغیر اطلاع غائب کہ جی فلاں کام تھا وغیرہ وغیرہ۔ ان سے بھی گزارش ہے کہ میرے ٹائم اور دوسرے کاموں کا حرج ہوتا ہے اس کو ذہن میں رکھیں تا کہ ان کا یا ہمارا نقصان نہ ہو۔ شکریہ!

نیا جنم

ذہن کے آسمان پر جب یاد کا کوئی شہابِ ثاقب ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کیا واقعی صغریٰ فنا ہوگئی ہے؟ کیا میں پوری طرح زبیدہ بن سکی ہوں؟

محمد سلیم اختر

پہلا فائر ہوتے ہی ہنستے بولتے، بڑکیں مارتے اور نعرے لگاتے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایک مضافاتی گاؤں کے باہر والے اس میدان میں میلے کا سا سماں تھا۔ ہر طرف لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کئی ناچ رہے تھے، کئی گا رہے تھے مگر اب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی شہرِ خموشاں میں کھڑے ہیں۔ لوگ حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑے میدان کے عین وسط میں خون میں لت پت پڑے ہوئے شیر ایسے جسیم کتے کی لاش کو گھور رہے تھے جو کچھ دیر قبل اپنے حریف کی گردن میں دانت گاڑے ہوئے اسے بُری طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔

یکا یک دائرے کی صورت میں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور بھاگتا ہوا کتے کے قریب جا کر بیٹھ گیا جواب سر جھٹک رہا تھا۔ کتے نے آخری بار اپنے مالک کی طرف دیکھا اور ''اوں، اوں'' کی آواز نکالتے ہوئے بمشکل اپنا سر مالک کے قدموں پر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔ یوں لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرے آقا میں اپنے ہم جنسوں کو چیر پھاڑ سکتا ہوں، درندگی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں مگر انسان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں اس کی وحشت اور بربریت سے ہار گیا ہوں۔

کتے کے مالک نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو قمیص کے دامن سے صاف کیا اور آہستہ آہستہ اٹھ کر اس طرف گھوم گیا جہاں چند کرسیاں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے انسانوں کی گردنیں یوں تنی ہوئی تھیں جیسے نعوذ باللہ وہ اس سرزمین پر خدا ہیں۔

''...... چوہدری جی! اس حیوان بے چارے دا کی قصور سی اے بے زبان تے......''

''اوئے کمینے، مسلّی دے پتر! زبان چلاتا ہے ہمارے سامنے''۔ بڑے چوہدری نے گرج کر کہا۔

''کمیوں کے کتے بھی کمی ہی ہوتے ہیں، اس کی یہ جرأت کہ ہمارے کتے کو......''

''پر چوہدری جی! کتے نوں کی پتا کہ......''

ابھی وہ بے چارہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ چھوٹے سرکار غصے سے بھرے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ابھی تک رائفل تھی۔ انہوں نے بڑی سرکار کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''بابا! تسی ایس کتے دے منہ نہ لگو۔ مینوں ایدا علاج کرنا آؤندا اے''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے رائفل کا رُخ اس کے سینے کی طرف کیا اور پھر ٹریگر دبا دیا۔ خاموشی اور سناٹے میں دوسرے فائر کی آواز توپ کے گولے کی طرح گونجی اور لوگ جو ابھی تک ساکت کھڑے تھے، افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ میں نے گنگو مسلّی کو سینہ دبائے گرتے ہوئے دیکھا۔ سرخ سرخ خون نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں نے فوراً اپنا سر ماسی برکتے کی گود میں چھپا لیا اور خوف سے کانپنے لگی۔ گھر واپسی تک میری یہی حالت رہی۔ میں ماسی کے ساتھ جیپ میں بیٹھی تھی۔ اس میں بابا جان اور بھائی جان بھی تھے جب کہ پیچھے ایک کھلی جیپ میں ہمارے محافظ کلاشنکوفیں لئے آ رہے تھے۔

''برکتے! اینوں کی ہویا اے؟'' بابا جان نے مجھے دبکے دیکھ کر ماسی سے پوچھا۔

''سرکار! بی بی جی نے خون کدی نہیں تکیا سی، اس لئے ذرا طبیعت خراب ہو گئی اے''۔

''بابا جی! میں پہلے ہی کہیا سی''۔

''خیر اے پتر عنایت! آخر شیراں دی دھی اے''۔ بابا جان بولے۔

میرے سامنے بابا جان اور بھائی جان اکثر اردو میں بات کیا کرتے تھے تاکہ مجھے شروع سے ہی اردو کی شدبد حاصل ہو جائے مگر اس وقت وہ پنجابی ہی بول رہے تھے۔

"بیٹا! کتے تو ہوتے ہی مالک پر قربان ہونے کے لئے ہیں۔ ان کا خون اگر نہ بہے تو ان کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

"مگر بابا! منگو تو انسان تھا۔ بھائی جان نے اسے کیوں مارا؟" میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ "جھلیئے! جن لوگوں کو ہم کھانے کے لئے دیتے ہیں وہ بھی ہمارے کتوں کی طرح ہی ہوتے ہیں اور کتا اگر مالک پر بھونکنے لگے تو اسے مار ہی دینا چاہئے"۔

"لیکن بابا! وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ بھائی جان نے خود ہی منگو سے کہا تھا کہ وہ اپنا کتا اس کے کتے سے لڑانا چاہتے ہیں، اب اگر منگو کا کتا جیت رہا تھا تو اس میں منگو کا......"

"بند کر منہ اپنا"۔ بھائی نے مڑ کر میری طرف غصے سے دیکھا پھر بابا جان سے کہنے لگے۔ "میں اس لئے اس کو پڑھانے کے خلاف ہوں۔ دیکھیں کس طرح زبان چلا رہی ہے۔ میں تو کہتا ہوں پڑھانے سے کڑیاں خراب ہو جاتی ہیں"۔

اور پڑھائی نے واقعی مجھے خراب کر دیا تھا۔ اب میں انسانوں اور کتوں میں فرق کرنے لگی تھی اور اس بات پر میری اکثر بھائی عنایت سے تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔

❁

میرا تعلق زرخیز پنجاب کے ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں کے لوگ ذہنی طور پر انتہائی بنجر ہیں۔ شاید ان لوگوں نے اپنے ذہنوں کی زرخیز زمین کو، گھروں کی بہار اور باغوں باغیچوں کی اور شخصی آزادی کو حق میرے بابا جانی ایسے چوہدریوں کے حضور بھینٹ چڑھا کر چند لقموں کا سودا کر لیا ہے۔ میں بچپن سے اکثر سوچا کرتی کہ ہمارے سارے مزارعے کتے بن جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس طرح وہ بھائی عنایت کے ظلم اور زیادتی سے تو محفوظ رہتے۔ تب، شاید بھائی عنایت بات بات پر ان کی کھال بھی نہ ادھیڑتے بلکہ الٹا ان کی خدمت کرتے۔ اصلی گھی کی چوری کھلاتے، گرمی سردی سے بچاؤ کا اہتمام کرتے اور اپنے ساتھ ائرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کراتے مگر کتا بننا بھی ہر ایک کے نصیب میں کہاں؟

میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں معمولی معمولی باتوں پر نسلیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ جائیداد، پانی کی تقسیم اور کتوں کی لڑائی جیسے بے وقعت معاملات پر خون بہانا آئے دن کا معمول ہے۔ تھانے اور کچہریاں ان لوگوں کی دیکھی بھالی ہیں۔ اگر کسی بات پر دشمنی کی بنیاد پڑ جائے تو پھر یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے اور ان گنت بے گناہوں کا خون جھوٹی انا اور نسلی دشمنی کے اس کانٹے دار درخت کا رزق بنتا ہے۔

میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوئی کہ اکلوتی بیٹی تھی اس لئے میرے بابا نے میری تربیت اور تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ پرائمری تک میں نے گھر پر ہی پڑھا۔ ہمارے ایک مزارعے نے اپنے لڑکے کی شادی قریبی شہر میں اپنے رشتہ دار کے گھر کی تھی۔ وہ لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ اس نے مجھے ابتدائی تعلیم دی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ سلمٰی باجی نے حویلی آنا چھوڑ دیا۔ بعد میں ماسی برکتے نے بتایا کہ باجی کے شوہر بابا سے اجازت لے کر قریبی شہر منتقل ہو گئے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز باجی مجھے پڑھا رہی تھی کہ اچانک عنایت بھائی جان آ گئے۔

"جناب عالی السلام علیکم!" بھائی عنایت نے خاصا مہذب انداز اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے لہجے میں اجڈپن نمایاں تھا کیوں کہ انہوں نے صرف ابتدائی چند جماعتیں پڑھی تھیں۔ پڑھائی سے زیادہ انہیں شکار، مار کٹائی اور جانور لڑانے کا شوق تھا۔

"وعلیکم السلام!" باجی نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے

اور نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"صغریٰ! تم ذرا بڑے کمرے میں چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری باجی سے کوئی ضروری گل کرنی ہے"۔ عنایت بھائی نے مجھے کہا۔

"مگر بھائی جان! یہ میرے پڑھنے کا وقت ہے میں......"

"برکتے او برکتے!" بھائی نے میری بات کاٹتے ہوئے آواز لگائی۔

"جی سرکار!"

"ذرا صغریٰ کو وڈے کمرے میں لے جاؤ"۔

"اچھا سرکار!" ماسی نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا اور میرے مچلنے کی پروا کئے بغیر میرا ہاتھ تھام کر مجھے میرے کمرے میں لے گئی۔ جاتے جاتے میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ باجی نے یہ کہہ کر کہ وہ بات سننے کے لئے پھر آ جائیں گی باہر نکلنے کی کوشش کی تھی مگر عنایت دروازہ گھیرے کھڑے تھے۔

"استانی جی! اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کھا نہیں جاؤں گا آپ کو میں، میں تے آپ ہی تہاڈا ماریا ہویا آں"۔ یہ آخری الفاظ تھے جو میں سن سکی تھی۔

"ماسی! بھائی جان کو کیا ضروری بات کرنی ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں پتر! ہووے گی کوئی گل"۔ ماسی نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے ماسی کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی دیکھی تھی۔ شاید آنسو ہوں مگر آنسو کیوں تھے؟ اگر بھائی عنایت کو باجی سے کوئی ضروری بات کرنی ہے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ میرا ننھا سا ذہن الجھتا رہا اور میں سو گئی۔

اگلے روز سے باجی نے حویلی میں آنا چھوڑ دیا۔ پھر خبر ملی کہ وہ شہر چلی گئی ہیں۔ میں نے ماسی برکتے سے بہت پوچھا کہ استانی جی اس طرح بغیر بتائے کیوں چلی گئی ہیں مگر وہ بھی ٹال گئیں۔ میرا پڑھنے کا شوق برقرار رہا لیکن ہمارے گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا جب کہ میں پرائمری تک تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ اب میں نے مزید پڑھنے کے لئے ضد شروع کر دی تھی۔ بھائی عنایت نے حسب معمول مخالفت کی مگر بابا کو میری ضد ماننی پڑی اور مجھے قصبہ کے نزدیکی ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میرے لئے ایک تانگا مخصوص تھا جو مجھے صبح اسکول لے کر جاتا اور واپس گھر بھی لاتا۔ ساتھ ہی ہمارا ایک محافظ بھی تانگے میں اپنی مخصوص گن پکڑے موجود ہوتا۔

دن گزرتے گئے اور میں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ میں جانتی تھی اس سے آگے پڑھنے کے لئے مجھے شہر جانا پڑے گا۔ جس کی اجازت ملنا تقریباً ناممکن تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر بابا جان کو قائل کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ میری ہمت سے مجبور ہو کر بابا جان کو ایک بار پھر ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہم لاہور آ گئے۔

لاہور میں میری پھوپھی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کی اپنی فیکٹریاں تھیں اور وہ شہر کے ممتاز صنعت کاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ بابا جان نے ان سے کہا کہ صغریٰ کو اپنے پاس رکھو اور اپنی نگرانی میں کالج بھیجا کرنا۔ پھوپھی جان نے بابا جان کو ہاسٹل کا مشورہ دیا۔ میں بھی اس حق میں تھی کہ ہاسٹل میں رہوں۔ نتیجتاً کافی چھان پھٹک کے بعد مجھے ہاسٹل میں داخل کرایا گیا۔ اس بات کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی کہ ماسی برکتے ملازمہ کی حیثیت سے میرے ساتھ رہے گی۔

شہر اور ہاسٹل کے ماحول نے میرے ذہن کو بہت وسعت بخشی۔ کتے اور انسان کا فرق میرے ذہن میں واضح ہوتا چلا گیا۔ اب میں شدت سے محسوس کرنے لگی

تھی کہ اپنے گاؤں کے گھٹن زدہ اور فرسودہ ماحول میں صرف تعلیم ہی کے ذریعے تبدیلی ممکن ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میری شادی اگر گاؤں ہی کے کسی رشتے دار کے ہاں ہوئی تو میں گھٹن سے مر جاؤں گی۔ میرے سارے کزن مخصوص مزاج کے حامل اور غیر تعلیم یافتہ تھے۔ میں شدت سے یہ چاہتی تھی کہ میں گاؤں میں اسکول کھولوں اور تعلیم کی روشنی عام کروں، مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ میں سوچتی اور کڑھتی رہتی۔

❁

پھر یوں ہوا کہ جیسے گلشن میں چپکے سے بہار آ جائے یا اندھیری رات میں اچانک بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہو جائے۔ وہ جواد تھا جو خوشبو بن کر میرے انگ انگ میں سما گیا اور میرے وجود کو پیار کی مدھر خوشبو سے مہکا گیا تھا۔ میں ہفتے میں ایک دو بار پھوپھی جان کے ہاں چکر لگایا کرتی تھی۔ وہیں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ دل نے تو خیر آنکھیں بند کر کے اس کے حق میں فیصلہ دے ہی دیا تھا، دماغ بھی اس کی راہ میں بچھا رہا تھا۔ جواد نہ صرف ہمارا رشتہ دار تھا بلکہ پڑھا لکھا اور خاصے سلجھے ہوئے ذہن کا مالک تھا۔ مجھے امید تھی کہ جواد بابا جان کے لئے قابل قبول ہوگا۔ پھوپھی جان نہ صرف اس معاملے سے واقف تھیں بلکہ جواد کو مجھ سے ملانے میں درپردہ انہی کا ہاتھ تھا۔ اکثر میں جب ان کے ہاں آتی تو جواد پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا۔ خالص دیہی حسن اور شہر کا تیکھا پن میرے وجود کا حصہ تھا۔ جواد کا دل پہلے ہی سے گھائل تھا وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

''صغریٰ! لگتا ہے قدرت نے دیہات کی خوشبو اور شہر کے رنگ تمہارے وجود میں بڑی نفاست کے ساتھ بکھیر دیئے ہیں۔'' اور میں ہنس دیتی۔

جب میں ایف ایس سی کے امتحانوں سے فارغ ہوئی تو گھر سے بلاوا آ گیا۔ بھائی عنایت کی منگنی تو پہلے ہی رنگ پورے کے چوہدری افضل خان کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔ اب شادی کی تاریخ رکھنا تھی۔ بڑی دھوم دھام سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مایوں اور مہندی جیسی رسموں کے بعد شادی کا دن آن پہنچا اور ہم لوگ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بارات لے کر روانہ ہوئے۔ تقریباً سارا گاؤں بارات میں شامل تھا۔

جیسے ہی ہم رنگ پور میں داخل ہوئے فضا استقبالیہ فائرنگ کے شور سے گونج اٹھی۔ جواب میں بھائی عنایت کے دوستوں اور مزارعوں نے بھی سینکڑوں ہوائی فائر کر ڈالے۔ ہمیں بڑی عزت سے بڑی حویلی میں لے جایا گیا اور ہم عورتیں زنان خانے میں چلی گئیں اور بالا خانے کی جالیوں سے نکاح کی رسم دیکھنے لگیں۔

افضل خان نے پانچ لاکھ روپے حق مہر اور دس ہزار روپے ماہانہ خرچ لکھوا دیا۔ دیگر شرائط بھی رکھیں۔ بھائی عنایت تو کئی شرطوں پر جز بز ہوئے مگر بابا جان نے انہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔ آخر میں افضل خان بولا۔

''قاضی صاحب! یہ بھی لکھیں کہ لڑکی پر خاندان والوں سے ملنے ملانے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی''۔

''افضل خان! کیا مطلب ہے تیرا''۔ بابا جان نے غصے سے پوچھا۔ اس شرط پر بھائی عنایت بھی بھڑک گئے تھے۔

''خان جی! ہم عزت دار لوگ ہیں، ایسی باتیں لکھوانا ہماری شان کے خلاف ہے۔ میں شادی کر رہا ہوں...... غلامی نہیں ہے''۔

مگر افضل خان اڑ گیا۔ بڑھتے بڑھتے بات تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ پھر نوبت ہاتھا پائی تک آ گئی۔ دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں اور کئی لوگ زخمی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارات بغیر نکاح اور دلہن کے واپس آ گئی۔

یہ ہماری بہت بڑی بے عزتی تھی۔ بھائی عنایت تو

اگلے ہی روز اپنے مسلح حواریوں کے ساتھ رنگ پور پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہے تھے مگر آس پاس کے کئی زمیندار اور چوہدری بیچ میں پڑ گئے اور یہ خون خرابہ ٹل گیا لیکن راضی نامہ نہ ہو سکا۔ بھائی عنایت نے قسم کھائی تھی کہ وہ افضل خان سے اس بے عزتی کا بھیانک بدلہ لیں گے۔ ہمارے تمام گاؤں نے رنگ پور والوں کا ہر طرح سے بائیکاٹ کر دیا اور ایک مستقل دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ کئی دن تک ماحول کشیدہ رہا پھر حالات معمول پر آ گئے۔

❁

میں جب حویلی میں اکتا جاتی تو چچا انور کے گھر چلی جاتی۔ چچا انور تھے تو ہمارے ہی رشتہ دار مگر مالی لحاظ سے کچھ کمزور تھے۔ اس وجہ سے بابا جان اور دیگر برادری کے لوگ ان سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ انور چچا بہت ہی اچھے انسان تھے اور مزاجاً بھی چوہدریوں سے خاصے مختلف تھے۔ خصوصاً ان کی لڑکی زبیدہ جو میری ہم عمر تھی اَن پڑھ ہونے کے باوجود بڑی سلجھی ہوئی تھی۔ بھائی عنایت خاص طور پر ان کے گھر جانے پر بُرا مناتے مگر میں نے اپنے معمولات جاری رکھے۔

میں اب میڈیکل میں پہنچ چکی تھی۔ جواد کی محبت کی نرم و نازک کونپل اب تناور درخت بن چکی تھی۔ ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ شادی کے بعد میں اپنے گاؤں میں چھوٹا اسپتال بناؤں گی اور جواد میری بھرپور مدد کرے گا۔

''صغریٰ! ڈاکٹر بننے کے بعد اپنے مریض کو بھول نہ جانا''۔ ایک دن جواد نے کہا۔

''کیا مرض ہے تمہیں؟''

''اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا!'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''جناب عالی! بندہ بیماری عشق میں مبتلا ہے اور سیانوں نے اس مرض کا جو علاج تجویز کیا ہے اس کے درمیان ایم بی بی ایس کی ڈگری حائل ہے۔ گویا چار سال مزید ہیں ابھی اس آگ میں جلنے اور کڑھنے کے لئے''۔

''ایک اور علاج بھی ہے''۔ میں نے کہا۔

''غالب نے بہت پہلے کہا تھا کہ — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا — اور اگر خلل دماغ میں ہو تو بہتر ہوتا ہے پاگل خانے سے رابطہ قائم کیا جائے۔ کیا خیال ہے جناب کون سے پاگل خانے میں رہنا پسند کریں گے؟''

''بھئی یہ پاگل خانے کون جا رہا ہے؟'' یہ پھوپھو اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

''کک...... کوئی نہیں پھوپھو...... وہ تو جواد کوئی بات کر رہے تھے کہ پاگلوں کا تذکرہ چھڑ گیا''۔ مجھ سے بدحواسی میں کوئی معقول بات نہ بن پڑی۔

''بس اتنی ہی ہمت تھی، صاف کیوں نہیں کہتی کہ مجھے پاگل کہہ رہی تھی''۔

''تو کیا غلط ہے؟'' پھوپھو مسکرائیں۔ ''پاگل تو تم ہو ہی''۔

''میں اسے یہی فرق سمجھانا چاہ رہا تھا کہ پاگل پن کا تعلق دماغ سے بھی ہوتا ہے اور دل سے بھی''۔

''دل سے!'' میں ہنس پڑی۔

''ہاں دل سے''۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''اگر دماغ چل جائے تو علاج پاگل خانے سے لیکن اگر دل کسی پر آ جائے تو پھر ایک علاج ہے شادی، کیوں پھپھو!''

''ارے ہاں صغریٰ! شادی پر یاد آیا، تمہارے انکل بتا رہے تھے کہ گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ افضل خان کے بیٹے ناصر خان کی شادی انور کی بیٹی زبیدہ سے طے پا گئی ہے''۔

مجھے یوں لگا کسی نے میرے عین سر پر توپ چلا دی ہو۔ میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''رنگ پور والا افضل خان؟''

''ہاں وہی۔ وہ آدمی بتا رہا تھا کہ حالات بہت

نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہارے بابا اور عنایت نے کھلم کھلا اعلان کر دیا ہے کہ اگر رنگ پور والے بارات لے کر آئے تو ان کی لاشیں ہی واپس جائیں گی۔ ادھر افضل خان بھی کہتا پھر رہا ہے کہ وہ مرد ہیں، ڈرنے والے نہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ کون انہیں روکے گا''۔

''اللہ خیر کرے''۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پھپھو! مجھے تو کسی بڑے خون خرابے کے آثار نظر آ رہے ہیں''۔

''تسلی رکھو''۔ جواد نے کہا اور پھر پھپھو سے مخاطب ہوا۔

''آنٹی! آپ انکل سے کہیں نا کہ وہی اس معاملہ میں کچھ کریں''۔

''وہ ہم سے زیادہ پریشان ہیں بیٹے! وہ خود بھی گاؤں جانے والے ہیں''۔

میں نے اگلے روز ہی چھٹی کی درخواست دے دی اور گاؤں روانہ ہوگئی۔ روانگی کے وقت جواد بھی موجود تھا۔

''جواد! پتا نہیں حالات کیا رُخ اختیار کریں؟''

''مت کرو مایوسی کی باتیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور تم واپس بھی آ ؤ گی ورنہ مجھے پاگل خانے میں کون داخل کرائے گا''۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے مایوسی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''اور دیکھو، تم مجھے ہر حال میں اپنا منتظر پاؤ گی''۔

پھر کار چل پڑی۔

راستے میں تمام وقت میری آنکھوں کے سامنے کٹے پھٹے مجروح جسم اور خون کی سرخی گردش کرتی رہی۔ جانے کب ان جاہلوں کو ہدایت نصیب ہوگی، کب انا اور جھوٹی عزت کی خاطر انسان کا خون بہنا بند ہوگا اور ہمارا معاشرہ امن و آشتی کی فضا میں سانس لے گا؟ میں یہی کچھ سوچتی رہی۔

گھر پہنچی تو ایک عجیب سی سوگواری طاری تھی۔ عالی شان حویلی کے در و دیوار سے وحشت سی ٹپکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نوکر اور مزارعے یوں سہمے سہمے پھر رہے تھے جیسے طوفان کی آمد متوقع ہو۔ گھر میں میرا استقبال کرنے کے لئے کوئی بھی موجود نہ تھا سوائے ملازموں کے۔ میں اندر داخل ہوتے ہی بے تابانہ بابا کرمو سے پوچھا۔

''کرما! بابا جان اور بھائی عنایت کہاں ہیں؟''

''بی بی سرکار! وہ انور صاحب سے ملنے گئے ہیں''۔

''انور چاچا!'' میرے ذہن میں اندیشوں نے اپنے زہریلے پھن اٹھانا شروع کر دیئے۔

''کس وقت گئے ہیں۔ خیریت تو ہے۔ ساتھ بندے اور اسلحہ تو نہ تھا''۔

''نہ جی نہ، سرکار کہہ رہے تھے کہ چوہدری انور کو سمجھانے جا رہے ہیں۔ اگر اس نے چوہدری جی کی گل نہ منی تے فیر......'' کرمو نے میرے کڑے تیور دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے جیسے ہی بابا اور بھائی عنایت واپس آئیں مجھے فوراً اطلاع کرنا''۔ پھر میں برکتے کی طرف مڑی۔ ''ماسی! میں ذرا آرام کے لئے جا رہی ہوں، تم میرے نہانے کے لئے انتظام کرا دو''۔

''سرکار! کوئی چا لسی؟''

''نہیں بابا کے ساتھ ہی چائے پیوں گی''۔

بابا اور بھائی شام کو گھر واپس آئے۔ میں آرام کرنے کے بعد نہا کر تازہ دم ہو چکی تھی۔ بھائی عنایت نے تو خیر حسب معمول رسمی اور اکھڑے ہوئے لہجے میں سلام دعا کی۔ البتہ بابا مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عنایت بھائی سے مخاطب ہوئے۔

''اوئے عنایتا! بہن کے ساتھ بھی ذرا ہنس بول لیا کر۔ اتنے دیہاڑوں کے بعد تو گھر آئی ہے، میری ڈاکٹر شہزادی۔'' بھائی سر جھکائے ہوئے اندر چلا گیا۔ ''صغریٰ! تو غم نہ کیتا کر، اس کی عادت ہی ایسی ہے ورنہ بڑی محبت کرتا ہے تجھ سے''۔

''محبت اور مجھ سے؟ نہیں بابا! بھائی جان کو اپنے کتوں اور جھگڑوں سے ہی کہاں فرصت ملتی ہے جو میرے بارے میں سوچیں گے۔ مجھ سے تو وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے''۔

''اوئے پاگلے! اسی طرح نئیں سوچی دا۔ بس ذرا نواں نواں جوان ہے، فیر چوہدری بچہ ہے۔ شیر کی طرح اکھڑ تو ہوگا''۔ بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بابا! چائے کا وقت ہو گیا ہے، آج میں بھی آپ کے ساتھ چائے پیوں گی''۔

''ٹھیک ہے، میں ذرا باہر سے ہو آؤں۔ کچھ بندے آئے ہوئے ہیں پھر چائے بھی پئیں گے اور گلاں باتاں بھی کریں گے''۔

چائے پر بابا جان کے ساتھ بھائی عنایت بھی تھے۔ میز پر طرح طرح کے میوے چنے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی کچھ خاص دیہاتی پکوان بھی رکھے تھے۔ میں نے حیرت سے ماسی برکتے کی طرف دیکھا۔

''ماسی! یہ سارا انتظام کس نے کیا ہے؟''

''بی بی سرکار! وڈی سرکاراں نے کیتا سی''۔ ماسی نے بابا کی طرف اشارہ کر دیا۔

''ہاں بھائی! میں ہی کہیا سی دھی اے شہر میں رہ کر تینوں وی ڈائٹنگ شیٹنگ دی ہوا لگ گئی اے۔ کچھ کھایا پیا بھی کرو''۔

''میں کہاں ڈائٹنگ کرتی ہوں بابا! خوب تو کھاتی ہوں''۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چوہدریاں دی کڑیاں وی شیرنیاں ہوندیاں نے''۔ بھائی عنایت جو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے بول

پڑے"۔ شہر دے مرد زنانیاں تے زنانیاں چھپکلیاں"۔

"اس لئے جب کوئی چھپکلی گاؤں میں آ جائے تو پھر یہ شیر اس کے آگے پیچھے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کر لینا کسی بھینس سے شادی جس کو ڈولی چڑھانے کے لئے کرین منگوانی پڑے"۔

"ہو گیا جھگڑا شروع، پہلے چائے پی لو پھر جھگڑتے رہنا"۔

"بابا زبیدہ"۔

"لو بھئی! ایہہ خبر بھی ہے اینو"۔ بابا مسکرا دیئے۔

"ہاں، دمی اے چوہدری انور نے سارے گاؤں اور جرگے کے فیصلے کے خلاف اپنی بیٹی کا رشتہ رنگ پور والوں کو دے دیا ہے۔ بڑی بے عزتی کی ہے اس نے"۔

"مگر بابا اس میں بے عزتی......"

"ہو گئی شروع تیری وکالت"۔ بھائی عنایت کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ انہوں نے بابا کی موجودگی کے پیشِ نظر اپنے تپتے ہوئے لہجے پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"بے غیرتی نہیں ہے تو ہور کی اے۔ اس کو پتا نہیں کہ رنگ پور والوں نے چوہدریوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ کیا جرگے کا فیصلہ اور برادری کی عزت چوہدری انور کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ذرا وی لاج نہ آئی اونوں"۔

"وہ بیٹی والا ہے، بھائی جان! آخر کہیں تو اس نے رشتہ دینا ہی تھا"۔

"تو کیا برادری میں لڑکے ختم ہو گئے تھے؟"

"ختم تو نہیں ہو گئے مگر اس کے لئے سب کے دروازے بند ہیں۔ کون پوچھتا ہے برادری میں اسے؟ کون شادی کرے گا اس کی بیٹی سے، آپ کریں گے؟" میں نے براہ راست بھائی عنایت سے سوال کر دیا۔

وہ اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گئے سٹپٹاتے ہوئے بولے۔ "مم...... میں...... میں کیوں کروں گا اس فقیر کی بیٹی سے شادی؟"

"آپ نے دیکھ لیا بابا! کوئی چاچا انور کو حقیر سمجھتا ہے، کوئی انہیں فقیر کہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی حویلی میں نہیں رہتے اور ان کے پاس سینکڑوں مربع زمینیں نہیں ہیں۔ وہ بے چارے زبیدہ کی شادی کریں تو کہاں کریں؟ برادری کے علاوہ گاؤں میں کمیوں اور مزارعوں کے علاوہ کون ہے۔ کیا ان میں کر دیں؟ کیا عزت رہ جائے گی سب کی؟"

"توں ٹھیک کہنی اے دھیئے پر......"

"نہیں بابا جانی! اس معاملے میں آپ کو سوچنا پڑے گا۔ آخر چوہدریوں کی اپنی لڑکیاں نہیں ہیں کیا؟ رنگ پور والوں سے ہماری دشمنی ہے مگر ہیں تو وہ خاندانی لوگ۔ اگر چوہدری انور کی بیٹی خاندان میں بیاہی جائے تو ہماری بھی عزت ہے ورنہ کون پوچھے گا اسے؟"

"ٹھیک ہے پتر!" بابا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ پھر عنایت بھائی سے مخاطب ہوئے۔

"عنایتا! بندیاں نوں منع کر دے۔ ہور گل سن۔ جیہڑے مفرور منگوائے سن انہاں نوں وی کج دے دلا کے واپس کر دے"۔

"بس کوئی گل نہیں کرنی؟" بابا نے عنایت کی بات کاٹ دی۔ "صغریٰ ٹھیک کہندی اے۔ انور جیسا بھی ہے، ہے تو ہماری عزت۔ تم فکر نہ کرو، بس ذرا افضل خان کی فصلیں پکنے دو پھر دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں؟"

بھائی عنایت کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

"بابا! یہ مفرور کیوں آئے تھے؟"

"جھلیئے! ایسے کام مفروروں اور ڈاکوؤں ہی سے کرائے جاتے ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ہاتھ گندے

کرنے کی۔ پروگرام یہ تھا کہ بارات والے دن تو ہم شہر چلے جاتے اور جب نکاح کے بعد بارات واپس ہونے لگتی تو ہمارے لوگ افضل اور اس کے بیٹے اور دلہن کو اغوا کر کے جنگل میں لے جاتے اور پھر ان کا نام و نشان بھی نہ ملتا"۔

"اب تو آپ عنایت کو سمجھائیں گے نا!"

"ہاں بھئی سمجھاؤں گا۔ بس تُو فکر نہ کر، جا ذرا آرام کر لے"۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے اصرار پر بابا نے برادری کے جرگے کو اکٹھا کر کے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور سب کے مشورے سے طے پایا کہ انور کی بیٹی کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی مگر برادری والے اس میں شرکت نہیں کریں گے۔ مجھے اس فیصلے کی اطلاع ہوئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ایک بڑا خون خرابہ ٹل گیا ہے۔ حالات پُرسکون تھے مگر جانے کیوں چھٹی حس رہ رہ کر مجھے احساس دلا رہی تھی کہ اس خاموشی کی تہہ میں کوئی بڑا طوفان پوشیدہ ہے۔ خصوصاً بھائی عنایت کا رویہ زیادہ ہی پُراسرار ہو گیا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خاموش اور الگ تھلگ رہنے لگے تھے، اکثر گھر سے غائب بھی رہتے۔ میں نے کئی بار بابا سے عنایت بھائی کے رویے کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہنس کر ٹال جاتے۔

"توں فکر نہ کر صغریٰ! میں نے اس کو چنگی طرح سمجھا دیا ہے وہ کچھ نہیں کرے گا"۔

"مگر بابا! مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں کچھ ہو نہ جائے"

"عنایت کچھ نہیں کرے گا بس اپنے انور چچا سے کہہ دینا کہ وہ افضل خان سے کہے کہ بارات کے ہمراہ معمول سے زیادہ اسلحہ نہیں ہونا چاہئے۔ شرافت سے آئے اور عزت سے واپس چلا جائے۔ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی یا اس کے آدمیوں نے ہمارے خلاف بڑھکیں ماریں تو پھر میری ذمے داری نہ ہو گی۔ اب ساری ذمے داری افضل خان کی ہے کہ کیسا رویہ اختیار کرتا ہے۔ شام کو چلی جانا اپنے چاچے کے گھر اور اس کو اچھی طرح سمجھا دینا ساری بات"۔

میں خود بھی کئی روز سے زبیدہ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اب بابا کی اجازت ملتے ہی میں سرِ شام ہی ان کے ہاں چلی گئی۔ زبیدہ مجھے دیکھتے ہی گلے کا ہار بن گئی۔ "بڑی جلدی خیال آ گیا میرا؟ میں کب سے انتظار کر رہی تھی تمہارا"۔

"تم ہی آ جاتیں"۔

"آ تو جاتی مگر تمہارے بھائی سے ڈر لگتا ہے۔ ہمارے خاندان سے تو اس کو خواہ مخواہ کی چڑ ہے"۔

"اسے کسی سے چڑ نہیں ہے، یہ بتاؤ چاچا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ تم اندر بیٹھو میں انہیں بلاتی ہوں"۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں چاچا بھی آ گئے۔ ایک تو وہ شادی کے انتظامات کی وجہ سے ہلکان تھے۔ اوپر سے برادری والوں کی دھمکیوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ ان کے چہرے اور ماتھے پر غور و فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ساری برادری میں ایک میں ہی تو تھی جو انہیں عزت دیتی تھی۔ ان کے ہاں آتی جاتی تھی اور ان کو اپنا سمجھتی تھی۔ وہ لپکتے ہوئے میری جانب بڑھے۔

"بھئی آج تو خدا سے جو چ کچھ بھی مانگتے مل جاتا۔ بیٹی! میں تمہیں یاد کر رہا تھا۔ ٹھیک تو ہو تم؟" چاچا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں خود آنا چاہتی تھی"۔ میں نے کہا۔

"بابا نے منع کر دیا ہو گا"۔ انہوں نے افسردگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے، آج تو انہوں نے مجھے خود یہاں بھیجا ہے''۔

''خود انہوں نے؟''

اس کے بعد میں نے تمام حالات ان کے گوش گزار کر دیئے اور انہیں بابا اور برادری کے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا۔

''بیٹی! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے ہم سب کی عزت رکھ لی ہے''۔ چاچا کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ انہوں نے کاندھے پر رکھی ہوئی چادر سے آنسو صاف کیے اور بولے۔ ''کاش! ہم سب چوہدریوں کو بھی ایسا ہی شعور اور سمجھ ملی ہوتی''۔

زبیدہ کی شادی میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ نہ صرف میں بلکہ ہمارے مزارعوں کی کئی لڑکیاں جنہیں میں نے بابا سے خاص طور پر اجازت دلائی تھی، تیاریوں میں زور و شور سے مصروف تھیں۔ شور ہنگامے، قہقہے، کنواری لڑکیوں کی معنی خیز سرگوشیاں اور بیاہ کے گیتوں سے گھر میں بھونچال سا آیا تھا۔ رات خاصی دیر میں جب میں گھر لوٹی تو عنایت بھائی کو بابا کے پاس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ''کہیں خدانخواستہ'' میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی اور آہستہ سے ان کے قریب چلی گئی۔ بابا بھائی سے کہہ رہے تھے۔

''پتر رات زیادہ ہو گئی ہے، صبح چلے جانا''۔

مگر عنایت بھائی کہنے لگے۔ ''نہیں بابا! ساتھ کے بندے تیار ہیں۔ ویسے بھی ابھی چلا جاؤں گا تو کل وقت پر واپس آ سکوں گا''۔

''ٹھیک ہے جیویں تیری مرضی''۔

عنایت بھائی مڑے اور میری طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

''بابا! بھائی اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟''

نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں!
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں!
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

''سب خیر ہے پتر! ذرا شہر تک جا رہا ہے۔ یوں بھی صبح رنگ پور والوں کی جج ہے۔ اچھا ہے تیرا بھائی یہاں نہ ہو ورنہ یہ گرم دماغ کسی وقت بھی ہنگامہ کر سکتا ہے۔ تو فکر نہ کر، جا شاباش جا کے آرام کر''۔

تھکی ہوئی تو تھی ہی، بستر پر گرتے ہی پلکیں ایک عرصہ کے بچھڑے اور ترسے ہوئے عاشقوں کی طرح باہم ایک دوسرے میں گویا پیوست ہو گئیں۔ پھر صبح میری آنکھ برکتے کے جھنجھوڑنے پر کھلی۔ ''چھوٹی بی بی...... سرکار! اٹھیں جلدی کریں''۔

''کیا قیامت آ گئی ہے، کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' میں نے جھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں حیران بھی تھی کہ برکتے کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تمام اداب آداب بھول کر بلند آواز میں باتیں کر رہی ہے۔ کہاں تو اس کی آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔

''سرکار! وہ زبیدہ بی بی غائب ہے گھر سے۔ ابھی ابھی رحمتاں بتا کر گئی ہے''۔

''کک...... کیا؟ زبیدہ غائب ہے۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ رات کو تو گھر پر ہی تھی''۔ میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑا میرے سر پر دے مارا ہو۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں

نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور بھاگم بھاگ چاچا کے گھر پہنچ گئی۔

وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ''بیٹی! وہ زبیدہ''۔ اس کے آگے آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ''پتر! میں نے ساری زندگی میں یہی ایک عزت جوڑی تھی، آج وہ بھی لٹ گئی برباد ہوگئی''۔

''مگر چاچا! وہ رات کو تو اِدھر ہی تھی۔ زمینوں پر اور اِدھر اُدھر دیکھیں۔ یہیں کہیں اڑوس پڑوس میں ہوگی''۔

''نہیں بیٹا نہیں، وہ گاؤں میں نہیں ہے۔ رحمتے کے گھر والا رات کو کھیتوں میں ہی تھا۔ اس کا پانی کا نمبر تھا اس نے بتایا ہے کہ تین چار بندے ایک لڑکی کا منہ دبائے گاڑی میں ڈال رہے تھے پھر وہ شہر والی سڑک کی طرف چلے گئے۔ وہ بے چارہ اکیلا تھا، خوف کے مارے کچھ نہ بولا''۔ چاچا کے آنسو ختم ہو چکے تھے، ہم برآمدے میں رکھے موڑھوں پر بیٹھ گئے، ان کے لہجے میں اب بے چارگی اتر آئی تھی۔

''ویسے بھی وہ اپنے مالکوں کے خلاف کچھ نہ کرسکتا تھا۔ وہ غریب جو کرسکتا تھا اس نے کیا۔ رحمتے کو سویرے سویرے خبر دے کر ہمارے ہاں بھیج دیا تھا کہ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو کرلو''۔

چاچا کے ٹوٹے ہوئے لہجے کی تلوار میرے دل میں ترازو ہو گئی پھر یکا یک میرے ذہن میں دھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ میری رگوں میں دہکتا ہوا لاوا گردش کرنے لگا اور احساس شرمندگی کی آگ میں میرا سارا وجود جلنے لگا۔ کاش! زمین پھٹتی اور میں اس میں سما سکتی۔

بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بھائی عنایت کے انتقام کی آگ بھڑک چکی تھی۔ زبیدہ تو اس کے انتقام کی بھینٹ چڑھ ہی چکی تھی۔ اب جانے مزید اور کتنے خاندان اور کتنی نسلیں اس کا ایندھن بنیں گی۔ اب مجھ میں وہاں بیٹھنے کی سکت نہ رہی۔ میں چاچا کا سامنا نہیں کرسکتی تھی۔ ''میں ابھی جا کر بابا کو بتاتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا''۔ میں اٹھی اور تیزی سے گھر کی طرف بھاگی۔

بابا کو غالباً اس واقعے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ وہ بھی پریشان بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی بھاگتی ہوئی ان کی آغوش میں سما گئی اور ان کے سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔

''بابا! یہ کیا ہوگیا ہے بابا؟'' الفاظ میرے منہ سے کرچی کرچی ہو کر نکل رہے تھے اور ان سے پیدا ہونے والے زخموں کی کسک میری روح تک پہنچ رہی تھی۔

''خیر اے پتر خیر اے! کچھ کرتے ہیں''۔ بابا کے لہجے میں عزم تھا۔ انہوں نے فوراً ہی انور چاچا کو حویلی بلا بھیجا اور برادری کے معززین کی طرف آدمی دوڑا دیئے۔ کچھ ہی دیر میں سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ایک وفد افضل خان سے ملنے جائے اور اسے تمام صورت حال بتا کر شادی ملتوی کی جائے۔ ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دور سے شہنائیوں اور ڈھول کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی تو سب لوگ چونک اٹھے بابا اور انور چاچا کے منہ سے آہ نکل گئی اور ان کا رنگ زرد ہوتا چلا گیا۔

''اب کیا ہوگا بھائی جی!'' انہوں نے بے چارگی سے بابا کی طرف دیکھا۔

سب لوگ دم بخود تھے کہ اب کیا ہوسکتا ہے۔ بارات کچھ ہی دیر میں گاؤں میں داخل ہو جاتی اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا وہ ناقابل تصور تھا۔

بابا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چاچا کے قریب چلے گئے۔ انہوں نے شاید زندگی میں پہلی بار

شفقت اور محبت سے چاچا کو مخاطب کیا۔ بابا چاچا کو آغوش میں بھرتے ہوئے بولے۔ ''انور! توں فکر نہ کر۔ غلطی ساڈے منڈے دی اے، معافی وی اسی ای منگاں گے۔ میں آپے ای افضل خان نال گل کراں گا''۔

انہوں نے معززین کو اشارہ کیا تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ٹھہریں بابا! آپ معافی نہیں مانگیں گے''۔ میں نے ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو کر کہا تو سب کی نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔

وہ ایک انقلاب آفریں لمحہ تھا۔ جانے وفا، خلوص، ایثار اور محبت میں گندھے مشرقی عورت کے خمیر کا کرشمہ تھا یا چاچا انور کے ٹوٹے ہوئے دل سے نکل کر عرش کو ہلا دینے والی کسی آہ کا معجزہ کہ اس ایک لمحے سب کچھ بدل گیا تھا۔ سب کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''بابا! ان لوگوں سے کہیں کہ جا کر بارات کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ سارا گاؤں اس شادی میں شریک ہوگا''۔

''لیکن بیٹی! زبیدہ تو.....''

چاچا انور نے حیرت زدہ ہو کر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''آپ لوگ استقبال کی تیاریاں کریں۔ زبیدہ کو ڈولی میں بٹھانے کی ذمے داری میری ہے جلدی کریں''۔

بابا نے لوگوں کو تیاری کرنے کو کہا اور خود چاچا کو ساتھ لئے ہوئے حیران حیران سے میرے پیچھے اندر آ گئے۔

''بیٹی! جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟ تم زبیدہ کو کہاں سے لاؤ گی؟''

''ہاں بیٹی! کہاں ہے زبیدہ، تمہیں کیسے پتا چلا؟'' چاچا بھی بے تابی سے بول پڑے۔ میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا کہ زبیدہ کس طرح ڈولی میں بیٹھے گی۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا مگر پھر انہیں میری بات ماننی پڑی کہ میں زبیدہ کو ڈولی میں بٹھا سکتی ہوں۔

''تیرے جئی دھی توں ہزاراں عنایت قربان''۔ بابا نے کہتے ہوئے بے اختیار مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

بارات گاؤں میں داخل ہونے سے قبل ہی بابا برادری کا وفد لے کر افضل خان سے ملنے چلے گئے پھر تمام معاملات بخوبی طے پا گئے۔ افضل خان کے بیٹے ناصر خان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام گاؤں والوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دن ہمارے گاؤں میں اور رنگ پور والوں کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک نیا رشتہ استوار ہوا اور ناصر خان اپنی دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر لے گیا۔

❁

آج زبیدہ کی شادی ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اس کے دو بچے ہیں جو لاہور میں پڑھتے ہیں۔ خود ناصر تعلیم بالغاں کے سینٹر میں پڑھ رہا ہے۔ زبیدہ نے اپنے حسن و خلوص اور پیار و محبت سے سب کے دل جیت لئے ہیں اور بہتر زندگی گزار رہی ہے۔ مگر ٹھہریے قارئین! آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ زبیدہ کو تو عنایت نے اغوا کر لیا تھا پھر وہ کس طرح ڈولی میں بیٹھ گئی؟

قصہ یہ ہے کہ میں جب بابا اور چاچا کے ساتھ اندر آئی تو انہوں نے یہی کہا تھا۔ چاچا نے پوچھا تھا۔ ''ہاں بیٹی! کہاں ہے زبیدہ، تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''آپ مجھے اپنی زبیدہ نہیں سمجھتے؟'' میں نے بھی جواباً پوچھا تھا۔

میری بات سن کر بابا بھی چونک پڑے تھے۔ ''کی مطلب ہے پتر؟''

''مطلب یہ ہے کہ بابا کو زبیدہ نہ سہی تو صغریٰ ہی سہی۔ رنگ پور والوں کی ڈولی آج اگر خالی چلی گئی تو پ

دشمنی کی بھڑکنے والی آگ سے ہم سب کے دامن جل جائیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے بابا کہ میں اپنی آرزوؤں اور خوشیوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔ آنے والی نسلوں کو نفرت کی آگ سے بچانے کے لئے خود کو مٹا دوں گی اور ایک ایسے درخت کی شکل اختیار کرلوں گی جس کی شاخوں پر نفرت کے کانٹوں کی جگہ محبت کے پھول کھلیں گے۔ جس کے سائے میں انا رپست بھیڑیوں کی جگہ منزل کے متلاشی مسافر سکون حاصل کریں گے اور جس کی ڈالیوں پر آدم خور گدھ نہیں امن و آشتی کی فاختہ اپنا گھونسلہ بنائے گی''۔

میں نے عزم سے کہا اور سر جھکائے ہوئے اندر چلی گئی۔ میں جانتی تھی کہ بابا اور چاچا انور آخر میرے فیصلے کو مان لیں گے۔

اس سے پہلے کہ خواتین مجھے دلہن بنانے اندر آئیں میں نے کاغذ قلم لیا اور جلدی جلدی چند سطریں گھسیٹ دیں۔ میں چاہتی تھی کہ رخصتی سے قبل یہ خط لاہور والی پھپھو کو دے دوں تاکہ وہ اسے جواد کے حوالے کردیں۔ میں نے لکھا تھا۔

''ڈیئر جواد! خود مجھے بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کرنے جارہی ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم جو زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے آخری بار ہم کلام ہیں لیکن شاید یہی زندگی ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہو پاتا اور جو کچھ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا، حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں مگر جواد! تم سے محبت کرنے والی صغریٰ آج ایثار و وفا کی بھٹی میں جل کر خاک ہو جائے گی اور اس خاک سے زبیدہ جنم لے گی۔ کوری اور کنواری زبیدہ جس کے جسم و روح کا مالک اب رنگ پور کا وارث ہوگا۔ اپنی نسلوں کو اور اپنے ماحول کو محبت کی ایک نئی دنیا میں بسانے کے لئے میرا یہ نیا جنم بہت ضروری تھا۔ بہت ضروری۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ فقط تمہاری مجرم...... صغریٰ (مرحوم)

❁

میرے اس اقدام سے بابا نے پہلی بار عنایت کو پیٹ ڈالا تھا۔ شاید یہ اس مار کا غم تھا یا میرا غم کہ بھائی عنایت نمازی بن گئے۔ انہوں نے ہر برائی سے توبہ کرلی اور زبیدہ آج بڑی حویلی میں ان کے تین پیارے پیارے بچوں کی ماں بن کر راج کر رہی ہے۔ ادھر میرے سسرال میرے احسان مند بھی ہیں اور میرے گرویدہ بھی۔ خصوصاً رنگ پور کے لوگ تو میرے حسن سلوک کے زرخرید غلام ہیں اور میں گاؤں بھر میں ''استانی جی'' کے لقب سے مشہور ہوں۔ چھوٹے بڑے سب میری عزت کرتے ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں کبھی کبھار رات کے پچھلے پہر درد کی ایک لہر میرے وجود میں پھیل کر مجھے بے چین کردیتی ہے۔ نیند سے بے زار کردیتی ہے۔ ایسے میں ذہن کے آسمان پر جب یاد کا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کیا واقعی صغریٰ فنا ہو گئی ہے؟ کیا میں پوری طرح زبیدہ بن سکی ہوں؟

❁

ہمارا میڈیا

محلے کی وہ پھپھے کٹنی مائی ہے جو اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر لگانے میں مصروف رہتی ہے۔ بدقسمتی سے میڈیا آزادی ملنے کے بعد صرف سیاسی بندروں کی اُچھل کود پر ہی فوکس کرتا آرہا ہے۔ ''ضربِ غضب'' آپریشن کہاں گیا؟ شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز اور تھر کی موجودہ صورتِ حال کہاں گئی؟

میڈیا کی صورت میں ہم پر مختلف لابیز مسلط کر دی گئی ہیں جن کا کام اپنی اپنی سوچ کے مطابق مائنڈ سیٹ ترتیب دینا ہے۔

سرِ بازار می رقصم!

عشقِ حقیقی ایسی لگن ہے جو اہل خرد اور دانا لوگوں کو اپنی طرف
مائل کرتی ہے، جس کے باعث وہ معبود کی طلب میں اس قدر
مستغرق ہو جاتے ہیں کہ وہی ان کا دین اور وہی مسلک ٹھہرتا ہے۔

☆ ---------------------------------0345-6875404-------------------- ڈاکٹر مبشر حسن ملک

دن کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، تاریکی ہر طرف ڈیرے ڈال چکی تھی۔ پیر جابر شاہ نے وقت کا اندازہ کیا اور سمٹا سمٹا سا پیر خانے سے باہر نکل آیا۔ پھر اس نے چادر سے اپنا بدن ڈھانپ لیا۔ وہ اپنا مشن خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ باہر اس کی جیپ تیار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے چابی جابر شاہ کے حوالے کر دی، جو تنہا اپنی منزل کی طرف رواں ہو گیا۔

بی بی نیکو سرشت کے ڈیرے پر محفل برپا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس آستانے پر خواتین کی محفلیں عموماً سجا کرتی تھیں۔ اس ماحول میں اسے اپنے وجود میں انجانی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا جیسے تپتی ہواؤں میں یخ آبی چشمے کی پھوار روح تک اتر جائے۔ پھر یہ سرور اُس کے بدن میں پھیلتا گیا۔ وہ بے ساختہ وہیں بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایسے روحانی کیف سے روشناس ہوا تھا۔

''فقر دشوار مگر عظمت میں لاثانی ہے''۔ اس کے منہ سے نکلا، اس نے آہ بھری۔

چاند تاروں میں تُو مرغزاروں میں تُو اے خدایا!
کس نے تیری حقیقت کو پایا
تُو نے پتھر میں کیڑے کو پالا
خشک مٹی سے سبزہ نکالا
ان بہاروں میں تُو، ان نظاروں میں تُو اے خدایا!
کس نے تیری حقیقت کو پایا

نسوانی نوائیں ہال میں گونج رہی تھیں اور کھلی کھڑکیوں کے راستے روشنی کے ہمرکاب گرد و پیش میں پھیل رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں مدھم پڑ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد بھڑے ہوئے دروازے وا ہونے لگے۔ خواتین کی بڑی تعداد ہال سے باہر نکل آئی، پھر یہ بھیڑ چھٹنے لگی۔

جابر شاہ نے قدم ہال میں رکھا تو اس کے قدموں میں لرزش آ گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا اور سانسیں کھنچ گئیں۔ وہ ہال کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمرے میں روشنیاں مدھم تھیں۔

بی بی نیکو سرشت پردے کی دوسری طرف موجود تھی۔ جابر شاہ نے تخلیے میں ملاقات کا اہتمام کرایا تھا۔ تعارف کے بعد اس نے مدعا بیان کیا۔ اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''میں بڑی آس لے کر آپ کے آستانے پر آیا ہوں''۔ اس نے کہا۔

''فرمایئے، میں کمتر آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''۔ بی بی نے عاجزی سے جواباً پوچھا۔

''میں اپنے بیٹے کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔ بے حد پریشان ہوں''۔ جابر شاہ نے بات شروع کی۔

''اگر آپ پریشان نہ ہوتے تو یہاں کبھی نہ آتے''۔ بی بی نے معاملہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ تو جانتی ہیں کہ میرے اسلاف اصولوں پر جیتے تھے، جید علماء تھے۔ مگر بیٹے کے کرتوتوں نے گدی کا سلسلہ داؤ پر لگا دیا ہے۔ اتنے متبرک لہو میں نہ جانے یہ گندا خون......''

''رکیئے پیر صاحب!''۔ بی بی نے جابر شاہ کی بات کو رعب سے کاٹ دیا۔

ہال میں یک دم خاموشی چھا گئی، پھر بی بی کی آواز گونجی۔

''خون نہیں، تقوے کی بات کریں۔ ذاتِ باری کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑھو برہمن کو
☆
اوہ نہ ہندو نہ مومن نہ سجدہ دین مسیتی ہو
دم دم دے وچ ویکھن مولا جہاں قضا نہ کیتی ہو
آہے دانے، بنے دیوانے، ذات صحی ونج کیتی ہو
میں قربان تنہاں توں باہُو، عشق بازی جت لیتی ہُو

تقویٰ عزیز ہے، صرف تقویٰ''۔

بی بی عموماً یہ کہا کرتی تھی۔ جابر شاہ جواباً خاموش رہا۔ پریشان ہوا، شرمندہ بھی۔ ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔

''کبھی آپ نے مجھے بھی گندے خون کا طعنہ دیا تھا۔ یاد کریں، دیکھیں آج آپ اسی فقیرنی کے گھر کھڑے ہیں جسے اپنے در پر آپ ٹھکرا چکے ہیں۔ یکا یک ہال میں روشنیاں جگمگانے لگیں۔ اگلے لمحے جابر شاہ کے سامنے تنا ہوا پردہ بھی معدوم ہو گیا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو مقابل روحی کھڑی تھی، سراپا پُر اعتماد، باوقار۔

''آپ......!'' جابر شاہ حیرت کے مارے چیخ پڑا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ چند لمحے اس پر سکتہ سا طاری ہوا، بمشکل سنبھلا۔

''بیٹی، باپ ہوں، مجبور ہو کر آیا ہوں۔ مراد بُرے دور سے گزر رہا ہے، ہم لوگ ہمت ہار رہے ہیں، آپ کی دعاؤں کے محتاج ہیں''۔ وہ دھیرے سے مدھم آواز میں بولا۔

''مراد کی مشکلات سے میں آگاہ ہوں، دعا بھی کروں گی مگر والدین کی دعائیں زیادہ کارآمد سمجھی جاتی ہیں''۔ بی بی نے جواب دیا۔ اگلے چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔ جابر شاہ سر جھکائے کھڑا رہا۔

''کٹھن راہوں میں آپ کی کامرانیوں پر آپ کا معتقد ہوں''۔ اس نے لفظ تول کر ادا کیے۔

''جس نے انسان کا درد اپنا لیا، اس نے رب کا کرم پا لیا''۔ بی بی نے جواباً کہا، پھر بولی۔ ''اہل ایمان باری تعالیٰ کے عاشق ہوتے ہیں۔ ایک ہی سمت سفر کرتے ہیں۔ فرق شاہراہِ عشق پر منزلوں کا رہ جاتا ہے۔ کوئی بمشکل چند قدم چلتا ہے تو کوئی اس بیچ کوسوں آگے نکل جاتا ہے۔ جہد جاری رہے تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ آخر اجل یہ سفر ختم کر دیتی ہے''۔ بی بی نے بات تمام کی۔

''ہو سکے تو میرے جرم پر مجھے معاف کر دیں''۔ جابر شاہ نے کہا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہال سے باہر نکل گیا۔ بی بی نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اس کا ہیولا اندھیروں میں کھو چکا تھا۔ وہ خود تو چلا گیا مگر اس نے بی بی کے پُرسکون بحر شب و روز میں پتھر پھینک دیا تھا۔

بی بی ہال کے ماحول سے سبزہ زار کی طرف نکل آئی۔ نصف ماہ کا چاند آسمان پر دمک رہا تھا۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ فاصلوں پر چند بادل اسود اور کچھ سیمیں بدن رکھتے تھے۔ سرما کا آغاز تھا۔ وہ لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ نباتات کے پیکر تراوت میں جھوم رہے تھے۔ گل و لالہ جذبوں کو برانگیختہ کرتے تھے۔ ماضی کی یادیں بی بی کے ذہن میں ابھریں تو آکاس بیل کی طرح رگ و پے میں پھیل گئیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی چاند کی مسافت کے سنگ وہ کئی سال پیچھے چلی آئی۔ جب وہ نوعمر تھی اور روحی کہلاتی تھی۔

وہ مراد کو بھا گئی تھی، یہ وہ جان گئی تھی۔ اسے بھی مراد اچھا لگا تھا جو اس وقت نوجوانی کی رُت سے جوانی کی طرف نکل رہا تھا۔ اس کی کایا میں مردانگی کی جھلک نمو پا رہی تھی۔ دوراں کے کینوس پر دونوں کی کہانی کچھ اس طرح تھی۔

مراد کو وہ سندر سی لڑکی سرِ بازار دکھائی دی تھی۔ وہ حادثاتی لمحے تھے یا نصیب کا لکھا، جب لڑکی نے اپنا نقاب دھیرے سے سرکا دیا تھا، کسی مجبوری کے تحت، یا جان بوجھ کر، جسے وہ خود بھی نہ جان پائی تھی۔ سیاہ لباس کی بدلیوں میں چاند سا نکل آیا تھا۔ بالوں کی لٹیں رخِ روشن پر لوٹ پوٹ کر بل کھا رہی تھیں۔ آنکھیں چار ہوئیں تو مراد رعد گزیدہ دکھنے لگا۔ روحی بھی چوٹ کھا چکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار دل کی اس دھڑکن سے روشناس ہوئی تھی، دم بخود رہ گئی۔ اسی کیفیت میں دقیقہ بھر ٹھٹک سی گئی اور انہی اداؤں کے تسلسل میں مراد کے من میں اتر گئی۔

مراد کوئی کایاں عاشق نہیں تھا جو مہ لقاء کا تعاقب کر لیتا، سنبھلا تو اسے کھو چکا تھا، لڑکی جا چکی تھی۔ اسے فقط نقوشِ پا راہوں میں سجے نظر آئے، تمام تر قیامت خیزی کا نتیجہ۔ کچھ یہی ستم روحی پر بھی وارد ہو چکا تھا۔ ایک وجیہہ چہرہ اس کی نظروں میں لہرانے لگتا تو دل پھڑکتا اور معنی خیز مسکان لبوں پر پھیل جاتی۔ پھر یہی چہرہ پھیل کر اس کی کائنات میں بکھر جاتا، رگ و پے میں اتر جاتا۔

تمنائیں دلوں میں سجیں تو شعور یرغمال بنتا گیا

پیر جابر شاہ کو مراد کا ہر دم کھویا رہنا کھٹکنے لگا۔ عرفان یا عشق حقیقی تو اس کی کائنات میں ممکن نہیں تھا۔ ہاں، عشق مجازی کی چوٹ ہو سکتی تھی، وہ سوچتا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتا۔ شاید اس لئے کہ اپنی ذات میں وہ ہر قسم کی لذتِ عشق سے ہمیشہ تہی دست رہا تھا۔ یہ بڑوں کی برکات تھیں جو اس کا معاشی دھندا چل رہا تھا ورنہ اس کی کرامات تو صرف دھوکہ اور فریب ہوا کرتیں۔

کچھ اسی لئے اس نے اپنے آستانے میں اسلاف کی تصویریں سجا رکھی تھیں۔ جتنی حلاوت ان کے چہروں پر نظر آتی، اتنا ہی قہر جابر شاہ کے نقوش میں ٹپکا کرتا تھا۔ سختی اس کی شخصیت کا جزو ثانی بن چکی تھی۔ جزو اولٰی کا تعلق محض پرایا مال اپنانے سے ہو سکتا تھا۔

جابر شاہ اپنی گدی قائم رکھنے میں کامران رہا تھا۔ اسے مستقبل کی فکر کہیں زیادہ تھی۔ اسی لئے اس نے جبراً مراد شاہ کی کرسی دربار میں متعین کر دی تھی اور اسے سنجیدگی اپنانے کی برملا تاکید کیا کرتا تھا۔ اسی خاطر اس نے مراد کا اتالیق بھی مقرر کر دیا تھا۔

قمر مراد کا قریبی دوست تھا یا پھر اس کا دوسرا رخ، جسے بگڑا ہوا امیر زادہ کہا جاتا تھا۔ دونوں کبھی ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر وہ ہائی سکول کے زمانے کی بات تھی، اب فقط شاموں کو ملا کرتے۔ چند شامیں خالی بھی چلی جاتیں، مگر مجبوری کے تحت۔

''میں اور گانے والی کا ڈیرہ؟ عزیز قیامت آ جائے گی''۔ مراد نے کانوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر قمر کب ماننے والا تھا؟ کچھ اور شیر ہو کر بولا۔

''یار! تمہارے والد محترم بھی تو کم رنگین مزاج نہیں رہے، کچھ انہی کا اثر لے لو۔ برادر مان جاؤ، ہماری مجلس علیحدہ ہوگی، وہاں اور کوئی نہیں ہوگا''۔ قمر نے اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

''مگر، دوست! تم نافہم ہو، ہمارے گھرانے کی طرف دیدے وا رہتے ہیں، لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ حرکات و سکنات کی پرکھ ہوتی رہتی ہے۔ اس شہر کے لوگ تو اڑتی چڑیا کے پَر بھی گن لیتے ہیں۔ اخباروں میں خبریں لگ جاتی ہیں، تصویریں چھپ جاتی ہیں۔ اوپر سے پیر جی کی جاسوسی کسی گستاپو سے کم نہیں۔ مجھے معاف ہی رکھو''۔ مراد نے ممیاتے ہوئے کلام کیا اور رحم طلب نظروں سے دوست کی طرف دیکھا۔

''کون سا تمہارے اہل خاندان وہاں نہیں جاتے؟ تمہارے پرہیز سے کون سی کرپشن ختم ہو جائے گی؟''۔ قمر نے سوال کیا اور مراد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس بار مراد خاموش ہو گیا۔ نیم رضامندی اس کے چہرے پر جھلکنے لگی۔

''نئی نویلی چڑیا ہے، پیارے! دیکھو گے تو جی اٹھو گے''۔ قمر نے مراد کے اخلاقی تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔ پھر ہرزہ سرائی کی، کہا۔ ''شیخ پر شراب پی لینا حرام ہے، اسے دیکھنا ہرگز جرم نہیں''۔ مکالمے کے ساتھ مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔

❁

رات بھیگ چلی تھی۔ مراد کسی بہانے کا سہارا لے کر پیر خانے سے نکلا تھا۔ کار ٹریکٹر کی مدد سے درست کئے گئے کچے راستوں پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

پیر خانے کی جاگیر پر ہریالے کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں موجزن پانی چاندنی میں چل رہا تھا۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کارندے آب پاشی کی نالیاں درست کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ آسمان پر بدلیاں تیرنے لگی تھیں۔ دور درختوں کے جھنڈ میں کبھی جنگلی جانور چیخنے چلانے لگتے اور نوع آدم کو متوجہ کر لیتے۔

چند کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد کار پختہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ شہر کی رنگ برنگ نئی آبادیاں پیچھے رہ گئیں تو تنگ گلیوں کے گرد کسی محلے کے آثار ابھرنے لگے۔ پھر رونق بڑھنے لگی۔ شہر سو رہا تھا مگر محلے کی بڑی نکڑ پر آبادی جاگ رہی تھی۔

نیچے پان کی دُکان، اوپر گوری کا مکان

نشے میں دھت شخص نے گلا پھاڑ کر بھونڈی آواز میں آنے والوں کا استقبال کیا۔ [illegible] اندر [illegible] تمام حیات بیدار تھی۔ اندرون عمارت سیڑھیوں پر سفر نیم خوابیدہ بتیوں میں طے ہوا، پھر اچانک رنگ برنگ روشنیاں بکھری نظر آنے لگیں۔

مراد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، ہونٹ ساکت ہوئے، انہیں ملانا بھول گیا۔ کوئی بات کرنا چاہتا تھا، شاید سلام و نیاز، مدعا زبان پر لانا بھول گیا۔ آنکھیں پوری طرح وا ہوگئیں، انہیں جھپکانا بھول گیا۔ ہاتھ جیب میں اٹکا تھا، سگریٹ کے لئے، وہیں چپکا رہا، سگریٹ گرفت میں لانا بھول گیا۔ سانس اوپر کی اوپر رہی اور نیچے کی نیچے رہ گئی، حواس میں توازن ملانا بھول گیا۔ پاؤں زمین میں گڑ گئے، آگے نہ بڑھ سکا، قدم اٹھانا بھول گیا۔ یونہی اوسان اس کے بُری طرح خطا رہے، کئی لمحے بعد سنبھلا تو پہلے آنکھیں جھپکیں، پھر تھوک نگلا، بار بار، کیونکہ اس کے دہان میں سیلاب بن چکا تھا۔ پھر تسلی کرنے کے بعد کہ وہی چہرہ اس کے سامنے تھا جو اس کے حواس پر سوار رہا تھا، وہ بُری طرح چہک اٹھا، اپنی کامرانی پر پھولا نہ سمایا۔

اس کی باچھیں کانوں تک پھیل گئیں، پھر ان میں جلتا ہوا سگریٹ دھنس گیا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ چہرے پر رونق پوری تاب سے دمک آئی۔ اس کی چہک بے قابو ہو کر مسرت کا اظہار کرنے لگی۔ وہاں آنے کا احساسِ ندامت جاتا رہا۔

روحی کی جلوہ سامانیوں میں بھی اس دم حقیقت کا روپ نکھر آیا تھا۔ وہ نیم بسمل پنچھی کی مانند تڑپ کر اٹھی اور جذبوں پر قدغن لگانے کی سعی کرتے ہوئے کورنش بجا لائی۔ اس لمحے تمام سچائی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ جذبوں میں مغلوب ہوئی تو وہ قیامت خیز غضب ڈھا رہی تھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں دو اجنبی جنم جنم کے ساتھ دکھائی دینے لگتے ہیں [illegible]

روحی نے اہتمام کے ساتھ سیّد عابد علی عابد مرحوم کی خوبصورت غزل گائی اور گائیکی اس طور نبھائی کہ۔ ع

اتنا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا میخانہ بھی

رنگ اور انگ محفل پر پوری طرح چھائے رہے۔

اس دوران قدرت نے یوں کرم کیا کہ گھٹاؤں سے مینہ لگاتار برسنے لگا اور گرتی بوندوں نے جلترنگ کا سماں باندھ دیا۔ موسیقی میں بجی تانیں ابھرتی رہیں۔ سیمیں گھٹائیں برستی رہیں۔ مراد کو یوں لگا جیسے روحی وجد میں اس سے مخاطب تھی۔

موجِ صرصر ہو پُر افشاں تو خطا میری ہے
ان کے گیسو ہوں پریشاں تو خطا میری ہے
اہرمن انجمن آراء ہوں تو ہے میرا قصور
برسرِ قہر ہو یزداں تو خطا میری ہے
نہ یہاں ذوقِ تماشہ نہ یہاں حُسنِ کلام
میں چمن میں ہوں غزل خواں تو خطا میری ہے
دل میں نشتر وہ چبھوئیں تو نہیں ان کا قصور
خوں رواں ہو سرِ مژگاں تو خطا میری ہے

ہر طرف صبح کے تارے ہیں فروزاں عابد
نہیں کٹتی شب ہجراں تو خطا میری ہے

اس شب برقی چراغ صبح تک جلتے رہے حتیٰ کہ محلے میں زندگی کی لو ماند پڑ گئی۔ محفلِ شب برخاست ہوئی تو ملاقاتوں کے نئے باب کھل گئے۔

روحی اور مراد دونوں پیہم آتش عشق میں جل رہے تھے۔ ایسی آگ کبھی ضبط کے بندھنوں کو بھی بھسم کر دیتی ہے مگر دونوں کی مجبوریاں ایسی تھیں کہ ملاقاتیں گر خفیہ نہ رہیں تو گویا قیامت آ جائے گی۔

''میری داستانِ حیات میری طرح ہے، بے باک اور بے حد نرالی''۔ ایک موقع پر روحی نے کہا۔ ''میں حوادث میں کھیل رہی ہوں''۔ وہ سنجیدہ دکھی۔

''حادثات تو زندگی میں رچے بسے رہتے ہیں''۔ مراد نے جواب دیا۔

''ایسا ہی بڑا حادثہ میری پیدائش بھی تھی۔ میرا باپ یہی سمجھتا تھا''۔ اس نے دل میں چھپا زہر اگل دیا۔ مراد کو اس کے نسب و نسل سے دلچسپی نہ تھی۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

''تمہیں زمیں پہ اتارا گیا تھا میرے لئے''۔ مراد نے تلخی میں رومانس بھرنے کی کوشش کی لیکن روحی اپنا مکمل تعارف کرا دینا چاہتی تھی۔

''ہاں، لیکن شاید نہیں بھی۔ میرے عشاق کا شمار کرنا مشکل ہے۔ اَن گنت، پتوں کی طرح شہر میں بکھرے ہوئے ہیں''۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا مگر متانت مراد سے کوسوں دور تھی۔

''کیا مجھ جیسا دیوانہ کوئی دوسرا بھی ہوگا؟''۔ اس نے روحی کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں کسی اور کی طالب نہیں''۔ روحی نے ہار مان لی۔

نظریں باہم ٹکرائیں اور لمحے منجمد ہو گئے۔ عہد و پیماں کو تمناؤں کے خوشنما ریپر میں لپیٹ کر تقدیر کے حوالے کر دیا گیا۔

مراد جانتا تھا کہ وہ ایک گائیکہ کا عاشق ہے۔ معاشرہ ان عورتوں کو نفرت سے بازاری کہا کرتا ہے۔ ان سے گر میل ہو جائے تو بھی انہوں نے بندھن کی کوکھ سے جنم لینے والی کہانیاں تلخ انجام پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ داستانیں گاہے بگاہے جنم پاتی ہیں، شاید اس لئے کہ بھنوروں کو جنگلی پھول تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ ان گلوں کے باغباں نہیں ہوتے۔

❁❁❁

روحی حساس تھی جو آئے دن کے استحصال کو حوادث کا نام دیتی تھی۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو سکتی تھی کہ وہ بازار میں ابھی تازہ جنس تھی اور حوادث کو معمول نہیں سمجھتی تھی۔ وہ گائیکہ کی حدوں سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی تھی لیکن یہ عین حقیقت تھی کہ روحی کی کہانی کوئی بھی موڑ لے سکتی تھی۔ یہ اس لئے بھی غور طلب اور بڑی درد انگیز تھی کہ معاشرے کے طاقتور خداؤں کا احاطہ کرتی تھی جو کمزور کو خس و خاشاک کی طرح کچل دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

پیدا ہوئی تو باپ اور اس کے جعلی پیشوا نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اسے جائز اولاد کا درجہ دینے سے بھی انکار کر دیا حالانکہ بچی کی ماں نے عالم نزع میں خاوند کو باور کرایا تھا کہ روحانی بیگم روحی اسی کی جائز اولاد تھی۔ دکھیاری ماں صرف واسطے دے سکتی تھی کیونکہ وہ اپنی بیماری کی نوعیت جانتی تھی اور شاید بیٹی کا متوقع انجام بھی۔

''تم روزِ اوّل سے سانولی تھی اور میں کوئلے جیسا کالا بھجنگ، پھر یہ سرخ و سپید پھول ہمارے آنگن کیسے کھل سکتا ہے؟ اس نے بیٹی کو مندے دل سے دیکھا اور فوراً ہی تہمت لگا دی۔ بار بار یہی کہتا رہا۔ بیوی کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے خاوند کی طرف

دیکھا، پھر نوزائیدہ کی زندگی پر عذاب بھانپ کر لرز گئی سیلن اپنا مؤثر دفاع نہ کر سکی۔ وہ بے کسی اور علالت کے باعث زخم زخم ہو چکی تھی۔ اس نے طاقت جمع کی اور فقط اتنا کہا۔

''غربت اور بے بسی چہروں کو مسخ کر دیتی ہے۔ نووارد کو بھی حالات کی بھٹی میں گر روند ڈالا گیا تو یہ بھی رنگ و روپ کھو کر ہماری تصویر بن جائے گی''۔ لیکن مرغے کی پھر وہی ایک ٹانگ، روحی کا باپ یہ منطق نہ مان سکا بلکہ اس کا رویہ حدوں سے بھی گر گیا۔ آخر وہ معاملہ پیر ساجن بودی شاہ کی عدالت میں لے گیا۔ روحی کا باپ حد درجہ پیر پرست واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندو توہمات سے بھی متاثر نظر آتا تھا۔ کوا چھت پر بولتا تو مہمان داری کی تیاریاں کر لیتا۔ ہاتھ پر خارش ہوتی تو دولت کی آس لگا بیٹھتا۔

پیر بودی شاہ مکمل جاہلانہ اعتقاد رکھتا تھا، جن کے خاندانی عطا ہونے پر وہ فخر محسوس کرتا تھا۔ اس کے تمام علوم وفنون کالے بکروں کے گرد گھوما کرتے تھے۔ کالے بکرے اس کے ڈیرے میں کثرت سے پھرا کرتے تھے۔ سنا گیا تھا کہ وہاں جنات بھی ہوا کرتے تھے مگر کسی نے دیکھے نہ تھے۔ یہ بھی سنا جاتا تھا کہ اس کے جنوں نے متعدد بچے اغوا برائے تاوان کئے تھے۔

بودی شاہ کا غصہ البتہ جنوں کے طیش کو بھی مات دیتا تھا، اس کے لہجے میں حلاوت کا شدید فقدان ہوا کرتا تھا، گالم گلوچ بھی کر دیتا تھا۔ کسی نے اسے عبادت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے مصاحب کہتے تھے کہ وہ اپنی عبادات براہ راست متبرک مقامات پر کر لیا کرتا تھا، وہیں بیٹھے بیٹھے۔ روحی کا والد ڈیرے پر پہنچا تو در و دیوار مکین کے خوف سے کانپ رہے تھے۔

''تمہیں یہ ناپاک وجود دربار میں لانے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' بودی شاہ نے کڑک کر کہا۔ بچی خوف کے مارے رو پڑی جبکہ اس کا باپ بودی شاہ کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اگلے لمحے بودی شاہ نے پاؤں کی ضرب سے بچی کو دھتکار دیا۔ باپ روتی ہوئی بچی کو گھر لوٹا لایا تو ممتا کی ماری عورت نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ بچی دریا برد بھی کی جا سکتی تھی۔ ماں نے بچی کو سینے سے چپکا لیا۔ وہ شاید انہی لمحوں کا انتظار کر رہی تھی، تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئی۔ بچی کو اکیلا چھوڑ گئی، جس کی ذمہ داری باپ کے لئے زحمت بنتی گئی۔

روحی کے باپ نے بودی شاہ سے ڈرتے ہوئے دوبارہ بات کی، جیسے حاکم سے فیصلہ لینا ضروری تھا۔

''تمہارے گھر میں منحوس روح فقط تباہی لا سکتی ہے، بربادی پر بربادی''۔ بودی شاہ نے کہا، پھر کڑک کر بولا۔ ''جتنا جلد ممکن ہو، اس بدروح سے چھٹکارا حاصل کر لو ورنہ پچھتاؤ گے اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا''۔ ساتھ ہی اس نے گھور کر روحی کے باپ کی طرف دیکھا جس کی روح فنا ہو گئی۔

بودی شاہ کے فرمان پر بچی ساٹھ ہزار روپے میں بک گئی۔ روحی کا باپ بچی کو گائیکہ کے حوالے کرتے ہوئے تھوڑا سا چونکا، مگر رقم کی چمک نے اسے بے ضمیر کر دیا۔ ''بچی کو پیار سے رکھے گی''۔ بودی شاہ نے حوصلہ دیا، پھر تیس ہزار روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ باقی تیس ہزار خود اپنے پاس رکھ لئے۔ مہوش گائیکہ بودی شاہ کی منظورِ نظر تھی اور اس سے ہر پہلو فیضیاب تھی۔

روحی کے باپ نے اگلے روز گھر میں جوئے کی محفل سجائی اور تمام رقم جوئے میں لگا دی۔

❁

مہوش پچھلی نسل کی گائیکہ تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر گلاب کھلا کرتے تھے مگر اب اُن کی جگہ جھریوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ اس نے اپنے کسی رسیا سے شادی بھی رچائی تھی مگر یہ بندھن ناکام ہو گیا اور چند سالوں

سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے گھرانے میں ایسے ناطوں کا یہی انجام ہوا کرتا تھا، اس نے نصیب سے سمجھوتہ کرلیا۔

مہوش روحی کی تربیت اپنے تصور کے مطابق کرنا چاہتی تھی، لاثانی۔ ''میں اسے خوش ادا بنانا چاہتی ہوں''۔ وہ خواب دیکھا کرتی۔ کبھی اسے قلوپطرہ کہتی تو کبھی نیفرتی۔ اسی لئے میٹرک کے بعد اسے رقص و موسیقی پر لگا دیا گیا۔ اس کے لئے ایک ماہر استاد مقرر کر دیا گیا۔ مہوش خود بھی اسے فن کی باریکیاں سمجھاتی، رکھ رکھاؤ سکھاتی۔ خود مہوش آنکھوں کے ذریعے جذبوں کے اظہار میں ملکہ رکھتی تھی۔

روحی کالج کی سطح پر تعلیم چاہتی تھی مگر اس کی یہ تمنا ادھوری رہ گئی۔ وہ بلا کی ہونہار تھی، اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی۔ ہر قسم کی کتب پڑھتی، دقیق مذہبی رسائل بھی پڑھ لیتی۔

ایک مولانا صاحب سے بھی تدریس پاتی تھی۔ وہ ہفتے میں دو بار آتے تھے۔ روحی ان سے مشکل سوال بھی کرلیتی۔ وہ نکتہ سمجھاتے تو عمل کا پہلو روحی پر چھوڑ دیتے۔ کبھی اختیار ملنے پر عمل کی تاکید کرتے۔

''میں اب پسندیدہ نہیں رہی''۔ ایک رات مہوش نے روحی سے بات کی اور اپنے زوال کا برملا اظہار کر دیا۔ ''آنے والے کوئی دمکتا ستارہ چاہتے ہیں۔ جاننے والے تمہاری بات کرتے ہیں''۔ اس نے نرم لہجے میں ایک انسان کو اس کا مستقبل جتلا دیا اور اسے اس کی اوقات زیست اور آخرت کا عندیہ دے دیا، اس لئے کہ وہ انسان اس پر تکیہ کرتا تھا، اس کے سائبان کی پناہ میں تھا۔

روحی یوں چونک پڑی جیسے اس پر رعد کوند پڑی ہو۔ ''آپ تو مجھے مزید تعلیم دلانا چاہتی تھیں؟''۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے احتجاج کیا۔

اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ دل کی دھڑکن غیر متوازن ہوئی اور بدن کا رنگ زرد پڑ گیا۔ مایوسی اس کے ظاہری نقوش میں چھلکنے لگی۔

''مجھے یہ بازار اور گورکھ دھندا اچھا نہیں لگتا''۔ چند لمحوں بعد روحی نے نرمی سے کہا۔ اس کا لہجہ اعتماد سے عاری تھا۔ اپنی رائے کا جواب اور انجام بھی جانتی تھی۔

''جیسے حویلیوں کے وارث ہوتے ہیں، ویسے ہی کوٹھے بھی نسلیں آباد رکھتی ہیں۔ جب تک ہمارے خریدار موجود رہیں گے، ہمارا طبقہ ان کا زر خرید بنا رہے گا''۔ مہوش نے نظریۂ ضرورت بیان کر دیا۔ روحی بُری طرح بے چین ہوگئی۔

''ہم اپنا روزگار بدل بھی تو سکتے ہیں؟''۔ دل کی بات آخر اس کی زبان پر آ گئی مگر اس دم وہ مہوش کی جانب نہ دیکھ سکی، ہارسی گئی تھی۔ نہ تو نگاہوں میں کوئی التجا جگا سکی، نہ ہی امید کے دیے لا سکی۔ بس نظریں زمین پر گاڑھے مہوش کی فیصلہ کن آواز کا انتظار کرتی رہی۔

''کوئی اور راستہ نہیں ہے لڑکی، جبر سمجھو یا الفت، تمہیں ایک ہی رہ گزر پر چلنا ہے اور وہ راہ وہی ہے جس پر میں نے مسافت طے کی ہے۔ ہر نسل اپنا ورثہ آنے والی نسل کو تھما دیتی ہے۔ یہی سمجھ لو، اسی میں سب کا بھلا ہے''۔ مہوش نے کہا اور روحی کے نصیب پر مہر لگا دی۔

روحی نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ وہ چپ چاپ سی اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹی رہی۔

''اپنا نصیب جانتے ہوئے بھی میں نے خواہ مخواہ خالہ مہوش سے تکرار کرلی''۔ وہ سوچتی رہی۔ ''اگر میں آج اس کی ضرورت نہ ہوتی تو اس طرح لے پالک کیونکر بنتی''۔ روحی اپنی تقدیر پر ہنسنے لگی۔ ''انسانی معاشرے کے تمام نظام معاشرتی ضرورتوں کے گرد گھوم رہے ہیں''۔ وہ بڑبڑائی۔ ''میں کہاں منفرد تھی؟''۔ اس نے آہ بھری۔

رات روحی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ سمجھی کہ بدن کمزوری کے تحت ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے مدت بعد شام کا کھانا چھوڑا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں آیا کہ اس نے

رات پان بھی نہیں کھایا تھا۔ کیا وہ پان کے نشے میں مبتلا ہو چکی تھی؟ اس نے سوچا تو بدن نے جھرجھری لی، وہ پریشان ہوگئی۔ کیا میٹھا پان بھی نشہ آور ہو سکتا ہے؟ خیال اس کے ذہن میں اٹک گیا۔ ریفریجریٹر میں قسم قسم کے پان موجود تھے، ان میں میٹھا پان کون سا تھا؟ روحی نہ جان سکی۔

اگلے روز وہ رونقِ بازار بن گئی۔ بازار اس کی متاعِ حُسن سے چکاچوند ہوگیا۔ اس کے فسانے طول و عرض میں گونجنے لگے۔ مہوش کے وارے نیارے ہوگئے۔

❁

''یاد رکھنا، میری سونے کی چڑیا! میں تمہاری تقدیر پر ایسی زنجیر ڈال چکی ہوں کہ تم جانو تو تمہاری روح فنا ہو جائے گی''۔ مہوش نے اسے بتایا۔

روحی پر خوف سا طاری ہونے لگا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے مہوش کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی خالہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

''میری چندا! تم افیون کی عادی ہو چکی ہو، اس ناطے اب تم میری مٹھی میں ہو۔ تمہارے بدن کا رواں رواں میری عنایت کا مرہونِ منت رہے گا۔ اگر میں تمہیں نشہ آور دوا بہم نہیں پہنچاؤں گی تو تم میرے قدموں میں ڈھیر ہو جاؤ گی اور رحم رحم پکارتے ہوئے مجھ سے دوا کی بھیک مانگو گی''۔ مہوش نے کہا۔ اس کے سفاک چہرے پر عیاری برس رہی تھی۔

روحی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس کا وجود لرز گیا اور نقوش میں تشویش نظر آنے لگی۔ ''میں نے برائیوں کو قریب نہیں آنے دیا، پھر میرا وجود کیسے نشے کا عادی ہوگیا؟''۔ روحی نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ تھوڑی دیر وہ خالہ مہوش کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی خالہ کبھی زمین پر پاؤں نہیں رکھتی، فسوں کی گہرائی میں ضرور کوئی سازش ہوگی۔

''میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو آج شب کھانے کے بعد پان مت لینا۔ اسے طاق میں رکھ کر سجا دینا، پھر اپنے بدن کا حشر بھی ملاحظہ کرنا۔ تمہیں میری معاملہ فہمیوں پر قائل ہونا آ جائے گا''۔ مہوش نے دبے لہجے میں لفظوں کے تیر برسائے، جن کا زہر روحی کے رگ و پے میں اتر گیا۔ اسے بدن کے روئیں روئیں میں کڑواہٹ کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی شریانوں میں غلیظ پانی گردش کر رہا ہو۔

''آپ تو ممتا کا دعویٰ کیا کرتی تھیں۔ بڑا ناقص رہا آپ کا بھرم۔ معاشی گورکھ دھندے کی معمولی ضرب بھی نہیں سہہ سکا''۔ روحی نے چہرے پر بکھرا طنز کا رنگ لہجے میں منتقل کر دیا۔ الم اس کے نقوش میں البتہ چھایا رہا، اس کی حرکات میں نزاکت کی جگہ سختی عود کر آئی۔

''ماں بننے اور کہلانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خالہ، وہی فرق جو زندہ اور مردہ میں ہوتا ہے''۔ وہ دل کی صدا زبان پر لے آئی۔ اگلے ہی لمحے اسے چکر آیا اور اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

اس لگا جیسے مہوش کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ہو، نقوش میں ہیبت اتر آئی ہو، آنکھیں پھٹ کر لہوفشاں ہوگئی ہوں اور نوکیلے دانت لمبوترے ہو کر خون فشاں ہو چکے ہوں۔ پھر یہ چہرہ جسامت میں پھیلنے لگا، حتیٰ کہ دیوہیکل ہوگیا اور نگاہوں کے طول و عرض میں روحی کو ہر جا دکھائی دینے لگا۔ اب وہ اس مافوق الفطرت تصور سے وجود بچانے کی خاطر اپنے بازو تواتر سے ہوا میں لہرا رہی تھی۔

❁

مراد اور روحی کے میل کی خبریں بازارِ حُسن سے نکل کر قرب و جوار میں پھیل رہی تھیں۔ یہ خبریں دربار پر بھی پہنچ چکی تھیں۔ پیر جابر شاہ اپنے بیٹے سے نالاں تھا۔ دونوں کے بیچ بار بار تکرار ہو چکی تھی۔ مراد نے نہ صرف روحی سے ملاقاتوں کا اقرار کر لیا تھا بلکہ اپنے اردوں کا

برملا اعلان بھی کر دیا تھا۔ وہ تعلق کو قانونی بندھن سے وابستہ کرنا چاہتا تھا۔ جابر شاہ کو وہ دھن کا پکا دکھائی دیا تھا۔ اس پہلو باپ بے حد پریشان ہو چکا تھا کیونکہ مراد صدیوں پرانی گدی کا اکلوتا وارث تھا اور اب تمام خاندان کی سبکی کا باعث بن رہا تھا۔

مراد نے قمر کو رازدان بنا رکھا تھا۔

قمر مہوش سے بات کر چکا تھا۔ بات گو روحی کو غلامی سے آزاد کرانے کی تھی مگر درحقیقت قیمت مہوش کی لگ رہی تھی۔ رقم کی کون سی حد اس کا دل موم کر سکتی تھی، قمر جان چکا تھا۔ رقم جمع کرنے کا عملی موقع بھی آ چکا تھا۔ جابر شاہ علاج کے لئے بیرون ملک جا رہا تھا۔ اس بیچ مراد اپنے حلقۂ ارادت میں امراء سے روابط قائم کر چکا تھا، گو مایا کا بیشتر حصہ قمر نے ادا کر دیا تھا۔

مراد کی مراد بر آئی مگر روحی کو تو گویا زندگی مل گئی۔ اس کی مثال اس پنچھی کی طرح تھی جسے کسی نے صیاد سے رہائی دلا دی ہو اور وہ کھلی فضا میں اڑانیں بھر رہا ہو۔ کچے دھاگے کا بندھن اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت دکھی۔ اس کے نزدیک مراد اس کی زیست میں مسیحا بن کر اترا تھا۔ اس نے شکریے کے ساتھ مراد کا ساتھ اپنا لیا اور ایک صبح دونوں نے نکاح کر لیا۔

بندھن کا مشورہ مراد کو اس کے قریبی احباب نے دیا تھا۔ جابر شاہ کی عدم موجودگی میں یہ مرحلہ روحی کو پیر خانے کی پناہ دلا سکتا تھا۔ یہی واحد صورت تھی جس کے تحت روحی اور مراد کو بادل نخواستہ معافی مل سکتی تھی، مگر قیامت خیز عتاب کے مراحل سے گزرنے کے بعد۔

روحی اور مراد کی شادی پر کوئی دمک نہ تھی۔ ایسا ہی لگا جیسے کوئی روزمرہ کی بزم آرائی ہو۔ تقریب میں رنگ و بو کا امتزاج ہر پہلو ناپید تھا۔ نہ کوئی دلہا بنا نہ دلہن سجائی گئی۔ حاضرین کے بیشتر چہروں پر ناگوار تاثر طاری رہا۔ رسم بڑی مختصر تھی، جو خوف، اندیشوں اور امید کے ملگجے میں ظہور پذیر ہوئی۔ بندھن کی آئندہ کی ساکھ پر حالات کی پرچھائیاں چاند گرہن کی طرح دکھیں۔ عقد کے لمحوں میں مدھم سی پھلجھڑیاں روحی کے من میں بھڑک اٹھیں اور ایک احساس سا اس کے وجود میں ابھرا کہ وہ دھرتی کی پاتال سے کہکشاں میں آن بسی ہے، جہاں اس کی تمناؤں کے ستارے درخشندہ ہیں۔

اجالوں میں اسے اپنا روپ اور بھی اجلا سا دکھائی دینے لگا۔ شاید یہ اس کی تمنا تھی۔ پیر خانے میں البتہ اسے اچھوت کے طور دیکھا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں غالب تاثر یہی تھا۔ پیر خانے میں اسے ایک ہی روز گزارنا تھا۔ شام جابر شاہ کی واپس آمد ہو سکتی تھی جو کسی بڑے سونامی سے کم نہ تھی۔ آخر یہ مرحلہ آ گیا۔

اہم ترین معاملہ دربار میں پہلے پیش کیا گیا۔ قریبی احباب جمع ہو چکے تھے جبکہ روحی اور مراد خواتین کے بیچ کھڑے تھے۔ اعزہ کی چہ میگوئیاں جابر شاہ کی ایک ہی للکار تلے دب گئیں۔

''تم نے غلاظت کا ڈھیر کچرے سے اٹھا کر اجداد کے سروں پر لا مسلط کیا ہے۔ کیا تم شرم سے اتنے ہی عاری ہو چکے ہو؟''۔ جابر شاہ نے چنگھاڑ کر کہا اور مراد کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر زوردار ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا۔ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، روحی پر بھی لرزہ طاری ہو گیا۔

''مذہب اور اخلاقیات مجھے اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کا اختیار دیتے ہیں''۔ مراد کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کا یہی بیان ایک بڑے تنازعے کی بنیاد بن گیا۔

''تم اسے فوری طور پر طلاق دے دو''۔ پیر جابر شاہ نے اپنے دربار میں حکمنامہ جاری کر دیا۔

''صبح نکاح شام طلاق، یہ کیونکر ممکن ہے؟''۔ روحی کو بولنا پڑا۔ ''آج اگر کوئی غیر مسلم ایمان لانے کی

خواہش کرے تو آپ اس کا ماضی نہیں، مستقبل دیکھیں گے اور اسے گلے لگالیں گے۔ کیا میں آپ کی عزت نہیں بن سکتی؟ جبکہ میں اپنا مستقبل سنوارنا چاہتی ہوں اور پیر خانے کے لئے نیک سرشتگی کی مثال بھی بننا چاہتی ہوں''۔ روحی نے مہین لیکن بھرپور آواز میں بڑا دعویٰ کیا اور اس طور کئی دلوں کو متاثر بھی کیا مگر جابر شاہ نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور کرخت لہجے میں اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اس نے مراد کو دوبارہ مخاطب کیا، کہا۔

''اگر تم میرے حکم سے اجتناب برتنا چاہتے ہو تو سن لو، میں تمہاری چہیتی ماں کو اسی لمحے طلاق دیتا ہوں''۔ غیظ وغضب میں مبتلا شخص مقدس خون کی رکھوالی میں اب آخری حدوں پر اتر آیا۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ مراد کی ماں رو پڑی اور بیٹے کے سامنے عاجزانہ ہاتھ باندھ دیئے۔ حاضرین میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ چند صدائیں جابر شاہ کو صبر کی تلقین میں بھی برآمد ہوئیں۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسری طلاق دے ڈالتا، مراد نے روحی کے سلسلے میں طلاق مکمل کر دی۔

تمام مجمعے میں روحی اب تنہا کھڑی تھی۔ اس نے ہر قسم کی نگاہیں اپنے بدن پر محسوس کیں، پھر بھی جسمانی لرزش پر قابو پائے رکھا، فقط ایک بار مراد کی طرف دیکھا، پھر مایوسی میں دھیرے سے مڑی اور باہر نکل گئی۔ ہار کر وہ روئی نہیں، جاتے ہوئے اس نے کچھ نہ کہا، بس نظریں جھکائے کھڑے مراد کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ عابد علی عابد نے کبھی کہا تھا۔

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

خانقاہ سے باہر نکلتے ہوئے وہ مرحوم بڑے پیر صاحب کے مرقد پر گئی اور سلام و نیاز عرض کیا۔ اس کے دل کو قدرے تشفی مل گئی۔ وہاں روحانیت کی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ مرحوم بڑے پیر صاحب انسان سے پیار کیا کرتے تھے۔ لوگوں کی مالی حاجت روائی بھی کرتے۔ اپنے لئے کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ اتباعِ شریعت کی سعی کرتے اور بدعتوں سے بچاؤ رکھتے۔

❁

روحی مہوش کے ڈیرے پر پہنچی تو رات ڈھل رہی تھی مگر در پوری طرح وا تھے۔

''آؤ، بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی''۔ مہوش نے کھانا چولہے پر سے اتارتے ہوئے کہا۔

''آپ نے ذہن میں کئی اندازے قائم کیے ہوں گے؟''۔ روحی نے کرسی میں دھنستے ہوئے پوچھا۔ مہوش نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔

''نہیں روحی، مجھے فقط ایک ہی اندازہ تھا، میں نے تمہارا کھانا بھی تیار کر لیا تھا''۔ مہوش نے جواب دیا۔

''ہمارے نصیب کالے ہوا کرتے ہیں، یہ نہیں سنورتے، پگلی!''۔ اس نے بات تمام کی۔ روحی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''اب کیا ہوگا؟''۔ وہ بمشکل پوچھ سکی، پھر بری طرح رونے لگی۔ مہوش تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

''میں تمہیں اپنی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر چکی ہوں، پھر بھی تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔ میں تمہیں کوئی بار خیال نہیں کرتی۔ اپنے لئے میں کوئی اور گائیکہ تلاش کر رہی ہوں۔ علاوہ ازیں تم میرے پاس مراد کی امانت ہو لہٰذا شوق سے اپنا جیون جیو''۔ مہوش نے معاملہ فہمی کا دھیان رکھا۔

روحی کو اپنی زندگی خزاں رسیدہ دکھنے لگی۔

رات گئے اس کے کمرے سے سسکیاں ابھرتی رہیں، پھر اس آہ وفغاں میں طبلے کی سنگت شامل ہوگئی۔ روحی طبلہ مہارت سے بجاتی تھی۔ اس شب ساز کی اصوات میں کچھ ایسا سوز ابھرا کہ مہوش بھی اپنے بیڈ روم

میں روتی رہی۔ روحی بار بار دیواروں پر متحرک سائے دیکھ کر چونکی مگر جان چکی تھی کہ مراد کا قصہ اب یادِ ماضی بن چکا تھا۔ ایک سلسلہ اس نے طے کر لیا، وہ اپنی زیست کو دوبارہ شجرِ سایہ دار نہیں بنانا چاہتی تھی جس کی چھاؤں میں اجنبی کچھ پل بیٹھ جائیں اور غم غلط کر کے اپنی راہوں پر آگے بڑھ جائیں۔

اگلے روز وہ داتا دربار پہنچ گئی۔

صبح کے پل وہاں زائرین تعداد میں زیادہ تھے۔ روحی کے دل میں حضرت علی ہجویریؒ کے لئے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ مرقد کے قریب جانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے تئیں کوشش بھی کی مگر ناکام رہی۔ اس دوران اس کے ذہن میں بھیڑ پیدا کرنے والوں کے لئے نامناسب احساسات ابھرنے لگے۔ وہ ہمت ہار کر برے دل کے ساتھ ہجوم سے باہر نکل آئی۔ جونہی دربار سے نکل کر آگے بڑھی، ایک اجنبی یک دم اس کے مقابل آ گیا۔ روحی اسے قریب پا کر ٹھٹک گئی۔ اجنبی بردبار اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ کلین شیو، گورا چٹا اور خوش وضع۔ وہ انتہائی باوقار دکھائی دیتا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے روحی کے سر پر ہاتھ رکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''بیٹی! فقیروں کے در پر افراد کا ہجوم ہو تو واہی تباہی نہیں سوچتے۔ احتجاج سے اجتناب کرنا چاہئے''۔ روحی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔ پھر روحی کو متوجہ پا کر گفتگو کرنے لگا۔ ''رقاصہ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں، رقص کر لیتی ہوں''۔ روحی نے جواب دیا۔

''نوعِ آدم کے لئے ناچتی ہو؟''

''جی!''

''ایک ناچ مصور (اللہ) کا عشق بھی کرواتا ہے، کبھی وہ رقص بھی کر کے دیکھنا''۔

''جی، حسرت ہے''۔

''حسرت کمزوری ہو سکتی ہے، ارادے کی، یا پھر جہد میں کمی۔ ویسے تم مجھے دنیاوی خداؤں کی ڈسی ہوئی لگتی ہو''۔

''آپ کی باتیں درست ہیں اور غور طلب بھی''۔

''ہر من میں عشق کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے، سچے عشق کی۔ کبھی اسے کھوج کر دیکھنا''۔ بات سن کر روحی کے من میں عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سنبھل پاتی، اجنبی شخص مڑا اور دھیرے دھیرے مجمعے میں گم ہو گیا۔

اس واقعے نے روحی کے دل میں جوت سی جگا دی، اس کی کایا پلٹ دی۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

روحی کے رگ و پے میں علامہ اقبالؒ کا مصرع گونجنے لگا۔ کچھ فاصلے پر قوال اس مصرعے کی تکرار میں مصروف، لطف اٹھا رہے تھے۔

✿

شام کے وقت حسبِ معمول برقی چراغ جلنے لگے تھے۔ روحی اپنے کمرے کے سامنے بالکونی میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ مہوش اسے، وہاں گھنٹوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''غم سے نکلنے کے لئے کبھی دواؤں کی ضرورت پڑ جاتی ہے''۔ اس نے رائے کا اظہار کیا یا شاید باور کرایا کہ جسم اس دم نشہ آور دوا مانگ رہا تھا۔ روحی جیسے چونک پڑی۔

مہوش نے اس کے بحرِ فکر میں پتھر سا لڑھکا دیا تھا۔ وہاں ایک تلاطم سا برپا ہوا، جو کئی دائروں میں منقسم ہوتا چلا گیا۔ پھر لمحوں میں یہ انتشار ایک نکتے پر سمٹ گیا جیسے کھیون ہارے کو منزل دکھائی دینے لگتی ہے مگر اس دم روحی کے حواس مکمل بحال نہیں تھے۔

''ہاں، مجھے سرور چاہئے''۔ اس نے یک دم کہا۔

''عشق کا پیالہ پلا دیں مجھے۔ کیا آپ مجھے شرابِ طہور دلا سکیں گی؟''۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی پھر اپنی نشست سے باہر نکل آئی۔ ''مجھے روشنی کی کرن نظر آئی ہے، اس کرن کے خالق سے ملا سکیں گی آپ؟''۔ روحی نے کچھ اس انداز میں کہا کہ مہوش دم بخود رہ گئی۔ روحی اس کے مقابل کھڑی تھی اور اس کے چہرے کی تختی میں کئی سوالیہ نشان ابھر آئے تھے۔ انجانی دلدل میں دھنسی ہوئی نظر آنے لگی۔

''کبھی کچرے کے انبار پر بھی گلوں کے نہال اگتے ہیں؟''۔ وہ گہری سوچ میں اتر گئی۔

اگلے روز روحی شدید بیمار پڑ گئی۔ اس کی بے چینی حدوں کو چھونے لگی۔ سر درد، قے اور متلی سے بات شروع ہوئی اور جسمانی پٹھوں کے کھچاؤ تک پہنچ گئی۔ دو روز میں روحی کا بدن سراپا الم بن گیا۔ سینے کا درد شدت اختیار کرتا گیا، سانس بار بار رکتی پھر اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے۔

''مر جاؤں گی مگر آپ کے پان والا نشہ نہیں لوں گی''۔ اس کا مہوش کو بس ایک ہی جواب ہوتا تھا جو وہ اپنا بدن اینٹھتے ہوئے درد میں لتھڑی ہوئی، ٹوٹی پھوٹی آواز میں بار بار دیتی تھی۔ ''مجھے شرابِ طہور چاہیے، کہیں سے دلا دیں''۔ حواس روبہ زوال ہوتے تو وہ کہنے لگتی اور پھر بار بار دہراتی۔

روحی کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اسے ہسپتال لے جانا پڑا، جہاں اسے فوراً داخل کر لیا گیا۔ کئی ہفتے اس کا علاج ہوتا رہا۔ اسے افیون کے بغیر زندہ رہنے کے قابل بنانے کی کوشش کی گئی۔

ہسپتال سے نکلی تو وہ دوبارہ داتا دربار گئی۔ اجنبی خوش وضع شخص، جسے وہ تلاش کر رہی تھی، اسے دربار میں نظر آ گیا۔ وہ ایک کونے میں دبکا قرآن پڑھ رہا تھا۔ روحی اس کے قریب کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اجنبی شخص کی صدا کبھی ابھر کر اس کے کانوں سے ٹکرانے لگتی تو وہ مسحور ہو جاتی۔ اسے لگتا جیسے قرآن اس کے دل پر وارد ہو رہا تھا۔

اجنبی باہر نکلا تو روحی اسے ملی۔ اجنبی نے اسے پہچان لیا، دوبارہ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور احوال پوچھا۔

''مجھے وہ راہ سمجھا دیں جہاں بے چین دل کو سکون مل جائے؟'' روحی نے دریافت کیا۔

''وہ راہ جو بندے کو خدا کی طرف لے جائے''۔ اجنبی نے جواب دیا۔

''آپ سے کیسے استفادہ کر سکتی ہوں؟''

''میں شاید تمہیں دوبارہ نہ مل سکوں''۔

''کیوں؟''۔ روحی یک دم پریشان ہوگئی۔ اسے لگا جیسے اس کا مہربان اس سے بچھڑ رہا تھا۔

''میں شام کی فلائٹ سے کیلیفورنیا جا رہا ہوں''۔ اجنبی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ روحی حیران ہوئی۔

''وہاں کس لئے؟''

''ڈیوٹی کہیں بھی لگ سکتی ہے''۔ اجنبی نے جواب دیا۔

''میں نہیں جانتی کہ کون سی کشش مجھے آپ کی طرف کھینچ رہی ہے؟''

''بیٹی! انسان سے پیار کرنا اور ہمیشہ خدا سے مدد مانگنا، تم سب کچھ پا لو گی۔ سچائی کی لو ہر من میں موجود ہوتی ہے، ہم دیپ جلائے رکھنے کا سلیقہ بھول جاتے ہیں۔ اگر تڑپ رکھتی ہو تو کھوج میں کمی نہ آنے دینا، دیپ جلانا سیکھ جاؤ گی۔ دنیا راہوں کا مجموعہ ہے، کوئی ایک در کامرانی کا اسلوب سکھا دیتا ہے۔ لو کی پہچان ہو جائے، اسے پالو تو انسان کو نہ بھولنا کیونکہ

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اور ہاں، ہمیشہ اللہ ہی سے مانگنا''۔ یہ کہہ کر اجنبی

نے طائرانہ نگاہ روحی پر ڈالی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا انسانوں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

❁

روحی مہوش کا گھر چھوڑنا چاہتی تھی۔ اب وہ خالہ کے ہاں اپنے آ کو محفوظ نہیں گردانتی تھی۔ وہ اپنی خالہ مہوش کی فطرت جانتی تھی۔ مراد سے لاتعلقی کے بعد اب وہ دوبارہ اسی کے رحم وکرم پر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی خالہ ایسا کھیل کھیلے گی جس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کا سودا کیا جا رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ فروخت کی جا رہی تھی جہاں فقط اجل ہی اس کی جان چھڑا سکتی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی، جب روحی نے مصلیٰ لپیٹا، اس کی خالہ مہوش گہری نیند سوئی ہوئی تھی جبکہ ایک معتبر سازندہ دروازے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا جونہی وہ سویا، روحی فوراً عمارت سے باہر نکل گئی۔

شاہراہ پوری طرح ویران تھی۔ چوک میں چوکیدار کھڑے ہنسی مذاق کر رہے تھے، روحی بازار کی مخالف سمت محوِ خرام رہی۔ چند لوگوں نے اسے دیکھا لیکن معاملے سے دور رہے۔ روحی کے قریب سے چند رکشے بھی گزرے مگر اس کی جیب اس دم خالی تھی، اسی طور اس نے طویل فاصلہ طے کرلیا۔ مدرسے کے در پر پہنچی تو فجر کی نماز جاری تھی۔ جونہی نماز ختم ہوئی روحی اندر چلی گئی۔

مدرسے کے دفتر میں چند باریش اشخاص بیٹھے ہوئے تھے، وہ ایک جوان لڑکی کو صبح سویرے یوں سامنے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

”مجھے ادارے میں جگہ دے دیں، میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں“۔ روحی نے چھوٹتے ہی مدعا بیان کر دیا۔ بات سن کر تمام اشخاص ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

”ہم گھر سے فرار ہونے والی عورتوں کو یوں پناہ نہیں دیتے“۔ ایک معتبر مولانا فوراً گویا ہوئے۔

”دارالامان چلی جاؤ“۔ ایک دوسرے شخص نے فیصلہ دے دیا۔ روحی نے تھوڑی سی ضد کی مگر اس کی خواہش رد کردی گئی۔ اسے بتایا گیا کہ معاملہ معاشی نہیں، معاشرتی ہے۔ روحی بھاری دل کے ساتھ مدرسے سے باہر نکل آئی، باہر نکلتے ہوئے اس نے وہاں چند لفظ کہے۔

”اگر مجھے اس مسجد میں انسانی پیار نہیں ملا تو دارالامان میں کیسے ملے گا؟“۔ اس کی اس بات پر کوئی اچھا تاثر نہ ابھر سکا۔

روحی انہی راہوں پر واپس چل پڑی جن پر چل کر مدرسے کی طرف آئی تھی۔ باہر نکلی تو ہلکی بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے لئے گویا مشکلات بڑھ گئی تھیں، اس نے رحم طلب نظروں سے فلک کی طرف دیکھا۔

”بیٹی! رک جاؤ“۔ اسے کسی نے عقب سے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ایک بزرگ کھڑے تھے۔ جھکتی کمر نے ان کے ہاتھ میں لاٹھی پکڑا دی تھی۔ ان کے چہرے پر متانت اور شخصیت میں جاذبیت نظر آتی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی، بردبار دکھتے تھے۔ مدرسے کے دفتر سے اٹھ کر اس کے پیچھے آئے تھے۔

”دکھیا ہو؟“۔ انہوں نے روحی کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا۔ آنسو روحی کی آنکھوں سے ٹپک پڑے، جن میں برکھا کی چند بوندیں مدغم ہوگئیں۔

”جی!“۔ روحی بمشکل کہہ سکی۔

”گھر چھوڑنا پڑا ہے؟“۔ بزرگ شخص نے اگلا سوال کیا۔

”جی!“۔ اب روحی زار وقطار رو رہی تھی۔

”میرے ایک محترم ہیں، کیلیفورنیا میں مقیم ہیں۔ تمہیں دیکھ کر ان کا تصور میرے ذہن میں کوند گیا، مجھے لگا وہ تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا وہم

ہو۔ میں نے داتا دربار کے باہر انہیں تمہارے ہمراہ محو گفتگو دیکھا تھا۔ شاید یہ بھی میرا واہم ہو"۔۔ بزرگ شخص نے سرسری بات کرتے ہوئے معاملہ نمٹایا۔ روحی کے دل میں ہلچل مچ گئی۔ وہ چادر کے گیلے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

"میرا نام اشرف علی مرزا ہے"۔ فرشتہ سیرت بزرگ شخص نے کہا۔ "اور تمہارا نام غالباً......"

"روحی ہے"۔ روحی نے بات مکمل کر دی۔ "ماں باپ نے روحانی بیگم رکھا تھا"۔ اس نے وضاحت کی۔

"بیٹا! میرے ہمراہ چلو، قریب ہی میرا گھر ہے۔ کٹیا میں تمہیں پناہ مل جائے گی، وہاں تم مجھے اپنی بپتا بھی سنانا۔ میں دیکھوں گا کہ تمہاری مدد کیسے کی جا سکتی ہے"۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ذرا سا توقف کیا، پھر کھنکار کر بولے۔ "گھر میں میری اکلوتی بٹیا بھی ہے، تمہیں ساتھ مل جائے گا"۔

✿

چند روز بعد روحی کی تعلیم کا انتظام ایک مدرسے میں کر دیا گیا جو عطیات کے بل بوتے پر چلتا تھا۔ وہاں خواتین کی تدریس کے علاوہ ان کے قیام کے انتظامات بھی موجود تھے۔ مرزا صاحب نے روحی کو اپنی شناخت عطا کر دی۔

مدرسہ ملحقہ شہر میں تھا۔ روحی نے اپنے آپ کو ادارے میں محصور کر لیا۔ گو ادارے کو اس کے حالات ماضی کا ادراک تھا مگر انہیں عام کرنے سے اجتناب برتا گیا۔ روحی تعلیمی معاملات میں ہونہار نکلی، وہ مدرسے میں چار سال فیضیاب ہوئی۔

مدرسے کی تعلیم نے جہاں اسے مالا مال کیا وہاں کئی سوالوں کے جواب بھی دے دیئے۔ اس کی سوچوں کو پرداخت عطا کر دی اور نئی جہتوں سے رُوشناس کرایا، اسے باور کرایا کہ:۔

☆......ایمان شعور الٰہی بخشتا ہے جبکہ عشق عرفان الٰہی سے ہمکنار کرتا ہے۔

☆......دنیا سے محبت معرفتِ الٰہی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قرب کے لئے نفس کی پاکیزگی ضروری ہے۔

☆......روحانیت کے نقطۂ نظر میں جسم انسانی ایک ایسا گھر ہے جہاں روح انسانی جو کہ پرتوِ حق باری تعالیٰ ہے، مقید ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ڈھونڈنا ہے تو اسے اپنے من میں تلاش کرنا چاہئے۔ یعنی عبادت اور ریاضت سے اندر کی دنیا کو سنوارنا چاہئے۔ جب انسان کے اندر بسی دنیا شعور اور احساس کے ذریعے سج دھج اختیار کر لیتی ہے اور یوں بالآخر اندر خلوت کدہ نورِ حق بن جاتا ہے تو پھر جستجو کرنے والے کو قبلہ و کعبہ کا ظہور بھی اپنے تن من میں ہی ہو جاتا ہے اور قبلہ گاہی کی سمت واضح نظر آنے لگتی ہے۔

روحی کو احساس ہوا کہ علوم، جن سے وہ رُوشناس ہوئی، گھنگور گھٹا بادلوں کی طرح بھائی دیتے تھے مگر اس برکھا سے عاری تھے جو من پر موسلا دھار برستی ہے۔ وہ ایسی برکھا چاہتی تھی جو اس کے من پر برسے تو روح میں اتر جائے۔ ایسی رعد چاہتی تھی جس کی چکا چوند میں وہ سب کچھ دیکھ لے، جس کی طرف علوم اشارہ کرتے تھے۔ وہ یقین کرنے لگی تھی کہ:

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں، عالم ہوئے بھارے ہُو
حرف اِک عشق دا پڑھ نہ جانن، بھلے پھرن وچارے ہُو

(عالم ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جو ظاہری علم و فضل میں بہت آگے نکل جاتے ہیں مگر باطنی علم اور تربیت سے محرومی کے باعث ساحل مراد سے دور رہ جاتے ہیں)

علمی کھوج کے بعد وہ عمل چاہتی تھی۔ بقول امیر خسرو:

عشق آمد و عقل رخت بر بست
ایں ہم ز کمال کاروانی است

(لوگ، جو عشق اور عقل کی منزلیں پہچان کر بھی عشق الٰہی سے گریز کرتے ہیں وہ تہی دست رہ جاتے ہیں)

روحی کو ادراک ہوا تھا کہ اب اس کی باطنی تربیت ضروری ہے۔ من میں عشق الٰہی کی جوت کسی کامل رہنما کی نگرانی ہی میں جگائی جا سکتی ہے۔ فیضان الٰہی کے باعث یہ تحفہ اسی دم ملتا ہے جب ریاضت صحیح ڈھب سے آگے بڑھے۔ کسی کامل کی نگہبانی ایسی جستجو کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی، مرشد من وچ میرے لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی ملیس، ہر رگے ہر جائی ہُو

(اللہ تعالیٰ کی جوت کا پودا مرشد نے میرے من میں اُگا دیا ہے اور پھر نفی اثبات کا سبق دے کر عشق کے اس نہال کو پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کیا ہے)

✿

روحی مرشد کی تلاش میں نکلی تو اسے مایوسیوں سے پالا پڑا۔ اس نے کئی در کھٹکھٹائے مگر پسپائی لے کر لوٹی۔ مردِ کامل جس کی وہ متلاشی تھی اسے نہ ملتا۔ درباروں پر نذرانوں کے ڈھیر دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اللہ کے برگزیدہ بندے یوں سرِ عام نہیں ملتے، وہ اپنے تئیں چھپا کر رکھتے ہیں، انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی صرف کسی قسمت والے کو ہی مل پاتے ہیں۔

ایک آستانے پر اسے کچھ سکون محسوس ہوا، وہاں کچھ عرصہ جاتی رہی۔ سائیں محترم اچھے شخص تھے لیکن کسی عطا سے پہلے ظرف دیکھتے تھے۔ ریاضت بھی پرکھی جاتی تھی، ثابت قدمی بھی دیکھی جاتی تھی تب باطنی تربیت شروع ہوتی تھی۔ روحی کے من میں بے چینی ہر پہلو دکھائی دیتی تھی۔ وہ آتش بھی پہچانی جاتی تھی جو پیاسے دلوں میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے باوجود وہ سائیں محترم کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکی۔

''ذکر کے لئے کلمہ لینا ہے تو سائیں جی کو خوش کر دو''۔ ایک روز ایک مصاحب نے اسے کہا۔

''وہ کیسے؟ مایا سے، عبادت سے، منت سماجت سے یا کسی دوسرے اللہ والے کی سفارش سے، کیسے؟''۔ روحی نے استفسار کیا۔

''جو عطا تم چاہتی ہو بہت پاپڑ بیلنے کے بعد ملتی ہے''۔ اسے جواب ملا۔

حال دا محرم کوئی نہ ملیا، جو ملیا سو غرضی ہُو

آخر روحی نے وہ کلمہ خود ہی تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کا ورد اس کے من کو جلا بخشے اور اسے باری تعالیٰ کے قریب لے جائے۔ قدرت اللہ شہاب کے تجربے وہ پڑھ چکی تھی، جن کا ذکر انہوں نے ''شہاب نامہ'' میں کیا ہے۔ اس نے صوفیائے کرام کی کتابیں کھول لیں اور جستجو میں آگے بڑھنے لگی۔ حضرت سلطان باہو کی چار سطریں اسے بھا گئیں۔

کلمے لکھ کروڑاں تارے، ولی کیتے سے راہیں ہُو
کلمے نال بجھانے دوزخ، اگ بلے، ازگاہیں ہُو
کلمے نال بہشتیں جانا، نعمت سنجھ صباہیں ہُو
کلمے جیہی نہ نعمت کوئی، اندر دوئیں سرائیں ہُو

(کلمہ طیبہ کے ورد سے کروڑوں طالبانِ حق کو بحرِ وحدت کے پار اترنا نصیب ہوا ہے اور یہ اَن گنت پیاسے دلوں کو مقام ولایت پر پہنچا چکا ہے۔ اس کی تاثیر سے روزِ محشر کئی افراد کو بھڑکتی آگ سے نجات مل جائے گی۔ یوں اس کے طفیل کئی لوگ جنت میں داخل ہوں گے)

روحی نے مزید جستجو کی تو اسے معلوم ہوا کہ ایمان کی سب سے افضل شاخ ''لا الہ الا اللہ'' ہے۔

(سیدنا ابوہریرہ، مسلم شریف)

حضرت سلطان باہو نے ایک جگہ اپنا تجربہ بھی لکھا ہے کہ ''ہمیں کفر اور اسلام کے درمیان امتیاز اس وقت

سمجھ میں آیا جب کلمہ طیبہ نے ہمارے جسم و جان اور جگر میں رچ بس کر اپنا اثر دکھایا۔

روحی نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کیا کہ دیگر عبادات کے ساتھ وہ کلمہ طیبہ کے اوراد کیا کرے گی۔ مدرسے میں کسی استاد کی مدد سے اس نے ذکر کا اسلوب بھی طے کر لیا۔ روحی اس پر مطمئن ہوگئی اور ثابت قدم بھی۔ اس کا استاد اپنی بساط کے مطابق اس کی رہنمائی کر دیتا۔

چند روز بعد اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ مرحوم اشرف علی مرزا کے ساتھ خلا میں کسی جگہ کھڑی ہے اور اسے تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس نے کہکشاں کی جانب دیکھا تو اسے وہاں ستاروں کی دھج میں ''لا الہٰ الا اللہ'' لکھا ہوا نظر آیا۔ اس خواب نے اس کی حوصلہ افزائی کر دی۔ اسے اپنی لگن کی سچائی پر یقین آ گیا۔

روحی اب بزم آرائیاں بھی کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی محافل بارونق ہونے لگیں۔ وہ گرد و نواح میں بی بی نیکو سرشت کے نام سے شہرت پانے لگی۔ خواتین کی کثیر تعداد اس سے استفادہ کرنے لگی۔ ماہ و سال اسی طور گزرتے رہے۔ ایک مدت گزر گئی، آخر وہ عالم بھی آ گیا کہ روحی کہا کرتی تھی:

کلمے نال نہائی، دھوئی، کلمے نال ویاہی ہُو
کلمہ میرا پڑھے جنازہ، کلمے گور سہائی ہُو
کلمے نال بہشتیں جانا، کلمہ کرے صفائی ہُو
مڑن محال تنہاں نوں، جنہاں صاحب آپ بلائی ہُو

(کلمہ طیبہ نے اپنے نفی اثبات کے اسرار و رموز اور اس کی کہنہ کی تفسیر و تعبیر نے میرے اندر سے شرک اور ماسوائے اللہ کے، تمام آلائشوں اور خواہشات کو مٹا کر اس طرح دھو ڈالا ہے کہ میں ان کی کدورت سے بالکل پاک صاف ہو گیا ہوں اور میرا یہ غسل کامل اسی کلمہ طیبہ کا ہی مرہون منت رہا ہے۔ کلمہ طیبہ نے چونکہ میرا ظاہر اور باطن مکمل طور پر پاک صاف کر دیا ہے، اس لئے یہ اب میرے روزمرہ کا حصہ بن گیا ہے۔ میرے مشاغل اور مراحل اب اللہ کی رضا کے تابع ہو گئے ہیں اور میرے اندر کوئی دوئی باقی نہیں رہی۔ جب میں خاکی جسم سے پاک ہو کر وحدت کے سمندر میں جانے لگا تو اسی کلمہ نے میرے ماضی کی تجہیز میں میری اعانت کی اور جب میرا وقتِ آخر آیا، تب بھی اسی کلمے نے میری منزلیں آسان کر دیں۔ آخر میں حضرت سلطان باہُو نے روحانی ارتقاء کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صاحب عرفان کی موت واقع ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسے اپنی طرف بلاتے ہیں اور اسے درجہ فنا فی اللہ عطا فرماتے ہیں اور پھر اسے واپس درجہ بقا باللہ میں لاتے ہیں، یہی کمال عروج ارتقاء ہے۔)

کبھی ماضی پر بات کرتی تو روحی دوسروں کی

انمول موتی

- زبان کی حفاظت دولت سے زیادہ مشکل ہے۔
- کسی کے منہ پر تعریف کرنا اسے قتل کر دینے کے مترادف ہے۔
- اگر عبادت نہیں کر سکتے تو گناہ بھی نہ کرو۔
- دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم پہلے کیا تھے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ تم اب کیا ہو۔
- جہاں اپنی بات کی قدر نہ ہو وہاں چپ رہنا ہی بہتر ہے۔
- لوگوں سے ملتے وقت اتنا نہ جھکو کہ اٹھتے سہارا لینا پڑے۔
- اس امید پر کہ دوسرا معافی مانگے گا لڑائی شروع نہ کرو کیا پتہ تمہیں ہی معافی مانگنا پڑے۔
- انسان کی خواہش ایک خاردار پودہ ہے اگر اسے آج نہ اکھاڑا گیا تو کل یہ تناور درخت بن جائے گا۔

رہنمائی کے لئے اپنی زندگی کے واقعات دہراتی۔

ایک بار کہنے لگی کہ میں نے سعی کر کے عبادات میں محنت بڑھا دی تو مجھے اپنی کارگزاری میں پختگی کا احساس ہونے لگا۔ اس دم اس پہلو لطف و سرود بھی بڑھ گیا۔ مجھے کچھ ادراک سا ہوا کہ میں منازل میں سفر طے کر رہی تھی۔ تغافل کرتی تو پیچھے کو دھکیل دی جاتی۔ فاصلوں کو ذرا طے کیا تو لگا جیسے اندر وجود میں آتش سی موجزن ہو گئی، جو کبھی بھڑک کر شدید ہونے لگتی۔ ایسا لگتا کہ میں اس آتش میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی اور باقی کچھ نہیں بچے گا۔ کبھی انجانی سی بے خودی طاری ہو جاتی۔ ایک شب میری یادوں میں ہمیشہ سرمایہ بنی رہے گی۔

موسم کی سردی زوروں پر تھی، میرا بدن حرارت میں تپ گیا تھا۔ میں اپنے وجود کی بھٹی میں بھانبڑ بنی لگتی تھی، کسی پل بھی چین نہیں آتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ حواس بھی معطل ہونے لگے۔ پھر ذہن میں مانوس الفاظ ابھرنے لگے۔ یہ نوائیں رفتہ رفتہ لے کے زیر و بم میں ڈھلنے لگیں۔

چھیتی آویں وے طبیبا! نہیں تاں میں مر گئی آں
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

مجھے کچھ سجھائی نہ دیا، ذہن ماؤف لگا۔ میں عجب سے کیف میں اٹھی اور پرانے صندوق کھول لئے۔ وہاں سے گھنگھرو نکالے اور بدن پر سجا لئے۔ پھر بے خود ہو کر آنگن میں رقص کرنے لگی۔ یخ بستہ تنہائی میں گھنٹوں ناچتی رہی۔ اتنا شدت سے ناچی کہ گھنگھرو ٹوٹ کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ آخر تھک ہار کر بے حس، زمین پر گر پڑی۔ تادیر وہیں پڑی رہی اور بدن پر کہر جمتا رہا۔ ہوش میں لوٹی تو حضرت خواجہ عثمان ہارونؒ کا شعر ذہن میں گونج رہا تھا۔

خوشا رندی کہ شاماش کنم صد پارسائی را
زہے تقوئی کہ من باجبہ و دستار می رقصم

یہ میرا آخری رقص تھا۔ سچ مانیں تو خود کو پہچاننے کے لئے اپنی ذات اور کمال کی نفی بہت ضروری ہوتی ہے۔

❁

روحی کسی ولایت کا دعویٰ نہیں کرتی تھی نہ ہی خود کو کوئی مذہبی رہنما خیال کرتی بلکہ اپنے آپ کو دین حق کی طالبہ گردانا کرتی۔ اس نے اسی مدرسے میں تعلیم دینے کا سلسلہ برقرار رکھا جہاں سے خود تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس کا قیام بھی مدرسہ سے ملحقہ ایک عمارت میں رہا جہاں اس کے دم سے خواتین کی محافل برپا ہوتی تھیں۔

روحی نوع انسانی سے عجز کا اظہار کرتی تھی اور اپنی محدود آمدنی میں بے کسوں کی حاجت روائی بھی کر دیتی تھی۔ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کے روزمرہ میں کوئی تمکنت نہیں تھی۔

جوانی کے دور میں اسے شادی کے پیغامات ملے مگر مختلف وجوہات کی بناء پر معاملات آگے نہ بڑھ سکے۔ ڈھلتی عمر میں اس نے ایک بچہ گود لے لیا۔ یہ شیر خوار بچہ بلجیم کے کسی جوڑے کی اولاد تھا جو ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ روحی نے بچے کو سیف اللہ خالد کا نام دیا۔ اس نے بچے کی تربیت جانفشانی سے کی۔

زندگی میں روحی نے اپنے باپ کو فقط ایک بار دوبارہ دیکھا تھا۔ اس ملاقات کی درخواست اس نے خود اپنی خالہ مہوش سے کی تھی وہ اس شخص کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی جس نے اپنی سگی نوزائیدہ کو فروخت کر دیا تھا۔ مہوش نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ زمانے میں بدنام ہو چکا تھا اور ہیرامنڈی میں مکروہ دھندے کر رہا تھا۔ اس نے روحی کو باپ سے دور رہنے کی تاکید بھی کی تھی۔

❁

روحی کا پتا کاٹ کر پیر جابر شاہ کو بڑی کامیابی ملی تھی۔ اس نے مراد کو دبئی بھجوا دیا تا کہ وہ اس کے امپورٹ

ISO 9001
UKAS
جوڑ سے بے نیاز غیر ملکی سے زیادہ مضبوط
اٹلس
100% امپورٹڈ
سٹین لیس سٹیل
پاکستان میں سب سے پہلے بنانے والے
اٹلس وایگل برانڈ
کچن سینک
واش بیسن
لیبارٹری باؤل
سٹینلیس سٹیل
مین ہول کور
ATLAS

ایکسپورٹ کے محدود کاروبار کو وسعت دے سکے۔ مراد بادلِ ناخواستہ وہاں چلا گیا۔ جابر شاہ نے اس کی شادی کے لئے بھی کوشش کی مگر مراد اس پہلو باپ سے متفق نہ ہو سکا۔ وہ مدتوں دل گرفتہ رہا۔ حالات کی یکسانیت پر پندرہ برس کی گرد جم گئی۔ مراد کی حیات نے پینتالیس بہاریں دیکھ لیں۔ زیست کے اس موڑ پر بالآخر ایک دوسری لڑکی نے اس کا من موہ لیا۔ اس لڑکی کا نام آشا تھا اور اس کا تعلق بھارت سے تھا، اس دم اس کا خاندان دبئی میں مقیم تھا۔

جابر شاہ نے مراد کی شادی کرنے میں تاخیر نہ کی۔ مراد یہ جانتا تھا کہ اس کا سسرال سفلی اور منفی علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خاندان کا بیشتر حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا، جن میں چند ایک ہندوؤں کے پروہت بھی تھے۔ آشا کے خاندان کے چند گھرانے عرب ممالک میں قیام کے باعث مسلمان ہو گئے تھے۔ مراد کو اپنے طور پر سفلی علوم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسے فقط آشا کی اداؤں نے گھائل کیا تھا۔ لڑکی آفت کی پڑیا تھی اور مردوں کو لبھانے کا سلیقہ رکھتی تھی۔

آشا بالآخر پیر خانے میں رہنے لگی مگر اسے وہاں کی روایات سے دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کا رجحان انہی علوم کی جانب رہا جنہیں اس کے اجداد کا عظیم تحفہ سمجھا جاتا تھا۔

مراد آشا کے ساز و سامان پر ہنسا کرتا تھا جس میں پُتلے، گُڈے، انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں، منکے، متفرق سفوفوں کی بوتلیں اور مختلف انواع کے برتن چھریاں، چاقو اور کئی جسامت کی سوئیاں اور سُوئے نمایاں نظر آتے تھے۔ اس کے پاس کتابیں بھی موجود تھیں جن میں مختلف اشکال کے ساتھ ہندی تحریریں بھی لکھی گئی تھیں۔

کتابوں میں تصویریں بھی تھیں جو مافوق الفطرت دکھائی دیتی تھیں۔ مراد ان چیزوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ یہی نہیں، وہ پیار سے اپنی بیوی کو جادوگرنی بھی کہا کرتا تھا۔ درحقیقت وہ آشا کی آنکھوں کے جادو کا گرویدہ تھا اور اپنی بیوی کی کایا میں فقط اسی سحر کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ ادراک نہیں رکھتا تھا کہ اس کی بیوی کا ہر انگ سراپا کالا جادو تھا جو کسی کو بھی ڈس سکتا تھا۔

مراد کو اپنی بیوی کی پُراسرار قوتوں کا اندازہ اس دم ہوا جب دونوں کے بیچ پہلا جھگڑا ہوا اور مراد نے بھرپور تھپڑ بیوی کے رخسار پر جڑ دیا۔ مار کھا کر آشا اسے خوفناک نظروں سے دیکھنے لگی جیسے ناگن زخمی ہو کر شکار کا جائزہ لینے لگتی ہے۔

''تم نے یہ جرأت تو کر لی، اب ذرا میرا وار بھی سہہ کر دیکھنا''۔ اس نے طیش بھرے لہجے میں کہا۔ اس دم وہ بل کھا رہی تھی۔

''کیا کر لو گی تم؟''۔ مراد غرایا۔

''وہ کروں گی کہ تم عمر بھر یاد رکھو گے''۔ آشا نے دیدے پھاڑ کر کہا۔

''اپنی اوقات مت بھولو''۔ مراد کڑک کر بولا۔

''اوقات تو تم اپنی جان لو گے۔ آج اور اسی شب، تم نے میرے آگے ہاتھ نہ جوڑ دیئے تو آشا میرا نام نہیں''۔ آشا نے دعویٰ کیا۔ ناگن کی طرح پھنکار کر صوت اپنی گفتگو میں شامل کر دی۔ شام تک دونوں کے بیچ بول چال بند رہی۔

رات، کھانے کے بعد عجیب ماجرا ہوا۔ مراد کے بدن میں دائیں جانب سرتاپا شدید درد ظاہر ہوا پھر یہ درد بڑھ کر بے قابو ہونے لگا۔ مراد کو یہ الم انجانا سا لگا، وہ بُری طرح کراہنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے مسکن اور درد کش ادویہ دیں، ٹیکہ بھی لگایا مگر مراد کو درد میں افاقہ نہ ہوا بلکہ اس کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ درد بڑھ کر حدیں چھونے لگا۔ وہ اسی درد کے مارے مرنے لگا، دربار میں قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ موقع پا کر آشا نے خاوند کو دن کا واقعہ

یاد کرایا۔ مراد کو معاملہ سمجھ میں آیا تو اس نے فوراً بیوی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، ہار مان لی۔

آشا تھوڑی دیر اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اٹھی اور ایک پٹاری سی کھولی، اس میں سے ایک پتلا نکالا جس کے دائیں جانب لمبی سی سوئی پیوستہ نظر آئی تھی۔ جونہی آشا نے کچھ بڑھتے ہوئے سوئی پتلے کے وجود سے باہر کھینچی، مراد کو سکون مل گیا۔

''مزید فساد برپا نہ کرنا۔ یاد رکھو! میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں''۔ آشا نے خاوند کو تنبیہ کی مگر مراد میں اتنی ہمت بھی نہیں بچی تھی کہ وہ کوئی بات کر سکتا۔ اس نے ہر پہلو سے ہار مان لی تھی۔ اب وہ مستقبل کے بارے میں بھی متفکر ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں آشا کا ایک کزن بھی بھارت سے آیا ہوا تھا اور وہ دونوں مل کر کسی منصوبے پر کام کر رہے تھے۔

انہی دنوں کوئی شخص پیر خانے آیا۔ اس کی جائیداد پر کوئی غاصب قابض ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ غاصب کا کسی عمل کے تحت قلع قمع کر دیا جائے تاکہ اس کی جائیداد واگزار ہو جائے۔ مراد نے یہ منفی عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ معاملے کی بھنک کسی طرح آشا کے کان میں پڑ گئی۔ اس نے اپنے کزن کی وساطت سے مذکورہ شخص سے ڈھیر سارا پیسہ بٹور لیا اور پھر اسی کزن کی وساطت سے منفی عمل کروا لیا۔ اس کا کزن اکیس روز تک کسی قبرستان جاتا رہا۔ وہ وہاں کھجور کی گٹھلیوں پر کچھ پڑھا کرتا تھا۔ عمل مکمل ہونے پر غاصب شخص کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مقصد تو حاصل ہو گیا مگر پیر خانے میں اس واقعے پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ جابر شاہ بھی آشا اور اس کے کزن کے بارے میں شکوک کرنے لگا۔

❁

پوتے کی پیدائش پر جب وہ آشا کو دیکھنے آیا تو اس کے کمرے کا ساز و سامان دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ وہ کمرے میں بیٹھے بغیر الٹے پاؤں وہاں سے چلا گیا۔

چند روز بعد اس نے مراد کو پاس بلایا اور اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا، کہا۔ ''ہمارے اجداد روحانیت سے مالا مال تھے، عالم بھی اعلیٰ پائے کے تھے۔ انہوں نے انسان کی بہت خدمت کی۔ میں نااہل تھا، ان کی تقلید نہ کر سکا، نہ تو پاس علم تھا اور نہ روحانیت، پیسہ کمانے کے لئے ہر قسم کا ڈھونگ رچانا پڑا۔ میں فریب کار تھا، معاشرے کو دھوکہ دیتا رہا، بزرگوں کا نام بیچتا رہا۔ میں نے زبان کا سودا کیا، محنت سے عاری شخص تھا۔

تسبیح ددا توں کبی ہویوں، ماریں دم ولیاں ہُو
دِل نہ منکا ہک نہ پھیریں، گل پائیں پنج ویہاں ہُو

(تُو نے دکھلاوے کے لئے تسبیح ہاتھ میں تھام رکھی ہے اور اس کے منکے گرانے کی عادت اس قدر پختہ کر لی ہے کہ اس میں کسب کمال حاصل کر لیا ہے۔ تُو ولیوں کی نقل کر رہا اور یہ فریب کر کے حرام کھا رہا ہے۔ اصل تو یہ تھا کہ ذکر دل اور روح سے جاری ہو جاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، زبان سے اقرار کرو اور دِل سے تصدیق کرو)

میں وہ منافق رہا ہوں جس سے جہنم کی آگ بھی پناہ مانگتی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ ٹیلی پیتھی قدرت نے ہر انسان کو عطا کی ہے، کسی میں یہ کم اور کسی میں بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس صلاحیت کو بعض مشقیں ابھار بھی سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں بغیر مادی ذرائع کے اپنے خیال دوسروں تک پہنچائے اور وصول کئے جا سکتے ہیں۔ اس صلاحیت کا استعمال محافل میں کیا جائے تو لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ میں نے اس پہلو دسترس حاصل کر لی تھی۔ زندگی میں یہ واحد لگن تھی جو میں نے شوق سے اختیار کی۔

میری دلی خواہش تھی کہ تُو میرے جیسا نہ بنتا، تعلیم میں ترقی کرتا، روحانیت بھی پا لیتا مگر تُو بھی سراسر محروم ہی رہا بلکہ اس بابت مجھ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا اور سفلی

امور کی طرف چل پڑا۔ لوگ تجھ پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ ابھی موقع ہے، سنبھل جا ورنہ مجھے خدشہ ہے کہ میں کئی انواع کا قلق ہمراہ لئے قبر میں اتر جاؤں گا''۔

مراد خاموشی سے گفتگو سنتا رہا کچھ بھی نہ کہہ سکا، نہ تو وعدہ کر سکا نہ کوئی تردید، بیٹھا انگلیاں چٹخاتا رہا پھر چپکے سے باہر نکل گیا۔ وقت کا پہیہ پھر اپنی ڈگر آگے چل پڑا۔

آشا کوئی عمل کر رہی تھی جس کے لئے وہ ایک شیر خوار بچے کی آنکھیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے کزن کو آمادہ کیا کہ وہ قبرستان میں نئی قبروں پر دھیان مرکوز رکھے مگر اس کا کزن حد سے بڑھ کر لالچی ثابت ہوا، اس نے مقصد حاصل کرنے کے لئے کسی کا شیر خوار بچہ قتل کر دیا۔ چند ہی دنوں میں پیر خانے پر چھاپہ پڑا اور وہاں کے تمام باسی دھر لئے گئے۔

پیر جابر شاہ کو عدالت نے ضمانت پر رہا کر دیا۔ زیست نے اس پر تجربوں کا بوجھ لاد دیا تھا، اب وہ شکستہ پا دوراں کی خاک چھان رہا تھا۔

''کبھی آپ نے مجھے بھی گندے خون کا طعنہ دیا تھا، یاد کریں۔ دیکھیں آج آپ اسی فقیرنی کے در پر کھڑے ہیں۔ خون نہیں، تقوے کی بات کریں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو صرف تقویٰ عزیز ہے۔ ہم سب اللہ کے عاشق ہیں، کوئی رستے میں آگے بڑھ گیا ہے تو کوئی فقط چند قدم چل سکا ہے۔ صرف اللہ سے مانگیں، جس نے انسانوں کا پیار اپنا لیا، اس نے رب کا کرم پا لیا''۔

بی بی نیک سرشت کے ڈیرے پر سے لوٹتے ہوئے پیر جابر شاہ کے ذہن میں گفتگو کے الفاظ گونج رہے تھے۔ یہ لفظ اس کے تفکر کا حصہ ہی نہیں بنے تھے بلکہ تیروں کی طرح اس کے دماغ میں پیوست ہو گئے تھے۔ لفظ گو سب پرائے تھے مگر انہوں نے جابر شاہ کے وجود میں الم جگا دیا تھا۔ وہ کٹھن راہوں پر تنہا چل رہا تھا۔ عمر نے اس کی کمر جھکا دی تھی جبکہ سالوں پر محیط غلط روی کے باعث اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ جلد از جلد دربار پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مراد کا نومولود شیر خواہ وارث وہاں اس کا منتظر ہوگا۔

عمر کے آخری حصے میں وہ گدی بُری طرح بدنام ہوئی تھی جو اس نے برسوں سے سنبھال رکھی تھی۔ ''کاش! ہم ان ہستیوں کا ورثہ سنبھال سکتے، جن کے باعث ہمیں معاشرے میں عزت ملی''۔ پیر جابر شاہ کی سوچ ایک نکتے پر مرکوز ہو گئی۔

❁

وہی شب تھی جب روحی کو وہ اجنبی خوش وضع شخص نظر آیا جس نے اس کی کایا پلٹ دی تھی۔ روحی اس کا نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اجنبی شخص روحی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، کہا۔ ''خدمت خلق بھی کسی ڈیوٹی سے کم نہیں ہوتی''۔ اس نے روحی سے مزید کہا۔ ''وہ ضعیف ہو چکا تھا اور بیمار رہنے لگا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اب کوئی امریکہ آ کر اس کا کام سنبھالے''۔ اس نے روحی سے یہ بھی کہا۔ ''وہ اپنے لے پالک بیٹے سیف اللہ خالد کی وساطت سے امریکہ آئے گی مگر ماں بیٹے کی ملاقات شاید اس سے نہیں ہو سکے گی''۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اجنبی شخص واپس جانے کے مڑا تو اس نے ایک معنی خیز جملہ کہا۔ ''ہر شجر سایہ دار اپنا متبادل بنانے کی سعی کرتا ہے۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنا بنا بنایا متبادل مل گیا ہے''۔ یہ کہہ کر اجنبی شخص رخصت ہو گیا۔ روحی بیدار ہوئی تو گفتگو کا آخری حصہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

نوٹ:۔ اس کہانی میں موجود صوفیانہ کلام سمجھنے کے لئے مختلف کتب کا مطالعہ کرنا پڑا جس میں ''شرح ابیاتِ باہو'' بطور خاص شامل ہے جو ابوالکاشف قادری کی کاوش ہے)۔

❁❁❁

بن کی سزا

محمد نذیر ملک

ساون کی نرم رو ہوا کسی حسینہ کے آنچل کی طرح دھیرے دھیرے مچل رہی تھی۔ آسمان پر جابجا پانی سے لدے مٹیالے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے زوردار مینہ برسا تھا۔ ہر شے جل تھل ہوگئی تھی۔

میں بن کے تیور دیکھنے اس کی سیڑھیوں والی منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ پیپل کے پیڑ کے ساتھ علیک سلیک کے بعد میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ کئی ایک سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بن لبالب بھری ہوئی تھی، تازہ بارش سے اس کا پانی کافی حد تک شفاف تھا۔ میری نظریں بن کے پانی پر گڑی ہوئی تھیں، نگاہیں جونہی لوٹ کر سیڑھیوں سے ٹکراتیں تو برسوں پہلے رونما ہونے والا کنیز کے ڈوبنے کا واقعہ ذہن میں تازہ ہوگیا۔ اس واقعہ کے یاد آنے پر مجھے یہ بن کچھ زیادہ ہی اجڑی ہوئی اور ویران لگی۔

گاؤں کی بن (تالاب) شمالی کنارے سے کھون (نشیبی علاقہ) کے کھیتوں کی جانب بہہ نکلی تھی۔ مغرب کی سمت بڑی منڈیر کے ملحقہ حصہ میں بن کی گہرائی بہت

زیادہ تھی جہاں صرف مشاق تیراک ہی ٹھہر سکتے تھے جو اونچی منڈیر سے بن کے اندر Dive یا غوطہ زنی میں ماہر ہوتے۔ اس کے علاوہ بن کے تینوں کنارے سطح زمین سے زیادہ گہرے نہ تھے۔ گھروں میں پانی مہیا نہ ہونے کے سبب گاؤں کی خواتین انہی کناروں پر کپڑے دھویا کرتیں اور مال مویشی بھی یہیں سے پانی پیتے۔ بن کی اونچی منڈیر پر پیپل کا ایک کہن سالہ پیڑ بازو پھیلائے ایستادہ تھا۔ پیپل کے خوشنما پتے ہوا کے دوش پر تالیاں پیٹتے رہتے۔ یہ پیڑ ہر کسی کا اتنا اپنا تھا جیسے اس کے اپنے گھر کی کوئی پالتو چیز ہو۔ ہمارا بچپن بھی اسی کے سایہ میں اور اس کے ٹہنوں پر جھولتے کھیلتے اور گرم دوپہروں میں بن میں نہاتے گزرا۔

عید کے موقع پر اس پیڑ کے ٹہنوں پر جھولے پڑتے، گاؤں کی نوجوان لڑکیاں جوڑی جوڑی ہو کر پینگیں جھولتیں۔ لمبے لمبے رسوں سے بڑی بڑی پینگیں بنائی جاتیں جنہیں مقامی زبان میں ''مسہلا'' کہا جاتا۔ عید والے دن ''مسہلے'' والی جگہ پر فقط خواتین اور بچوں کا راج ہوتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب گھر والے آرام کر رہے ہوتے تو ہم چپکے سے نکل کر بن پر پہنچے ہوتے اور اس میں نہانے لگ پڑتے۔ پہلے پہل بن کی کم گہرائی کے پانی والی منڈیر کی سیڑھیوں کی جگہ کا انتخاب کیا۔ اس جگہ منڈیر سے بیری کا ایک درخت ترچھا ہو کر بن کے پانی کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ کم عمر لڑکے اس درخت پر چڑھ کر کم گہرے پانی میں چھلانگیں لگاتے اور تیراکی کی مشق کرتے۔ تب تک اونچی منڈیر والے حصہ کی طرف جا کر نہانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہاں پر ہم سے بڑی عمر کے لڑکے جو تیراکی میں ماہر ہوتے، وہ نہایا کرتے۔ ہم وہاں جا کر ان کو اونچی Dive لگاتے اور تیرتے دیکھا کرتے۔

گاؤں کے مشہور آرمی کلر ہولڈر تیراک کپتان محمد بشیر بھی اس بن کی مرہونِ منت تھے۔ کپتان بشیر کا گھر بھی اس بن کے پڑوس میں تھا اور انہوں نے بن کا پڑوسی ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا وہ وہاں سے ماہر تیراک بن کر نکلے۔ آرمی Join کی اور تیراکی میں نام کمایا۔ ہم نے تو ان کا بچپن نہیں دیکھا وہ ہم سے عمر میں دس سال بڑے تھے۔ آرمی کلر ہولڈنگ کا اعزاز جیتنے پر ایک فوجی رسالے Army Gazette میں ان کا ایک انٹرویو چھپا۔ اس انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے تیراکی کہاں سے سیکھی ہے؟ تو کپتان بشیر نے بے ساختہ کہا کہ گاؤں کی بن سے۔ ان سے دوبارہ سوال کیا گیا کہ بن کیا ہوتی ہے؟ تو جواب میں انہوں نے گاؤں کی اس بن کا بھرپور تعارف کرایا اور کہا کہ تیراکی سیکھنے میں ان کا باقاعدہ کوئی استاد نہ تھا۔ ان کا استاد اور کوچ وہی گاؤں کی بن ہے۔

ہماری عمر کے تقریباً تمام لڑکوں نے وہیں سے تیراکی سیکھی جو بڑے ہوتے ہوتے بھی کام آئی۔ یہ بن تیراکی کی بہترین تربیت گاہ بھی تھی۔

ہاں تو ساون کے موسم میں جب بن میں تازہ پانی پڑتا تھا تو ایک تو اس کا پانی صاف اور شفاف ہو جاتا دوسرا پانی کی سطح اوپر آ جانے سے اس کی گہرائی میں اضافہ ہو جاتا۔ بڑی منڈیر کی جانب سے بن میں اترنے کے لئے بڑے بڑے پتھروں کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو بارش ماپنے کے پیمانے کا کام بھی کرتی تھیں۔ ہر ہونے والی بارش کے بعد دیکھا جاتا کہ اس بارش سے ان سیڑھیوں کے کتنے قدمچے (Steps) پانی میں ڈوبے ہیں۔ بڑی منڈیر کی سیڑھیوں سے بن کا نظارہ کافی خوفناک معلوم ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھی بعض خواتین اور لڑکیاں کپڑے دھویا کرتی تھیں لیکن والدین عموماً اپنے بچوں کو اس منڈیر کی سیڑھیوں کی جانب جانے سے سختی

سے منع کیا کرتے تھے کیونکہ دو ایک بار ایسے بھی ہوا تھا کہ کپڑے دھوتے دھوتے چھوٹی عمر کی لڑکیاں پھسل کر بن میں جا گریں اور ڈوب مریں۔

بیری والی منڈیر سے تیراکی سیکھنے کے بعد میں نے بھی تیراکی کے زعم میں بڑی منڈیر کا رخ کر ڈالا اور بعض تیراک لڑکوں کی طرح اونچی اور لمبی Dive (چھلانگ) لگانے کی ٹھانی جو کہ بغیر استاد اور کوچ کے ایک بہت بڑا رسک تھا اور یہ میری پہلی اور آخری Dive تھی۔

دوپہر سر پر تھی اور دھوپ بھی خوب تیز تھی۔ پیپل کا پیڑ اور بڑی منڈیر والی سیڑھیاں تقریباً آمنے سامنے تھیں۔ میں Dive لگانے کے لئے پیڑ کے قریب سے دوڑ کر آیا اور اونچی منڈیر سے سیدھا پیٹ کے بل بن میں چھلانگ لگا دی۔ بغیر ہاتھ چھوڑے سر نیچے کئے اور بدن کو کم از کم 40-30 ڈگری کے زاویہ پر ترچھا کئے اپنے آپ کو سیدھا پیٹ کے بل پھینک دیا جو کہ غالباً خودکشی کے مترادف تھا۔ بس ہونا کیا تھا جو ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ اتنی بلندی سے جب پیٹ سیدھا پانی پر آن گرا تو یوں لگا کہ پیٹ پھٹ گیا ہے۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ایک بار تو جسم پانی میں بہت نیچے چلا گیا، تیراکی جاننے کے باعث اوپر تو آ گیا لیکن درد سے کراہ اٹھا۔ اردگرد تیراکی کرنے والے دیگر ہم جولی بھی نہا رہے تھے، کسی نے میری طرف توجہ نہ دی لیکن میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ نہایت مشکل سے سیڑھیوں پر پہنچا جہاں کپڑے تھے، بمشکل تمام وہ کپڑے پہنے اور سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سبکی ہو جانے کے ڈر سے کسی کو بتانے سے بھی کترا رہا تھا کہ الٹا ساتھی لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنوں گا۔ بس وہیں پر پیٹ پکڑ کر بیٹھا رہا اور مشکل سے سانس لیتا رہا۔ کافی دیر بعد جب درد میں ذرا سا افاقہ ہوا تو منڈیر کی سیڑھیاں چڑھ کر گھر آ گیا۔

میں نے دوبارہ کبھی اس بن میں Dive نہیں لگائی البتہ سیدھی چھلانگیں خوب لگائی جاتیں اور لمبی تیراکی سے بھی دل بہلایا جاتا۔ گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود گاؤں کی نوجوان لڑکیاں بھی کپڑے دھونے کے لئے کبھی کبھی اس منڈیر کی سیڑھیوں کا رُخ کرلیتیں۔

دو نوجوان لڑکیاں جو آپس میں گہری سہیلیاں تھیں، شمیم اور کنیز، ان کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ دونوں اکثر اکٹھی رہتیں۔ ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی خوب آنا جانا تھا۔ دونوں کے والدین ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ انہیں ایک دوسری کے ساتھ باہر نکلنے سے کبھی کوئی نہیں روکتا تھا۔ وہ ذرا پابندی اور حیا کا دور تھا۔ بن پر کپڑے دھونا خواتین کی بڑی مصروفیت اور ایک بڑا کام ہوتا کیونکہ گھروں میں پانی دستیاب نہ تھا۔ پانی باہر سے بھر کر لانا پڑتا تھا لہٰذا اکثر خواتین کپڑے لے کر کسی پتن پر چلی جاتیں اور وہاں سے کپڑے دھولاتیں۔

بن لبالب ہوگئی تھی کیونکہ ساون کا تیز دھار مینہ برسا تھا۔ یہ کہونے والے کنارے سے بہہ نکلی تھی اور بھری پڑی تھی۔ بن کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک دفعہ تو مشاق تیراکوں کو بھی جھرجھری آجاتی۔ والدین نے بچوں کو بن پر نہانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ آج وہاں کپڑے دھونے والی کوئی خاتون یا لڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ سیڑھیاں خالی پڑی تھیں۔ بن سنسان تھی۔ پیپل کا پیڑ بھی سر نہوڑے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماحول پر ایک مہیب سا سناٹا طاری تھا۔ بن کے تیور اچھے نہ تھے۔ تیراک لڑکے ابھی نہیں پہنچے تھے البتہ تازہ بارش سے موسم نہایت خوشگوار ہوگیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم رو ہوا بہہ رہی تھی۔ ایسے میں نہ جانے کہاں سے دونوں سہیلیاں شمیم اور کنیز قہقہے لگاتی بن کی بڑی منڈیر کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ گھروں سے کپڑے اٹھالائی تھیں اور دھونے کے لئے پانی میں ڈوبی ہوئی سیڑھی سے اوپر والی سیڑھی پر جا بیٹھیں اور کپڑے دھونے شروع کردیئے۔ اس سنسان جگہ ان کو آپس میں گفتگو کے لئے مکمل رازداری حاصل تھی جبکہ دوسرے کناروں پر اکا دُکا خاتون دکھائی دینے لگی تھی اور کچھ ہی دیر میں وہاں کپڑے اٹھائے چند دیگر خواتین بھی آن پہنچیں۔

اچانک دوسرے کناروں پر کپڑے دھونے والی خواتین نے دیکھا کہ بڑی منڈیر کی سیڑھیوں سے ایک لڑکی پانی کی طرف ہاتھ اٹھائے چلا رہی ہے وہ سب اس طرف کو دوڑ پڑیں، اسی اثناء میں منڈیر کے اوپر سے کچھ مرد بھی آن پہنچے۔ شمیم نے بتایا وہ اور کنیز کپڑے دھو رہی تھیں کہ اچانک کنیز کا پاؤں پھسلا اور وہ پانی میں گر گئی ہے۔ مردوں میں تیراک بھی تھے فوراً دو تین نے پانی میں چھلانگیں لگادیں لیکن اس 7-5 منٹ کے دورانیے میں کنیز ڈوب چکی تھی۔ بہرحال تھوڑی سی دیر کی تلاش کے بعد کنیز کو پانی سے باہر نکال کر منڈیر پر لٹایا گیا۔ منہ کے راستے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کی گئی لیکن کنیز پانی میں ہی دم توڑ چکی تھی۔ کنیز کے گھر اطلاع ہوگئی، وہاں کہرام مچ گیا۔ جوان بچی جس کی منگنی کی بات چل رہی تھی، یوں اچانک موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ پورے گاؤں میں صفِ ماتم بچھ گئی، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کنیز کی سہیلی شمیم کی حالت تو غیر تھی۔ پہلے تو وہ بن سے ہی نہیں آرہی تھی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی یہیں جان دے دے گی۔ بمشکل تمام اسے لایا گیا۔ کنیز کا بہت بڑا جنازہ اٹھا۔ ہر دل افسردہ تھا اور آنکھ نم تھی۔ ایک بہت بڑا حادثہ ہوکر گزرا تھا۔

کہتے ہیں وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے۔ جوان بیٹی کی موت سے کنیز کے والدین کے دلوں پر لگنے والا گھاؤ بھرنے لگا۔ شمیم بھی نارمل ہوگئی۔ زندگی پھر سے رواں دواں ہوگئی۔ بن پر زندگی عود کر آئی۔ وہی چہل پہل، لڑکوں کی تیراکی، خواتین اور لڑکیوں کا

کناروں پر کپڑوں کا دھونا دھلانا پھر سے جاری ہو گیا۔ شمیم نے ایک دوسری سہیلی بنالی جس کا نام راشدہ تھا۔ اب یہ دونوں اکٹھی بن پر جانے لگیں اور اس طرح ایک دوسری کی رازدان بن گئیں۔ جیسے شمیم اور کنیز تھیں، ان دونوں نے بڑی منڈیر کی سیڑھیوں کا رخ تو پھر نہیں کیا البتہ یہ بھی دیگر خواتین کے درمیان رہ کر دوسرے کناروں پر کپڑ دھولیا کرتی تھیں۔

کچھ ہی عرصہ بعد شمیم کی اسی گھر میں شادی ہو گئی جہاں پر اس کی مرحومہ سہیلی کنیز کی منگنی کی بات چل رہی تھی۔ شمیم کے شوہر کا نام غلام عباس تھا جو فوج میں نائیک تھا۔ سال بعد شمیم کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی پھر اوپر نیچے بیٹا اور بیٹی ہوئے۔ وقت کا ساگر بہتا رہا۔ گھر میں بھی پانی کی بدستور قلت رہی اور خواتین کپڑے دھونے کے لئے بن ہی کا رخ کرتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اولاد والدین کی فرمانبردار ہوا کرتی۔ چھوٹی عمر میں بیٹی ماں کا اور بیٹا باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیتا۔ شمیم کی بڑی بیٹی ساجدہ چودہ پندرہ سال کی ہو چکی تھی وہ بن پر برابر ماں کے ساتھ جا کر گھر کے کپڑے دھونے میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔ یوں تو ساجدہ کی کئی ایک سہیلیاں تھیں لیکن ایک نادیہ نام کی لڑکی اس کی گہری سہیلی تھی۔ ان دونوں کی آپس میں ایسی ہی دوستی اور پیار تھا جیسے شمیم اور اس کی مرحومہ سہیلی کنیز کا آپس میں تھا۔ یہ دونوں بھی آپس میں ایک دوسری کی رازدار تھیں۔

کئی بار ایسے بھی ہوتا کہ ان دونوں کی ماؤں کو فرصت نہ ہوتی تو گھروں سے یہ دونوں از خود ہی اکثر بن پر آ جاتیں۔ انہیں بھی گھروں سے سختی سے ہدایات تھیں کہ کسی طور بھی بڑی منڈیر والی سیڑھیوں کی جانب کا رخ نہ کریں۔ دوسری خواتین کی طرح وہ فقط بن کے کناروں پر ہی کپڑے دھولیا کریں۔ وہ والدین کا کہنا مانتی تھیں اور سیڑھیوں والی طرف نہیں جاتی تھیں۔ عموماً لڑکیوں کو چونکہ بن میں نہانے کی اجازت نہ تھی لہٰذا وہ تیراکی سے نابلد ہی رہتیں۔ پھر بھی اکا دکا خاتون کپڑوں سمیت مٹی کا خالی گھڑا لے کر پانی میں گھس جاتیں اور اسے پکڑ کر اس کے سہارے تیراکی کر لیتیں۔ ایسی لڑکیاں یا خواتین کبھی تیراکی نہ سیکھ سکتیں اور وہ سوہنی کی طرح عمر بھر ”کچے گھڑے“ کی محتاج رہتیں۔

ایسی ہی ساون کے مہینے کی ایک دوپہر کو جب حسب معمول بن لبالب بھری تھی یہ دونوں سہیلیاں بھی بن کو چل نکلیں۔ انہوں نے بھی شمیم اور کنیز کی طرح بن کی سیڑھیوں ہی کا رخ کیا اور وہاں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کپڑے دھونے لگیں۔ اس اثنا میں ان کے پیچھے پیچھے ساجدہ کی ماں شمیم بھی چلی آئی اس نے جب دیکھا کہ دونوں سہیلیاں سیڑھیوں پر بیٹھی کپڑے دھو رہی ہیں تو وہ بھاگ کر سیڑھیوں کے نیچے اتری اور تڑاخ سے دو تین تھپڑ اپنی بیٹی ساجدہ کے گال پر جڑ دیئے اور ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ان سیڑھیوں سے پانی میں پھسل جاتیں تو کیا ہوتا۔ ساجدہ نے گال سہلاتے ہوئے ماں کو جواب دیا کہ امی ہم دونوں بچیاں نہیں ہیں جو پھسل کر پانی میں جا گریں۔

”تمہیں ایک دوسری کا دھکا بھی لگ سکتا ہے تم دھکا دے کر ایک دوسری کو گرا بھی سکتی ہو“۔

ساجدہ نے اپنی سہیلی کے سامنے سبکی ہونے پر شرمندہ ہوتے ہوئے چلا کر کہا کہ امی میں بچی نہیں ہوں۔

شمیم نے جھٹ سے کہا کہ کنیز بھی بچی نہیں تھی اسے اس کی سہیلی نے دھکا دے دیا تھا اور وہ پانی میں گر کر ہلاک ہو گئی تھی۔

ساجدہ نے پوچھا کون کنیز اور کس نے اُسے دھکا دیا تھا؟ شمیم نے یہ بات کہہ تو دی تھی بیٹی کی سہیلی نادیہ کے سامنے لیکن اب وہ اپنی بات واپس نگل نہیں سکتی تھی۔ شمیم سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور پانی میں ڈوبی آخری

سیڑھی کو گھورنے لگی۔ پھر یوں بن پر نگاہ دوڑائی وہ اچانک چیخ اٹھی ــــ "کنیز میں نے تمہیں مار ڈالا تھا۔ تم ان سیڑھیوں سے پھسل کر بن میں نہیں گری تھی میں نے تمہیں دھکا دے کر گرایا تھا۔ میری اچھی بہن مجھے معاف کر دو" ــــ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکی بندھ گئی، پھر وہ اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ غوطے کھانے لگی۔ دونوں سہیلیاں مدد کے لئے چیخ اٹھیں اسی اثناء میں لڑکوں کی ایک ٹولی بن پر نہانے پہنچ چکی تھی جنہوں نے فوراً بن میں چھلانگیں لگا دیں اور ڈوبتی ہوئی شمیم کو جا دبوچا اسے جلدی میں پانی سے باہر نکال کر منڈیر پر لٹایا گیا۔ لڑکیوں کو سمجھایا گیا کہ کس طریقہ سے پیٹ دبا کر اندر داخل ہونے والا پانی نکالنا ہے۔ لڑکیاں اس کام میں جٹ گئیں۔ کافی پانی باہر آ گیا، شمیم زندہ تھی، گاؤں کے دیگر لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ شمیم کا شوہر جو چھٹی پر تھا وہ بھی بھاگتا ہوا بن پر پہنچ گیا۔ اس نے شمیم کو سنبھال لیا، وہ بچ گئی، اسے ہوش آ گیا۔

ہوش آنے پر اس نے کراہنا شروع کر دیا ــــ "مجھے مار ڈالو، مجھے ڈوبنے دو، میں نے کنیز کو بن میں دھکا دیا تھا۔ وہ خود سے نہیں گری تھی اور اس عباس کی خاطر" ــــ اس نے اپنے کی جانب غضبناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں نے منہ میں انگلیاں ڈال لیں۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ کیسے اور کیوں کر ہوا اور اتنی دیر یہ بات چھپی کیوں رہی؟

جب بات کھلی تو کہانی کچھ یوں تھی کہ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ شمیم اور کنیز گہری سہیلیاں تھیں لیکن ان کے اندر پلنے والے رقابت کے ایک اور گہرے جذبے کا کسی کو علم نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسری کی رازدار تھیں دونوں آپس میں ہر بات شیئر کرتی تھیں۔ دونوں نے دل ہی دل میں فوجی نائیک غلام عباس کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنا رکھا تھا۔ دونوں چاہتی تھیں کہ ان کی شادی عباس سے ہو۔ ادھر عباس کنیز کا دور پار کا رشتہ دار تھا، اس نے شمیم کو بتایا کہ عباس کے گھر والے اس کے گھر اس کا رشتہ مانگنے کے لئے آ جا رہے ہیں۔ اس زمانے میں لڑکی کا رشتہ لینے کے لئے ناکوں چنے چبانے پڑتے تھے۔ اس مقصد کے لئے لڑکے والوں کو بہت جوتے گھسانے پڑتے تھے اور بہت عرصہ لڑکی والوں کے گھر جانا پڑتا تھا تب جا کر لڑکی والے ہاں کرتے تھے۔ جو جتنا جلدی ہاں کر دیتا اتنا ہی وہ اپنی قدر گنوا دیتا اور لڑکے والوں کی نظر میں ہلکا پڑ جاتا اور بسا اوقات لڑکی کو شادی کے بعد سسرال سے طعنہ بھی سننا پڑتا کہ تمہارے والدین تو تیار بیٹھے تھے بس اشارے کی دیر تھی کہ کسی طرح یہ بلا گلے سے اترے۔

رشتہ دار ہونے کے ناطے اس بات کا قوی امکان تھا کہ کنیز کا رشتہ عباس سے ہو جائے گا جو شمیم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس وقت یہ بات بھی خلاف رواج تھی کہ کوئی لڑکی بول اٹھے کہ اس کا رشتہ فلاں لڑکے کے ساتھ کیا جائے۔ البتہ بولنے کا حق صرف لڑکوں نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہوا تھا۔ شمیم کی ماں صرف اس کی ماں نہیں تھی بلکہ گہری دوست بھی تھی اس سے وہ دل کی اندرونی باتیں بھی شیئر کر لیتی تھی۔ شمیم نے ماں کو کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گی تو عباس کے ساتھ کرے گی ورنہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی۔ ماں چونکہ بیٹی کی سہیلی بھی تھی اس نے شمیم کی اس بات کا برا منانے کی بجائے اس لائن یا پہلو سے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی چاہت پوری کرنے کے لئے کس طرح یہ رشتہ حاصل کرے۔

شمیم کی ماں نے عباس کے والدین سے تعلق رکھنے والی خواتین کے ذریعے اس بات کی ٹوہ لگانی شروع کر دی اور یہ کوشش بھی کہ عباس کے والدین کے کانوں تک یہ بات پہنچ جائے اور وہ اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے اس کے گھر آئیں بلکہ اس نے اپنے طور پر بھی عباس کی ماں

محبوب عالم، صابر حسین راجپوت اور میم الف کی شہرۂ آفاق کتب

کار، شلوار اور دوپٹہ -/.
ایک پاکستانی ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کی حیران کن سراغرسانی کی روئیداد (احمد یار خان)

بال ایک چڑیل کے -/.
جرم اور سراغرسانی کی حیران کن روئیداد (احمد یار خان)

روح کے رشتے اور مقتول کی بدروح -/.
جرم اور سراغرسانی کی دو طویل اور سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب مجھے اغوا کیا گیا -/.
جرم اور سراغرسانی کی تین خونچکاں داستانیں (احمد یار خان)

ایک رات کی شادی -/.
جرائم اور سراغرسانی کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

لاش، لڑکی اور گف کے گنہگار -/.
جرم وسزا اور سراغرسانی کی ایک انوکھی اور سچی کہانی (احمد یار خان)

دام میں صیاد آ گیا -/.
جرم وسزا اور سراغ رسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

واردات اُس رات کی -
جرم وسزا اور سراغرسانی کی ایک لرزہ خیز واردات (احمد یار خان)

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی -
جرم وسزا اور سراغرسانی کی بے مثال چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں -
رشتوں کے ناگ جب انسان کے جذبات کو مسخ کر دیتے ہیں تو انسان حیوان بن جاتا ہے (احمد یار خان)

آشرم سے اُس بازار تک -/.
تفتیش اور سراغرسانی کی پانچ حقیقی کہانیاں (احمد یار خان)

لائن پر لاش -
جرم وسزا کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

رتن کمہار کی روپا -/.
جرم وسزا اور سراغرسانی کی حقیقی، جذباتی پانچ سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جائیداد کا وارث -/.
جرم اور سراغرسانی کی دو طویل سچی تفتیشی کہانیاں (احمد یار خان)

بھیڑیا، بدروح اور بیوی -/.
انسانوں اور کتوں کے شکار کی سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ -/.
شکاریات کے موضوع پر آٹھ ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

قبر کا بھید -/.
شکار کے موضوع پر سات ایسی کہانیاں جو آپ کے جذبات میں زلزلے پیدا کر دیں گی (صابر حسین راجپوت)

ایک لڑکی دو منگیتر -/.
جذبات میں زلزلے برپا کر دینے والی شکار اور سماج کی ہنگامہ خیز نو سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

سانپ سادھو اور نوجے کی کہانی -
معاشرت کی نو ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

مایوسی کیوں؟ -/.
نفسیاتی، جسمانی اور روحانی توانائی ضائع نہیں ہوتی (میم الف)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) -/.
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (میم الف)

داستان ایک داماد کی -/.
جرم وسزا کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) -/.
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (میم الف)

لائن پر لاش -/.
جرم وسزا کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پاپی -/.
جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (محبوب عالم)

چادر اور چوڑیاں -/.
جرم اور سراغرسانی کی سچی اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ (محبوب عالم)

حوالات میں طلاق -/.
جرم وسزا سراغرسانی اور جذبات کو ہلا دینے والی دو طویل سچی کہانیاں (محبوب عالم)

بن بیاہی ماں -/.
جرم وسزا سراغرسانی کی سچی کہانیاں (محبوب عالم)

1857ء کی داستانِ خونچکاں
جنگ آزادی کی روئیداد قتل و غارت اور محبت کی چند کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پل صراط -/.
جرم اور سراغ رسانی کی پانچ سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جنات کے دربار میں -
جرم اور سراغ رسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دلیر یا بیوقوف -/.
جرم وسزا اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دوسری بیوی -/.
جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دی لیکن بہت جلد اُسے محسوس ہونے لگا کہ یہ رشتہ حاصل کر کے بیٹی کی خواہش کی تکمیل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ عباس کے والدین عباس کا رشتہ کنیز کے ساتھ تقریباً طے کر چکے تھے۔ اسے اپنی ناکامی صاف نظر آنے لگی۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے چہرے پر اداسی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب کنیز اور عباس کا رشتہ تقدیر ہی روک سکتی ہے تو پھر کیوں نہ کسی طریقہ سے کنیز کا پتہ ہی کاٹ دیا جائے۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندگیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے بن کی سیڑھیوں سے پھسل کر ڈوبنے والی دو لڑکیاں گھوم گئیں۔ اس نے سوچا کہ کنیز کا پاؤں بھی سیڑھیوں سے پھسل سکتا ہے اور وہ بھی بن کے پانی میں ڈوب سکتی ہے۔

ادھر کنیز نے جب سے شمیم کو یہ خبر سنائی تھی کہ اس کا رشتہ عباس سے تقریباً طے ہونے والا ہے تو وہ سخت پریشان ہو گئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ اس نے بیٹی کو بٹھا کر سارا منصوبہ سمجھایا۔ جسے سن کر پہلے تو شمیم بہت گھبرائی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کنیز اس کی بہت گہری سہیلی اور سگی بہن کی طرح ہے۔ وہ اسے کیسے مار سکتی ہے۔ پھر اسے اپنی ناکامی کے ڈراؤنے خواب ستانے لگے۔ آخر ماں نے اس کام کے لئے اپنی لاڈلی بیٹی کو رضامند کر لیا اور عین منصوبہ کے مطابق شمیم اپنی سہیلی کنیز کو اصرار کر کے بڑی منڈیر کی سیڑھیوں پر لے گئی کہ وہاں انہیں خلوت حاصل ہو گی۔ آج اس نے خاصی راز کی باتیں کرنی ہیں وہ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گی۔

پھر شمیم نے باتوں باتوں میں اپنی پیاری سہیلی کنیز کو سیڑھی سے بن میں دھکا دے دیا اور کنیز پانی میں ڈوب گئی۔ شمیم نے بالکل اسی طرح واویلا مچانا شروع کر دیا جیسے اسے ماں نے سمجھایا تھا اور ماں بیٹی کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ یوں کنیز کا کانٹا درمیان سے نکل گیا۔ کنیز کی موت کے بعد شمیم کی ماں کے لئے عباس کے ساتھ بیٹی کا رشتہ کرانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی اور پھر شمیم اور عباس کی شادی ہو گئی۔ کنیز کی موت کو سب ہی نے حادثہ مان لیا کیونکہ پہلے بھی اسی طرح کے دو حادثے ہو گزرے تھے۔

کنیز کا صریحاً قتل ہوا تھا اور قتل انسانی فطرت پر بہت بھاری ہوتا ہے۔ یہ کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ قاتل کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ قاتل کے اندر بلا کی توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے اور اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ آخر اسے یہ جرم اگلتے ہی بنتی ہے۔

یہاں 18 برس بعد قاتلہ نے اقبال جرم کر کے اپنے ضمیر پر رکھی پتھر کی بھاری سل اتار پھینکی۔ تب تک گاؤں والوں کے ذہنوں سے بھی یہ واقعہ محو ہو چکا تھا۔ لوگ اسے حادثہ سمجھ کر بھول چکے تھے۔ کنیز کی ماں کب کی فوت ہو چکی تھی، بوڑھے باپ نے جب یہ خبر سنی تو اسے تقدیر کا کہا جان کر قبول کر لیا۔ بھائیوں نے البتہ کچھ جوش دکھایا لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور سبھی نے چپ سادھ لی۔

ادھر گاؤں کے گھروں میں پانی آ جانے کی وجہ سے خواتین کا بن پر جا کر کپڑے دھونے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ چھوٹی بڑی عمر کے لڑکے گھروں سے نکل کر بن کے گدلے پانی میں نہیں نہاتے، نئی پود تیراکی کے ہنر سے ناآشنا ہے۔ بن اجڑ چکی ہے اس کی ویرانی دیکھی نہیں جاتی۔ یہ کب سے زوال پذیر ہے۔ منڈیر پر کھڑا پیپل کا پیڑ اب بھی موجود ہے اور بن کی ویرانی پر ماتم کناں ہے۔ شمیم کو تو کنیز کے قتل کی کوئی سزا نہ ملی لیکن بن جو کہ اس قتل کی آماجگاہ بنی اپنی ویرانی کی شکل میں ضرور سزا بھگت رہی ہے۔

جب کسی زندہ انسان کی شناخت کھو جائے تو پھر ایسی ہی دردناک کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ ہمارے کرپٹ سسٹم کے داغ دار چہرے کی نقاب کشائی۔

☆

رزاق شاہد کوہلر

وطن

عزیز پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے چھیاسٹھ برس سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مگر سسٹم میں ابھی تک کوئی مثبت تبدیلی دیکھنے میں نہیں آرہی اور نہ ہی آئندہ ایسے کوئی امکانات نظر آرہے ہیں۔اس کی وجوہات نہایت ہی سادہ ہیں۔دراصل ہم عملی طور پر ایک ناکام قوم ہیں محض خوابوں اور خوش فہمیوں کے سہارے زندہ رہنے والی قوم۔ ہم ساری زندگی کوشش کرنے کی بجائے کسی معجزے کے منتظر رہتے ہیں۔یہ نہیں جانتے کہ معجزے بھی انسانی کاوشوں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں، یہ آسمان سے نہیں اُترتے بلکہ ہمارے اعمال کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔خدا زمین پر آکر تو ہماری حالت بدلنے سے رہا۔ہم گذشتہ چھیاسٹھ برسوں سے اس ملک کا کرپٹ سسٹم بدلنا چاہتے ہیں لیکن خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ہم آنگن میں نیم کا پیڑ لگا کر آم کھانا چاہتے ہیں، جَو بو کر گندم کاٹنے کے منتظر ہیں۔ہم بھی کیا خوب قوم ہیں فرقوں میں بٹے اور نفرتوں کے مارے ہوئے۔ جب چھیاسٹھ برسوں سے ہم ایک قوم نہ بن سکے تو ملک کا نظام کیا خاک بدلیں گے؟ خدا اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو اپنی حالت خود بدلنے کے لیے تیار نہ ہو۔

جب کسی زندہ انسان کی شناخت کھو جائے تو پھر ایسی ہی دردناک کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ہمارے کرپٹ سسٹم کے داغ دار چہرے کی نقاب کشائی۔

حالات نہایت ہی خراب تھے۔خاص کر امن و امان کی صورتِ حال تو ناقابلِ بیان تھی۔دن دیہاڑے اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، بم بلاسٹ، اور خودکش حملوں کی وارداتیں ہو رہی تھیں، جب کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بسی کی زندہ تصویر بنے ہوئے تھے۔اخبارات کی سُرخیاں چیخ رہی تھیں۔الیکٹرانک میڈیا پر اینکر پرسن واویلا مچا رہے تھے لیکن حکمران محض بیانات داغ رہے تھے۔وہ اب بھی اُن آہنی ہاتھوں کے حوالے دے رہے تھے جو آج تک کسی مجرم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے اور نہ آئندہ پہنچنے والے تھے کہ انھیں عوام سے زیادہ اپنی تجوریاں عزیز تھیں۔

ایسے حالات عام پبلک کے لیے بلاشک وشبہ ناموافق ہوتے ہیں۔اُنھیں جان و مال کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ ڈر ڈر کر جیتے ہیں تو کبھی جیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔صبح سے لے کر شام اور شام سے لے کر صبح تک وہ اپنے چاروں طرف موت کی آہٹ محسوس کرتے رہتے ہیں۔مگر جرائم پیشہ لوگوں کے لیے یہ آئیڈیل صورت حال تھی اور اس سے وہ خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔لوگ جب سہمے ہوئے ہوں تو جُرم کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ جُرم کرتے ہوئے مجرم کو لطف بھی آتا ہے۔سو اُن دنوں جرائم پیشہ گروہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔شہر کے حالات اس قدر مخدوش ہو چکے تھے کہ شہریوں کا زندگی پر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔رات تو رات لوگوں نے دن کے وقت بھی گھروں سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا لیکن بدن سے سانسوں کا رشتا بحال رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے اور کچھ کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ہر روز پندرہ بیس جنازے اُٹھنا معمول بن چکا تھا مگر لوگ تھے کہ ہر روز مرنے کے لیے باہر آجاتے تھے۔شاید اُنھیں بھوک سے مرنے کی بجائے گولی سے مرنا زیادہ آسان لگتا تھا۔بھوک سسکا سسکا کر مارتی ہے جب کہ گولی پل بھر میں زندگی کے غموں سے آزاد کر دیتی ہے۔چنانچہ لوگ زندگی کے غموں سے نجات پانے کے لیے روز مر رہے تھے۔

عامر شفیق عرف عامی نے اپنی مجرمانہ زندگی کا آغاز اسٹریٹ کرائم سے کیا تھا۔لوگوں سے موبائل فون، نقدی اور موٹر بائیک وغیرہ چھین لینا اُس کا پیشہ تھا۔آگے پیچھے کوئی تھا نہیں اس لیے اُس کے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ویسے اُس نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی

تھی۔ اِس کے بعد جونہی والدین کا سایا اُس کے سر سے اُٹھا وہ شترِ بے مہار کی طرح گاؤں سے بھاگا اور سیدھا کراچی جا کر دم لیا۔ کراچی میں پہلے پہل تو اُس نے عام لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر کے رزقِ حلال کمانے کی کوشش کی مگر جلد ہی اُسے یہ احساس ہو گیا کہ ایک میٹرک پاس شخص کے لیے کراچی جیسے شہر میں باعزت طریقے سے کمانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور دوسرا اُس پر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ یہاں شرافت راس نہیں آتی۔ تب وہ متبادل راستا چنتے ہوئے جُرم کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ چونکہ بندہ جی دار تھا اس لیے جلد ہی اپنے قدموں پہ کھڑا ہو گیا۔ شکل وصورت اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ ہمیشہ کسی ایکشن فلم کے ہیرو کی طرح ایک مخصوص گیٹ اپ میں رہتا تھا۔ دن دیہاڑے کسی بھی شخص کو بیچ چوراہے پہ لُوٹ کر اپنی ہیوی موٹر بائیک پہ بیٹھ کر منٹوں میں نکل جاتا تھا۔ قانون کے آہنی ہاتھ آج تک اُس کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ کراچی شہر میں اُس جیسے ہزاروں تھے جو اسٹریٹ کرائم میں ملوث تھے اور پولیس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

پانچ چھ ماہ تو وہ اکیلے ہی وارداتیں کرتا رہا، پھر بقول شاعر لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا کے مصداق اُس نے اپنا گینگ بنا لیا۔ چھ افراد پر مشتمل اس گینگ کا لیڈر وہ خود تھا۔ گینگ کے لوگ اُسے باس تو کبھی عامی اُستاد کہتے تھے۔ گینگ بنا تو وہ اسٹریٹ کرائم کے ساتھ ساتھ پٹرول پمپس اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز وغیرہ بھی لوٹنے لگے۔ عامی اُستاد نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے چند پولیس آفیسرز کو بھی رام کر لیا تھا۔ ان پولیس والوں کو ہر واردات کے بعد باقاعدہ نذرانہ پہنچایا جاتا تھا۔ کراچی کے جس علاقے میں اُن کی رہائش تھی، وہاں کا پولیس اسٹیشن تو اُن کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا۔ تھانہ انچارج انسپکٹر اسلم کرمانی اور عامی اُستاد کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ انسپکٹر اسلم کرمانی اُس پر بے حد مہربان تھا۔ عامی جب کبھی بھی فارغ ہوتا تھا تو گپ شپ لگانے کے لیے انسپکٹر اسلم کرمانی کے پاس چلا جاتا تھا۔

اُس روز عامی اپنے گینگ سمیت فلیٹ میں موجود تھا۔ وہ سب بے حد خوش تھے اور پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں نہایت ہی فحش گفت گو کر رہے تھے۔ ابھی دو دن قبل ہی اُنھوں نے ایک پٹرول پمپ لُوٹا تھا۔ اس ڈکیتی میں کافی تگڑا مال اُن کے ہاتھ لگا تھا۔ لہٰذا اسی خوشی میں وہ پی کر جشن منا رہے تھے۔ عامی اُستاد ایک پیگ چڑھانے کے بعد دوسرا پیگ سامنے لیے بیٹھا تھا کہ ایسے ہی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کال کرنے والے کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے جیب سے سیل فون نکال کر سکرین پر نظر ڈالی تو وہاں انسپکٹر اسلم کرمانی کا نام جھلملا رہا تھا۔ شور مچاتے اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے کال ریسیو کی تو اسلم کرمانی نے بغیر علیک سلیک کے پوچھا۔

"کہاں ہو یار تم سے ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔"

"اپنے فلیٹ پر ہوں۔" وہ قدرے حیران ہو گیا۔ "کیسا کام؟"

"تم بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ، میں شدت سے تمہارا منتظر ہوں۔" انسپکٹر نے حکمیہ انداز میں جواب دیا۔

"کچھ پتا تو چلے جناب! آخر بات......"

"عامی! تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" انسپکٹر کرمانی نے جھنجھلا کر قطع کلامی کی۔ "جو میں نے کہا ہے اُس پر عمل کرو، ہر بات فون پر بتانے والی نہیں ہوتی۔ بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرو۔"

''او کے میں پہنچتا ہوں۔'' کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ کرمانی حرامی ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے۔ میں ذرا پولیس اسٹیشن تک جا رہا ہوں، تم میں سے کوئی بھی فلیٹ سے باہر نہ نکلے۔''

''باس! کیا میں بھی ساتھ چلوں؟'' صفدر نے سوال کیا، وہ عامی اُستاد کا رائیٹ ہینڈ تھا۔

''نہیں یار! اُس نے صرف مجھے بلایا ہے۔'' عامی اُستاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم لوگ مزے کرو، میری قسمت میں تو شاید بے آرامی ہی لکھی ہے۔''

''او کے باس جیسے آپ کی مرضی، لیکن ذرا سنبھل کر رہنا پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔'' صفدر نے مخدوش انداز میں جواب دیا۔

عامی اُستاد کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اپنی ہیوی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی موٹر بائیک پولیس اسٹیشن کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی جب کہ وہ انسپکٹر کرمانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نجانے اُس پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ صفدر کا خدشہ بھی اُس کے دماغ میں چکرا رہا تھا کہ پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔ مگر عامی اُستاد کا دل کہتا تھا کہ انسپکٹر کرمانی ایسا نہیں ہے۔ وہ دوست بن کر دھوکا نہیں دے گا۔

☆☆☆

ظہیر احمد صدیقی نے اپنے سامنے ٹیبل پر بکھری فائلیں سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی تو تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ آفس کا سارا عملہ جا چکا تھا سوائے پیون شکور کے جو ایک چوبی اسٹول پر بیٹھا اُس کے اُٹھنے کا شدت سے منتظر تھا۔ شکور کی بے چینی اُس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی مگر وہ آفس کے ہیڈ کلرک ظہیر صدیقی کو وقت پر چھٹی کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ صدیقی نہایت ہی ایمان دار انسان تھا۔ وہ ہمیشہ آفس کا کام نمٹا کر ہی چھٹی کرتا تھا۔ سو اکثر لیٹ ہوتا رہتا تھا۔ وہ بچپن کے پیٹے میں تھا اور کچھ عرصہ کے بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔

صدیقی صاحب نے وال کلاک سے نظر ہٹا کر شکور کی طرف دیکھا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''بھئی شکور! میں آج پھر تم سے شرمندہ ہوں کہ کوشش کرنے کے باوجود وقت پر کام نہ نمٹا سکا۔''

''کوئی بات نہیں سر! ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اب تو میں اس بات کا عادی ہو چکا ہوں۔'' شکور نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے جواب دیا اور پھر دل ہی دل میں بولا۔ ''سالا بڈھا کھوسٹ مرتا بھی نہیں، روزانہ کتنے لوگوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ نصف درجن بوری بند لاشیں بھی ملتی ہیں۔ پتا نہیں اس کا نمبر کب لگے گا؟''

صدیقی صاحب نے کہا۔ ''شکور! یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔ ورنہ آج کل کون کسی کی سنتا ہے؟ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ ایمان دار لوگ تو اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ چاروں طرف بے ایمان ہی بے ایمان ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ جائے تو جائے کہاں؟''

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر۔'' شکور نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا البتہ دل میں بولا۔ ''یا اللہ! تُو اپنے اس ایمان دار بندے کو اپنے پاس بلا لے تو بدلے میں تیرا یہ بے ایمان بندا داتا دربار پر بریانی کی دیگ چڑھائے گا اور وہ بھی بکرے کا گوشت ڈال کر۔''

''نہیں شکور۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آئندہ اگر مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم نکل جانا، میں خود ہی آفس بند کر لیا کروں گا۔''

شکور نے کہا۔ ''جیسے آپ کا حکم سر۔'' پھر دل میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوا۔ ''یا اللہ! مجھے معاف کر دینا میں

یہ ڈیل کینسل کر رہا ہوں، تجھے تو معلوم ہی ہے کہ میری تنخواہ نہایت ہی قلیل ہے۔ بریانی کی دیگ میں پوری تنخواہ نکل جائے گی۔"

"اوکے۔" صدیقی صاحب نے سیٹ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں اب چلوں گا۔تم تالے وغیرہ سنبھال کر آفس بند کرلو، کھڑکیاں ضرور چیک کر لینا۔"

"بے فکر رہیں سر! پہلے کبھی مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اب ہوگی؟" شکور نے عجلت میں کھڑکیوں کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

ظہیر صدیقی آفس سے باہر نکلا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا جہاں اُس کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ یہ موٹر سائیکل اُس نے پندرہ برس قبل خریدی تھی جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ اب تک اُس کا ساتھ نبھا رہی تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پارکنگ ایریا سے نکلتا ہوا کھلے روڈ پر پہنچ گیا۔ اُس کا گھر آفس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر شہر کی گنجان آبادی میں واقع تھا۔ راستے میں ایک تندور سے اُس نے چھ عدد گرم گرم روٹیاں خریدیں، انھیں موٹر سائیکل کے سیف گارڈ سے لٹکایا اور دوبارہ روانہ ہوگیا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے اُسے چار بج گئے۔ دروازہ اُس کے اکلوتے بیٹے عماد احمد نے کھولا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل برآمدے میں جا کر روک دی اور پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سوری بیٹے! میں آج پھر لیٹ ہوگیا۔ یقیناً بھوک سے تمہارا بُرا حال ہوگا۔"

عماد بولا۔ "بے شک بھوک تو ہے مگر مجھے آپ کے بغیر کھانا کھانے کا لطف نہیں آتا۔"

"ٹھیک ہے تم یہ روٹیاں لے جا کر ٹیبل پر لگاؤ، میں ابھی سالن گرم کر کے لاتا ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کچن میں ایک درمیانے سائز کا فریج موجود تھا۔ اُس نے فریج کھول کر سالن نکالا اور چولھا جلا کر سالن گرم کرنے لگا۔ جب سالن گرم ہوگیا تو اُس نے دو پلیٹوں میں سالن ڈالا اور عجلت میں کمرے کی طرف چل دیا۔ تب تک عماد ٹیبل پر روٹیاں اور پانی کا جگ لگا چکا تھا۔ دونوں کھانا کھانے میں لگ گئے۔ گذشتہ دس برسوں سے اُن دونوں کا یہی معمول تھا۔ عماد کی امی کو فوت ہوئے دس برس بیت چکے تھے۔ چنانچہ پچھلے دس برسوں سے ظہیر صدیقی نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ عماد نے ایم ایس سی تک تعلیم حاصل کی تھی مگر تا حال بے روزگار تھا۔ وہ روزانہ دفاتر کے چکر کاٹتا رہتا تھا مگر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہمیشہ کی طرح ظہیر صدیقی نے اپنا من پسند ٹاپک چھیڑ دیا۔ "عماد! تم اگر شادی کرلو تو میری اس کچن کے عذاب سے جان چھوٹ جائے گی۔ میں اب تھک چکا ہوں بیٹے۔"

عماد بولا۔ "ابو مجھے اس کا احساس ہے مگر میں کیا کروں...... آپ جانتے ہیں کہ میں فی الحال شادی افورڈ نہیں کرسکتا۔ ابھی تو میں آپ کا محتاج ہوں، بیوی کی ذمہ داری کیسے اور کس طرح سنبھالوں گا؟"

"بیٹے! شادی کو روزگار کے ساتھ نتھی مت کرو، رزق دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کیا وہ بے روزگاروں کو رزق نہیں دیتا۔ کبھی کوئی بے روزگار بھوکا سویا ہے؟"

"نہیں ابو۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک میں اپنے قدموں پہ کھڑا نہیں ہو جاتا تب تک میں شادی نہیں کروں گا اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

"میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ پھر تجھے کس بات کی فکر ہے؟"

"بے شک آپ کا سب کچھ میرا ہی ہے مگر میں پھر بھی شادی نہیں کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اب اس

موضوع کو چھیڑا ہی نہ کریں۔''

''کہیں تم کسی کو پسند تو نہیں کرتے؟'' اچانک اُس نے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''نن......نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایکدم بوکھلا یا مگر پھر فوراً سنبھل گیا۔''پسند ناپسند والی بات تو تب ہوگی جب میں اپنے قدموں پہ کھڑا ہو جاؤں گا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟'' اُس نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

''یہ محض آپ کا وہم ہے۔ میں بھلا کوئی بات آپ سے کس طرح چھپا سکتا ہوں؟ آپ کے علاوہ اور کون ہے میرا اپنا جس پر میں اعتماد کر سکوں؟''

''گڈ مجھے تم سے یہی اُمید تھی بیٹے! کہ تم مجھ سے کبھی کوئی معاملہ مخفی نہیں رکھو گے۔''

''بے فکر رہیں ابو! میں کبھی بھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔''

''او کے تو پھر کیا خیال ہے ایک ایک کپ چائے کا ہو جائے؟'' اُس نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''بالکل......مگر آج چائے میں بناؤں گا ابو، آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرلیں۔'' وہ اُٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

عماد کے جانے کے بعد وہ اُٹھا اور بک شیلف سے اپنی پسند کی ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ مطالعے کا اُسے اسکول کے زمانے ہی سے شوق تھا جو اَب تک باقاعدگی سے چلا آ رہا تھا۔ ہر مہینے تنخواہ لینے کے بعد وہ چند اچھی کتابیں خریدنا نہیں بھولتا تھا۔ تاہم عماد کو کتابیں پڑھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ بھی نوجوان نسل کی طرح انٹرنیٹ کا دیوانہ تھا اور اکثر ٹائم کمپیوٹر کے سامنے گزارتا تھا۔ فیس بک پر اُس کے بے شمار دوست تھے۔ جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔

☆☆☆

عامی اُستاد نے موٹر بائیک تھانے کے احاطے میں روکی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا انسپکٹر کرمانی کے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ کوارٹر اُس کا دیکھا بھالا تھا۔ اکثر وہیں اسلم کرمانی کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بلا جھجک اُس کمرے میں داخل ہو گیا جسے انسپکٹر کرمانی نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کمرے کے اندر انسپکٹر کرمانی اکیلا نہیں تھا۔ وہاں ایک اجنبی شخص بھی موجود تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ عامی اُستاد پر نظر پڑتے ہی اجنبی کے چہرے پر شناسائی کی چمک اُبھر کر معدوم ہو گئی جب کہ انسپکٹر کرمانی بولا۔''آؤ یار! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''میں اتنا اہم کب سے ہو گیا ہوں کرمانی! کہ آپ جیسے آفیسر لوگ بھی میرا انتظار کرنے لگے ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر اُن دونوں سے باری باری مصافحہ کرنے کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

کرمانی بولا۔''پہلے ان سے ملو، یہ سلیمان پاشا صاحب ہیں اس شہر کے مشہور و معروف بزنس مین اور سیاست دان۔ تم نے یقیناً ان کا نام سُن رکھا ہوگا؟''

وہ بولا۔''نام تو سنا ہے لیکن ملاقات کا شرف پہلی بار حاصل ہو رہا ہے۔''

کرمانی نے کہا۔''تم خوش قسمت ہو کہ پاشا صاحب نے تمہیں نہ صرف ملاقات کا شرف بخشا ہے بلکہ تمہارے لیے ایک ایسا کام لے کر آئے ہیں کہ تم دنوں میں کروڑ پتی ہو جاؤ گے۔ تو پھر کیا خیال ہے پاشا صاحب کا کام کرو گے یا نہیں؟''

''کرمانی صاحب! کام کی نوعیت جانے بغیر میں بھلا کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں؟''

کرمانی نے کہا۔''ڈونٹ وری کام تمہاری مرضی کا ہے اور کام کا معاوضہ تمہاری توقع سے بہت زیادہ ہے۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ کس طرح کا کام ہے؟''

اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔" کرمانی نے اثبات میں سر ہلایا اور سنٹرل ٹیبل پہ پڑا ہوا بریف کیس کھول کر پانچ پانچ ہزار روپے والے نوٹوں کی دو عدد گڈیاں نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پورے دس لاکھ روپے ہیں اور یہ اُس کام کا معاوضہ ہے جو تمہیں پاشا صاحب کے لیے کرنا ہے۔"

"لیکن کام تو آپ نے ابھی تک......"

"میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔" کرمانی نے قطع کلامی کی اور بریف کیس سے ایک تصویر نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں اس شخص کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا ہے۔ یہ شخص پاشا صاحب کا جانی دشمن ہے اور کبھی بھی موقع پا کر پاشا صاحب پر جان لیوا حملہ کر سکتا ہے اس کا مکمل ایڈریس تصویر کے پیچھے درج ہے۔"

عامی اُستاد نے اُس کے ہاتھ سے تصویر لے کر بغور اُس کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔ "شکل سے تو یہ ایک عام سا شریف انسان لگتا ہے۔ آپ شاید مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہیں؟"

"کرمانی ٹھیک کہتا ہے۔" سلیمان پاشا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "شکل سے یہ بے شک شریف لگتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک غنڈا ہے اور مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔ ایک بار یہ مجھ پر وار کر چکا ہے، وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بال بال بچ گیا ورنہ اس نے تو مجھے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

وہ بولا۔ "پاشا صاحب! یقیناً آپ سچ کہہ رہے ہوں گے لیکن میں نے آج تک کسی انسان کی جان نہیں لی۔ میں مانتا ہوں کہ میں ایک بُرا انسان ہوں لیکن کسی انسان کو قتل کرنے کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"نہیں سوچا تو اب سوچ لو۔" پاشا کی بجائے کرمانی نے کہا۔ "تمہیں اس شخص کو جلد از جلد ٹھکانے لگانا ہے۔"

"نہیں کرمانی! مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" کرمانی سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "کب تک یہ چھوٹی موٹی ڈکیتیاں کرتے رہو گے؟ کسی دن کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بننے سے بہتر ہے کوئی مردوں والا کام کرو۔ دس لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہے ورنہ اس شہر میں تو بیس بیس ہزار روپے پر بھی کلرز دستیاب ہیں۔ پاشا صاحب تو کسی کو بھی ہائر کر سکتے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی غیر متعلق شخص کی بجائے میرے دوست کو فائدہ پہنچے۔"

"کرمانی! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں لیکن قتل جیسی واردات کرنے سے میں قاصر ہوں۔" اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"لیکن میں جو پاشا صاحب کو زبان دے چکا ہوں، اُس کا کیا ہوگا؟ ان کے بہت احسان ہیں مجھ پر۔" کرمانی نے پہلی بار قدرے سختی کا مظاہرہ کیا۔

"میں مجبور ہوں کرمانی صاحب۔" اُس نے کمزور سا احتجاج کیا۔ "ورنہ پہلے کبھی آپ کو انکار کیا ہے؟"

"تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں۔ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اگر تم انکار کرو گے تو بات بگڑ جائے گی اور بہت نقصان ہوگا۔" کرمانی نے ڈھکے چھپے انداز میں دھمکی دی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کرمانی کی ذات اُس کے لیے ناگزیر تھی۔ وہ کرمانی سے تعلقات بگاڑ کر اپنا دھندا جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ کرمانی چاہتا تو اُسے اُس کے گینگ سمیت باآسانی گرفتار کر سکتا تھا۔ گینگ سمیت اُس کا ان کاؤنٹر کر سکتا تھا۔ شہر میں غنڈا گردی کے ساتھ ساتھ پولیس گردی بھی عروج پر تھی۔ عامی اُستاد تو اُس وقت ایک عام سا غنڈا تھا سو کوشش کے باوجود کرمانی کو انکار نہ

کر سکا۔

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ نیم رضامندی سے بولا۔ ''کہ پاشا صاحب کے دشمن کو......''

''کوشش نہیں۔'' کرمانی نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔ ''بلکہ کام کر کے دکھانا ہے۔ مجھے لفظ کوشش سے نفرت ہے کیونکہ یہ لفظ اکثر جھوٹے لوگ استعمال کرتے ہیں۔''

''اوکے ہو جائے گا۔'' اُس نے پہلی بار پُرعزم لہجے میں جواب دیا اور نوٹوں کی گڈیاں اور تصویر اُٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔

''ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔'' کرمانی نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''میں بعد میں تم سے فون پر رابطہ کرلوں گا۔''

اُس نے دونوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''کرمانی! یہ تم نے کیا کیا؟'' عامی اُستاد کے نکلتے ہی پاشا نے سوال کیا۔ ''میں نے تو اس کام کے بدلے میں بیس لاکھ روپے دیے ہیں۔''

''اُس کی جتنی اوقات تھی میں نے دے دیے۔'' کرمانی نے قہقہہ لگایا۔ ''بقیہ دس لاکھ روپیا میں نے بطور نذرانہ رکھ لیا ہے۔''

پاشا نے ہنس کر کہا۔ ''تمہارا نذرانہ تو میں نے ویسے بھی دینا ہی تھا۔ پھر اس جلد بازی کی کیا ضرورت تھی؟''

''بہت اشد ضرورت تھی پاشا صاحب! دراصل ہی سائٹ پہ میں نے دو کمروں کا ایک بہت ہی عمدہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے اور مالک پہلی فرصت میں ہی اُسے ٹھکانے لگانے کی سوچ رہا ہے۔ فکر نہ کریں آپ کے نذرانے کی بھی ضرورت پڑے گی۔ سی سائٹ پہ آج کل بہت ہائی ریٹ چل رہا ہے۔'' کرمانی نے تھوڑی کھجاتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

''ڈونٹ وری وہ فلیٹ سمجھو آپ کا ہو گیا۔'' پاشا نے اُٹھتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا تو کرمانی بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اوکے تو اب اجازت دیجیے۔'' پاشا نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

کرمانی نے اُس کا ہاتھ تھام کر خدا حافظ کہا اور پاشا لبوں پہ مسکراہٹ سجائے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

زارا احمد سے اُس کی دوستی بذریعہ انٹرنیٹ ہوئی تھی۔ دو ماہ قبل جب اُس نے فیس بک پرانی آئی ڈی بنائی تو اُسے پہلی فرینڈ ریکوئسٹ زارا احمد ہی کی موصول ہوئی تھی۔ جسے اُس نے بلا سوچ سمجھے ہی کنفرم کر دیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فیس بک کی یہ دوستی بالمشافہ ملاقاتوں میں بدل گئی۔ زارا احمد اُس کے تصور سے کہیں بڑھ کر حسین و جمیل نکلی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں نہایت ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ دوستی محبت میں بدلی تو ملاقاتوں کا دورانیہ بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ کبھی کسی پارک میں تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں۔ گزشتہ ایک ماہ سے اُن کی یہ ملاقاتیں جاری تھیں۔ کبھی دو دن بعد تو کبھی تین دن بعد اُن کی ملاقات ضروری تھی۔

زارا نے اپنے متعلق اُسے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق اُس کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا اور اُس کے والد ایک سرکاری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب کہ اُن کا خاندان پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ماں باپ، ایک بھائی اور دو بہنیں، بہن زارا سے بڑی تھی جب کہ بھائی اُس سے چھوٹا تھا اور وہ کالج میں تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ عماد نے بھی اپنے متعلق اُسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا کہ سوائے ایک باپ کے اُس کا بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عماد نے اب تک یہ بات باپ سے چھپا رکھی تھی

تاہم وہ زارا سے شادی کرنے کے لیے پوری طرح سنجیدہ تھا اور باپ سے بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔

اُس دن بھی وہ زارا کے ساتھ سی سائٹ پر گھوم رہا تھا جب اچانک اُسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اُن دونوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اُس نے زارا سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بے پروا سے انداز میں بولی۔

''عمو! تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔ یہاں کتنے ہی لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا پتا کہ وہ کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہمیں نقصان پہنچانے والا ہے۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ محض تمہارا وہم ہے۔'' زارا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم میرے خدشے کو مذاق میں مت ٹالو۔'' وہ پُرزور انداز میں بولا۔ ''مجھے اس سے قبل کبھی اس طرح کا وہم نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' زارا نے سر جھٹکا۔ ''ہمیں اپنی تفریح برباد نہیں کرنا چاہیے۔''

زارا کے تسلی دینے پر وہ وقتی طور پر مطمئن ہو کر چپ ہوگیا۔ تب زارا نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ''تمہارے انٹرویو کا کیا بنا، کوئی اُمید ہے کہ نہیں؟''

''اُمید تو تب ہوگی جب میرے پاس کسی تگڑی شخصیت کی سفارش یا نذرانے کی صورت میں کرنسی نوٹوں کا بنڈل ہوگا۔ آج کل ذہانت اور ٹیلنٹ کو کون دیکھتا ہے؟ اس ملک میں صرف سکہ رائج الوقت اور سفارش چلتی ہے۔'' اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''مجھے تو جاب وغیرہ میں بالکل انٹرسٹ نہیں ہے۔ تم کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتے...... جاب میں کیا رکھا ہے؟''

''کاروبار کے لیے بھی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارا گھر ابو کی تنخواہ سے چلتا ہے۔ یہ تو ہمارا کنبہ محدود ہے ورنہ ابو کی تنخواہ تو اس قدر قلیل ہے کہ چند افراد کا پیٹ مشکل سے پلتا۔''

''اگر میں سرمایے کا بندوبست کر دوں تو کیا تم کاروبار کرو گے؟'' زارا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اُس نے چونک کر زارا کی طرف دیکھا اور پھر ہنس کر کہا۔ ''تمہاری اتنی اوقات کہاں...... کیوں مجھ سے مخول کرتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''اوقات ہے یا نہیں اس بات کو چھوڑو تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، کتنے سرمایے سے کام چل جائے گا؟''

''او میڈم!'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے کریانے کی دکان تو نہیں کھولنی، کاروبار کرنے کے لیے اور وہ بھی کراچی جیسے شہر میں جانتی ہو کتنے سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے؟ کروڑوں روپے کی۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ تمہارے پاس تو ڈھنگ کا لباس بھی نہیں ہے، کروڑوں روپیا کہاں سے لاؤ گی؟''

''وہ میرا مسئلہ ہے تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ؟'' وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

''بس مذاق بہت ہوگیا، چلو کہیں سے کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔ سرمایا دینے کی بجائے بل چکا دینا۔''

''تم میری توہین کر رہے ہو۔'' اُس نے پہلی بار غصے کا اظہار کیا۔ ''میں چاہوں تو ایک بزنس ایمپائر کھڑی کر سکتی ہوں۔''

''شاید یہ کسی نئی فلم کے ڈائیلاگ ہیں؟'' عماد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ ''بس اب خوابوں کی دنیا سے باہر آ جاؤ میڈم...... بہت ہوگیا۔''

اسی دوران وہ ایک سنسان مقام کے نزدیک پہنچ گئے۔ قریب ہی ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ معاً

اُس جھنڈ سے چار آدمی نکلے اور تیزی سے اُن کی طرف بڑھے۔ وہ دونوں آپس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھیں خبر ہی نہ ہوسکی کہ وہ خطرہ جو تھوڑی دیر قبل عماد نے محسوس کیا تھا اُن کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ وہ چار تھے اور چاروں ہٹے کٹے تھے۔ دو نے عماد کو چھاپ لیا جب کہ بقیہ دو نے زبردستی زارا کو اُٹھالیا اور برق رفتاری سے دوبارہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے۔ اُنھوں نے زارا کو چلانے کا موقع تک نہیں دیا تھا۔ دوسری طرف وہ دو جو عماد کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے پہلے تو عماد کی خوب دھلائی کی اور پھر تقریباً اُسے گھسیٹتے ہوئے جھنڈ کے اندر لے گئے۔ عماد کی بُری حالت تھی اُس کی ناک اور باچھوں سے خون رس رہا تھا جب کہ شرٹ کا گریبان گلے میں جھول رہا تھا۔ جھنڈ میں تقریباً تین سو فٹ کے فاصلے پر ایک وین کھڑی ہوئی تھی۔ جو شاید حملہ آوروں ہی کی تھی۔ پٹنے کے دوران عماد بار بار اُن سے اپنی غلطی پوچھتا رہا تھا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

جھنڈ میں لے جاکر اُنھوں نے عماد کو مزید چند ٹھوکریں رسید کردیں اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔ ”آئندہ اگر تم زارا میم صاحب کے قریب بھی پھٹکے تو کاٹ کر پھینک دیں گے۔“

”وہ...... مم...... میں......“ اُس نے کراہتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ایک اور زوردار ٹھوکر اُس کے پہلو میں پڑی۔ درد کی شدت سے اُس نے چلانا شروع کر دیا۔ تب ٹھوکر مارنے والا دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ”چلانا بند کردو ورنہ ہمیشہ کے لیے زبان بند کردوں گا۔“

وہ فوراً چپ ہوگیا۔ یوں جیسے کھلونے کی چابی ختم ہوجاتی ہے۔ وہ بدحال سا ریتلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گو کہ وہ جسمانی لحاظ سے اُن میں سے کسی سے بھی کم نہیں تھا۔ مگر وہ دونوں مسلح تھے۔ اُس کی مدافعت پر اُسے شوٹ بھی کرسکتے تھے۔ وہ جوانی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو چپ چاپ پڑا رہا۔ پورے بدن میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے بہت ہی بے دردی کے ساتھ اُسے مارا تھا۔ وہ دونوں چند لمحے اُس کی حالت سے محظوظ ہوتے رہے۔ پھر ایک نے جیب سے والٹ نکال کر چند بڑے نوٹ نکالے اور اُس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔ ”ان پیسوں سے اپنا علاج کرالینا اور خبردار آج کے بعد زارا بی بی سے ملنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔“ وہ دھمکی دے کر وین کی طرف بڑھ گئے جب کہ عماد وہیں پڑا رہ گیا۔

جب کافی دیر گزر گئی تو وہ کراہتے ہوئے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک طرف چل دیا، زمین پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا لیکن پھر اچانک ہی اُس کی ہمت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر تن گئی اور وہ لڑکھڑاتا ساحل کی ریت پر گر گیا۔

☆☆☆

سلیمان پاشا نے گھور کر اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر درشت لہجے میں بولا۔ ”میرے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی...... کم از کم باپ کے مرتبے کا ہی خیال کرلیا ہوتا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سلیمان پاشا کی بیٹی ایک تھرڈ کلاس نوجوان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔“

”سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں ڈیڈ۔“ وہ بلا جھجک بولی۔ ”یہ اپر مڈل اور لوئر کلاس تو آپ جیسے لوگوں نے بنائی ہے۔ خدا نے تو تمام انسانوں کو ایک جیسا ہی بنایا ہے۔ سبھی کے دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ میں نے آج تک کسی اپر کلاس والے کے پاس کوئی اضافی عضو نہیں دیکھا۔“

”اپنی یہ گھٹیا فلاسفی اپنے پاس رکھو۔“ پاشا نے انگلی

کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "تم زارا سلیمان احمد پاشا ہو، پہلے اُس کی اور اپنی اوقات دیکھو پھر......"

"میں اُس سے کسی پاشا کی بیٹی بن کر نہیں ملتی ڈیڈ۔" زارا نے قطع کلامی کی۔ "وہ میری حیثیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"وہاٹ نان سنس...... کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں وہ مجھے ایک سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سمجھتا ہے۔ میں نے اُسے یہی بتایا ہے۔"

"تم نے اُسے حقیقت کیوں نہیں بتائی؟" پاشا نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی اُسے آزمانے کے لیے۔"

"کیوں...... اور کس لیے؟" وہ دوبارہ بھڑ گیا۔ "کون لگتا ہے وہ تمہارا؟...... کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اُس دو ٹکے کے آدمی کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دینے کے لیے راضی ہو جاؤں گا؟"

"مجھے اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ آپ رکاوٹ بنیں گے تو میں......"

"بکواس بند کرو۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے چلایا۔ "تم نے اگر اُس حرام زادے سے ملنا نہ چھوڑا تو میں اُسے مٹی میں ملا دوں گا۔"

ایسے ہی وقت بیگم پاشا کمرے میں داخل ہو کر بولی۔ "جوان بیٹی پر اس طرح چلاؤ گے تو وہ بغاوت پر اُتر آئے گی۔ یہی بات آپ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتے ہیں۔"

"یہ سب تمہارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔" وہ بیگم پر چڑھ دوڑا۔ "کہ آج یہ مجھے یعنی اپنے باپ کو آنکھیں دکھانے لگی ہے۔ بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ مجھ سے نظریں جھکا کر بات کرتے ہیں جب کہ یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ اِسے سمجھاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

بیگم نے منہ بنا کر کہا۔ "اپنی غلطیاں مجھ پر کیوں تھوپتے ہو؟ سر پر تو اسے آپ نے چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اپنے بھائی کے بیٹے افضال سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی، آپ ہی نہیں مان رہے تھے۔ اب بھگتو۔"

"دفع کرو افضال کو۔" پاشا نے چڑ کر کہا۔ "ایک نمبر کا آوارہ اور حرام خور ہے۔ اُسے تو میں اپنے جوتے بھی صاف کرنے کے لیے نہ دوں، تم بیٹی دینے کی بات کرتی ہو؟"

بیگم نے ہاتھ نچایا۔ "میرا بھتیجا آوارہ ہے تو اب اس نے کون سا شہزادہ چُن لیا ہے؟"

"افضال کی طرح میٹرک فیل نہیں ہے وہ، ایم ایس سی کیا ہے اُس نے۔ بہت جلد اُسے کوئی اچھی جاب مل جائے گی۔" زارا نے عماد کا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا۔

پاشا بولا۔ "تم ماں بیٹی فضول میں ایک دوسرے سے مت لڑو، زارا کی شادی جہاں میں چاہوں گا وہیں ہوگی۔"

"میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس کھونٹی سے چاہو گے باندھ دو گے۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

"تم نے دیکھا یہ کس قدر بدتمیز ہوگئی ہے۔" وہ بیگم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "مجھے کچھ کرنا پڑے گا ورنہ یہ میری عزت کا جنازہ نکال دے گی۔"

بیگم بولی۔ "اُسے پیار سے سمجھاؤ، سختی کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں بغاوت دیکھی ہے۔"

"میں یہ نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟"

وہ بولی۔ "افضال میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ میں تو

کہتی ہوں کہ آپ بھائی صاحب کو ہاں کر دیں۔اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہے گی۔اپنا اپنا ہوتا ہے جب کہ......"

"بس......" پاشا نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔"میں اس وقت افضال کی تعریف سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔مجھے سوچنے دو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟"

"تم سوچتے رہو گے اور بیٹی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"میں جو سوچتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں...... جاؤ میرے لیے کافی بھجوا دو۔" پاشا نے حکمیہ انداز میں کہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

عماد کو ایک ہمدرد نوجوان نے ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔ چونکہ اُسے کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی تھی، سو ڈاکٹر نے اُس کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔اُس روز سنڈے کی چھٹی تھی تھی۔اس لیے عماد جب مرہم پٹی کروا کر گھر پہنچا تو ظہیر احمد اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔کس سے جھگڑا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ کون تھا وہ؟ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔" اکلوتے بیٹے کو زخمی حالت میں دیکھ کر اُس نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

"میں ٹھیک ہوں۔معمولی سی چوٹیں ہیں یہ، آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔" عماد نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

وہ بولا۔"میں تمہارا باپ ہوں مجھ سے بات چھپاؤ گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا، وہ بس ایک غنڈ......" وہ کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔

"عماد! تم کچھ چھپا رہے ہو...... مجھے بتاؤ کس سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

"ابو! آپ رہنے دیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم میرے بڑھاپے کا واحد سہارا ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ شہر کے حالات تو دیکھو روزانہ بیسیوں لاشیں گر جاتی ہیں مگر قاتلوں کا کوئی پتا نہیں چلتا۔" اُس نے دل میں پنہاں خدشے کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔"میرے زخمی ہونے کا شہر کے حالات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔"

"جب تک تم مجھے سچ نہیں بتاؤ گے میری پریشانی کم نہیں ہو گی۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُس نے پورا واقعہ باپ کے سامنے بیان کر دیا۔ساری بات غور سے سننے کے بعد وہ بیٹے سے بولا۔"یہ لڑکی ذارا تم سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے۔میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ تم اُس سے مت ملنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔"

"مگر ابو! میں اُس سے پیار کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔میں اُس سے ملنا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" اُس نے احتجاج کیا۔

"زندگی ایک بار ملتی ہے بیٹے! اس کی قدر کرو، کیا پتا وہ بڑے باپ کی بیٹی تجھے اُلو بنا رہی ہو؟ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اُس سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ابو، میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

"اور میں...... میرا کیا ہو گا...... یہ کبھی سوچا ہے تم نے؟" وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔"اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیسے جیوں گا میں...... بولو...... جواب

دو...... اب چُپ کیوں ہو؟"

عماد نے سر جھکا لیا۔ تب باپ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھ اور باز آجا...... میں تمہاری جدائی سہہ نہیں پاؤں گا ...... سمجھنے کی کوشش کر بیٹے! بعض خواہشیں انسان کی جان لے لیتی ہیں مگر پھر بھی تشنہ کام رہتی ہیں۔ ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جن کی تعبیر انگارے ہوں؟"

"ٹھیک ہے ابو جی۔" وہ غیر متوقع طور پر رضامند ہو گیا۔ "آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ میں زارا سے نہیں ملوں گا۔"

"جیتے رہو بیٹا۔" اُس نے خوش ہو کر دعا دی۔ "تم نے میرا مان رکھ لیا ہے۔"

عماد کے وعدہ کرنے سے اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آرہا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کے لیے ہیں۔ سو عماد بھی اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔

دوسرے دن جب وہ گھر میں اکیلا تھا تو اُسے زارا کا فون آگیا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتا رہا لیکن جب زارا بار بار کال کرنے لگی تو اُسے فون اٹینڈ کرنا ہی پڑا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے سخت ناراض ہو۔" رابطہ ہوتے ہی زارا نے ندامت سے کہا۔ "مگر یقین کرو میں نے تم سے جھوٹ کسی مصلحت کے تحت بولا تھا۔ میں تو اُسی روز تمہیں سچ بتانے والی ہی تھی کہ عین موقع پر ڈیڈی کے بھیجے ہوئے آدمی پہنچ گئے۔"

"آدمی یا غنڈے؟" اُس نے جل کر پوچھا۔

وہ بولی۔ "تم یہ کہنے میں حق بجانب ہو لیکن ڈیڈی ایک بزنس مین ہیں اور بزنس مین غنڈے نہیں پالتے۔"

"مگر اُنھوں نے مجھ سے سلوک تو غنڈوں والا کیا ہے۔" وہ بدستور ناراضی کے عالم میں بول رہا تھا۔ "بہت مارا ہے اُن حرامیوں نے مجھے۔"

"مجھے بھی ڈیڈی نے بہت زیادہ بے عزت کیا ہے اور تم سے ملنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔" اُس نے اپنا دکھڑا بیان کیا۔

"تو نہ ملو...... کون کہتا ہے تم سے ملنے کو۔" اُس نے جل کر جواب دیا۔

وہ بولی۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں تم سے نہیں ملوں گی۔ ڈیڈی مجھ پر پہرا تو نہیں بٹھا سکتے، میں تم سے ملوں گی اور ضرور ملوں گی۔"

"مگر میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" اُس نے طنزاً پوچھا۔ "ذرا سی مار کھا کر کیا عشق کا بھوت اُتر گیا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہارے باپ کے غنڈوں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔"

"کیسا وعدہ؟" اُس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"میرے باپ نے مجھے قسم دی ہے کہ میں آئندہ تم سے نہ ملوں۔"

"تو کیا اب تم مجھ سے نہیں ملو گے؟"

"میں باپ سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتا زارا! ہمیں ایک دوسرے کو بھلانا ہوگا۔"

وہ بولی۔ "میں مر تو سکتی ہوں مگر تجھے نہیں بھول سکتی۔ یاد رکھنا اگر تم مجھے ملنے کے لیے نہ آئے تو میں زہر کھا لوں گی۔ کل دن کے تین بجے میں اُسی پارک میں تمہارا انتظار کروں گی جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ ٹھیک تین بجے پہنچ جانا دیر ہوئی تو تمہیں وہاں میری لاش ملے گی۔"

"یہ ...... یہ کیا بکواس کر رہی ہو زارا!" وہ بوکھلا گیا۔ "بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں مجبور ہوں تم سے......"

"مجھے کچھ نہیں سننا...... سمجھے تم۔" اتنا کہہ کر اُس

نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

عامی اُستاد کے لیے پہلا قتل ہی مشکل تھا۔ اس کے بعد تو اُس نے پیچھے مڑ کر ہی نہ دیکھا بس قتل پہ قتل کرتا چلا گیا۔ اُس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ سلیمان پاشا آخر کیوں ایک خاص مکاتبِ فکر کے لوگوں کو ہی قتل کرواتا ہے؟ حالانکہ یہ سوال غور طلب تھا۔ پاشا لسانی اور مسلکی تعصب کو ہوا دے رہا تھا۔ ویسے بھی اُن دنوں شہر کے حالات لسانی اور مسلکی لحاظ سے نہایت ہی ابتر تھے۔ لوگ مساجد میں جاتے ہوئے بھی سو بار سوچتے تھے۔ عامی کا اپنا کوئی مسلک نہیں تھا۔ اُسے بس کرنسی نوٹوں سے پیار تھا اور پاشا نے اُسے دیتے ہوئے کبھی بھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ عامی اب پاشا کے لیے ایک روبوٹ کے مانند تھا۔ پاشا جو حکم دیتا عامی بلاچوں چراں اُس پر عمل کرتا۔ عامی کو انسپکٹر کرمانی کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وہ بیسیوں قتل کرنے کے بعد بھی آزادی سے گھوم رہا تھا۔

عامی کا یہ ٹارگٹ کلنگ والا کام جاری تھا کہ ملک میں نئے جمہوری دور کا آغاز ہو گیا۔ گزشتہ حکومت نے چونکہ شہر میں جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تھا اس لیے نئے حکمرانوں نے اقتدار سنبھالنے کے چند ماہ بعد میں شہر میں آپریشن کرنے کے احکامات صادر کر دیے تھے۔ جونہی آپریشن شروع ہوا شہر میں سکیورٹی فورسز اور جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان آئے ن فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ کچھ علاقوں میں گینگ وار بھی شروع ہو گئی، جو دن میں کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اُنہی دنوں عامی کو انسپکٹر کرمانی کی کال موصول ہوئی۔ ''عامی!'' کرمانی نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ''تم کچھ ماہ کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے جاؤ یا پھر اپنے گاؤں بھاگ جاؤ، کیونکہ حالات بہت زیادہ خراب ہونے والے ہیں۔''

''نہیں میں نہیں بھاگوں گا۔'' اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کرمانی کو انکار کیا۔ ''میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' کرمانی کو غصہ آ گیا۔ ''آپریشن پولیس کی بجائے ایف سی فورس کر رہی ہے۔''

''ایف سی فورس کرے یا آرمی کرے میں نہیں بھاگوں گا۔''

''مطلب تم کتے کی موت مرنے کا ارادہ کر چکے ہو؟'' کرمانی نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

وہ سارا احترام بالائے طاق رکھتے ہوئے بولا۔ ''کرمانی! کتے کی موت میں اکیلا نہیں مروں گا، میرے ساتھ تم اور پاشا صاحب بھی ایسی ہی موت مرو گے۔''

''اوہ...... تو اب چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔'' کرمانی کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ ''تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ تم کس کو دھمکی دے رہے ہو؟''

''ہاہاہا......'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''کرمانی! میں کوئی معمولی چور اچکا نہیں ہوں کہ تمہاری دھونس میں آ جاؤں گا۔ سنو! میرا اگر بال بھی بیکا ہوا تو تم اور پاشا زندہ نہیں بچو گے۔ تم دونوں کے خلاف میرے پاس ایسے ایسے ثبوت موجود ہیں کہ دونوں عمر بھر جیل میں چکی پیستے رہو گے۔''

عامی کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور کرمانی کا غصہ جھاگ کے مانند بیٹھ گیا۔ ''یار! میں تو تمہیں آزما رہا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم تو خواہ مخواہ سیریس ہو گئے ہو۔''

''بس اسی طرح میں بھی تمہیں آزما رہا تھا۔ چلو حساب برابر ہو گیا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''مگر ثبوتوں کی بات کر کے تم نے مجھے ڈرا دیا ہے...... کیا سچ مچ تم نے میرے اور پاشا کے

خلاف......"

"ڈونٹ وری کرمانی۔" اُس نے قطع کلامی کی۔ "ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کو دھوکا دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ہمارا اتحاد ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" کرمانی اُس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "بہرکیف تم محتاط رہنا سکیورٹی فورسز کا کوئی پتا نہیں ہے کسی وقت بھی دھاوا بول سکتی ہیں۔"

"اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فی الفور تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔تم کوئی بھی الزام لگا کر مجھے گرفتار کر لینا۔"

"گڈ یہ پلان ٹھیک رہے گا۔" کرمانی نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز شام ڈھلنے کے بعد سکیورٹی فورس کے ایک دستے نے اُن کے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔عامی نے اپنے گینگ کے ساتھ مل کر چند لمحے تو سکیورٹی فورس کا مقابلہ کیا مگر پھر موقع ملتے ہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔اُس کے فرار ہونے کے فوراً بعد ہی اُس کے تمام ساتھی سکیورٹی فورس کے ہاتھوں مارے گئے۔اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کے وقت انسپکٹر کرمانی آفس کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اچانک اُس کا سیل فون بجنے لگا۔اُس نے سستی کے عالم میں ٹیبل سے سیل فون اُٹھایا اسکرین پر ایک خمار آلود نگاہ ڈالی تو اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔دوسرے ہی لمحے اُس کی نیند اُڑ گئی۔سیل فون کی اسکرین پر پاشا کا نام جھلملا رہا تھا۔اُس نے فوراً کال ریسیو کی۔ "ہیلو سر! انسپکٹر کرمانی بات کر رہا ہوں۔خیریت تو ہے جناب! اس وقت کیوں زحمت کی؟"

دوسری جانب سے پاشا بولا۔ "خیریت ہوتی تو تجھے فون کیوں کرتا؟"

"حکم کریں جناب۔" کرمانی نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔

پاشا نے شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "تم چند کانسٹیبل لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤ، میرا ایک آدمی وہاں موجود ہے جو تمہیں بتائے گا کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ اور ہاں اُس کی کسی بات سے انکار مت کرنا۔"

"مگر جناب! کچھ پتا تو چلے کہ میں نے کرنا کیا ہے؟"

پاشا بولا۔ "ایک نوجوان کو گرفتار کرنا ہے، مگر خیال رکھنا وہ عامی اُستاد کا ہم شکل ہے کہیں دھوکا نہ کھا بیٹھنا۔دونوں کی شکل وصورت میں معمولی سا فرق بھی نہیں ہے۔اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوگی، جسے تم نے ہاتھ بھی نہیں لگانا...... سمجھ گئے؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا لیکن وہ لڑکی کون......"

"وہ لڑکی میری بیٹی ہے۔" اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پاشا بول پڑا۔ "وہ ضرور ہنگامہ کرے گی مگر تم لوگوں نے اُس کی بات سُنی ہے اور نہ ہی اُسے کچھ کہنا ہے۔یاد رکھنا اگر میری بیٹی کو خراش بھی آئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"پاشا صاحب! بے فکر رہیں بے بی کی طرف کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔آپ کی بیٹی تو کرمانی کی بھی بیٹی۔"

"گڈ۔" پاشا نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے تم سے یہی اُمید تھی اور ہاں اُس نوجوان کا نام عماد ہے اور اُس کا باپ ظہیر احمد صدیقی ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک ہے۔"

"میں ابھی نکلتا ہوں جناب! ایک گھنٹے کے اندر آپ کو خوش خبری مل جائے گی۔" اتنا کہہ کر وہ سرعت سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پاشا نے کہا۔ ''اوکے خدا حافظ۔'' اور پھر کال ڈس کنکٹ کردی۔

دس منٹ کے بعد انسپکٹر کرمانی کی جیپ پولیس اسٹیشن سے نکلی اور مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ جیپ میں چار ہٹے کٹے کانسٹیبل بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں شکل سے ہی خون خوار نظر آرہے تھے۔ وہ پولیس مین کم اور غنڈے زیادہ لگتے تھے البتہ یونی فارم نے اُن کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد جیپ شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کے مین گیٹ سے گزرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پارک میں بہت سے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ جوڑے سنگی بنچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انسپکٹر کرمانی نے پارک کے عین وسط میں جیپ روک دی۔ جیپ کے رکتے ہی چاروں کانسٹیبل تیزی سے نیچے اُترے اور رائفلوں کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑتے ہوئے انسپکٹر کرمانی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ کرمانی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ جیپ سے نیچے اُترا اور عقابی نگاہوں سے پارک کا جائزہ لینے لگا۔ اُسے اُس بندے کی تلاش تھی جس کے بارے میں پاشا نے بتایا تھا۔

''سر جی! حکم کریں؟'' ایک تیز و طرار کانسٹیبل نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

''صبر کرو صبر...... اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔''

کرمانی نے جواب دیا اور پھر ایک نوجوان کی طرف متوجہ ہوگیا، جو تیزی سے اُن کی طرف آرہا تھا۔

''سر جی! میں آپ ہی کا منتظر تھا۔'' نوجوان نے قریب پہنچتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا شکار وہ سامنے والے بنچ پر بیٹھا ہے۔''

''ہوں۔'' کرمانی نے اُس سے ہاتھ ملانے کے بعد ذو معنی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو یہ ہے وہ حرام زادہ جو پاشا صاحب کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے؟''

''یہی ہے جناب۔'' نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی ہوئی ہے وہ پاشا صاحب کی اکلوتی بیٹی زارا بی بی ہے۔''

''تم کسی طرح زارا بی بی کو یہاں سے ہٹا سکتے ہو؟'' کرمانی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''بہت مشکل ہے جناب وہ مجھے نہیں پہچانتی...... میری بات کبھی نہیں مانے گی۔''

''ہوں۔'' کرمانی نے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا ورنہ یہ تو شور مچائے گی۔ اپنے عاشق کو آسانی سے گرفتار نہیں ہونے دے گی۔''

''جناب! پاشا صاحب نے حکم دیا ہے کہ زارا بی بی کو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔ اگر......''

''مجھے پتا ہے۔'' کرمانی نے اُس کی بات کاٹی۔

''چلو اب تم بھاگ جاؤ۔''

نوجوان سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس ہوگیا۔

نوجوان کے جانے کے بعد کرمانی نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اسے پُرامن طریقے سے گرفتار کرنے کا پلان میں نے سوچ لیا ہے۔ تم میں سے کسی نے بھی کوئی مداخلت نہیں کرنی، بس میری تائید کرنی ہے۔ اب چلو۔''

وہ سب کرمانی کی پیروی کرتے ہوئے اُس بنچ تک پہنچ گئے، جہاں عماد اور زارا بیٹھے مستقبل کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔ پولیس کو اپنے سر پر دیکھ کر وہ دونوں ایک دم گھبرا گئے۔ خاص کر عماد کے چہرے پر تو ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دوسری طرف اُسے دیکھ کر کرمانی کو بھی حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ عماد نامی وہ نوجوان بالکل عامی اُستاد کا ہم شکل تھا۔ دونوں کی شکل میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں تھا۔ اگر پاشا اُسے اس بات سے آگاہ نہ

کر چکا ہوتا تو یقیناً وہ عماد کو عامی اُستاد ہی سمجھتا۔

''عماد! تمہارا ہی نام ہے ناں؟'' کرمانی نے خلافِ توقع ملائم لہجے میں سوال کیا۔

''ج...... جی...... جناب...... میرا ہی نام ہے۔'' عماد نے گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

''اور باپ کا نام ظہیر احمد صدیقی ہے؟'' کرمانی نے دوسرا سوال کیا۔

''جی...... ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر...... آپ یہ سب...... کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''عماد! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے پاس کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ دراصل تمہارے باپ کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اس وقت وہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہاسپٹل میں پڑے ہوئے ہیں۔''

یہ دردناک خبر سن کر عماد کا رنگ یک دم فق ہوگیا۔ زارا بھی گھبرا گئی تھی۔ تاہم عماد نے انتہائی کرب کے عالم میں پوچھا۔ ''انسپکٹر صاحب! ابو کی حالت کیسی ہے؟''

''یہ بات تو تجھے ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں۔ اب چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' کرمانی نے عجلت میں جواب دیا۔

عماد خاموشی سے اُن کے ساتھ چل دیا۔ اس دردناک خبر نے اُسے اتنا بھی سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ پولیس والوں سے یہ پوچھتا کہ اُنھیں عماد کی یہاں موجودگی کا پتا کس طرح اور کیسے چلا؟ بڑی آسانی سے وہ کرمانی کے جال میں پھنس گیا تھا۔

وہ جیپ تک پہنچے ہی تھے کہ زارا بھی بھاگ کر وہاں پہنچ گئی اور بولی۔ ''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتی ہوں۔''

''سوری۔'' کرمانی نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ ''ہم تمھیں ایک پولیس وین میں نہیں لے جا سکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔''

''زارا! تم جاؤ اللہ بہتر کرے گا۔'' عماد اُس سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے کال کر کے سب کچھ بتا دوں گا۔'' زارا کو وہاں چھوڑ کر عماد انسپکٹر کرمانی کے ساتھ چل دیا۔

☆☆☆

کرمانی ورغلا کر عماد کو سیدھا تھانے لے آیا۔ اُسے جیپ سے اُتارا اور سپاہیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''اسے اچھی طرح سبق سکھا کر حوالات میں بند کر دو۔''

''مم...... مگر...... جناب! میرا قصور کیا ہے؟''

''تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے سلیمان پاشا جیسے بڑے آدمی سے دشمنی مول لی ہے۔'' کرمانی نے جواب دیا اور پھر سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

چاروں سپاہی آگے بڑھے اور بھوکوں گدھوں کی طرح عماد پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چیختا رہا، چلاتا رہا، اُن کی منتیں کرتا رہا اور حتی المقدور خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن حکم کے وہ غلام سنی ان سنی کرتے ہوئے اُس کی پٹائی میں لگے رہے۔ وہ انسان تھا کوئی پتھر تو تھا نہیں آخر کار مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا۔ تب سپاہیوں نے اُسے اُٹھا کر حوالات میں پھینک دیا۔ اس دوران آفس کے اندر انسپکٹر کرمانی فون پر پاشا کو اپنی کامیابی کی خبر سنا رہا تھا۔ ''پاشا صاحب!'' وہ خوشامدی انداز میں بولا۔ ''ہم نے اُس کی خوب مرمت کی ہے اور اب حوالات میں پڑا ہے...... حکم کریں جناب! اُس کا کیا کرنا ہے؟''

پاشا بولا۔ ''کرمانی! اُسے ایک بار میرے آدمی سمجھا چکے ہیں لیکن وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو اپنا بُرا بھلا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ایک ہی علاج ہوتا ہے کہ انھیں اللہ میاں کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ

بجے بانسری۔"
کرمانی نے کہا۔ "پاشا صاحب! یہ کام تو آپ عامی اُستاد سے بھی کرا سکتے تھے۔ پھر مجھے......"
"شہر کے حالات دیکھ رہے ہو کرمانی۔" اُس نے قطع کلامی کی۔ "تمام جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف آپریشن شروع ہو چکا ہے۔ عامی جیسے غنڈے کسی بھی وقت ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔ تمہیں عماد کے ساتھ ساتھ عامی سے بھی دائمی چھٹکارا حاصل کرنا پڑے گا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ کام ہے بہت مشکل، میں اُوپر والوں کو کیا جواب دوں گا؟" اُس نے مکارانہ انداز میں جواب دیا۔
"تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے اس لیے بہانے مت بناؤ اور ہاں تمہارے اکاؤنٹ میں آج ہی 20 لاکھ روپیہ ٹرانسفر ہو جائے گا۔" پاشا نے اُس کی چال سمجھتے ہوئے پتا پھینکا۔
"بہت بہت شکریہ پاشا صاحب! میں اس معاملے کو جلد ہی نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔"
"اوکے میں خوش خبری سننے کا منتظر ہوں۔" پاشا نے جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔
کرمانی کی نگاہوں کے سامنے 20 لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ ناچنے لگے۔ چنانچہ اُس کا عیار دماغ تیزی سے پلان ترتیب دینے لگا مگر اُسے کوئی مناسب حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس دوران مغرب کی اذان ہونے لگی۔ وہ آفس سے نکلا اور اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔ نماز اُس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ چنانچہ یونی فارم اُتار کر اُس نے عام لباس پہنا اور آرام کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔ اُس کا دماغ اب بھی عامی اُستاد اور عماد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے میں اُلجھا ہوا تھا۔ عماد سے تو وہ باآسانی نمٹ سکتا مگر عامی اُستاد جرم کی دنیا کا بندہ تھا وہ آسانی سے اُس کے ہاتھ لگنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی دو دن قبل عامی اُستاد نے اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ اُس کے پاس کرمانی کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ کرمانی نہیں جانتا تھا کہ وہ ثبوت عامی اُستاد نے کہاں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں؟ ان ثبوتوں کی موجودگی میں وہ عامی اُستاد پر کسی طرح بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھا کہ معاً اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ اُس نے سیل فون اُٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر عامی کا نام جھلملا رہا تھا۔
"یس۔" اُس نے کال ریسیو کی۔ "بولو کیا بات ہے؟"
"کرمانی! میرے سب ساتھی اب تک سکیورٹی فورس کے ریڈ میں مارے جا چکے ہوں گے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ پلیز یار! مجھے بچا لو۔" اُسے عامی اُستاد کی پریشان کن آواز سنائی دی۔
"تم فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔" کرمانی نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔
"ٹھیک ہے میں ابھی پہنچتا ہوں۔"
"تم نے وہاں اپنے فلیٹ پر کوئی ثبوت وغیرہ تو نہیں چھوڑے ناں؟" کرمانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔
"نہیں میں سب کچھ نکال لایا ہوں۔"
"گڈ...... یہ تم نے اچھا کیا۔ بس اب فوراً پہنچنے کی کرو۔"
"اوکے میں آدھے گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔" اُس نے جواب دیا تو کرمانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔
"اب تم سے نمٹوں گا حرام زادے۔" کرمانی نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تیسرا آدمی

☆ راوی: شاہین/تحریر: حامد رضا قادری

جہاز بحیرۂ عرب کی بے کراں گہرائیوں کے اوپر تقریباً 40 ہزار فٹ کی بلندی پر فضا کی وسعتوں میں محوِ پرواز تھا۔ نیچے ہر سُو بحیرۂ عرب کا نیلگوں پانی لہریں لے رہا تھا۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی غائب دماغی سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس نظارے سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ میرے دماغ میں تو یادوں کے کنکھجورے رینگ رہے تھے۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی طرح یادیں تھیں کہ موج در موج ذہن کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ کئی سال کے بعد میں اپنے وطن اپنے گھر لوٹ رہی تھی۔ جانے میری بیٹی کیسی ہوگی۔ جسے ساڑھے تین سال کی عمر میں مَیں چھوڑ کر دیارِ غیر کو چلی گئی تھی۔ بیٹی کیا یاد آئی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب تو وہ کافی بڑی ہو چکی ہوگی۔

بیٹی یاد آئی تو یادوں کی کسی موج کے پیچھے سے رضا کا چہرہ نمودار ہوا۔ رضا جو کہ ایک مخلص انسان تھا، سچا اور وفادار دوست تھا مگر میں ہی اُسے پہچان نہ سکی۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ مجھے چاہنے لگا تھا تو کچھ غلط نہ تھا۔ اس کی دوستی کی طرح اس کی چاہت بھی بے غرض اور بے لوث تھی۔ وہ حدود کا خیال رکھنا جانتا تھا اور اس سے کبھی تجاوز نہ کرتا تھا۔ پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ میں اُس کی خزاں رسیدہ زندگی میں ہوا کا تازہ جھونکا بن کر داخل ہوتی تھی۔ تب میں نہیں جانتی تھی کہ یہ شخص صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ ایسے ملا تھا جیسے مدتوں سے آشنا رہا ہو۔

یادوں کا ایک طوفان تھا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میرے اپنے اندر کا موسم بے حد خراب تھا یا یہ پچھتاوا تھا جو بھی تھا ہر پل میری بے قراری میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں چاہنے کے باوجود یادوں کے ان چمگادڑوں کو ذہن کے اندھیرے گوشوں سے نکل کر دماغ میں آنے سے روک نہ پا رہی تھی۔ مجھے

تیسرا آدمی

لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کرنے والے شخص کا قصہ جس کی تنہائیوں کی جھیل میں ایک حسنِ تمام نے پتھر دے مارا تھا، اُس کی اپنی زندگی خزاؤں کی زد میں تھی۔
ایک نادان حسینہ کی نادانیوں کی سرگزشت جس کے دردل پہ خوش بختی نے دستک دی تھی مگر وہ تو پتھر چاٹنے پر تلی ہوئی تھی، پچھتاوے اور بگڑ کر سنور جانے والے لمحوں کی داستان

رضا کی بیٹیاں یاد آئیں جو میرے اور رضا کے تعلقات کا باعث بنی تھیں۔

میں ان دنوں ایک بسکٹ بنانے والی فیکٹری میں ملازمت کر رہی تھی اور پارٹ ٹائم بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ میری ایک ساڑھے تین سال کی بیٹی تھی جس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مجھے ملازمت کرنی پڑتی تھی کیونکہ میرے خاوند نے مجھے اُس وقت طلاق دی تھی جب میری بیٹی ابھی چھ ماہ کی تھی۔ کئی سال تک میں اس صدمے میں رہی۔ طلاق مرد دیتا ہے مگر اس کا عذاب صرف عورت کو سہنا پڑتا ہے۔ اپنے برائے سب کی نظروں میں ایک ہی سوال کہ شوہر نے طلاق کیوں دے دی؟ کوئی خرابی ہوگی۔ کردار پر بھی انگلیاں اٹھتی ہیں۔ لوگ نظروں سے ہی چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے خود پر ہر قسم کی رعنائی کا دروازہ بند کر لیا تھا اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مگر اپنی بیٹی کی خاطر مجھے اس کنارہ کشی سے نکلنا پڑا مگر میری ویران زندگی پھر بھی ویران ہی رہی۔

مجھے ملازمت کرتے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ تین نئی لڑکیاں ملازمت کے لئے آئیں مگر وہ خاصی کم عمر تھیں، یہ لڑکیاں مجھے بڑی اچھی لگیں۔ جلد ہی میری اُن سے دوستی ہوگئی کسی اچھے گھر کی بچیاں لگتی تھیں۔ ایک روز میں نے اُن سے پوچھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں ملازمت کی کیا ضرورت پیش آگئی تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنے شوق کے لئے ملازمت کر رہی ہیں۔ اُن میں سے دو لڑکیاں تو نویں کلاس کی طالبہ تھیں سکولوں میں چھٹیاں تھیں۔ انہیں ملازمت کا شوق ہوا تو تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کر لی۔ دو لڑکیاں تو رضا کی بیٹیاں تھیں جبکہ تیسری لڑکی رضا کی بھانجی تھی۔ پھر تقریباً ایک ماہ بعد یہ لڑکیاں کام چھوڑ کر چلی گئیں پتہ چلا کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے فون پر ہی اُن سے تعزیت کر لی تھی۔ پھر اس کے بعد اکثر ان لڑکیوں سے فون پر رابطہ رہتا تھا۔ ایک روز میں نے اُن سے کہا کہ میں یہ ملازمت چھوڑ رہی ہوں اپنے پاپا سے کہہ کر کہیں اچھی جگہ ملازمت کا بندوبست کرا دیں۔ اس طرح اُن کے پاپا سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔ ایک روز انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا کہ آپ کی ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے۔ آپ پاپا سے خود بات کرلیں اور انہوں نے مجھے اپنے پاپا کا فون نمبر دے دیا۔ اگلے دن میں نے ہمت کر کے اپنی دوست کے پاپا کو فون کیا۔

''السلام علیکم!'' دوسری طرف سے فون اٹینڈ کرنے پر میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جی، وعلیکم السلام!'' ایک بھاری مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''جی فرمایئے!'' جواب میں انتہائی پُراعتماد اور نرم لہجے میں کہا گیا۔ تب میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں، دو ایک روز میں آپ کی نئی جاب کا بندوبست ہو جائے گا''۔ اُسی طرح نرم لہجے میں کہا گیا۔ لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی جیسے صدیوں سے آشنائی رہی ہو۔

اس طرح پہلی بار غائبانہ تعارف سے نکل کر ہم صوتی ملاقات کے مرحلے میں داخل ہوئے۔ ابھی تک ہم بالمشافہ نہیں ملے تھے۔ دو روز بعد مجھے رضا کا پیغام ملا کہ میری ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے لہٰذا اگلے روز ایک جگہ ملاقات کا وقت طے ہوگیا۔

اگلے روز کی ملاقات کا ایک ایک سین ایک ایک لفظ مجھے روزِ روشن کی طرح یاد آیا۔ صبح ساڑھے دس بجے ہی رضا کا فون آیا تھا۔

''کیا آپ تیار ہیں''۔ اُس نے پوچھا تھا۔

''جی، میں تیار ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''بس ہم گھر سے نکل رہے ہیں''۔

''ٹھیک ہے میں بھی گھر سے نکل رہا ہوں''۔

تقریباً بیس منٹ بعد میں اپنی سہیلی کے ساتھ مقررہ جگہ پہنچ گئی یہاں پہنچ کر میں نے رضا کو فون کیا اور بتایا کہ ہم مقررہ جگہ پہنچ گئے ہیں۔ میرا دل کسی انجانے سے احساس سے دھڑک رہا تھا کسی حد تک میں خوفزدہ بھی تھی کیونکہ میں کبھی بھی اس طرح کسی سے ملنے نہیں گئی تھی۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک موٹر بائیک ہمارے پاس آ کر رکی میں نے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا، نیوی بلیو پینٹ اور ییلو کلر کی لائننگ والی ہاف بازو شرٹ میں ملبوس ایک درمیانی سی عمر کا شخص بائیک سے اتر کر ہماری جانب بڑھا۔

''السلام علیکم!'' اُس نے بڑی شائستگی سے سلام کیا۔ لہجے میں اپنائیت تھی۔ مجموعی طور پر اچھی خاصی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا وہ پُروقار چال چلتا ہوا ہم تک پہنچا تھا۔ ہماری طرف سے اجنبیت تھی مگر وہ تو ایسے لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے آشنا رہا ہو۔ وہ ہمیں لے کر ایک آفس میں گیا اور ہمارا انٹرویو کرایا اور ہمیں سلیکٹ کرایا۔ یوں ہمیں ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ انٹرویو کے بعد رضا ہمیں ایک قریبی ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ یہاں کچھ دیر تک ہماری میٹنگ رہی۔ رضا ہمیں نئی جاب کے بارے میں بریفنگ دیتا رہا۔ یہ ہماری بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ یوں رضا سے میرے تعلقات کی شروعات ہوئیں جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتے چلے گئے۔ رضا ایک اچھا اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ وہ ایک بہت اچھا اور بہت ہی ہمدرد دوست ثابت ہوا تھا۔ میرے سابقہ شوہر کے ساتھ کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے اس وقت طلاق دی تھی جبکہ میری بیٹی صرف چھ ماہ کی تھی اور اب وہ مجھ سے میری بیٹی بھی چھین لینا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس نے عدالت میں کیس کر رکھا تھا اس سلسلے میں بھی رضا میرے ساتھ ساتھ سائے کی طرح رہا اور اُس کی کوششوں سے اور اس کی ہمت سے میں نے یہ کیس جیت لیا تھا۔

کبھی کبھی میں بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی کہ رضا کی دوستی چاہت میں بدل رہی ہے یا وہ دل ہی دل میں مجھے پسند کرنے لگا ہے مگر کبھی بھی اُس نے زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک روز میں اور رضا کہیں بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے کہ رضا اٹھ کر کچھ دیر کے لئے کہیں گیا، میں اُس کی واپسی تک وقت گزاری کے لئے اُس کی ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگی۔ یہ ڈائری وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اچانک ایک صفحہ پر میری نظریں ٹھہر گئیں اور میں اُسے پڑھنے لگی لکھا تھا۔

17 جون بروز اتوار صبح گیارہ بجے 1986ء۔ بچوں کی جس باجی کا کئی ماہ سے گھر میں تذکرہ ہوتا رہتا تھا آخر آج اُسے ملنے کا موقعہ مل ہی گیا۔ مجھے اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اُس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہے اور آج صبح گیارہ بجے جب میں نے اُسے دیکھا تو اُس کے بارے میں جو سنا تھا غلط سنا تھا وہ خوبصورت نہیں بہت خوبصورت تھی۔ اُسے دیکھ کر پلک جھپکنا تو دور کی بات میں سانس بھی لینا بھول گیا۔ اب میری زندگی میں مزید کسی عورت کی گنجائش نہیں، مجھے اپنی ان سوچوں پر پابندی لگانا ہو گی۔ کوئی اور عورت میری فرزانہ کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ مجھے اب اپنے بچوں کے لئے جینا ہے۔''

رضا کے آ جانے پر مجھے ڈائری بند کرنا پڑی مگر ڈائری پڑھ کر میں سکتے میں آ گئی تھی۔ مانا کہ میں حسین تھی مگر اتنی بھی نہیں جتنی رضا نے مجھے لکھ دیا تھا۔ رضا کی ڈائری میں اپنے حسن کے قصیدے پڑھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ رضا مجھے پسند کرنے لگا ہے۔ رضا ہر لحاظ سے ٹھیک تھا مگر ہمارے درمیان عمروں کا کافی فرق تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دوستی اور محبت عمروں کے فرق کو نہیں دیکھتی، پھر بھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' رضا کی آواز نے مجھے چونکا

دیا۔

''کچھ نہیں''۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آؤ چلیں''۔

اس رات گھر آ کر میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ رضا کی تحریر نے میرے دل کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اگرچہ اُس نے تحریر میں اپنی بیوی فرزانہ سے عشق کا لکھ کر کسی دوسری عورت کے لئے گنجائش نہ چھوڑی تھی مگر اُس تحریر کے پڑھ لینے کے بعد رضا کے لئے میرے دل میں ہلچل شروع ہوگئی تھی۔

عین اُس وقت جب رضا کے لئے میں کسی اور زاویے سے سوچ رہی تھی اور کسی اور ہی نظر سے اُسے دیکھنے لگی تھی کہ اچانک ہی رضا اور میری دوستی میں ایک عجیب موڑ آیا۔ یہ تھا طارق بٹ۔ طارق بٹ کراچی سے کاروباری سلسلے میں ہمارے آفس میں آتا تھا یوں رفتہ رفتہ طارق بٹ سے شناسائی پیدا ہوگئی۔ اگرچہ طارق بٹ کی شخصیت رضا کی شخصیت کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ رضا خوبصورت شخصیت کا مالک تھا مگر طارق بٹ دولت مند تھا اور دوسرے ملکوں میں لوگوں کو بھیجنے کے کام سے منسلک تھا۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے طارق بٹ سے کہا کہ کیا آپ مجھے امریکہ بھیج سکتے ہیں۔ جواب میں طارق بٹ نے کہا کہ امریکہ تو نہیں، میں آپ کو دبئی بھیج سکتا ہوں کیونکہ وہاں سے ڈیمانڈ آئی ہے۔

اصل میں جب کسی انسان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے تو وہ بہت زیادہ حساس اور جذباتی ہو جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ طلاق کے وقت میری بیٹی چھ ماہ کی تھی۔ ایسے وقت میں میرے بھائیوں نے مجھے سہارا دیا۔ بھائیوں کی بیویاں، بچے، اُن کے اخراجات، اُس پر میری اور میری بچی کی ذمہ داری اُن پر آن پڑی تھی۔ میرے بھائیوں نے اور میری بھابیوں نے میری ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا مجھے کسی شے کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی مگر میں خود اُن کے لئے سوچتی تھی کہ ملازمت کر کے اُن کا کچھ تو بوجھ ہلکا کروں۔ آخر مجھے اپنی اور اپنی بچی کی ضروریات کے لئے مجبوراً جاب کرنی پڑی مگر اس جاب میں پیسے اتنے کم ملتے تھے کہ دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں ہوتی تھی جبکہ میں اپنی بیٹی کو ایک اچھا مستقبل دینا چاہتی تھی اور اس کے لئے مجھے محنت کرنی تھی اور اس ملک میں کب کسی کو محنت کا پورا صلہ ملتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں باہر جاؤں گی۔

طارق بٹ نے میری اسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے مجھے کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دبئی جانے کے خواب دیکھنے لگی۔ یوں طارق بٹ اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ پھر طارق بٹ کی کوششوں سے میرے کاغذات بھی مکمل ہوگئے۔ ایک روز طارق بٹ نے مجھے کہا۔ ''آپ کا ویزا آ گیا ہے آپ اس فارم پر اپنے دستخط کر دیں''۔ اُس کے پاس ایک فائل تھی جو اس نے میرے سامنے رکھ دی اور پھر وہ جہاں جہاں کہتا گیا میں وہاں وہاں دستخط کرتی چلی گئی بلا سوچے سمجھے، بلا دیکھے اور فارم پڑھے۔

رضا کو پتہ چلا تو وہ بھونچکا رہ گیا اور بہت تڑپا اس نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی مجھے بہت سمجھایا کہ ایسا مت کرو۔ باہر لڑکیوں کو لے جا کر کیا کیا حالات پیش آتے ہیں، کیا کیا فراڈ ہوتے ہیں، اس کا آپ کو علم نہیں۔ مگر رضا کی کوئی دلیل مجھے قائل نہ کر سکی میرے سر پر تو دبئی جانے کا بھوت سوار تھا۔

''طارق بٹ کو کب سے جانتی ہو؟'' رضا نے پوچھا۔

''یہی کوئی دو ماہ سے''۔ میں نے کہا۔

''وہ کون ہے کیا ہے کوئی اس کا تا پتہ معلوم نہیں ایک اجنبی کے ساتھ جانے کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا بغیر کسی سے پوچھے۔ مجھ سے بھی مشورہ کرنا پسند نہ کیا''۔ رضا نے

انتہائی سنجیدگی سے کہا اس کے لہجے میں ناراضگی اور غصے کی آمیزش تھی۔

''آپ بھی اجنبی ہو اور پھر کس حیثیت سے آپ مجھے روک رہے ہو؟'' اس روز پہلی بار میں نے رضا کے ساتھ تلخ لہجے میں بات کی۔ ''کیا حق حاصل ہے آپ کو میرے فیصلوں میں دخل دینے کا جبکہ یہ میری بیٹی اور میرے مستقبل کا معاملہ ہے...... یوں کیوں نہیں کہتے کہ طارق بٹ سے حسد کرتے ہو''۔ جانے اُس روز تلخی میں مَیں رضا کو کیا کیا کہہ گئی۔ رضا یہ سب سن کے سکتے میں آ گیا وہ تو سن ہو کے رہ گیا تھا۔ جانے کتنی دیر چپ چاپ میری طرف حیرت سے دیکھتا رہا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا کہ جو کچھ اُس نے سنا وہ کہیں اس کی سماعت کا دھوکا تو نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کو میرے ان الفاظ سے بے انتہا دکھ پہنچا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھی تھی جس کے پیچھے ساون کی گھٹاؤں کی مانند گھٹائیں تھیں جو امنڈ پڑنے کے لئے مچل رہی تھیں مگر وہ ان آنسوؤں کو خاموشی سے پی گیا۔ کچھ لمحے یونہی گزر گئے۔ یہ لمحے اور یہ خاموشی صدیوں پر محیط ہو گئی تھی پھر رضا دھیرے سے اٹھا ایک نظر مجھے دیکھا اور خاموشی سے نکل گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں بیٹھی رہی، مجھے اپنے رویے پر دکھ بھی ہو رہا تھا۔

اُس روز میرے تلخ رویے نے رضا کا دل توڑ دیا تھا وہ رضا جو ایک مہربان دوست تھا۔ جس نے مجھ تک پہنچنے کے لئے صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کیا تھا جس نے ہر مشکل وقت میں ہر مرحلے میں میرا ساتھ دیا تھا اور کبھی بھی اس کا صلہ نہیں چاہا تھا۔ مگر میں نے اس کا صلہ کیا دیا؟ ''آنسو'' وہ آنسو جو اُس نے میری بے رخی پر خاموشی سے پی لئے تھے۔ مگر آج وہی آنسو میری آنکھوں میں تھے۔

آج جہاز میں سفر کے دوران یادیں تھیں کہ قطار

اندر قطار چلی آ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے زندگی کا یہ سفر ختم ہو جائے گا مگر یادوں کا سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ رضا اور طارق بٹ کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اور شخص یاد آیا۔ یہ تیسرا شخص کون تھا اس کا کیا نام تھا مجھے نہیں معلوم تھا۔ مگر وہ تیسرا شخص میرے لئے رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ اُسی کی کوششوں سے میں طارق بٹ کے چنگل سے نکل پائی تھی ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ مہربان جو کبھی سامنے ہی نہیں آیا جس نے اپنا نام تک نہ بتایا تھا جانے یہ گمنام محسن کون تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں دبئی جانے کے لئے ائر پورٹ پہنچی تھی دبئی جانے کے لئے میں نے اپنے بھائیوں کو طارق بٹ سے ملوایا تھا۔ میرے بھائیوں نے مجھے روکا تھا مگر میں بضد رہی مجبوراً بھائیوں کو مجھے اجازت دینی پڑی۔ ایک تو میں بھائیوں کی لاڈلی تھی دوسرا میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اُس کی وجہ سے تو میں بھائیوں کی آنکھ کا تارا بن گئی تھی اور بھائی اور میری بھابیاں میری کسی بات یا خواہش کو رد نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا دبئی جانے کے مسئلے پر بھی بھائیوں نے میری خواہش کا احترام کیا کچھ اس لئے بھی کہ طارق بٹ بڑا چرب زبان تھا۔ اس کی چرب زبانی نے بھی کام دکھایا تھا اور میرے بھائیوں کو شیشے میں اتار لیا تھا میں تو پہلے ہی اُس کے شیشے میں اتر چکی تھی۔

رات ایک بجے دبئی کی فلائٹ تھی، رضا مجھے ائرپورٹ پر سی آف کرنے نہیں آیا تھا جس کا مجھے تھوڑا سا احساس تھا مگر جلد ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا کیونکہ میں تو اپنے خوابوں کی دنیا میں جا رہی تھی ایسے میں رضا کو یاد کر کے میں ذہن کو پراگندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

جب میں دبئی ائرپورٹ پر اتری تو طارق بٹ میرے استقبال کے لئے موجود تھا اور ایک بہترین ہوٹل میں میرے لئے کمرہ بک تھا۔ طارق بٹ نے مجھے ہوٹل میں چھوڑا اور یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ آپ آرام کر لیں صبح ملاقات ہوگی۔ میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور انٹرکام پر روم سروس سے کھانا منگوایا اور کھانا کھا کر میں سو گئی۔ پھر فون کی گھنٹی پر میری آنکھ کھلی تھی دوسری طرف طارق بٹ تھا اُس نے کہا کہ میں آ رہا ہوں، آپ تیار ہو جائیں۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ہی طارق بٹ وارد ہوا تھا۔ وہ مجھے لے کر ایک بنگلے پر گیا وہاں چند افراد اور تھے، ایک دو خواتین بھی تھیں۔ یہ کوئی بڑا رئیس گھرانہ لگتا تھا باہر گیٹ پر مسلح گارڈز موجود تھے۔

طارق بٹ کچھ دیر ان لوگوں سے گفتگو کرتا رہا۔ اس دوران مشروبات اور قسم قسم کے پھلوں کے ساتھ ہماری تواضع کی گئی۔ کچھ دیر بعد طارق بٹ نے مجھے کہا۔ ''اب آپ کو یہیں رہنا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے گا۔ میں چند روز بعد آؤں گا''۔ پھر وہ مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع دیئے بغیر حیران پریشان چھوڑ کر چلا گیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔

اس بنگلے میں مجھے ایک کمرہ دے دیا گیا جہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔ رات تقریباً آٹھ بجے ایک عورت میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ رسمی تعارف کے بعد اُس نے بتایا کہ اس بنگلے کا مالک شیخ صالح ہے جس کی دو بیویاں ہیں، ایک بیوی پاکستانی ہے، دوسری مقامی ہے اور اس وقت شیخ صالح اپنی دونوں بیویوں اور بچوں کو ساتھ یورپ گئے ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک ماہ تک ان کی واپسی ہوگی۔ یہاں آپ کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی مگر شیخ صالح کے آنے تک آپ کو صرف بنگلے تک محدود رہنا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ایک قسم کی قید ہو کر رہ گئی تھی اور میری حالت اُس پرندے کی سی ہو گئی تھی جس کے بال و پر کاٹ کر سونے کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔

تقریباً ایک ماہ تک میں اس قید میں پریشان رہی

پھر شیخ صالح کی آمد کی اطلاع آئی اور ایک روز شیخ صالح اپنی دونوں بیویوں اور بچوں کے ہمراہ واپس آ گیا۔

شیخ صالح کی ایک بیوی پاکستانی تھی اور اُس کے دو بچے تھے۔ جن کی عمریں سات سال اور پانچ سال تھیں۔ ایک بیٹا تھا ایک بیٹی تھی۔ دوسری بیوی مقامی تھی اس کے تین بچے تھے وہ بڑے تھے اور یورپ میں کسی جگہ زیر تعلیم تھے۔ شیخ صالح کے آنے پر مجھ پہ ایک خوفناک انکشاف ہوا کہ طارق بٹ شیخ صالح کے ہاتھ مجھے 5 لاکھ کے عوض 5 سال کے لئے فروخت کر گیا تھا۔ شیخ صالح نے مجھے وہ کاغذات دکھائے جن پر میرے دستخط تھے۔ یہ میرے اور شیخ صالح کے مابین 5 سالہ معاہدہ تھا جس کی رُو سے میں نے شیخ صالح کے ساتھ 5 سال کا ملازمت کا معاہدہ کیا تھا۔ اب میں 5 سال کے لئے شیخ صالح کی ملازمہ تھی۔ طارق بٹ نے خود کو میرا شوہر ظاہر کیا تھا اور شیخ صالح سے میرے عوض 5 لاکھ روپے لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ تب مجھے رضا کے الفاظ یاد آئے۔

''باہر کیا کیا فراڈ ہوتے ہیں آپ نہیں جانتی، قدم قدم پر دھوکے ہیں''۔ اور میں ایک بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو چکی تھی۔ رضا نے مجھے بہت سمجھایا تھا بہت روکا تھا مگر میں تو وہ مچھلی تھی جو پتھر چاٹ کر ہی مڑتی ہے۔ مگر یہاں تو پتھر چاٹ لینے کے بعد واپسی کے راستے بھی بند ہو چکے تھے۔ میں بُری طرح پھنس چکی تھی۔ میری عزت اور میری زندگی دونوں خطرے میں تھیں۔ شیخ صالح کیسا آدمی تھا میرے ساتھ کیا سلوک کرتا میں نہیں جانتی تھی میں مکمل طور پر اُس کے رحم و کرم پہ تھی۔ شاید میری قسمت اچھی تھی کہ شیخ صالح ایک بھلا اور شریف النفس انسان ثابت ہوا اُس کی پہلی بیوی کے بچے بڑے تھے اور یورپ میں کسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے جبکہ پاکستانی بیوی کے بچے چھوٹے تھے لہٰذا اُن کی دیکھ بھال کے لئے انہوں نے کسی پاکستانی گورنس رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اخبار میں

تیری چاہت

اللہ! میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ تُو میرا پروردگار ہے۔ تُو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں۔ بس تُو مجھ کو ویسا بنا دے جیسا تُو چاہتا ہے۔

(مظہر سعید)

اشتہار دیا جسے پڑھ کر طارق بٹ اُن تک پہنچا اور اُن کو بتایا کہ میری بیوی ایک پڑھی لکھی خاتون ہے لہٰذا بچوں کی گورنس کے لئے بہت مناسب رہے گی۔

آدمی چرب زبان تھا دوسروں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا تھا لہٰذا یہاں بھی اُس کا فراڈ کامیاب رہا۔ یوں بھی اس نے 5 سال کے لئے صرف 5 لاکھ ہی مانگا تھا جو کہ اس کام کے لئے بہت ہی کم معاوضہ تھا بلکہ ایک قسم کا نہ ہونے کے برابر لہٰذا شیخ صالح اس کی اس شرط پر کہ معاوضہ اُسے پہلے دیا جائے، رضامند ہو گیا۔ طارق بٹ نے معاوضہ موصول ہونے کے بعد دو ماہ کا وقت مانگا اور کسی لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جب تک دنیا میں میرے جیسے ضرورت مند، مجبور اور بیوقوف لوگ موجود ہیں فراڈیئے لوگوں کا فراڈ کامیاب ہوتا رہے گا۔ شومیٔ قسمت کہ میں اس کے ہتھے چڑھ گئی اور اس کا فراڈ کامیاب رہا۔ میں نے شیخ صالح کو بتایا کہ طارق بٹ میرا شوہر نہیں بلکہ میرے ساتھ فراڈ ہوا ہے۔ تو شیخ صالح نے وہ کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے جن پر میرے دستخط تھے۔ شیخ صالح کا کہنا تھا کہ جب تم نے دستخط کئے تھے تو کاغذات پڑھے بغیر کیسے دستخط کر دیئے۔ ویسے بھی میری رقم تم پر لگی ہے میں نے 5 سال کے لئے تمہارا معاوضہ دیا ہے۔

شیخ صالح کے ساتھ فراڈ والی بات کر کے میں نے

ایک اور غلطی کر دی تھی اس کا فائدہ ہونے کی بجائے یہ نقصان ہوا کہ مجھ پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور میرے باہر جانے پر پابندی لگ گئی اگر کبھی میں باہر جاتی بھی تو وہی عورت جو پہلے روز میرے کمرے میں آئی تھی میرے ساتھ ہوتی اور ساتھ پہرے دار ہوتا۔

مجھے دبئی آئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور مجھے اس قید سے رہائی پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ہر پہلو سے حالات کا جائزہ لے چکی تھی ہر زاویے سے سوچ اور دیکھ بھال چکی تھی کہ شاید کوئی راستہ ملے تو میں بھاگ نکلوں مگر ہر راستہ زنداں میں کھلتا تھا۔ میں ہر وقت دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتی رہتی تھی اور خدا سے دعائیں کرتی رہتی تھی کہ اے پروردگار مجھے اس قفس سے آزاد کرا، کوئی راستہ دکھا، غیب سے میری مدد فرما۔

مجھے اپنی بیٹی یاد آتی تھی تو میں خون کے آنسو پی کے رہ جاتی تھی۔ پتہ نہیں میری بیٹی کس حال میں ہوگی میرے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ انہیں کیسے اطلاع دوں کہ میں یہاں قید میں پڑی ہوں۔

اس طرح تقریباً دو سال گزر گئے۔ پھر قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ میرے خدا نے میری سن لی۔ ایک روز میں بازار گئی وہی عورت اور پہرے دار میرے ساتھ تھے۔ مگر اب وہ مجھ پر اتنی کڑی نظر نہ رکھتے تھے اور کافی حد تک مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے یا یوں کہہ لیں کہ میں بڑی حد تک اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ پہلے تو وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے تھے مگر اب میں کسی دُکان میں جاتی تو وہ باہر ہی رک جاتے تھے یا گاڑی ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو صرف محافظ ہی ساتھ ہوتا تھا اور وہ بھی گاڑی میں بیٹھا رہتا تھا۔

پچھلے کئی روز سے میں ایک شخص کو دیکھ رہی تھی، میں جب بھی مارکیٹ آتی تھی وہ کسی نہ کسی موڑ پر کھڑا مجھے گھور رہا ہوتا۔ ایک دو بار تو میں نے اُس کو اپنا پیچھا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ایک بار میں نے اُس کے ہاتھ میں ایک فوٹوگراف بھی دیکھا تھا وہ سڑک کے دوسری طرف کھڑا کبھی فوٹوگراف کو دیکھتا تھا اور کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے فوٹوگراف اور میرا موازنہ کر رہا ہو۔ پھر ایک روز اُس نے مجھے بہت قریب آ کر دیکھا تھا اور پھر فوٹو سے موازنہ کیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد میں نے اسے ایک پبلک کال بوتھ میں کسی کو فون کرتے دیکھا جیسے وہ کسی کو کوئی اہم اطلاع دے رہا ہو۔ اس وقت بھی وہ فوٹوگراف اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اصولی طور پر تو مجھے اُس شخص سے خوفزدہ ہونا چاہئے تھا مگر میری دلچسپی اُس میں رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اُس کی بھی دلچسپی بڑھے اور وہ یونہی میرا پیچھا کرتا رہے اور مجھے واچ کرتا رہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ شاید اس طرح میرا باہری دنیا میں کسی سے کوئی مبہم سا ہی سہی تعلق قائم ہو جائے۔ شاید اس قسم کے مبہم سے تعلق سے ہی کوئی راستہ نکل آئے۔

پھر ایک روز میں بازار گئی تو میری نگران عورت ساتھ نہیں تھی۔ محافظ ہی میرے ساتھ تھا اور یہ محافظ مجھ پر اعتماد کرتا تھا۔ ابھی میں مارکیٹ میں داخل ہی ہوئی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میرا نام لے کر آواز دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی آدمی میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی۔ وہ آدمی میرے قریب آیا تو اس نے بڑے شائستہ انداز میں سلام کیا اور مجھے سوالیہ نشان بنا دیکھ کر بولا۔

”آپ میرے منہ سے اپنا نام سن کر پریشان نہ ہوں مجھے اپنا ہمدرد اور دوست ہی سمجھیں۔ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں تقریباً ایک سال سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں“۔ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے اُسے روک دیا۔

”یہاں نہیں کسی محفوظ جگہ چلو۔ میں نے کہا اور پھر ہم مارکیٹ میں نسبتاً غیر آباد حصے میں آ گئے۔ ”جی، اب

کہیے۔ آپ کون ہیں اور کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟''

''میرا نام ماجد ہے''۔ اس نے کہا۔ ''اور میں 18 سال سے دبئی میں مقیم ہوں۔ میرے بیوی بچے بھی یہیں ہیں۔ پاکستان میں میرے ایک پھوپھی زاد ہیں انہوں نے مجھے آپ کا فوٹوگراف بھیجا تھا''۔ اُس نے میرا ایک فوٹو میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکی کو تلاش کرو، یہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میں یہاں کی ہر گلی کوچے سے واقف ہوں۔ میں نے آپ کی تلاش شروع کر دی اور پھر ایک سال کی خاک چھاننے کے بعد میں نے نہ صرف آپ کو پالیا بلکہ آپ کے بارے میں ہر معلومات حاصل کر لی ہیں''۔

''آپ مجھے کیوں تلاش کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ آپ کو شیخ صالح کی قید سے رہائی دلواؤں جس میں آپ کو طارق بٹ پھنسا کر چلا گیا ہے''۔ اس کی اس بات پر میں حیران رہ گئی تو گویا کہ ماجد ہر بات جانتا تھا۔

''آپ جانتی ہیں طارق بٹ کون ہے؟'' اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''اگر جانتی تو اُس کے جال میں نہ پھنستی''۔ میں نے کہا۔ طارق بٹ کے نام پر میرا خون کھول اٹھا۔

''طارق بٹ بہت بڑا فراڈیا ہے۔ عورتوں کا سمگلر ہے۔ بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنساتا ہے کسی کو ملازمت کا دھوکا دے کر، کسی کو شادی کا جھانسا دے کر دبئی لاتا ہے اور اُن کو بیچ کر رقم لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس اُس کے پیچھے ہے جلد ہی وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا''۔

کیا آپ مجھے اس قید سے رہائی دلا سکتے ہیں؟'' میں نے امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اسی لئے تو میں آپ کو ایک سال سے تلاش کر رہا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''اب آپ بے فکر ہو جائیں اس قید سے آپ کی رہائی قریب ہے ان شاء اللہ، بہت جلد آپ اپنے پیاروں میں ہوں گی''۔ اس کی اس بات پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ یہ سب کیسے کریں گے اور کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہ سب کیسے کروں گا یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں رہی بات کہ کیوں کر رہا ہوں تو یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے ایک کزن ہیں انہوں نے مجھے یہ کام سونپا ہے اس کے تمام اخراجات بھی وہی برداشت کر رہے ہیں''۔

''کون ہے وہ مہربان اور کیوں ایسا کر رہے ہیں''۔ میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے بتانے کی اجازت نہیں بس آپ اس چنگل سے آزاد اور اپنے گھر میں جلد جائیں۔ اس بارے زیادہ نہ سوچیں مجھے اجازت دیں میں اب آپ کو اُس دن ہی ملوں گا جس دن آپ کو واپس پاکستان جانا ہو گا''۔ پھر وہ مجھے حیران اور پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اس ملاقات کے تقریباً ایک ماہ بعد ایک روز شیخ صالح نے مجھے بلوایا جب میں وہاں پہنچی تو شیخ صالح کے پاس چھ سات آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ میرے آنے سے پہلے اُن کی میٹنگ ہو چکی تھی اور ہر چیز طے پا گئی تھی۔ شیخ صالح نے مجھے کہا کہ آپ کے کاغذ بن گئے ہیں اور ہر معاملہ طے پا گیا ہے اور وہ جو شخص آپ کو یہاں لایا تھا، گرفتار ہو چکا ہے۔ آپ اپنی تیاری کر لیں، چند روز بعد ضروری قانونی کارروائی کے بعد آپ واپس پاکستان جا سکیں گی۔ شیخ صالح کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

''میرا نہیں شکریہ ان کا ادا کریں جن کی کوششوں سے آپ کی مشکل دور ہوئی ہے''۔ اس نے ماجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماجد اٹھ کر میرے پاس آیا اور میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ اللہ کا شکر ادا کریں میرا نہیں۔

اس کے بعد تقریباً پندرہ روز تک کچھ قانونی کارروائیاں ہوتی رہیں اور پندرہ روز بعد ماجد اور شیخ صالح مجھے ائرپورٹ پر چھوڑنے آئے اور شیخ صالح نے مجھے بہت سے تحفے تحائف دیئے اور ایک بہت بڑی رقم میرے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں منتقل کر دی اور مجھے کہا کہ اگر آپ کا دل چاہے تو پاکستان جا کر اپنے گھر والوں سے مل کر آپ واپس آنا چاہو تو واپس آ سکتی ہو، مجھے بہت خوشی ہو گی۔ مجھے فون کر دینا تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا ہے، آپ اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لا سکتی ہیں اس کی تعلیم و تربیت کے اخراجات سب کچھ میرے ذمہ ہوگا۔

یوں میں اُن سے رخصت ہو کر جہاز میں بیٹھی اور یادوں کا سفر شروع ہوا مگر تمام سفر کے دوران میں اُس تیسرے شخص کے بارے میں سوچتی رہی جس نے سامنے آنا بھی پسند نہ کیا اور میرا نجات دہندہ بن گیا۔ مگر میں کوشش کے باوجود اُس تک نہ پہنچ سکی۔ لاہور ائرپورٹ پر اتری تو میری ساری فیملی وہاں میرے استقبال کے لئے موجود تھی۔ گویا کہ میرے گھر والوں کو پہلے ہی اطلاع دی جا چکی تھی۔ میں اپنی بیٹی سے مل کر خوب روئی، میرے سب گھر والے بہت خوش تھے، میں بھی خوش تھی اور پھر اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ تقریباً چار ماہ ہو گئے تھے مجھے پاکستان آئے ہوئے کہ ایک روز میرے بھائی نے مجھے کہا کہ ایک رشتہ آیا ہے، تم دیکھ لو اگر رضامند ہو تو ہاں کر دو۔

''نہیں بھائی! مجھے کسی کو نہیں دیکھنا اگر آپ کو پسند ہے تو میری طرف سے ہاں ہی سمجھیں''۔

''ہاں، مجھے تو پسند ہے لیکن عمر تھوڑی سی زیادہ ہے''۔ فوراً ہی میرا ذہن رضا کی طرف گیا تب مجھے یاد آیا کہ تقریباً چار ماہ سے زیادہ وقت گزر گیا ہے پاکستان آئے اور میں نے رضا سے رابطہ نہیں کیا۔

چند روز بعد بھائی نے مجھے کہا کہ آج مہمان آ رہے ہیں، دیکھ لو اور اگر پسند ہو تو آج ہی نکاح کر دیا جائے۔ شام کے وقت میرے اندازے کے مطابق رضا اپنی دو عدد بہنوں کے ہمراہ ہمارے گھر میں داخل ہوا۔

اور یوں میں رضا کے نکاح میں آ گئی۔ رضا بیاہ کر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ رضا کی بیٹیاں بڑی خوش تھیں۔ میں نے رضا کے گھر کو آباد کرنے کے لئے ہر طرح کا خیال رکھا۔ رضا کے بیٹے کو ماں کا پیار دینے کی کوشش کی۔ بچیوں کے لئے ہر ممکن ماں کا رول ادا کیا۔

آج میں زندگی کی جس سٹیج پر ہوں وہاں میرے پاس صرف یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ دبئی والے واقعہ کو 24 سال گزر چکے ہیں۔ رضا کو اس دنیا سے رخصت ہوئے 12 سال ہو گئے ہیں، رضا کا میرا تقریباً 12 سال کا ساتھ رہا۔ اس دوران میں نے رضا کے بیٹے کو جنم دیا جس کا نام عابد رضا رکھا گیا۔ رضا کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد میں نے رضا کے بیٹے گوہر کی اور دوسرے بیٹے عابد رضا کی دل و جان سے نگہداشت کی اور تربیت کی۔ رضا کی بچیوں کی اچھے گھرانوں میں شادیاں کیں۔ بڑی بیٹی کی شادی تو رضا اپنی زندگی ہی میں کر گیا تھا۔ جبکہ رضا کا بیٹا گوہر فوج میں لیفٹیننٹ ہے اور عابد رضا پولیس میں انسپکٹر ہے۔ رضا نے ساری زندگی مجھے نہ بتایا کہ وہ تیسرا شخص کون تھا۔ مگر میں نے اُس کی خاندانی البم میں ماجد کی تصویر دیکھ لی تھی اور جان گئی تھی کہ وہ تیسرا شخص رضا ہی تھا۔

ملفوظاتِ حضرت گفتار خان غازی علیہ ما علیہ

اگر مجنوں وغیرہ کی شادیاں ہو جاتیں تو ان کی داستان تک نہ ہوتی داستانوں میں"۔

☆ ---------- خادم حسین مجاہد

ایک دن جب حضرت نشست گاہ میں تشریف لائے تو خلاف معمول چہرہ تمتمایا ہوا تھا جرأت کر کے میں نے وجہ پوچھی تو خوش ہو کر بولے۔ "آج زوجہ نے عرصے بعد بڑی خدمت کی، ٹانگیں بھی دبائیں اور سر بھی ورنہ پہلے تو گلا دبانے کو دوڑتی تھیں"۔ ہم نے اس انقلاب کی وجہ پوچھی تو بولے۔ "سسر مرحوم کی برسی آ رہی ہے جس پر زوجہ نے مجھے قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خود تو رہائی پا گئے مگر ہمیں پھنسا گئے"۔ پھر سرد آہ بھر کر بولے۔ "زندگی کے سرکٹ میں مرد و عورت کی مثال پازیٹو اور نیگیٹو کی ہے جس کے بغیر کرنٹ نہیں چل سکتا اس لئے یہ دونوں ناگزیر تو ہیں لیکن یہ عملی زندگی میں بھی نیگیٹو اور پازیٹو ہی ہیں اس میں مرد پازیٹو اور عورت نیگیٹو ہے اور ظاہر ہے دونوں اپنی خاصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے الٹ ہیں اس لئے جب ان کو شادی کی صورت اکٹھا کیا جاتا ہے تو یہ سپارکنگ کرتے رہتے ہیں ساتھ ہی ساتھ مخالف چارج رکھنے کی بنا پر ایک دوسرے سے بے پناہ کشش بھی رکھتے ہیں جو کہ وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے بعض لوگ اسی وجہ سے نئی بیٹری لے آتے ہیں لیکن نئی کو پرانی ہونے میں دیر کتنی لگتی ہے"۔

حاضرین میں سے ایک نے عرض کی کہ حضرت جب زندگی کے لئے مرد عورت کا ساتھ ناگزیر ہے تو ذرا رہنمائی کر دیں کہ کون کون سی خوبی دیکھ کر عورت سے شادی کی جائے۔ حضرت نے گھور کر سائل کی طرف دیکھا اور بولے۔ "انسان جتنی بھی خوبیاں دیکھ کر جیسی بھی عورت سے شادی کر لے بعد میں وہ ایک جیسی ہی نکلتی ہیں اس لئے شادی کرنی ہو تو بس کر لینی چاہئے زیادہ تحقیق و تفتیش یا تلاش و جستجو بے فائدہ ہے۔ ویسے تو عقل مند آدمی کبھی شادی نہیں کرتا لیکن بیوقوفی عقل مند آدمی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے کہ میں آپ کے سامنے اس کی زندہ مثال ہوں تو اگر عقل مند آدمی شادی کر لے تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے البتہ اگر کوئی بے وقوف شادی کر لے تو اسے آہستہ آہستہ عقل آنا شروع ہو جاتی ہے اس لئے تمہیں ضرور شادی کرنی چاہئے"۔

دوسرے سائل نے عرض کی۔ "شادی کے بعد میاں بیوی کے تعلقات میں تلخی کیوں آ جاتی ہے؟" تو حضرت نے اس کی عقدہ کشائی یوں کی۔ "عورت چونکہ پیدائشی اداکارہ ہوتی ہے اور گھر بسانے کے لئے جو حسن سلوک وہ مرد سے کرتی ہے مرد عموماً اسے دیکھ کر فوراً شادی کی ہامی بھر لیتا ہے کیونکہ وہ اسے اس کا اصلی روپ سمجھتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ ہمیشہ ایسے ہی برتاؤ کرے گی لیکن

شادی ہوتے ہی عورت اپنا روپ بدل لیتی ہے بدلتا مرد بھی ہے لیکن وہ عورت کی طرح یوٹرن نہیں لیتا۔ ہاں، البتہ کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر کبھی کبھی اباؤٹ ٹرن ضرور لے لیتا ہے کیونکہ شادی کے بعد عورت کی اداکاری میں اور بھی نکھار آ جاتا ہے گھر پر اپنا اقتدار قائم کرنے اور پھر برقرار رکھنے کے لئے یہ وہ وہ سازشیں کرتی ہیں کہ مرد گھن چکر بن جاتا ہے۔ اگر وہ ماں اور بہنوں کی سنے تو سارے عیب بیوی میں نظر آتے ہیں اور اگر بیوی کی سنے تو گھر میں اس سے زیادہ مظلوم اسے کوئی اور دکھائی نہیں دیتا کیونکہ دونوں طرف عورتیں ہی ہوتی ہیں جو اسے حقیقت کا پتا لگنے ہی کب دیتی ہیں۔ اصلی مظلوم تو وہ مرد ہوتا ہے جو شادی سے قبل ان پریشانیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ مشترکہ سلطنت میں عورت اگر حکومت قائم نہ کر سکے تو فطری سیاستدان ہونے کی بنا پر علیحدگی پسند تحریک چلا دیتی ہے تاکہ اُدھر تم اِدھر ہم والے سیاستدانوں کی طرح اپنی الگ حکومت بنا سکے اور اکثر وہ اپنے مشن میں کامیاب بھی رہتی ہے لیکن اس سارے بکھیڑے میں مرد و عورت کے تعلقات میں وہ پہلے والی مٹھاس باقی نہیں رہتی''۔

تیسرے سائل نے عرض کی۔ ''کہا جاتا ہے کہ مرد و عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے؟'' تو حضرت نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ مرد و عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ یہ موٹر کے پہیوں کی طرح ایک ہی گیج کے ہوں یہ ٹریکٹر کے چھوٹے بڑے پہیوں کی طرح بھی ہو سکتے ہیں بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو عموماً ایک پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے اور دوسرا پھول کر ٹریکٹر کے پہیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر گاڑی چلتی نہیں بلکہ گھسٹتی ہے اور ٹائر بیکار ہو جاتے ہیں۔ نئے ٹائر ڈلوانا اکثر آسان نہیں ہوتا اس لئے گاڑی اسی طرح گھسیٹنا پڑتی ہے۔ گاڑی کو اس طرح گھسیٹنا بھی ایک فن ہے اکثر شوہر جس کے ماہر ہو جاتے ہیں اور جو ماہر نہیں ہوتے وہ گاڑی سے باہر ہو جاتے ہیں''۔

چوتھے سائل نے پوچھا۔ ''گھر بسانے یا بگاڑنے میں زیادہ کردار کس کا ہوتا ہے؟'' حضرت نے فرمایا۔ ''اس میں سب سے اہم کردار عورت کا ہوتا ہے اور عورت میں بھی اس کی زبان سب سے زیادہ اہم ہے زبان کا مطلب یہ نہ سمجھ لینا کہ عورت زیادہ زبانیں جانتی ہو تو گھر بسنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ عورت کے لئے ایک ہی زبان کافی بلکہ بہت کافی ہوتی ہے۔ اگر وہ میٹھی ہو تو پورا گھر اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور گھر ہمیشہ متحد رہتا ہے اور اگر یہ کڑوی ہو تو سب پناہ مانگتے ہیں اور اکثر اس کی وجہ سے گھر کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک اکٹھے رہنے والے بھائی جن کے اتفاق و اتحاد کی لوگ مثالیں دیتے ہیں، بیویاں آتے ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں رہتے لیکن مزے کی بات یہ کہ بیویاں آپس میں شیر و شکر ہوتی ہیں۔ سیاستدانوں کی طرح عوام کو لڑائے رکھتی ہیں، اقتدار قائم رکھنے کے لئے''۔

پانچویں سائل نے حجت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر عورت اتنی ہی خطرناک اور بُری چیز ہے تو شاعروں نے اس کی تعریف میں دیوان کے دیوان کیوں بھر دیئے ہیں اور عشاق کیوں دیوانے ہو جاتے ہیں؟'' حضرت نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاعر ہی تو قوموں کی تباہی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ عورت کی خوبیوں کے بیان میں جس قدر مبالغہ کرتے ہیں جھوٹ کا لفظ تو اس کی ادنیٰ سی نمائندگی بھی نہیں کرتا۔ عورت کا دماغ خراب کرنے میں اور عشاق کو دیوانہ کرنے میں شاعروں کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ عام طور پر ان شعراء اور عشاق نے عورتوں کو صرف دور سے ہی دیکھا ہوتا ہے

اس لئے ان کی باتیں دور کے ڈھول سہانے کی حیثیت رکھتی ہیں اکثر شعراء کی جب شادی ہو جاتی ہے تو وہ حقیقت سے دوچار ہوتے ہی اپنی پچھلی شاعری سے تائب ہو جاتے ہیں اور بقیہ عمر المیہ شاعری کر کے گزارتے ہیں اور جن عشاق کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ عشق اور دیوانگی بھول کر اچھے خاصے فرزانے ہو جاتے ہیں تب ان سے عورت کے بارے میں رائے لو تو وہ میرے ہم خیال ہی ثابت ہوں گے۔ اگر مجنوں وغیرہ کی شادیاں ہو جاتیں تو ان کی داستان تک نہ ہوتی داستانوں میں"۔

چھٹے سائل نے کہا۔ "آپ کی زیادہ باتیں ہوائی ہوتی ہیں، اپنے مؤقف پر کوئی نقلی ثبوت بھی دیا کریں"۔ حضرت نے پہلے تو اس منہ پھٹ کی گستاخی پر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا پھر بولے۔ "یہ باتیں ہوائی نہیں بیٹا تجرباتی ہیں۔ جب تمہارا پالا عورت نامی بلا سے پڑے گا تو تمہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ جہاں تک نقلی ثبوت کا تعلق ہے تو یاد رکھو قرآن مجید میں عورتوں کے فریب کو عظیم فریب کہا گیا ہے اور یہ بیان وہاں ہے جہاں زلیخا کے یوسفؑ کو بہکانے کی کوشش کرنے کے واقعہ کا ذکر ہے پھر داناؤں کے اقوال ہیں جو تم سنتے ہی رہتے ہو۔ اس کے علاوہ ہر زبان میں محاورے ضرب الامثال اور کہاوتیں موجود ہیں جیسے عورت کی عقل گدی کے پیچھے ہوتی ہے۔ Beauty has no brains عورت کی کوئی زبان نہیں ہوتی، بی جمالو، ٹسوے یا مگرمچھ کے آنسو بہانا، لگائی بجھائی کرنا اور پھر غیبت، حسد، چغلی جیسی صفات بھی عورت سے منسوب ہیں بھی عورتیں ایسی نہیں ہوتیں مگر اکثریت کا حال ہی ہے اب اسی پر اکتفا کرو کہ مجھے گھر بھی جانا ہے"۔ یہ کہہ کر حضرت نے محفل برخاست کر دی۔

◆◆◆

کشمیر کی تاریخ کا اہم دن
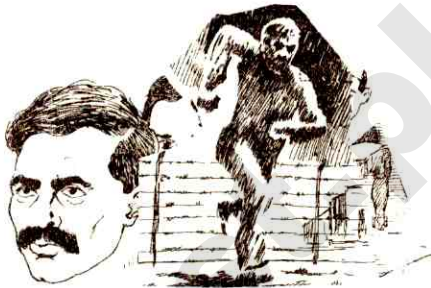
13 جولائی 1931ء کا یہ واقعہ تحریک آزادی کشمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ کشمیر میں اس واقعہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو حاصل ہے۔

☆ 0301-3005908, 0345-8599944 گلزار اختر کاشمیری

قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے مسلمانوں میں اضطراب کی شدید لہر اٹھی۔ اس انقلاب آفریں لہر سے اندازہ ہو گیا کہ اب بہرحال انگریز چلا جائے گا، تاہم اس کے ساتھ ہی یہ خدشات جنم لینے لگے کہ انگریز کے جانے کے بعد ہندو اپنی اکثریت کی وجہ سے سارے ہندوستان کے اقتدار پر قابض ہو جائے گا۔ انگریز نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا، اس لئے معتوب مسلمان ہی تھے، ہندوؤں نے انگریز سے ساز باز کر لی تھی۔ انگریزوں نے ہندو کو اس لئے ساتھ ملایا تاکہ اپنے اقتدار کو دوام بخش سکیں۔ اس اتحاد کا قدرتی نشانہ مسلمان بن گئے۔ انگریز مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے بعد ان کی تہذیب کے نشان مٹاتے رہے مثلاً عربی اور فارسی اس سے پہلے سرکاری زبانیں تھیں، ان کی جگہ پہلے انگریزی اور پھر ہندی نے لے لی۔ مسلمان انگریزی سے نفرت کرتے تھے۔ اس کو پڑھنے لکھنے اور بولنے سے نفرت کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے سرکاری

محکموں میں چھوٹے ملازمین بھی ہندو بھرتی ہوئے۔ ہندوؤں نے بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے مسلمانوں کو خوب نشانہ بنایا اور ایک ہزار سالہ غلامی کا انتقام لیا۔

مسلمانوں کی ہندوؤں سے نفرت تحریک آزادی کی بنیادوں میں شامل تھی۔ آزادی کی تحریک میں ہندو کانگریس کا کردار بھی اہم تھا۔ جس نے قومیت کا تصور دیا اور کہا کہ برصغیر کے رہنے والے سب ایک قوم ہیں لیکن قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے دوقومی نظریہ پیش کیا اور کہا۔ قومیں وطن سے نہیں مذہب، زبان، بودوباش اور معاشرتی زندگی کے خدوخال سے بنتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا رہن سہن جدا، زندگی گزارنے کا مقصد جدا، عقیدہ اور مذہب جدا غرض یہ کہ کوئی قدر بھی مشترک نہیں۔ اس لئے برصغیر میں دوقومیں آباد ہیں۔ اگر ان کو آزادی مل رہی ہے تو دوقومی نظریے کی وجہ سے ان کی تقسیم عمل میں آنی چاہئے۔ کانگریسی مسلمان ہندو کی فریب کاری کو نہ سمجھ پائے۔ تاہم مخلص مسلمانوں نے ہندوؤں کا تعصب دیکھ لیا تھا۔ کشمیر سمیت برصغیر میں جو ہندو ریاستیں تھیں ان میں ہندو حکومتوں کا کردار اور طرز حکومت بھی دیکھ لیا تھا۔

کشمیر میں ڈوگرہ حکومت نے اپنی مسلمان رعایا پر جابرانہ نظام مسلط کر رکھا تھا۔ ہندو اور مسلمان کے لئے الگ الگ قانون تھا۔ کشمیر میں زمین کا مالیہ انگریز حکومت کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھا۔ شالیں بنانے پر علیحدہ ٹیکس اور درآمد کرنے پر علیحدہ ٹیکس تھا۔ مقامی صنعتیں مسلمانوں کی ہی تھیں جو ٹیکس سے بری طرح متاثر ہوئیں۔ کارخانہ دار پر الگ اور کاریگروں پر علیحدہ ٹیکس تھا۔ قالین کی برآمد پر پچاس فیصد ٹیکس لگ گیا۔ قصاب، تندوری، بڑھئی، میسن، کشتی کے ملاح حتیٰ کہ طوائفوں پر بھی ٹیکس لگا دیا۔ سیاحوں کے ساتھ پورٹر سامان اٹھاتے۔ ان کو بھی نصف آمدن ٹیکس میں دینا پڑتی تھی۔ نمبردار مالیہ لیتے ہوئے اتنی سختی کرتا تھا کہ جو آدمی بروقت مالیہ ادا نہ کر سکے اس کے سر پر پتھر کی کنکری رکھ کر اوپر بھرا ہوا پانی کا گھڑا رکھا جاتا تھا۔ اسے کئی کئی گھنٹے تک اسی اذیت سے گزارا جاتا۔ اس کے نتیجے میں کنکر سر کی جلد میں ہڈی تک اتر جاتا اور بندہ لہولہان ہو جاتا تھا۔

1970ء میں ایک بزرگ نے اپنے والد کا واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ والد صاحب کی پٹواری سے ناراضگی ہو گئی۔ پٹواری نے دشمنی میں ایک سو کنال زمین میرے والد صاحب کے نام الاٹ کر دی تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ مالیہ دینا پڑے۔ نمبردار نے بتا دیا کہ اس دفعہ تمہارا مالیہ بڑھ گیا ہے تو میرے والدؒ گھر سے تین بکریاں اور ایک بکرا کھولا اور پیدل مری لے گئے اس لئے کہ اگر مقامی طور پر فروخت کرتے تو چاروں کی قیمت صرف ایک روپیہ ملتی۔ مری میں ایک روپیہ فی کس حساب سے فروخت کر کے مالیہ ادا کیا۔ ٹیکس وصول کرنے والے سپاہی اور عملے کے لوگ بہت جبر سے کام لیتے۔ سرکاری اہلکار ٹیکس کے ساتھ رشوتیں بھی وصول کرتے۔ جہاں کوئی اہلکار آتا تمام محلے سے مرغے جمع کئے جاتے اور جو کوئی نہ دے اسے سخت سزا دی جاتی۔ یہ نذرانہ کسی شمار میں نہیں ہوتا تھا۔ بس حاکم کی آمد پر سختی سے بچنے کی یہ رشوت تھی۔ مسلمانوں سے زمینیں چھین لی جاتیں اور یہ اپنے پنڈتوں، ڈوگروں میں بطور جاگیر دے دی جاتیں۔ مسلمانوں میں سے صرف اس آدمی کو جاگیر ملتی جو حکمرانوں کا بہت ہی وفادار ہوتا اور ان سے مل کر عام مسلمانوں کا خوب استحصال کرتا تھا۔ مسلمان کسان جب فصل کاٹتے تو اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ ایک حصہ حکمرانوں کا دوسرا پنڈتوں کا اور تیسرا زمیندار کا ہوتا تھا۔ زمیندار کے پاس ناکافی غلہ بچتا اور سردی کے یخ بستہ موسم میں اس کے اہلِ خانہ کو بڑی مشکل سے گزارا کرنا

پڑتا۔ اکثر گھروں میں فاقے رہتے تھے۔ مسلمان مزدور سے کوئی پنڈت یا ڈوگرہ کام کرواتا تو اجرت دینے سے انکار کر دیتا۔ سرکاری طور پر مسلمان مزدوروں سے بیگار لی جاتی اور کئی کئی مہینے وہ بیگار پر رہتا تھا۔ جب گھر سے اسے نکالا جاتا تو زیر کفالت بچے اور عورتیں رو رو کر سرکاری اہلکار کے پاؤں پکڑ لیتیں۔ انہیں خدشہ ہوتا تھا کہ شاید یہ واپس نہیں آسکے گا۔ یخ بستہ سردی اور طوفانی برف باری میں کہیں مر جائے گا۔ غربت کے مارے 99 فیصد لوگوں کے پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ لوگ دھان کی گھاس کے خود جوتے بناتے جسے پہاڑی زبان میں ''پول'' کہتے ہیں یہ جوتا زیادہ سے زیادہ تین چار دن استعمال ہوسکتا تھا۔ ہوائی چپل کی مانند اوپر سے پاؤں ننگا ہوتا تھا۔ یہ جوتے برف میں پہن کر سفر کرنا انتہائی مشکل ہوتا تھا۔ اکثر مزدور ننگے پاؤں سفر کرتے اور بیماریوں کا شکار ہو کر راستے میں ہی مر جاتے تھے۔

جبری محنت یعنی بے گار کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ ایک انگریز سیاح مسٹر ناہیٹ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔ ان مظلوم لوگوں کے قافلے ڈیڑھ ڈیڑھ من اجناس سر پر اٹھا کر چلچلاتی دھوپ میں استور سے گلگت جانے والے ویران راستوں پر چل رہے ہوتے تھے۔ یہ منظر سائبیریا کی سڑکوں کی یاد دلاتا ہے۔ یہ لوگ مجرم نہیں بلکہ مسلمان مزدور ہوتے تھے۔ مہاراجہ کی بے ضرر رعایا۔ کئی کئی دنوں کی بھوک اور پیاس سے نڈھال یہ مزدور خوش قسمتی سے ہی اپنی منزل پر پہنچتے تھے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا۔ ریاست میں باہر سے تجارتی روابط کم تھے۔ مظفر آباد، باغ اور پونچھ کے لوگ مری سے سامان خریدتے، کوہالہ سے نیچے باسیاں کے قریب کشتی جس کو بیٹری کہتے تھے، کے ذریعے پار لے جاتے تھے۔ پار جانے کا کرایہ ایک دمڑی ہوتا تھا جو ایک پیسے سے بھی کم مالیت کا سکہ تھا، مگر لوگ اس کو بھی مہنگا تصور کرتے تھے۔ مری سے سامان خرید کر بیٹری کے ذریعے دریا عبور ہوتا اور وہاں سے کھودر کے راستے لوگ باغ، راولاکوٹ جاتے تھے۔ جموں کے لوگ پنجاب سے جا کر خریداری کرتے مگر رقم ناپید تھی۔ قحط کے زمانے میں فاقہ کشی سے تنگ لوگوں نے زندگی بچانے کے لئے دودھ دینے والی گائیں ذبح کر کے کھائیں جس پر ان کے خلاف مقدمات قائم ہو گئے۔ بعض لوگوں کو ہمیشہ کے لئے ہری پربت جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس وقت گائے کو ذبح کرنے پر عمر قید کی سزا دی جاتی تھی اور کسی شخص کو زبان ہلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی زمانے میں کوئی برٹش افسر سیاحت کے لئے کشمیر آیا لوگوں نے اس کے ساتھ مہاراجہ کے رعایا کے ساتھ سلوک پر بات کی اور اس کی اطلاع سرکاری اہلاروں کو ہوگئی۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ان کی جائیداد ضبط کر دی گئی اور انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ 1924ء میں وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کے دورہ کشمیر کے موقع پر مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں مہاراجہ کے ظلم وستم پر احتجاج کیا گیا تھا۔ اس میں حسب ذیل مطالبات پیش کئے گئے:۔

1- کشمیری عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح کے حقوق بھی حاصل نہیں، ان کو انسانیت کے بنیادی حقوق دلوائے جائیں۔

2- ریاست میں غیر ملکیوں کے بجائے ریاستی افسر مقرر کئے جائیں۔ اس لئے مہاراجہ ہندوستان سے ہندو افسر لایا تھا۔

3- وہ شہری آزادیاں بحال کی جائیں جس طرح ہندوستانی عوام کو حاصل ہیں۔ ملاحظہ ہو میر محمد کشفی کی کتاب ''کشمیر ہمارا ہے'' لارڈ ریڈنگ کے کہنے پر مہاراجہ نے ان مطالبات پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جو تین سرکاری افسروں پر مشتمل تھی۔ کمیٹی نے اپنے پہلے ہی

اجلاس میں یہ فیصلہ دے دیا کہ شکایات غلط ہیں اور ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ وائسرائے کے جانے کے بعد یادداشت پر دستخط کرنے والوں کو تشدد کے ذریعے دبا دیا گیا۔ بعض لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر کے ان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ بعض لوگوں کو ریاست بدر کر دیا گیا۔

1929ء میں وزراء کونسل کے ممبر سر ایلبین بینرجی نے ریاست کے ناگفتہ بہ حالات کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ لاہور پہنچ کر بینرجی نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو جو بیان دیا، اس نے کشمیر کی ساری صورت حال کو ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ ریاست جموں و کشمیر میں صورت حال اس قدر خراب تھی دیہات کے مسلمانوں کی اکثریت غربت، افلاس، معاشی حالات کے بوجھ تلے پس کر رہ گئی تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے قتل کا صرف دو روپے جرمانہ اور گائے ذبح کرنے پر عمر قید کی سزا دی جاتی تھی۔ حکومت اور رعایا کے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔ شکایات کے ازالے کی کوئی صورت نہ تھی، عوام کی ضروریات اور ان کی مظلومیت سے انتظامیہ کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مہاراجہ کی انتظامیہ کے کچھ لوگوں نے سر ایلبین بینرجی کی پریس کانفرنس کے جواب میں بیانات دیے کہ مہاراجہ کے خلاف ذاتی عداوت کی وجہ سے یہ پریس کانفرنس کی گئی، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کی تفصیل چوہدری غلام عباس کی کتاب ''سیاسی کشمکش'' صفحہ نمبر 53 پر ملاحظہ ہو۔

ان مظالم سے تنگ آ کر جموں میں چند پڑھے لکھے نوجوانوں نے ایک تنظیم بنائی جس کا نام ''ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن'' رکھا۔ چوہدری غلام عباس بھی ان نوجوانوں میں شامل تھے۔ یہ تنظیم کوئی باقاعدہ سیاسی تنظیم نہ تھی لیکن جموں کے مسلمانوں کے مخصوص مسائل حل کرانے اور ان میں اپنے حقوق کا شعور بیدار کرنے میں اس تنظیم نے اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح سری نگر میں بھی حالات ایسے ہی تھے۔ وادی کا علاقہ دور دراز ہونے کی وجہ سے یہاں سیاسی کام دیر سے شروع ہوا۔ وادی میں چند پڑھے لکھے لوگ جو ہندوستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ کر آئے تھے۔ ہندوستان میں کچھ عرصہ قیام سے ان میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور ان کو سیاسی جدوجہد کے طریق کار سے واقفیت ہوئی۔ انہوں نے سوچا کہ ریاست میں برٹش انڈیا کی طرح سیاسی آزادی حاصل نہیں، اس لئے نوجوانوں کو جدوجہد کرنی چاہئے۔ سیاسی کام کی ابتدا کے لئے بظاہر بے ضرر سی ''فتح کدل ریڈنگ روم پارٹی'' سے کام شروع کیا۔ سری نگر کے مسلم نوجوان اکٹھے ہوتے۔ ریاستی سیاست اور مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے۔ اس گفتگو اور باہمی مشاورت نے نوجوانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ وہ گھنٹوں کشمیری مسلمانوں کے مسائل کو کم کرنے اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوششوں پر بحث کرتے۔ اس طرح ریڈنگ روم پارٹی ایک طرح ان نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا ذریعہ بن گئی۔ ان نوجوانوں کو باقاعدہ تنظیم میں منظم کرنے کا کام جن لوگوں نے کیا، شیخ محمد عبداللہ بھی ان میں شامل تھے۔

شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کو سیاست میں آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں آ ہوا تھا کہ جموں میں دو واقعات نے مظلوم اور سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگا دیا۔ ان واقعات نے نہ صرف سیاست کا رُخ موڑ دیا بلکہ اس کے دوررس نتائج مرتب ہوئے۔ ان میں پہلا واقعہ جموں میں خطبہ عید کی بندش کا ہے۔ یہ 29 اپریل 1931ء کو پیش آیا۔ عید کے خطبے میں امام مسجد فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کر رہے تھے کہ ڈوگرہ ڈی آئی جی چندر رام کو یہ گمان ہوا کہ فرعون کا نام لے کر ڈوگرہ حکمران ہری سنگھ پر تنقید کی جا رہی ہے اس نے

انسپکٹر کھیم چند کو حکم دیا کہ وہ عیدگاہ میں داخل ہو کر یہ خطبہ بند کروائے۔ انسپکٹر نے جب امام صاحب کو خطبہ بند کرنے کا حکم دیا تو مسلمان احتجاج کے لئے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ بپھرے ہوئے مجمعے کو سنبھالنا مشکل تھا۔ پولیس بھاگ گئی۔ مسلمانوں نے پہلی دفعہ اسی دن مہاراجہ کے خلاف جلوس نکالا پھر جلسہ عام ہوا جس میں علماء کرام کے علاوہ چوہدری غلام عباس نے بھی تقریر کی۔ مقررین نے اس واقعے کی مذمت کی۔ لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ پھر ہر روز جلسے اور جلوس نکلنے لگے۔ جموں کے مسلمانوں نے انسپکٹر کھیم چند کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ مجسٹریٹ ہندو تھا اس نے فیصلہ دیا کہ خطبہ نماز عید کا جزو نہیں ہے۔ اس فیصلے پر مسلمان زیادہ مشتعل ہو گئے حکومت کو احساس ہو گیا کہ انسپکٹر کی غلطی کی وجہ سے کس قدر نقصانات ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مجسٹریٹ کے اس فیصلے کے خلاف حکومت نے خود ہائی کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کی۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ خطبہ نماز عید کا جزو ہوتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد انسپکٹر کھیم چند کو معطل کر دیا گیا۔ یہ جموں کے مسلمانوں کی پہلی فتح تھی۔ ”چوہدری غلام عباس سیاسی کشمکش“ صفحہ نمبر 50-51 میں لکھتے ہیں۔

”حقیقت یہ ہے کہ یہ دن مسلمانوں کے لئے یوم نجات کا درجہ رکھتا ہے۔ صدیوں کے دبے ہوئے جذبات سمندر کے طوفان کی طرح دلوں میں موجزن ہو گئے۔ ان کی دیوانگی و وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ آج مسلمانوں کو آسیب ہو گیا ہے۔“ دوسرا واقعہ بھی ان ہی دنوں پیش آیا۔ ایک ڈوگرہ کانسٹیبل لبھو رام نے سینٹرل جیل جموں میں قرآن پاک کی بے حرمتی کی۔ اس حرکت سے سینٹرل جیل میں مسلمان قیدیوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ لوگ ناموس قرآن پر جان دینے پر تیار ہو گئے۔ جیل سے نکل کر یہ خبر جموں اور وہاں سے نکل کر ریاست کے دوسرے مقامات تک پہنچی۔ جہاں پہنچی وہاں آگ لگاتی گئی۔ ضلع پونچھ، میر پور، جموں اور سری نگر میں جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ جموں میں روزانہ جلسے جلوس میں یہ مطالبہ ہوتا کہ لبھو رام کو توہین قرآن پر سزا دی جائے اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر کے احترام کی ضمانت دی جائے۔ ان مطالبات کے علاوہ مستقل نوعیت کے دیگر مطالبات کا اضافہ ہو گیا۔ یہ تحریک ینگ منز ایسوسی ایشن کے ذریعے پوری ریاست میں پھیل گئی۔ اسی دوران ینگ منز کا نام تبدیل کر کے مسلم ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ چوہدری غلام عباس اپنی کتاب کشمکش صفحہ نمبر 53 میں لکھتے ہیں ”اس زمانے میں میر واعظ کشمیر کو مسلمانوں میں پیغمبر کے بعد سب سے مقدس انسان تصور کرتے تھے۔ میر واعظ مولانا یوسف اس وقت نئے نئے میر واعظ بنے تھے۔ ان کے دل میں حرارت ایمانی نے جوش مارا۔ میر واعظ کی آواز مسلمانوں کے لئے جادو کا اثر رکھتی تھی۔ ان کے حکم کی خلاف ورزی گناہ سمجھی جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے شیخ محمد عبداللہ کی معاونت میر واعظ کے خاندان نے قبول کر لی۔ چند ہی دنوں میں توہین قرآن کے واقعہ نے کشمیری مسلمان کی روح کو تڑپا دیا اور اس کے خون کو گرما دیا۔“

شہر جموں میں جوش و خروش اور حکومت کے لئے جذبہ حقارت و نفرت روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ایک دن اچانک مسٹر ویکفیلڈ جو ان دنوں مہاراجہ ہری سنگھ کا مشیر خاص تھا اور تمام نظم و نسق حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ سری نگر سے جموں پہنچ گیا۔ اس کی آمد سے دوسرے روز جمعہ تھا۔ ایسوسی ایشن نے قبل از وقت اعلان کر رکھا تھا کہ فریضہ جمعہ جموں کی شاہی مسجد میں ادا ہو گا اور بعد از جمعہ یہاں سے جلوس نکالا جائے گا۔ حکومت نے جمعہ والے دن صبح سویرے ہی پولیس کے ذریعے مسجد کو باہر سے گھیرے میں لے لیا۔ حکام پولیس اور مجسٹریٹ بھی موقعہ پر متعین کر

دیے گئے۔ اس پر ایسوسی ایشن کے ذمہ داران نے ویکفیلڈ کے نام خط لکھا۔ اس میں پولیس کو مسجد سے فوری ہٹانے کا اور مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا مطالبہ تھا۔ ویکفیلڈ نے نماز جمعہ سے قبل ہی پولیس کو ہٹا دیا اور نماز جمعہ کے بعد سرکردہ مسلمانوں کو ملاقات کے لئے بلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت کے کوئی مجاز فرد نے مسلمانوں کو بات کرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ نماز جمعہ کے بعد جلوس مؤخر کر کے مسلمانوں کا وفد مشیر حکومت سے ملنے گیا۔ تفصیلی مذاکرات کے بعد طے پایا اور ویکفیلڈ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ہلہ گلہ کرنے کے بجائے آپ ایک وفد لے کر سری نگر آئیں۔ اپنے مطالبات ضبط تحریر میں لا کر ان کے سامنے پیش کریں تاکہ اس کا کوئی حل نکالا جا سکے۔

جموں کا وفد چوہدری غلام عباس کی قیادت میں 11 جولائی کو سری نگر پہنچا۔ مؤرخہ 12 جولائی 1931ء کو مسلم ایسوسی ایشن کا ایک اجلاس رکھا گیا جس میں جموں اور وادی کشمیر کے جملہ عہدے داران مل کر مطالبات کی ایک فہرست تیار کرتے تاکہ مشیر حکومت اور مہاراجہ ہری سنگھ سے ملاقات پر یہ مطالبات پیش کئے جائیں۔ اس سے قبل مؤرخہ 25 جون 1931ء کو سری نگر خانقاہ معلی میں مسلمانان کشمیر کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں 60 ہزار مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ اس جلسے کی صدارت میر واعظ یوسف شاہ اور میر واعظ مولانا احمد اللہ ہمدانی نے کی۔ مقررین میں شیخ محمد عبداللہ خواجہ غلام احمد عشائی، آغا حسین جشاہ جلالی شامل تھے۔ جلسہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اچانک ایک نوجوان سٹیج پر چڑھا اور آتے ہی تقریر شروع کر دی اور کہا۔

"مسلمانو! اب وقت آ گیا ہے کہ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ یادداشتوں اور گزارشوں سے ظلم وستم میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور نہ ہی توہین قرآن کا مسئلہ حل ہوگا۔ مسلمانو! تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو جاؤ۔" اس نے مہاراجہ کے راج محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ جب تک یہ راج محل سلامت کھڑا ہے نہ تم پر ظلم ختم ہوگا، نہ انصاف ملے گا اور نہ ہی آزادی ملے گی"۔

اس اجنبی نوجوان کی تقریر جذبات سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں میں جوش وخروش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اس نوجوان نے ریاست کے ہندو باشندوں کے کردار پر اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے رویے پر بات کی بلکہ مہاراجہ کو بھی سخت سُست کہا اور اس کے رویے کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ اس نوجوان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ تاریخ میں اس کا نام عبدالقدیر لکھا ہے جو ایک انگریز سیاح کے ساتھ کشمیر آیا تھا۔ تقریر ختم کرنے کے بعد وہ گم ہو گیا۔ اسی شام اس کو ایک بوٹ ہاؤس سے گرفتار کر لیا گیا۔

مؤرخہ 13 جولائی 1931ء کو سینٹرل جیل سری نگر میں عبدالقدیر کے خلاف مقدمے کی کارروائی شروع ہونی تھی۔ چوں کہ عبدالقدیر کو مسلمانوں سے ہمدردی کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اس لئے فیصلہ ہوا کہ مسلمان اس مقدمے کی پیروی کریں گے۔

مؤرخہ 12 جولائی 1931ء کو گاؤ کدل کے مقام پر مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں عبدالقدیر کے خلاف سینٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت کی مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ مقدمے کی سماعت کھلی کچہری میں کی جائے۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوا کہ لوگ کل سینٹرل جیل کے سامنے جمع ہو جائیں۔ اگلے روز سینٹرل جیل میں عبدالقدیر کے مقدمے کی سماعت تھی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی لوگ جوق در جوق سینٹرل جیل کی طرف بڑھنے لگے۔ سرفروشوں کے یہ

جتھے موت سے بے خوف جان ہتھیلی پر رکھے گھروں سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سینٹرل جیل کے اردگرد لوگوں کا مجمع غفیر جمع ہو گیا۔ لوگ مطالبہ کر رہے تھے کہ عبدالقدیر پر مقدمہ جیل کے بجائے کھلی عدالت میں چلایا جائے۔ اتنے میں سیشن جج کی گاڑی جیل کے بیرونی دروازے پر پہنچی۔ اس کے لئے دروازہ کھولا گیا تقریباً 200 لوگ جیل کے دروازے سے اندر ہو گئے۔ سیشن جج نے عبدالقدیر کے وکلاء صفائی محمد عبداللہ اور سید قمرالدین سے بات کی کہ آپ لوگوں کو باہر نکلنے کی تلقین کریں۔ دونوں وکلاء نے لوگوں کو جیل کے گیٹ سے باہر جانے کے لئے کہا مگر لوگ انکاری ہو گئے۔ عین اسی وقت گورنر جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھا، اس نے مظاہرین پر فائرنگ کا حکم دے دیا۔ اس فائرنگ میں 22 افراد شہید ہو گئے۔ 13 جولائی کے روح فرسا واقعہ نے ریاست بھر میں ڈوگرہ راج کے خلاف نفرت اور حقارت کی آگ پھیلا دی۔

چوہدری غلام عباس جو اس وقعہ کے عینی شاہد ہیں لکھتے ہیں کہ گولی چلانے سے قبل لاٹھی چارج ہوا۔ لوگ مین گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ پولیس نے منتشر ہوتے ہوئے جلوس پر گولی چلائی کیونکہ تمام لاشیں جیل کے احاطے سے باہر سڑک سے اٹھائی گئیں۔ شہر میں کرفیو لگ گیا۔ شہر کو فوج کے حوالے کر دیا اور کسی بھی مسلمان کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دیا گیا۔ بے کس اور نہتے مسلمانوں کے خون سے سری نگر کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ بعض ڈوگرہ فوجیوں نے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکال کر گولی کا نشانہ بنایا۔ ان کے مال و اسباب لوٹے اور عفت مآب خواتین کی عصمت دری کی۔ سری نگر اور اردگرد کے مسلمانوں نے ایک ماہ تک ہڑتال کی۔ مسلمانوں نے اپنے کاروبار اور روزگار معطل کر کے اس تحریک کو زندہ رکھا۔ مہاراجہ نے ویکفیلڈ پر الزام لگایا کہ اس نے مسلمانوں کو بھڑکا کر یہ تحریک شروع کرائی ہے۔ اسے برطرف کر دیا گیا اور راجہ ہری کشن کول کو اس کی جگہ مسند وزارت پر بٹھایا۔

شیخ محمد عبداللہ کا کہنا تھا کہ میں سینٹرل جیل کے واقعہ میں موجود تھا۔ ایک زخمی نے دم نزع مجھ سے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب آگے بڑھنا آپ کا کام ہے۔“

13 جولائی 1931ء کا یہ واقعہ تحریک آزادی کشمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ کشمیر میں اس واقعہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو حاصل ہے۔

چوہدری غلام عباس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں اگر یہ ایک دن کیلنڈر میں موجود نہ ہوتا تو یقیناً ریاست کشمیر کی سیاسی تاریخ مختلف ہوتی۔

یہ حقیقت ہے کہ 13 جولائی کے شہداء نے اپنے مقدس خون اسلام کے لئے قرآن پاک کے تقدس کے لئے دیا۔ شہداء کے اس مقدس لہو سے گلشن کشمیر کی آبیاری ہوئی۔ ان کے زخموں سے نکلے خون کے ایک ایک قطرہ نے مسلمانوں کو نئے جذبے اور نئی توانائیاں عطا کیں۔ ڈوگرہ راج یہ نوشتہ دیوار پڑھ کر بوکھلا اٹھا کہ جس قوم میں آزادی اور حریت کا جذبہ پیدا ہو جائے اسے زیادہ عرصے تک غلام نہیں رکھا جا سکتا۔

1947ء میں کشمیر جہاد کے نتیجے میں آزاد کشمیر کا علاقہ آزاد ہوا۔ آج ایک کروڑ تیس لاکھ کشمیری مسلمانوں میں صرف 30 لاکھ لوگوں کو آزادی کی نعمت مل سکی۔ ایک کروڑ لوگ اب بھی مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے چکے ہیں مگر ظلم کی سیاہ رات ختم نہیں ہوئی اور قربانی مانگ رہی ہے۔

❖O❖

روپ متی

تاریخ کے جھروکوں سے کشید کیا ہوا ایک دلچسپ واقعہ

نسیم سکینہ صدف

سخت گرمیوں کے دن تھے، شہنشاہ جہانگیر صبح سویرے شکار کی غرض سے اپنے محل سے نکلا، شاہی فوج کا چاق و چوبند دستہ ہمراہ تھا۔ ابھی بندھیا چل کے جنگل میں داخل ہوئے ہی تھے کہ جہانگیر کی نظر ایک خوبصورت ہرن پر پڑی۔ جہانگیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، لیکن ہرن چوکڑیاں بھرتا دور بہت دور نکل گیا۔ جہانگیر مسلسل ہرن کے تعاقب میں تھا، وہ اس کوشش میں تھا کہ ہرن کو زخمی کیے بغیر پکڑ لے، لیکن یوں لگتا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی رکنے کا نام نہ لے گا۔ آخر ایک جگہ ہرن کو گھنی جھاڑیاں نظر آئیں، وہ اس طرف بھاگا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔ اب جہانگیر کو احساس ہوا کہ وہ ہرن کے تعاقب میں بہت دور نکل آیا ہے اور محافظ دستہ بھی کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

جہانگیر پسینہ میں شرابور تھا۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، لیکن دور دور تک اسے آبادی کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ سورج اپنی گرمی سے بندھیا چل کے جنگل کو بری طرح جھلسا رہا تھا۔ لُو نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پیاس کی شدت سے گھوڑے کا بھی برا حال تھا اور جہانگیر کی زبان پر تو پیاس کے مارے جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن دور دور تک اسے پانی کا چشمہ نظر نہ آیا نہ آبادی کا کوئی نشان۔ اسی عالم میں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ

کچھ فاصلے پر اسے بہت سے درخت نظر آئے۔ وہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا کہ وہاں چند مکانات بھی ہیں۔ لق ودق جنگل میں آبادی کا نشان دیکھ کر جہانگیر نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دیکھا ایک مکان کے باہر چبوترے پر چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ لڑکی کیا تھی، حسن قدرت کا ایک شاہکار تھی۔ جہانگیر گھوڑے سے اتر آیا اور لڑکی کے پاس گیا۔ لڑکی نے کھڑے ہو کر ادب کے ساتھ کہا: سلام...... پھر بولی:

''آپ مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ پسینے سے آپ کا برا حال ہے۔ آپ یہاں آرام سے چبوترے پر بیٹھیں، میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔''

لڑکی مکان کے اندر چلی گئی۔ جہانگیر چبوترے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ بندھیا چل کے اس سنسان جنگل میں بھی ایسا حسن جنم لے سکتا ہے، جسے دیکھ کر چاند بھی شرمائے۔ جہانگیر دستِ قدرت کی ان فیاضیوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی واپس آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھال تھا، جس میں ایک روٹی رکھی تھی۔ لڑکی نے یہ دونوں چیزیں جہانگیر کے آگے رکھتے ہوئے کہا: 'پہلے آپ روٹی کے چند لقمے تناول فرمائیے، کیونکہ سخت گرمی میں ایک دم ٹھنڈا پانی پینے سے نظام ہضم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آپ مسافر ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت دور سے آئے ہیں۔''

جہانگیر کو بھوک اور پیاس دونوں ستا رہے تھے۔ تاہم ایک کم عمر لڑکی سے عقل مندی کی یہ بات سن کر اس نے پہلے روٹی کے چند نوالے لیے اور پھر پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس دوران لڑکی پانی سے بھری ہوئی ایک بڑی بالٹی گھوڑے کے آگے رکھ چکی تھی۔ جہانگیر کھانا کھا کر فارغ ہوا، تو لڑکی اس کے ہاتھ دھلانے کے لیے پانی لائی ہاتھ دھلاتے ہوئے لڑکی کی نظر جہانگیر کی انگشتری پر پڑی، جس میں ایک نہایت قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا۔

ہاتھ دھلانے کے بعد لڑکی مکان کے اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بہت سے کاغذ تھے۔ وہ جہانگیر کے سامنے بیٹھ کر کچھ لکھنے لگی، جہانگیر اس کی بچگانہ حرکتیں دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اتنے میں لڑکی نے کہا:

''معزز مسافر! کیا میں آپ کا ہاتھ دیکھ سکتی ہوں؟''

جہانگیر نے اپنا دایاں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ ہاتھ دیکھ کر لڑکی پھر مکان کے اندر گئی اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ جہانگیر نے دیکھا اس کاغذ پر اس کا زائچہ بنا ہوا تھا۔ لڑکی نے بلند آواز سے اپنی ماں کو آواز دی۔

''ماتا جی، ماتا جی۔''

چند لمحوں بعد اس کی ماں سامنے والے مکان سے باہر آئی اور کہا:

''روپ متی کیا بات ہے؟''

پھر اس کی نظر جہانگیر پر پڑی تو اس نے پوچھا:

''روپ متی یہ کون ہیں؟''

قبل اس کے لڑکی کچھ بتاتی، جہانگیر نے کہا:

''بہن؟ میں آگرہ کا رہنے والا ہوں، شاہی فوج کا سپاہی ہوں اور راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔ روپ متی کا ممنون ہوں، اس نے میری خدمت کی اور میرے گھوڑے کو پانی پلایا۔''

روپ متی بولی:

''جناب! گستاخی معاف، آپ اپنی شخصیت ہم سے چھپا رہے ہیں، میرے زائچے کے مطابق آپ ہمارے مہاراج جہانگیر ہیں۔''

جہانگیر روپ متی کی یہ قابلیت دیکھ کر بہت حیران ہوا، لیکن اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا:

''بیٹی! تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں تم سے اپنی شخصیت نہیں چھپا رہا، لیکن تم یہ بتاؤ، تم اس ویران جنگل میں کیونکر رہتی ہو؟ تمہاری معاش کا کیا ذریعہ ہے؟''

''مہاراج......''

جہانگیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

''میں نے کہا نا! کہ میں مہاراج نہیں ہوں۔''

بڑھیا بولی:

''روپ متی کے پتا بیجا پور کے بہت بڑے پنڈت اور شاہی نجومی تھے۔ ایک روز وزیر اعظم کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ جس پر روپ متی کے پتا شاہی ملازمت چھوڑ کر اس جنگل میں آ بسے۔ قریب کے ایک گاؤں والے ہماری کفالت کرتے ہیں۔ روپ کے پتا گزشتہ سال فوت ہو گئے تھے۔ انہوں نے روپ کو بھی نجوم اور رمل کی تعلیم دی تھی۔ اس کا امتحان لینے کے لیے ایک روز انہوں نے اس جگہ کا زائچہ بنوایا۔ روپ کے بنائے ہوئے زائچے کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے، کیونکہ ان کے اپنے بنائے ہوئے زائچے اور روپ متی کے زائچے میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ ان زائچوں سے معلوم ہوا کہ ایک روز شہنشاہ ہمارے مہمان ہوں گے اور ان کی شناخت کا ذریعہ ان کی انگشتری بنے گی۔ جس میں نہایت اعلیٰ قیمتی یاقوت جڑا ہو گا۔ مہاراج! روپ متی کا زائچہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہی ہمارے مہاراج جہانگیر ہیں، پرماتما آپ کو سلامت رکھے!''

بڑھیا کی یہ بات سن کر جہانگیر کے لیے اپنی شخصیت کو چھپانا از بس مشکل تھا۔ بولا: ''خیر اس بات کو چھوڑیں کہ میں کون ہوں؟ لیکن روپ متی آج سے میری بیٹی ہے۔'' پھر اس نے اپنی انگشتری اتار کر روپ متی کو دیتے ہوئے کہا:

''اسے تم یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھو۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہی فوج کا ایک دستہ وہاں آ پہنچا۔ شہنشاہ کو دیکھ کر انہوں نے فوجی انداز میں سلام کیا اور پھر جہانگیر کے اشارے پر نہایت ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

روپ متی نے کہا:

''مہاراج! ان دو ثبوت کی موجودگی میں تو آپ میرے زائچے کو غلط نہیں کہہ سکتے!''

''دو ثبوت؟'' جہانگیر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں مہاراج! پہلا ثبوت تو یہ شاہی فوج کی سلامی ہے اور دوسرا ثبوت انگوٹھی ہے، جو مہاراج جہانگیر کے سوا کوئی عطا نہیں کر سکتا۔''

پھر وہ تیزی سے مکان کے اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک خط لا کر جہانگیر کو دیا کہ یہ میرے پتا جی نے مرنے سے پہلے آپ کے نام لکھا تھا۔ جہانگیر نے خط کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا:

''مہاراج! بہت جلد آپ دکن پر بھی حکمرانی کریں گے۔ میری درخواست ہے کہ میری بیوی اور بچی کا بھی خیال رکھیں۔''

یہ خط پڑھ کر جہانگیر نے حکم دیا کہ ''روپ متی اور اس کی والدہ کو شاہی محل میں پہنچا دیا جائے۔''

شاہی محل میں ملکہ نور جہاں نے روپ متی اور اس کی والدہ کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔ کچھ دنوں بعد آگرہ کے ایک معزز برہمن خاندان میں روپ متی کی شادی کر دی گئی۔ روپ متی کے والد کی حیثیت میں خود جہانگیر تمام رسوم میں شریک ہوا اور جہیز کے طور پر ایک بہت بڑی جاگیر بھی روپ متی کو عطا فرمائی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر کے بعد جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی منہ بولی بہن کی جاگیر میں مزید اضافہ کر دیا۔

☆ ☆ ☆

جب وہاں کے ڈاکٹروں نے مجھے پوری طرح صحت مند دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ میرے تمام ٹسٹ دوبارہ لئے گئے تو نتیجہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے۔ ''محترمہ! کیا آپ ہی وہ خاتون ہیں جو......''

توبہ کا در کھلا ہے

☆ -- شازیہ محسن

غزل لاہور کی رہنے والی تھی، وہ ایک معمولی فلمی اداکارہ تھی۔ فلمی حلقوں میں اس کا رقص بڑا مشہور تھا۔ وہ بڑا ہیجان انگیز رقص کرتی تھی۔ اُسے ایک انتہائی مہلک مرض ''کینسر'' لاحق ہو گیا تھا۔ کینسر کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نے اس مرض کے علاج کے لئے مختلف ماہرین طب سے رجوع کیا لیکن ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اسے اپنی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ ہاں ایک امید باقی تھی اور وہ تھی اس کے رب کا دروازہ۔ اس کی یہ روداد اسی کی زبانی پیش ہے۔

میں ایک عرصے سے اپنی ایک چھاتی میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ بڑا علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر

ڈاکٹروں نے میرے کئی ٹسٹ لئے جن کی روشنی میں یہ انکشاف ہوا کہ میں چھاتی کے کینسر کی شکار بن چکی تھی۔ اس مہلک مرض نے میری چھاتی میں اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے اور میں پوری طرح اس موذی مرض کے شکنجے میں آ گئی تھی۔

اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے اور دین کی تعلیمات سے بالکل غافل تھی۔ میں ایک مشہور فلمی اداکارہ تھی، میں سمجھتی تھی کہ میرا حسن و جمال تاحیات میری شخصیت کو تازگی بخشتا رہے گا۔ مجھے ہمیشہ لطف اندوزی کا خوش کن موقع نصیب رہے گا اور میں سدا بہار پودے کی طرح ہمیشہ تروتازہ رہوں گی۔ مجھے یہ خیال تک نہ گزرا تھا کہ میں کبھی "کینسر" جیسی جان لیوا بیماری میں گرفتار ہو جاؤں گی لیکن جب میں اس خطرناک مرض میں مبتلا ہوئی تو اس کے خوف و دہشت نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں بُری طرح حواس باختہ ہو گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں لیکن بھاگ کر جاتی تو کہاں جاتی؟

اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ میں خودکشی کرلوں لیکن اپنی جان لینا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر مجھے اپنے بچوں اور شوہر کا خیال آ گیا۔ مجھے اپنے شوہر اور بچوں سے شدید محبت تھی۔ اس لئے میں نے خودکشی کا خیال دماغ سے نکال دیا۔

اُس وقت میرے خودکشی نہ کرنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا خوف یا ڈر نہ تھا، اس طرف تو کبھی خیال ہی نہیں گیا تھا۔ میں تو اسلام سے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کوسوں دور تھی۔ میں توبہ و استغفار سے ناواقف تھی۔ جب مجھے یہ خطرناک مرض لاحق ہو گیا تو مجھے اللہ بھی یاد آ گیا اور اس کا رسول بھی۔ میرا دھیان خود بخود توبہ استغفار کی طرف چلا گیا۔ بعض اوقات بیماری بھی انسان کے لئے رحمت کا باعث ہوتی ہے اور وہ اسے جھنجھوڑ دیتی ہے۔ شاید اللہ چاہتا تھا کہ نہ صرف مجھ پر کرم کر کے سیدھے راستے پر لائے بلکہ اور لوگ بھی میری وجہ سے سیدھے راستے پر آ جائیں۔

ہاں آج میں وہی غزل ہوں جو نہ جانے کتنے لوگوں کو گمراہ کر چکی تھی۔ اپنے جسم کی نمائش کر کے، رقص و سرود کے ذریعے، سینما کے ذریعے...... میں نے بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ سب نے میرے شوہر سے کہا کہ اس کے سینے کا متاثرہ حصہ کاٹ دینا ضروری ہے اور ایسی کیمیائی ادویات اور شعاعیں استعمال کرنا پڑیں گی جس سے سر کے بال جھڑ جائیں گے، پلکیں اور بھنویں گر جائیں گی، چہرے پر داڑھی کے بال اُگ آئیں گے، ناخن اور دانت بوسیدہ ہو جائیں گے۔ میں نے اس علاج سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں ایک چھاتی کٹوانے، گنجی ہونے اور قدرتی بناوٹ اور خوبصورتی کو داغدار کرنے پر مرجانے کو ترجیح دوں گی۔

میں پھر لاہور واپس آ گئی۔ چھوٹا موٹا علاج کرواتی رہی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ ڈاکٹروں نے میری درست تشخیص نہیں کی اور انہوں نے خواہ مخواہ میرے اندر کینسر کا مرض بتا دیا ہے جبکہ میں بالکل صحت مند ہوں۔

تقریباً چھ ماہ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے وزن میں خاصی کمی ہو چکی ہے۔ جب میں نے ایک مشہور ڈاکٹر سے طبی معائنہ کروایا تو اس نے مجھ بلجیم جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے بچوں کو ان کی پھوپھی کے گھر چھوڑا اور شوہر کے ساتھ بلجیم چلی گئی۔ وہاں ڈاکٹروں نے جب میرا معائنہ کیا تو انہوں نے نہایت افسوس ناک خبر میرے شوہر کو بتائی کہ کینسر پوری چھاتی میں پھیل چکا ہے اور پھیپھڑے بھی اس سے بری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس اب اس کے لئے کوئی علاج نہیں ہے۔ اب تمہارے لئے صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ تم اپنی بیوی کو پاکستان لے جاؤ تاکہ اُسے وطن میں موت نصیب

ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے جب میرے خاوند کو یہ اطلاع دی تو اُن پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ حواس باختہ ہو گئے پھر ہم لوگوں نے واپس اپنے وطن پاکستان جانے کی بجائے فرانس کا ٹکٹ لیا کہ شاید وہاں کوئی علاج ہو سکے اور وہاں میں چھاتی کٹوا کر کیمیائی دوائیں استعمال کروں تاکہ کسی طرح زندگی بچ سکے۔

ایک دن جب ہم پریشان بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اچانک میرے خاوند کے ذہن میں آیا کہ دنیاوی علاج کروا چکے ہیں مگر ایک طبیب باقی رہ گیا ہے اس کے پاس جانا چاہیے۔ اس نے جب مجھ سے بات کی تو جیسے مجھے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو، بلاشبہ ہمیں مکہ مکرمہ جانا چاہیے۔ بیت اللہ کی زیارت کریں اور وہاں اللہ کے دربار میں توبہ واستغفار کریں، اللہ سے دعا کریں کہ اس مہلک مرض سے مجھے شفا دے۔

کیونکہ آسمان کے دروازے ہر سائل کے لئے ہر وقت کھلے ہیں اور وہاں پر بیماری کا کامیاب علاج دستیاب ہے۔ چنانچہ ہم میاں بیوی پیرس سے خانہ کعبہ روانہ ہو گئے۔ راستہ بھر ہم "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا ورد کرتے رہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کیونکہ بیت اللہ کی طرف میری زندگی کا یہ پہلا سفر تھا اور پہلی دفعہ اللہ کے گھر کا دیدار کرنے والی تھی۔ میں نے پیرس میں قرآن مجید کا ایک نسخہ خرید لیا تھا اور گاہے بگاہے اس کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔ آخر وہ مبارک وقت آ گیا جب ہم مکہ مکرمہ پہنچ کر خانہ کعبہ میں داخل ہو گئے۔ جونہی نگاہ خانہ کعبہ پر پڑی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے گزشتہ زندگی یاد آ گئی۔ رب کی نافرمانی اور گناہ آلودہ زندگی میں نماز، روزے سے قطعاً دور رہی تھی۔ اب میں نہایت عاجزی کے ساتھ اس رب العالمین کے در پر حاضر تھی۔ جو دعائیں قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے۔ میں نے خانہ کعبہ کے دروازے کے قریب جا کر رو رو کر یہ دعا کی۔

"اے میرے پروردگار! میری مہلک بیماری کا علاج ڈاکٹروں کے بس میں نہیں، وہ ہزار ہا کوششوں کے باوجود میرے علاج سے انکار کر چکے ہیں۔ میرے پیارے اللہ! تیری طرف بیمار آئی ہوں اور اس کا علاج بھی تُو ہی کرے گا۔ میری بیماری کے علاج کے معاملے میں ڈاکٹروں نے ہسپتالوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ صرف تیرا دروازہ میرے لئے کھلا ہے۔ میں اپنے علاج کے لئے تیرے پاس پہنچ چکی ہوں، میرے رب! اپنا دروازہ میرے لئے بند مت کرنا"۔

پھر میں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور اس دوران میں اللہ سے دعائیں کرتی رہی کہ اے اللہ! میری دعا کو نامراد واپس نہ کرنا۔ مجھے ناامید نہ کرنا اور مجھے شفا عنایت کر کے ڈاکٹروں کو اپنی عظمت و شان دکھا دینا"۔ اس سے پہلے اللہ سے بالکل غافل تھی اور اس کے احکامات پر کبھی عمل نہ کیا تھا لیکن اب میری وہ کیفیت نہ رہی جو پہلے تھی بلکہ اب میں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ میں نے مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیمات کی جانکاری حاصل کی اور کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور زیادہ سے زیادہ اللہ عزوجل کا ذکر کرنے لگی۔ ہر وقت توبہ استغفار کا وِرد جاری رہتا۔

مسجد حرام میں مجھے کافی راحت محسوس ہو رہی تھی اور میرے دل کو بہت ہی اطمینان تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ مجھے مسجد حرام میں ہی زیادہ وقت گزارنے کی اجازت دیں۔ میں ہوٹل میں کم ہی جاؤں گی اور زیادہ وقت اللہ کے گھر میں گزاروں گی۔ انہوں نے میری بات مان لی اور میں اپنے اوقات مسجد حرام میں اللہ کے مقدس دربار میں دعا و مناجات کے ساتھ گزارنے لگی۔ مسجد حرام کے اندر میرے پڑوس میں مصر اور ترکی کی چند خواتین تھیں جو میری تکلیف و آہ و بکا کو سنتی اور میرے

آنسو دیکھتی تھیں۔ انہوں نے سبب دریافت کیا، میں نے ان سے کہا سچی بات یہ ہے کہ مجھے کینسر کی بیماری ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں آہ وزاری کر رہی ہوں۔ ان عورتوں کا معمول تھا کہ نمازوں کے بعد میرے اردگرد بیٹھ جاتیں اور خاصی دیر بعد الگ ہوتیں۔ یوں ہماری اللہ کے لئے آپس میں محبت ہوگئی پھر میں نے ان سے کہا کہ کیوں نہ میں مسجد میں اعتکاف کی نیت کر لوں۔ ان عورتوں کے خاوندوں نے بھی اجازت دے دی اور ہم سب اللہ کے گھر میں معتکف ہوگئیں۔ اب ہمارا سارا دن ذکر واذکار، قرآن پاک کی تلاوت، نمازوں اور نوافل میں گزر جاتا۔ اب ہم آب زمزم کثرت سے پیتیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مجھے یاد تھا۔

''آب زمزم جس نیت سے بھی پیا جائے تو وہ نیت پوری ہو جاتی ہے''۔

آب زمزم اگر بیماری سے شفایابی کی نیت سے پیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا بخشتا ہے۔ اگر سیرابی کی نیت سے پیا جائے تو پیاس بجھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کی نیت سے پیا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری بھوک کو زمزم کی برکت سے ختم کر کے ہمیں زندگی بخشی۔ کچھ دن یونہی گزر گئے۔ ایک رات عبادت کے دوران میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خود کو مدینہ میں روضۂ رسولؐ پر حاضری دیتے دیکھا۔ میری آنکھوں نے گنبد خضریٰ کا دیدار بھی کیا۔ آنکھ کھلی تو دل میں ایک ہی تڑپ اور لگن تھی کہ میرا علاج کالی کملی والے آقا کے در اقدس پر ہے۔ اس روضۂ اقدس کی عظمت کا خیال آیا جس پر زمین ناز کرتی ہے، کائنات فخر کرتی ہے، انسانیت کو قرار اور سکون ملتا ہے، زمانے کے ٹھکرائے ہوؤں کو پناہ ملتی ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ دنیا کی ہر پریشانی کا حل تمام مصائب کی دوا، تمام دُکھوں کا علاج کالی کملی والے کے روضہ کی چھاؤں میں ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ اگلے دن ہم مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے لرزاں وترساں آقا کے در پر حاضری دی۔ اپنے گناہوں میں ڈوبے وجود کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھتی رہی۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ روضہ رسول کی جالیوں سے لپٹ گئی۔ شرمندگی اور ندامت کے آنسوؤں سے ان مقدس جالیوں کو بھگونے لگی۔ اپنے کیئے پر پچھتانے اور فریاد کرنے لگی۔ ''یارسول اللہؐ! مجھے معاف کر دو، میں بھول گئی تھی، میں نے لالچ کا کاروبار شروع کیا۔ دنیا بناتے ہوئے اپنی عاقبت بھول گئی۔ میں گناہ گار ہوں، رُوسیاہ ہوں، مگر شکر ہے کہ تیری اُمت سے ہوں...... مجھے تیری رحمت پر بھروسہ ہیں تیرے کرم کا آسرا ہے۔ خدارا کرم کی اک نظر ادھر فرمایئے ورنہ زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے کیئے پر ندامت ہے۔ شرمندگی سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ ندامت سے بات نہیں کر سکتی۔ میں دولت کی ہوس سے توبہ کرتی ہوں...... تیرا دربار گناہ گاروں کے لئے کھلا رہتا ہے۔ سیاہ کاروں کو معاف کرنا تیری فطرت ہے۔ میرے مولا! میں نے حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ تیری عظمت کو پہچان لیا ہے۔ میں اپنے گناہوں سے تائب ہوتی ہوں۔ میرے مولا...... میرے آقا!''

روضہ رسولؐ پر حاضری سے دلی سکون ملا پھر واپس مکہ آ گئی۔

میری سہیلیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جسم کو آب زمزم سے دھو ڈالوں۔ میں نے انکار کر دیا مگر مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اندرونی طاقت مجھے آب زمزم سے اپنے جسم کو دھونے پر آمادہ کر رہی ہے۔ میں نے آب زمزم کی بے ادبی کے خوف کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کیا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنا جسم نہیں دھویا کیونکہ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ جب تیسری مرتبہ میرے دل نے گواہی دی اور مجبور کیا تو میں اٹھی اور آب زمزم لے کر اپنے ہاتھوں سے جسم اور چھاتی پر موجود پھنسیوں پر پھیرا

شروع کر دیا جو کہ فاسد خون اور پیپ وغیرہ سے پُر تھیں۔ چند دنوں میں دیکھتے ہی دیکھتے میرا جسم حیرت انگیز طور پر ان تمام بیماریوں سے پاک ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جسم کو شل کر دینے والے درد والم سب غائب ہو گئے۔ میں پہلے تو بے یقینی کی کیفیت میں رہی کہ یہ میرا واہمہ ہے۔ پھر میں اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر بار بار جسم کو چھونے لگی لیکن میرے جسم کے کسی حصے میں اب ہرگز کوئی سوجن نہیں تھی۔ میں کانپ اٹھی۔ فوراً میرے ذہن نے کہا تعجب کیوں کر رہی ہو، کیا اللہ اس کام پر قادر نہیں؟ میں نے اپنی سہیلی سے کہا کہ میرے جسم سے اب تمام پھنسیاں غائب ہیں اور میرا جسم صحیح وسالم ہو گیا ہے تو وہ بے ساختہ پکار اٹھیں ”اللہ اکبر اللہ اکبر“۔

میں فرطِ مسرت سے اپنے شوہر کو خوش خبری دینے کے لئے مسجد حرام سے نکل کر ہوٹل کے لئے چلی۔ کمرے میں داخل ہو کر جب اپنے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی ان سے کہنے لگی کہ دیکھو دیکھو یہ اللہ کی رحمت...... کہاں ہیں میرے جسم پر پھوڑے اور پھنسیاں......؟ ختم ہو گئیں ناں! اور یہ سب متبرک اور پاک آبِ زمزم کی برکت سے ہوا۔ پھر میں نے مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنے شوہر کو اپنے حالات سے آگاہ کیا لیکن وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے بلند آواز میں کہا۔

”کیا تجھے معلوم نہیں، کیا تُو اتنی جلدی بھول گئی کہ صرف تین ہفتے قبل ڈاکٹروں نے پورے حتم ویقین سے کہا تھا کہ یہ چند ہی دنوں کی مہمان ہے؟“

”زندگی اور موت کا وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے“۔ میں نے جواباً کہا۔ ”غائب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ کب کسی کو موت آنی ہے، یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔“

اس کے بعد ہم میاں بیوی بیت اللہ میں ایک ہفتہ قیام پذیر رہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتی رہی اور اس کی حمد وثنا بیان کرتی رہی۔ پھر ہم نے دوبارہ مدینہ دیارِ رسول ﷺ پر شکرانے کی حاضری دی اور مسجد نبوی کی زیارت کی اور اس کے بعد فرانس واپس ہو گئے۔ جب وہاں کے ڈاکٹروں نے مجھے پوری طرح صحت مند دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ میرے تمام ٹسٹ دوبارہ لئے گئے تو نتیجہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے۔ ”محترمہ! کیا آپ ہی وہ خاتون ہیں جو......“

”جی ہاں میں ہی وہ خاتون ہوں جس کی موت کا آپ لوگوں نے اعلان کر رکھا تھا“۔ میں نے فخر سے جواب دیا۔ ”اور یہ میرے شوہر ہیں جنہوں نے میری شفایابی کے لئے اپنے سارے وسائل استعمال کر ڈالے تھے۔ آپ لوگوں کے علاج سے بے زار ہو کر ایک نئے ہسپتال میں جا کر داخل ہو گئی اور اب وہاں کے علاج سے شفایابی کے بعد واپس آئی ہوں۔ مجھے اب کسی کا خوف اور ڈر نہیں سوائے اللہ کے...... کیونکہ قضا وتقدیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی زندگی وموت کا مالک ہے اور تمام امور اس کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ ایک پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں گرتا ہے“۔

ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا۔ ”محترمہ! آپ کا یہ معاملہ عجیب وغریب ہے۔ تعجب ہے آپ کی بیماری ختم ہو گئی اور آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئیں۔ آپ کینسر جیسے خطرناک مرض میں گرفتار تھیں۔ براہ کرم! آپ ہمیں بتائیں کہ وہ کون سی ادویات تھیں جن کے علاج سے آپ کی یہ مہلک اور خطرناک بیماری رفع ہو گئی“۔

کون سی تھی وہ دوا......؟

میں نے بڑے یقین واعتماد کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ اس دوا کا نام ”آبِ زم زم ہے“۔

اسلم شاہد منھیال، ضلع اٹک

غزل

کھا جائے نہ خوشبو کو، حجابوں میں پڑا ہے
وہ ناگ جو گلشن کے گلابوں میں پڑا ہے

تم ڈھونڈ رہے ہو، اسے دنیا کی زمیں پر
بچھڑا ہوا انسان کتابوں میں پڑا ہے

کانٹے ہی چبھاؤ مجھے کانٹے ہی بہت ہیں
پھولوں کا زمانہ ابھی خوابوں میں پڑا ہے

ہے بھوک کا موسم میرے بازو بھی نہیں ہیں
لقمہ مری قسمت کا عقابوں میں پڑا ہے

بہتر تھا کہ بچتا وہ زمانے کی نظر سے
اُلٹا جو سوالوں کے جوابوں میں پڑا ہے

رستے سے بھٹکتے ہوئے آئے ہیں مسافر
کہتے ہیں کہ ہر شخص سرابوں میں پڑا ہے

اک شہر ہے شاہد جسے دنیا نے سنبھالا
اک شہر ہمارا ہے عذابوں میں پڑا ہے

دھوپ کے پگھلنے تک

اُس سر پھرے کی کہانی جو اندھیر نگری میں اُجالا کرنے نکلا تھا۔

قسط: 9 ☆ امجد جاوید

''آج تم دن کے وقت آ گئی۔ پھر تم اتنی دیر سے آئی ہوئی ہو اور بڑی خاموش خاموش سی ہو، کیا پریشانی ہے؟'' سراج نے پوچھا تو رانی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں کہ تم سے کیسے بات کروں؟''

''اگر کوئی بات کہنی ہے تو کہو، اس میں سوچنا کیا؟'' سراج نے کہا تو رانی بولی۔

''پتہ نہیں، مجھے وہ بات تم سے کہنی بھی چاہئے یا نہیں۔ اصل میں سراج، وہ چوہدرانی کا ایک کام ہے، اس نے وہ مجھے کرنے کے لیے کہا ہے''۔

''چوہدرانی کا کام، دیکھ رانی، اگر اس نے کوئی دھمکی دی ہے تو چپ چاپ واپس چلی جا، بہت سن لیں میں نے اس خاندان کی دھمکیاں اور......'' سراج نے غصے میں کہا تو رانی اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

''ایسا نہیں ہے سراج، وہ صرف فہد سے ملنا چاہتی ہے اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ وڈھے اور نکے چوہدری کی طرح خون خرابہ نہیں چاہتی۔ چوہدرانی نے اتنا کہا ہے کہ میں ملنا چاہتی ہوں فہد سے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتی ہوگی، جس سے یہ لڑائی ختم ہو جائے''۔

''رانی! ان چوہدریوں نے ظلم ہی اتنے کیے ہیں کہ اب زخموں پر جتنا بھی مرہم رکھ دیا جائے وہ زخم بھریں گے نہیں''۔ سراج نے اسے حقیقت بتائی۔

''تم اگر اسے فہد سے ملا دو تو ممکن ہے کوئی راہ نکل ہی آئے؟'' رانی نے صلاح دی تو سراج نے خلوص سے کہا۔

''تو یقین رکھ رانی، میں پورے خلوص کے ساتھ چوہدرانی کو فہد سے ملوا دوں گا، وہ اگر نہ بھی مانا تو میں منا لوں گا۔ آگے اللہ کی مرضی''۔

''مجھے تم پر یقین ہے سراج، اللہ کرے یہ ظلم، خون خرابہ اور لڑائی بند ہو جائے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے''۔ رانی نے اٹھتے ہوئے کہا تو سراج بھی اٹھ کے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں تجھے بتا دوں گا۔ آؤ تجھے چھوڑ دوں''۔

وہ دونوں منڈھیر سے اٹھ کر آگے بڑھے۔ تبھی ان کے عقب میں ماکھا نمودار ہوا۔ وہ انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ سراج اور رانی کو خبر ہی نہیں تھی کہ دشمنوں کی نگاہ ان پر پڑ چکی ہے۔

ماکھا بڑے مضطرب انداز میں ڈیرے کے صحن میں کھڑا تھا۔ اتنے میں کبیر کی گاڑی آ کر رکی اور اس میں سے کبیر باہر نکلا۔ ماکھا تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب آیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا۔

''اوئے ماکھے، خیر تو ہے نا، ایسے کیوں کھڑا ہے؟''

''نکے چوہدری جی! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا''۔ ماکھے نے تیزی سے کہا تو چوہدری کبیر سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ کیوں؟ میرا انتظار کیوں کر رہا تھا؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے، نکے چوہدری جی!'' وہ جھجکتے ہوئے بولا تو اس نے غصے میں کہا

''تو چل پھر منہ کھول، بتا کیا بات ہے۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالی ہوئی ہیں کیا؟''

''وہ حویلی میں آپ کی نوکرانی ہے نا جی، وہ کیا نام ہے اس کا رانی......'' ماکھے نے کہا

''ہاں کیا ہوا اسے؟'' چوہدری کبیر بولا

''آج میں نے اس کو سراج کے ساتھ بیٹھے ہوئے اور بڑی گہری باتیں کرتے ہوئے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کتنی دیر تک وہ اس کے کھیتوں میں اس کے ساتھ رہی ہے۔ پھر سراج اسے کافی دور تک چھوڑنے

آیا۔اور......''

''تو سچ کہہ رہا ہے''۔ چوہدری کبیر نے تصدیق چاہی تو ماکھا جلدی سے بولا۔۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا جی، پھر میں نے گاؤں کے کچھ بندوں سے بھی معلوم کیا، وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں جی، محبت کرتے ہیں جی وہ ایک دوسرے کے ساتھ''۔

''وہ تو ٹھیک ہے ماکھے پر حویلی کی ملازمہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ملے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟' چوہدری کبیر نے ایک دم غصے میں کہا اور واپس اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ڈیرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس وقت بشریٰ بیگم اپنے بیڈ روم میں تھی اور رانی اس کے پاس قالین پر بیٹھ ہوئی تھی۔ بشریٰ بیگم نے اس سے پوچھا۔

''ہاں اب بتا، وہ فہد سے ملنے کی کوئی راہ نکلی؟''

''چوہدرانی جی! وہ سراج ہے نا، امین ارائیں کا بھائی، ان کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔ اس کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہی ہے لیکن میں اسے اکیلے میں اس کے ڈیرے پر ملی تھی، اور اس کے ساتھ اطمینان سے بات کی''۔ رانی نے تحمل سے کہا

''تو اس نے تمہاری بات سن لی؟'' بشریٰ بیگم نے حیرت سے پوچھا تو رانی بولی۔

''پہلے تو اس نے بہت غصہ کیا کہ میں ایسی بات کہنے کیوں آ گئی ہوں، پھر جب میں نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ خون خرابہ نہیں چاہتی ہو تو پھر اس نے میری بات پر سوچا۔

''اچھا تو پھر کیا کہا اس نے؟'' بشریٰ بیگم نے تجسس سے پوچھا تو رانی نے سکون سے بتایا۔

''میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ آپ فقط فہد سے ملنا چاہتی ہیں تم کوئی ایسا بندوبست کرو کہ آپ دونوں کی ملاقات ہو جائے پھر جو فیصلہ ہو گا وہ بعد کی بات ہے''۔

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اس نے کیا کہا؟'' بشریٰ بیگم نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ مان گیا، اس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ آج ہی فہد سے بات کرے گا۔ بلکہ اسے مجبور کرے گا کہ چوہدرانی جی کی بات سن لے، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا''۔ رانی نے بتایا تو بشریٰ بیگم نے سوچتے ہوئے پوچھا

''تمہارا کیا خیال ہے سراج کی بات فہد مان جائے گا۔ ویسے اگر تم سیدھے فہد سے بات کر لیتی تو زیادہ اچھا تھا''۔

''نہ چوہدرانی جی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، اسی لیے تو میں نے سراج سے بات کی ہے، وہ تو ہمارے گاؤں کا ہے نا''۔ رانی نے خود میں سمٹتے ہوئے کہا تو بشریٰ بیگم نے سکون سے کہا۔

''اچھا چل ٹھیک ہے۔ اب اس کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو، میں فہد سے مل کر کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گی''۔

''اللہ کرے امن ہو جائے''۔ رانی نے دعا کی تو بشریٰ بیگم نے کہا۔

''اب تو جا، اپنا کام کر، میں ذرا آرام کر لوں، بہت تھک گئی ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ نیم دراز سی ہو گئی اور رانی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

رانی صفائی ستھرائی میں مشغول تھی کہ چوہدری کبیر کمرے میں آیا اور اس نے آتے ہی اس کو چوٹی سے پکڑ کر زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ پھر غصے میں پھنکارتے ہوئے بولا

''تم حویلی کی ملازمہ ہو کر ہمارے ہی دشمنوں سے پیار کی پینگیں بڑھاؤ۔ انہیں یہاں کے راز بتاؤ''۔

''نن......نن، نہیں چوہدری جی، ایسی کوئی بات

نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ رانی نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا تو چوہدری کبیر پاگل ہوتے ہوئے بولا۔

''غلط فہمی...... وہ بھی مجھے ہوئی ہے، بتا تو سراج سے ملی تھی، کیا یہ جھوٹ ہے؟''

''میں گئی تھی اس کے پاس لیکن......'' اس نے کہنا چاہا مگر چوہدری کبیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہمارا ہی نمک کھاتی ہو اور ہمارے ہی خلاف دشمنوں سے ملتی ہو۔ میں تو کسی کو اپنے خلاف سوچنے نہیں دیتا اور تم ہو کہ حویلی کی باتیں باہر جا کر دشمنوں کو بتاتی ہو؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے نکے چوہدری جی ایسا کچھ نہیں ہے''۔ رانی روتے ہوئے ڈر کے بولی

''تو بولو، وہاں کیا کرنے گئی تھی کیوں ملتی ہو سراج سے وہ بھی اس کے کھیتوں میں جا کر''۔ چوہدری کبیر نے جس طرح الزام دینے والے انداز میں کہا تو رانی نے عزت پر حرف آتا محسوس کر کے دلیری سے بولی۔

''یہ سچ ہے کہ میں اس سے ملی ہوں مگر میرا یقین کریں حویلی کے خلاف میں نے......''

''خاموش!'' چوہدری کبیر نے دھاڑتے ہوئے کہا تو رانی سہم گئی اور سہمے ہوئے انداز میں کبیر کی طرف دیکھا تو وہ نفرت سے بولا

''پتہ نہیں کب سے تم یہاں کی باتیں انہیں بتا رہی ہو۔ میں بھی کہوں حالات ہماری گرفت میں کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ ہمارے ہی گھر کا بھیدی...... تمہیں سزا ملے گی اور ضرور ملے گی''۔

''نہیں نہیں چوہدری جی آپ چوہدرانی جی سے پوچھ لیں میرا کوئی قصور نہیں ہے''۔ رانی ہذیانی انداز بولی تو کبیر نے اسے تھپڑ دے مارا۔ اور پھر اچانک رُک کر اس کے بدن کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے چوہدری کبیر بدلے ہوئے لہجے بولا

''مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم جوان ہو گئی ہو شادی کرنا چاہتی ہو، سراج کے ساتھ''۔

یہ کہتے ہوئے وہ اس کی جانب بڑھا تو رانی اس کی نیت سمجھتے ہوئے بولی

''نہ چوہدری جی نہ میرے قریب مت آنا''

کبیر رکا نہیں بلکہ اس کی بانہیں تھام لیں۔ وہ کسی بے بس پرندے کی مانند اس کی گرفت میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ وہ کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی، لیکن ایسا نہ کر سکی۔ کبیر نے اسے دبوچ لیا تھا۔

ایک چیخ حویلی میں گونج کر رہ گئی۔ لٹی پٹی رانی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبیر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے کپڑے درست کرتا ہوا اٹھا۔ وہ باہر جانے کے لئے مڑا تو سامنے دروازے میں بشریٰ بیگم کھڑی تھی۔ وہ شدید حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔ کبیر قریب سے خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا، بشریٰ جیسے ہی اس کے قریب آئی، رانی سسک پڑی تو بشریٰ بیگم نے دھیرے سے پوچھا۔''رانی، بولو کیا ہوا، بولو رانی؟''

رانی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ بشریٰ بیگم نے حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

''یہ تُو نے اچھا نہیں کیا کبیر، مان توڑ دیا ہے تُو نے میرا، بھروسہ ٹوٹ گیا ہے میرا......'' وہ بڑبڑاتے ہوئے رانی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔''اٹھ جا، اس سے پہلے کہ حویلی کے دوسرے ملازموں کو معلوم ہو، اپنا آپ سمیٹ لے''۔

''نہیں بیگم صاحبہ، رانی اب نہیں رہی، ختم ہو گئی ہے''۔ رانی نے انتہائی دکھ سے کہا تو بشریٰ بیگم دانت پیستے ہوئے بولی''کبیر!''

وہ انتہائی غصے میں اٹھ کر باہر چلی گئی۔ رانی وہیں دیوار کے ساتھ لگی ہوئے بے دم سی پڑی رہی۔

بشریٰ بیگم کو کبیر گھر نہیں ملا۔ وہ پہلے تو اسے خود حویلی میں تلاش کرتی رہی پھر اسے نوکروں سے معلوم ہوا کہ کبیر اپنی گاڑی میں باہر چلا گیا ہے۔ بشریٰ دالان میں غصے میں بے حال اور پریشان سی کھڑی رہی پھر چونک کر اس طرف چل پڑی جہاں وہ رانی کو چھوڑ آئی تھی۔ اس نے کوریڈور میں چلتے ہوئے اسے آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ تبھی وہ اس کمرے کے دروازے تک آ کر رک گئی۔ وہ اندر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ رانی پنکھے سے جھول رہی تھی۔ یہ دہشت زدہ منظر دیکھ کر بے ساختہ بشریٰ بیگم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

☆......☆......☆

فہد اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی چارپائی پر سراج بیٹھا کہہ رہا تھا۔

''یار آج صبح رانی آئی تھی بشریٰ بیگم کا پیغام لے کر۔''

''رانی اور وہ بھی بشریٰ بیگم کا پیغام لے کر، خیر تو ہے نا، کیا کہتی ہے؟'' فہد نے چونکتے ہوئے پوچھا تو سراج بولا

''چوہدرانی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ......'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ چھاکا تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس یوں آتے دیکھ کو وہ دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور فہد نے پوچھا۔۔

''خیر تو ہے چھاکے، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''غضب ہوگیا سراج، حویلی میں رانی نے خودکشی کر لی ہے۔ مگر لوگ کہہ رہے ہیں کہ اسے قتل کیا گیا ہے''۔ چھاکے نے کہا تو وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ سراج نے بڑبڑانے والے انداز میں پوچھا۔

''خودکشی......مگر کیوں؟ کس لیے؟ تمہیں کس نے کہا؟''

''حویلی کے مالی نے مجھے ساری تفصیل بتائی ہے۔ کبیر نے رانی کو کسی جوگا بھی نہیں چھوڑا تھا، اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور ابھی کچھ لوگ اسے دفنا کر آئے ہیں''۔ چھاکے نے بتایا تو سراج کے غصہ پھیلتا چلا گیا۔ فہد کا حیرت اور دکھ ملا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔

''رانی کو پامال کرکے، اسے قتل کرکے دفن بھی کر دیا گیا''۔ سراج نے انتہائی حیرت سے پوچھا تو چھاکے نے بتایا۔۔

''حویلی والوں نے اسے خاموشی سے دفنا دیا ہے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، مگر اتنا بڑا ظلم چھپ تو نہیں سکتا نا''۔

یہ سنتے ہی سراج غصے میں اٹھا۔ چارپائی پر پڑی گن اٹھائی اور تیزی سے باہر کی طرف لپکتا چلا گیا۔ فہد نے بھاگ کر اسے پکڑا تو سراج نے حیرت اور شکوہ بھرے انداز میں کہا

''نہیں فہد، کیا اب بھی مجھے تم روکو گے؟''

''تم کیوں اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ گندے کرنا چاہتے ہو۔ تھوڑا صبر کرلو۔ یقین کرو مجھ پر، ہم بدلہ لیں گے اور ضرور لیں گے، اس وقت میرے کہنے پر رک جاؤ''۔ فہد نے اس کے ہاتھ سے گن چھینتے ہوئے کہا

''کب تک صبر کروں فہد، رانی میری محبت تھی یار، اس بے غیرت نے میرے بھائی کو قتل کیا۔ اب رانی کو ......اب بھی اسے چھوڑ دوں۔ نہیں فہد نہیں، تم میں حوصلہ ہوگا مجھ میں اب نہیں رہا''۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''میری بات تو سنو، میں چلوں گا تیرے ساتھ

لیکن......'' فہد کہتا ہوا رک گیا کہ سراج اس کی بات کاٹتے ہوئے باہر کی جانب جاتے ہوئے بولا

''وہ قتل پر قتل کیے جا رہا ہے اور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں۔ اب وقت آ گیا ہے فہد، تم میرا ساتھ دو یا نہ دو میں آج اسے ختم کر دوں گا''۔

''تم کیا سمجھتے ہو، وہ ہمارے انتظار میں نہیں ہوگا؟ اس نے اپنے ڈیرے پر غنڈوں کی فوج بٹھائی ہوگی۔ اندھا دھند چڑھائی ہمارے نقصان میں جائے گی، یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے ہو؟ ذرا سا صبر کرو۔ میرے کہنے پر''۔ فہد نے اسے سمجھایا تو سراج نے انتہائی غصے میں کہا

''یار یہی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا۔ اب مجھے مر ہی جانا چاہئے''۔

''مریں گے تمہارے دشمن، تم ایک بار ادھر بیٹھو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ ہم نے کرنا کیا ہے۔ میری بات اگر تمہاری سمجھ میں آ جائے تو پھر جو چاہے کرنا، آؤ بیٹھو''۔ فہد نے اسے پکڑا اور وہ اس کے کاندھے سے لگ کر رونے لگ گیا۔

رانی کے خودکشی کرنے والی بات کوئی معمولی نہیں تھی۔ جنگل کی آگ کی مانند پورے قسمت نگر میں پھیل گئی۔ صبح ہو جانے تک یہ بات ہر بندے کو معلوم ہو گئی۔ اس وقت سلمیٰ سکول میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک کاپی دیکھ رہی تھی۔ ایک بچہ اس کے پاس کھڑا تھا۔ تبھی اس کے پاس صفیہ اور ایک عورت آ گئیں۔ صفیہ نے آتے ہی بتایا۔

''سلمیٰ، حویلی میں رانی نے خودکشی کر لی ہے۔ راتوں رات بے چاری کو خاموشی سے دفنا بھی دیا''۔

''کیا...... کیوں؟'' سلمیٰ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''خودکشی کی تو بات اڑائی گئی ہے، اصل میں چوہدری کبیر نے اس کی عزت سے کھیل کر قتل کیا ہے''۔

تب صفیہ نے اسے وہ روداد سنائی جو قسمت نگر میں پھیل چکی تھی۔ سلمیٰ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے آنسو نکل پڑے۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا۔

''وہ بے چاری غریب لڑکی ان حویلی والوں کے ظلم کا سہہ کر دفن ہو گئی، کون پوچھتا ہے سلمیٰ! کس نے سوال کرنا ہے ان حویلی والوں سے؟'' عورت نے کہا تو سلمیٰ چونکتے ہوئے بولی

''میں...... میں کروں گی سوال، نہیں بخشوں گی ان حویلی والوں کو۔ میں لوں گی رانی کے خون کا حساب۔ صفیہ تم ان بچوں کو گھر بھیج کر آ جانا میں دیکھتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ''۔

سلمیٰ اس عورت کو اپنے ساتھ لے کر سکول سے باہر کی طرف چل پڑی۔

☆......☆......☆

حبیب الرحمٰن اپنے گھر کے لان میں بید کی کرسی پر بیٹھا انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں اندر سے مائرہ آ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''پاپا۔ یہ اخبار چھوڑیں اور میری بات سنیں۔ میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہ رہی ہوں''۔ مائرہ نے کہا تو اس نے اخبار سے نگاہیں ہٹا کر مسکراتے ہوئے کہا

''اہم بات اور وہ تم کرنا چاہتی ہو۔ تو کہو میں سن رہا ہوں''۔

''پاپا! میں کہیں پر تھوڑی سی انویسٹمنٹ کرنا چاہتی ہوں۔ ظاہر ہے اس کے لیے مجھے کچھ سرمایہ چاہئے۔ آپ دیں گے؟'' مائرہ نے لاڈ سے کہا تو حبیب الرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔

''تم بزنس کرو گی، کر سکو گی؟''

''پاپا! بزنس نہ کر سکی تو میرے پاس تجربہ تو ہوگا۔ آپ سرمایہ دیں گے؟'' مائرہ نے کمزور سی دلیل دے کر

پوچھا

"بیٹا۔ !تم نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور پھر یہ سارا کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ جتنا چاہے سرمایہ لینا اور مجھے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں کہ تم یہ سرمایہ کہاں لگا رہی ہو"۔ حبیب الرحمٰن نے اعتماد سے کہا تو مائرہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔۔

"تھینک یو پاپا۔ آپ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں۔ میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گی لیکن اس سے پہلے میں خود پوری معلومات لینا چاہتی ہوں"۔

"اگر بات معلومات کی حد تک ہے تو ایک بات پوچھوں بیٹا، تم یہ سرمایہ لگا کہاں رہی ہو؟ شاید میں تمہیں کوئی اچھا مشورہ دے دوں"۔ حبیب الرحمٰن نے سنجیدگی سے پوچھا تو مائرہ بولی۔۔

"پاپا میں یہ سرمایہ ایک فیکٹری میں لگانا چاہ رہی ہوں اور یہ محض منافع کمانے کے لیے نہیں"۔

"تو پھر کس مقصد کے لیے؟" اس نے پوچھا

"پاپا، جب ہم کسی بھی علاقے کے بے روزگار نوجوانوں کے لیے روزگار کا بندوبست کرتے ہیں نا تو وہاں پر خوشحالی آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود جاگیرداروں کے تسلط کے تلے پسے ہوئے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں تو وہ لوگ جب اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے ووٹ کا درست استعمال کرتے ہیں۔ جس سے بہترین نمائندے آگے آتے ہیں اور بہترین حکومت بنتی ہے"۔ مائرہ نے تفصیل سے بتایا تو حبیب الرحمٰن نے پوچھا۔

"ہوں، یہ تو اس وقت ہمارے ملک کی اہم ضرورت ہے کیا تم کسی مخصوص علاقے میں یہ کام کرنا چاہ رہی ہو"۔

"جی پاپا"۔ مائرہ نے کہا حبیب الرحمٰن نے مسکراتے ہوئے کہا

"گڈ لک بیٹا، میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اب میں اخبار پڑھ لوں؟"

"جی بالکل پڑھیں۔ میں آپ کے لیے خود چائے بنا لاتی ہوں"۔ مائرہ نے ہنستے ہوئے کہا تو حبیب الرحمٰن نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چلی گئی تو حبیب الرحمٰن اخبار پڑھنے لگا۔

مائرہ آفس میں داخل ہوئی تھی کہ اس کا سیل فون بجا۔ اس نے اسکرین دیکھ کر فون رسیو کر لیا اور بولی

"کیسے ہو جعفر؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ"۔ وہ تیزی سے بولا تو مائرہ نے تشویش سے پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تمہاری آواز سے نہیں لگتا کہ تم ٹھیک ہو، بات کیا ہے؟"

"میں تمہیں قسمت نگر میں ہونے والی ایک واردات کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ یقین جانو اس کا مجھے ذاتی طور پر دکھ ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر جعفر نے نہایت اختصار سے بتایا تو مائرہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا کیا تم نے فہد سے بات کی؟"

"اب تو میرا اور اس کا ہر لمحے رابطہ رہتا ہے۔ اسی نے بتایا بلکہ فہد کا دوست سراج اسی رانی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں قسمت نگر جا رہا ہوں۔ حویلی بھی جاؤں گا لیکن اس کے لئے کوئی ابتدائی رپورٹ ہونا۔ یہ لوگ قتل پر قتل کیئے جا رہے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر پا رہے ہیں"۔ جعفر نے دکھ سے کہا تو مائرہ نے تیزی سے کہا

"جعفر، میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔ مجھے کچھ سوچنے دو"۔

"او کے، میں نور پور جا کر پھر تم سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ قسمت نگر سے معلومات لے کر بتاتا ہوں"۔

اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مائرہ ایک دم سے دکھی اور پریشان ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے آفس میں بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم سے اس نے فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

اس وقت فہد اپنی زمین پر چھاکے کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا

''چھاکے۔ ابھی تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کیسے ہوگا میری آنکھ سے دیکھو۔ یہاں جو فصلیں اُگتی ہیں۔ یہاں فیکٹریاں لگیں گی تو بے شمار لوگوں کو روزگار ملے گا''۔

''لیکن فہد یہ فصلیں کہاں اُگیں گی۔ اس طرح فیکٹریاں لگتی رہیں تو یہ کسان لوگ کہاں جائیں گے''۔ چھاکے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تو فہد نے سمجھایا۔

''ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں مزدور زیادہ ہیں اور مزدوری کم۔ مزدور کم ہوں گے تو مزدوری زیادہ ہو جائے گی۔ ماضی میں یہیں زمین بے آباد تھی۔ ایسی بے شمار زمینیں بے آباد پڑی ہیں۔ انہیں آباد کرنا ہے۔ پیٹ میں روٹی جائے گی نا تو مستقبل کے بارے سوچنا بھی آ جائے گا۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ اور جو زرعی ملک نہیں بھی ہیں وہ امیر ہیں۔ بس یہی وسائل کی تقسیم ہی ترقی کی طرف لے گئی۔ غریب کا حق اسے ملنا چاہیے۔'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ فون کی بیل بجی۔ اسکرین دیکھ کر فون ریسیو کرتے ہوئے بولا۔

''ہیلو! مائرہ''۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''میں اس وقت اس زمین پر ہوں جہاں فیکٹری لگانی ہے۔ میرے ساتھ میرا دوست ہے''۔ اس نے بتایا تو مائرہ بولی

''اچھا سنو، تمہیں جتنا فنانس چاہیے، میں دوں گی۔ پاپا سے میری بات ہو گئی ہے۔ اب یہ کیسے کرنا ہے۔ کیا ہونا ہے مجھے نہیں پتہ''۔

''تم میری بزنس پارٹنر بننا چاہتی ہو۔ ویل کم، یہ ٹھیک رہے گا''۔ فہد نے کہا تو مائرہ خفا لہجے میں بولی۔

''میں تو بہت کچھ چاہتی ہوں۔ مگر تم ہی نہیں مان رہے ہو۔ خیر! ابھی میری جعفر سے بات ہوئی ہے، وہ رانی والے معاملے پر۔ میں خود آ رہی ہوں۔ سلمیٰ سے کہنا پریشان نہیں ہونا۔ اب میں کچھ دن قسمت نگر ہی میں رہوں گی''۔

''واقعی، کب آ رہی ہو؟'' فہد نے حیرت سے پوچھا تو مائرہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''بہت جلدی، ہمارا رابطہ تو رہے گا۔ او کے میں بعد میں فون کرتی ہوں۔ اللہ حافظ''۔

فون بند ہو گیا۔ فہد کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ چند لمحے سوچتا ہے پھر سر جھٹک کر چھاکے سے بولا

''آؤ چلیں''۔

وہ دونوں سڑک کنارے کھڑی کار کی جانب بڑھ گئے۔ اس کا رخ سلمیٰ کے آفس کی طرف تھا۔

سلمیٰ میز کے اس طرف کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے صفیہ کے ساتھ چند عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سلمیٰ ان سے بات کر رہی تھی۔

''میں نے آپ سب کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اس آفس کا ہم باقاعدہ افتتاح کریں گے تاکہ پورے علاقے میں پتہ چلے کہ یہ آفس ہم نے کس مقصد کے لیے بنایا ہے۔ لیکن اس وقت رانی والا معاملہ انتہائی دکھ بھرا اور سنگین ہے۔ میں آپ سب کو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں لڑوں گی رانی کا مقدمہ۔ اس سے پہلے بھی میں صفیہ کی جنگ لڑ رہی ہوں''۔

''باجی آپ ہمیں بتائیں۔ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' ایک عورت نے پوچھا تو سلمیٰ نے کہا۔

ہومیوپیتھی واحد طریقۂ علاج ہے
جو
مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ مرض کی وجوہات کو ختم کرتا ہے۔ علامات کو وقتی طور پر دباتا نہیں، مرض کو
ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہے۔ ہومیوپیتھی واحد طریقۂ تشخیص ہے جو بتاتا ہے کہ جسمانی مرض کا باعث
جسمانی ہے یا نفسیاتی۔ باعث جسمانی ہو یا نفسیاتی، ہومیوپیتھی کے سوا کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔
کوئی مرض لاعلاج نہیں
خواہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے تمام امراض خصوصاً پرانے (کرانک)
اور بگڑے ہوئے امراض، معذور بچوں کے علاج کے لئے دستِ شفاء "حکایت" سے رجوع کریں۔
رابطہ کے لئے
ڈاکٹر رانا محمد اقبال
(گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
0312-6625086
عارف محمود
0323-4329344
بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔
دستِ شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

''اپنے گھروں میں اپنے مردوں سے بات کریں ہم سب نے مل کر اس مقصد کو حاصل کرنا ہے''۔

''باجی، آپ برا نہ مناؤ تو ایک بات کہوں''۔ دوسری عورت نے کہا تو سلمیٰ بولی۔۔

''کہو۔ برا ماننے والی کیا بات ہے''۔

''آپ یہاں جو بھی کر رہی ہے، ہمیں اس کی سمجھ ہے یا نہیں لیکن یہاں کے لوگ کیسے ہیں آپ کو پتہ ہے''۔

''ہماری بات لوگ سمجھیں گے۔ آج تھوڑے لوگ ہوں گے تو کل زیادہ ہوں گے۔ دھیرے دھیرے ہماری بات کی سمجھ سب کو آ جائے گی۔ ایک بار حوصلہ کر لیا جائے نا تو پھر ڈرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دیکھنا ایک دن یہ سارے لوگ اپنے ساتھ ہوں گے۔ دیکھو! ہمارا کسی کے ساتھ جھگڑا تو نہیں ہے۔ ہم تو اپنے حق کی بات کرتے ہیں۔ اور ہمارے جو حالات ہیں، ان میں حق چھین لینا پڑتا ہے۔ ہمارا خدا ہماری مدد کرے گا۔ یہاں بیٹھ کر عورتوں کے جو چھوٹے موٹے مسئلے ہیں ہم خود حل کر سکیں وہ لڑکیاں جو پڑھ نہیں سکیں۔ انہیں تعلیم دے سکیں۔ اردگرد گاؤں کی عورتوں کو پتہ ہو کہ اس علاقے میں ان کی آواز سننے والا کوئی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے رانی بارے آواز بلند کرنی ہے''۔

''ہم غریب لوگ کسی کا مسئلہ کیا حل کریں گے؟'' ایک عورت نے پوچھا تو سلمیٰ نے کہا

''مانا کہ ہم غریب ہیں بے بس ہیں لیکن کب تک؟ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہاری اولاد ان جاگیرداروں کی غلامی سے نکلے۔ ہم نے کسی سے لڑائی نہیں کرنی بلکہ اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں گے''۔

''یہ صفیہ نے چوہدریوں کی بات نہیں مانی، اسے اپنے گھر سے نکلنا پڑا یہ تو اچھا ہو تم نے اسے سنبھال لیا ایسی تو کتنی ہیں۔ کس کس کو سنبھالیں گی''۔ دوسری عورت نے پوچھا تو سلمیٰ بولی۔

''جب تک مجھ میں حوصلہ اور قوت رہی۔ اب آپ لوگ بتائیں۔ میرا ساتھ دیں گی یا نہیں؟''

''میں شاید پہلی عورت ہوں۔ جس نے چوہدریوں کی بات نہیں مانی۔ وہ اپنی طاقت آزمائیں۔ میں اپنا صبر آزماؤں گی۔ اور سچ یہ ہے ہمیشہ صبر کی فتح ہوتی ہے''۔

''یہ ٹھیک ہے کہ رانی پر ظلم ہوا۔ ہم عورتیں اپنی عزت نہیں کریں گی تو کون کرے گا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہر طرح'' دوسری عورت نے کہا تو سب اس کی ہمنوا ہو گئیں۔ ان کا جوش و جذبہ دیکھ کر سلمیٰ ایک دم جذباتی ہو گئی اور بولی

''آج سے میں رانی کا بدلہ لینے کا اعلان کرتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اسے اب فہد سے ملنا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری جلال نے بڑے کروفر سے فون بند کر کے رکھا۔ پھر قریب کھڑے منشی سے پوچھا۔

''ہاں بول منشی کیا بات ہے؟''

''وہ جی باہر اے ایس پی صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں''۔ منشی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے بڑبڑاتے ہوئے کہا

''اے ایس پی! وہ کیا کرنے آیا ہے یہاں، بلاؤ''

منشی پلٹ گیا تو چوہدری جلال کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ چند لمحوں بعد جعفر اندر گیا۔ تو چوہدری جلال نے بجائے بٹھانے کے، دور ہی سے پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا اے ایس پی؟''

''آپ اور آپ کے بیٹے کبیر کے خلاف میرے پاس درخواست آئی ہے۔ اس کے بارے میں ''تفتیش'' کرنے آیا ہوں، چوہدری صاحب۔'' جعفر نے طنزیہ

انداز میں کہا تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا۔

"تفتیش؟ آج تک کسی کی اتنی جرات نہیں ہوئی کہ یہاں آ کر ایسی بات کرے۔ بول کس نے ہمارے خلاف درخواست دی ہے۔ وہ خود یہاں آ کر انکار کرے گا کہ اس نے درخواست نہیں دی"۔

"نہ چوہدری صاحب نہ، یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ آپ ایسا نہیں کر سکیں گے اور اگر ایسا زعم ہے تو بلا لیں اسے ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلمٰی نے درخوست دی ہے۔ میں دیکھوں یہ انکار کیسے ہوتا ہے۔ کیا طریقہ ہے آپ کے پاس منت کرتے ہیں یا تشدد"۔

یہ سنتے ہی چوہدری جلال کا رنگ اڑ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے حیرت سے بولا

"سلمٰی نے ...... ایسا نہیں ہو سکتا؟"

"ایسا ہو گیا ہے چوہدری صاحب اور اب سیدھے سجاؤ مجھے بتائیں کہ رانی نے خودکشی کیوں کی؟ اور کیسے کی؟" جعفر نے غصے اور حقارت سے کہا تو چوہدری جلال نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

"اس نے چوری کی تھی۔ سزا کے خوف سے اس نے خودکشی کر لی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تھانے میں ہم نے رپورٹ کر دی تھی، قانونی کارروائی بھی پوری کی، اب تم کیا تفتیش کر رہے ہو؟"

"یہ کہ خودکشی تو اس نے کی لیکن کیوں کی؟ کس نے اسے خودکشی پر مجبور کیا۔ درخواست میں کچھ اور لکھا ہے۔ میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں۔ سچ کیا ہے یہ آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گا"۔ جعفر نے کہا تو چوہدری جلال ہتک آمیز انداز میں بولا

"جو تمہاری ڈیوٹی ہے نا تم وہ کرو، ایویں اِدھر اُدھر کیوں وقت ضائع کرتے پھر رہے ہو۔ اب کچھ مزید پوچھنا ہے یا......"

"میں ڈیوٹی ہی کر رہا ہوں، یہ سبق مجھے نہ دیں۔ جہاں تک میرے علم میں بات آئی ہے، وہ یہ ہے کہ رانی نے خودکشی نہیں کی، اسے قتل کیا گیا ہے اور اس کی عزت تم لوگوں کے ہاتھوں پامال ہوئی ہے۔ ابھی مجھے آپ سے کچھ نہیں پوچھنا لیکن بہت جلد آپ مجھے خود بتائیں گے کیونکہ مجھے ڈیوٹی کرنا ہے غلامی نہیں"۔ جعفر نے غصے میں کہا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے تحمل سے کہا

"تمہارا خون کچھ زیادہ ہی گرم لگتا ہے اے ایس پی۔ خیر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری ان فضول قسم کی تفتیشوں میں اپنا وقت ضائع کروں۔ میرے منشی سے بات کر لیا کرو اور جاؤ"۔

"اوکے میں چلتا ہوں لیکن ایک بات کہتا چلوں، وقت کسی کا نہیں ہوتا جب یہ ہاتھ سے نکلتا ہے، تب سمجھ آتی ہے"۔ جعفر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر باہر کی سمت چل دیا۔ چوہدری جلال اس کی طرف غصے سے دیکھتا رہا۔

چوہدری جلال ڈرائنگ روم ہی میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اتنے میں چوہدری کبیر اور منشی وہیں آ گئے تو چوہدری جلال ان کی طرف دیکھ کر دھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری حویلی میں کوئی معمولی افسر آ کر اونچی آواز میں بات کرے۔ مگر وہ اے ایس پی اتنی باتیں کر کے گیا ہے۔ بہت ایمان دار بنتا ہے۔ اس کی کیا جرأت تھی کہ یہ سب کہے لیکن اسے تو سلمٰی نے درخواست دی وہ کچھ زیادہ ہی پر پُرزے نہیں نکالنے لگی"۔

"اس کی جرأت صرف اور صرف فہد کی وجہ سے ہوئی ہے بابا، ورنہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ میں نے تو آپ کو کہا تھا کہ اس چڑیا ہی کو قید کر لیں مگر آپ نے......"

چوہدری کبیر کہتے ہوئے رُک گیا تو چوہدری جلال بولا۔

"مگر اس کی اوقات نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کا

حصہ بنے۔"

"میں کون سا اسے اپنے خاندان کا حصہ بنا رہا ہوں بابا۔ فہد جس کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا ہے میں نے تو وہ کاندھا قابو کرنا ہے بس"۔ چوہدری کبیر نے کہا۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں آتی ہے لیکن......"

چوہدری جلال نے کہنا چاہا مگر چوہدری کبیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ سوچتے ہی رہیں گے اور پانی سر سے گذر جائے گا۔ آپ اپنے ووٹوں کی سیاست کی سوچتے ہیں لیکن میں اس علاقے پر اپنی حکمرانی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ووٹ تو پھر بھی ہمیں ہی ملنے ہیں یہ لوگ پیار سے ماننے والے نہیں ہیں"۔

"تیرا کیا خیال ہے منشی؟" چوہدری جلال نے پوچھا تو منشی نے بلاتردد کہا۔

"نکے چوہدری جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ان پر اگر بھرپور وار نہ کیا گیا تو یہ ہماری جان کو آجائیں گے۔ سلمٰی کی شادی، اگر نکے چوہدری جی سے ہوگئی تو فہد کی چابی ہمارے ہاتھ آجائے گی اور وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ پھر یہ حالات ہی نہیں رہیں گے۔"

"کیا وہ ماسٹر مان جائے گا، وہ تو آرام سے نہیں مانے گا؟" چوہدری جلال نے پوچھا تو چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا۔

"اسے ماننا ہوگا، وہ جس طرح بھی مانے۔ آپ ایک بار بات کرلیں پھر میں اسے منالوں گا، مجھے اپنے طریقے سے منانا آتا ہے"۔

"ٹھیک ہے منشی، ابھی بلا اس ماسٹر کو، میں کرتا ہوں بات"۔ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چلا گیا تو منشی پلٹ گیا۔ کبیر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

چوہدری جلال اضطرابی انداز میں ٹہل رہا تھا کہ منشی کے ساتھ ماسٹر دین محمد اعتماد کے ساتھ اندر آگیا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو چوہدری جلال نے کہا۔ "خوش آمدید ماسٹر دین محمد خوش آمدید، آؤ بیٹھو۔ میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"میں یہیں کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔ آپ کہیں میں سن رہا ہوں"۔ ماسٹر دین محمد نے کسی تاثر کے بغیر کہا تو چوہدری جلال تحمل سے بولا۔

"ماسٹر دین محمد! غیروں جیسی باتیں مت کرو، ماضی میں جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ آؤ۔ بیٹھو! اور میری بات غور سے سن لو"۔

"ایسی بات کیا چوہدری۔ جس سے ماضی کی ساری باتیں بھلائی جاسکتی ہیں اور پھر...... کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم ماضی کی باتیں بھول جائیں؟" ماسٹر دین محمد نے سوال کیا تو چوہدری جلال نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوئے ماسٹر! تو نے ابھی سے ناراضگی والی باتیں شروع کردی ہیں۔ آؤ۔ ادھر آؤ۔ بیٹھو"۔

ماسٹر دین محمد کھڑا رہا، تو وہ اسے باور کرانے کے لیے بولا۔ "میں اپنے ساتھ بٹھا رہا ہوں۔ عزت اور مان دے رہا ہوں تمہیں، اپنے ساتھ بٹھا کر۔"

"چوہدری، سیدھا کہو تم کہنا کیا چاہتے ہو"۔ ماسٹر دین محمد بھی اکتائے ہوئے لہجے میں بولا تو چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

"تو پھر سنو! مانا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئیں لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں عزت دوں۔ تمہاری بیٹی سلمٰی اس حویلی کی بہو بن کر رہے"۔

"چوہدری! میں جانتا ہوں کہ صبر کیا ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صبر کی حد کیا ہوتی ہے۔ تُو کون ہوتا ہے کسی کو عزت دینے والا۔ عزت اور ذلت فقط میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے مجبور نہ کر کہ میں اپنا صبر توڑ دوں"۔ ماسٹر دین محمد سخت لہجے میں بولا

تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا۔

''میرے سامنے انکار کا مطلب تم سے زیادہ اچھی طرح اور کون جانتا ہے۔ تمہاری یہ تلخ بات میں اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ میں تم سے ناطہ جوڑنا چاہتا ہوں جا سوچ لے اور بہت اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لے۔ نکاح ہوتے ہی کروڑوں کی جائیداد سلمٰی کے نام کر دوں گا''۔

''چوہدری! اپنی حویلی میں بلا کر تم نے یہ بات کی۔ اچھا نہیں کیا۔ میرا جواب بھی سن لو۔ ہم مر تو سکتے ہیں لیکن تمہاری یہ بات نہیں مان سکتے''۔ ماسٹر دین محمد نے سخت لہجے میں کہا تو چوہدری جلال بولا۔

''ٹھنڈے دماغ سے سوچو ماسٹر ٹھنڈے دماغ سے، چند روپوں کی نوکری تلاش کرنے والی لڑکی کے دن پھر جائیں گے، کروڑوں کی جائیداد ملے گی۔ زندگی سنور جائے گی، اس کی بھی اور تیری بھی۔ جاؤ جا کر سوچو۔ ورنہ میں خود ہی تمہاری ہاں سن لوں گا''۔

''میرا آج بھی اور کل بھی یہی جواب ہے چوہدری۔ تم ......'' ماسٹر دین محمد نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''بس! جاؤ لے جاؤ منشی اسے اور سمجھاؤ۔ آنے والے دنوں میں کیا ہوگا اسے یہ بھی سمجھا دو''۔

یہ کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا۔ منشی اسے باہر کی جانب لے گیا۔ ماسٹر دین محمد نہایت افسردہ باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

چوہدری جلال لان میں بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔ چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں رکی اور وہ کار سے اتر کر سیدھا اپنے باپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ چوہدری جلال فون بند کر کے کہا

''کبیر! کہاں تھے، تم مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے''۔

''بابا! نور پور کے بھی اور یہاں کے بھی سارے معاملات کو دیکھنے کے لیے آپ ہی نے کہا تھا۔ وہی دیکھ رہا ہوں، مصروف تو ہونا ہی ہے۔ خیر آپ بتائیں کیا بات کرنا تھی''۔ چوہدری کبیر نے کہا

''دیکھو، میں نے تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا، تم جو مرضی کرتے رہے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے مشکل میں ڈال دو، تمہاری وجہ سے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں''۔ چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر بولا۔ ''ایسی بھی کیا بات ہوگئی بابا؟''

''میڈیا کی رپورٹ نے اپنا اثر تو کیا ہے نا پارٹی کی طرف سے پوچھ گچھ کی گئی ہے کہ معاملہ کیا ہے، یہ ذرا سی چنگاری بھڑک بھی سکتی ہے۔ اس لیے میں اب تمہیں سمجھا رہا ہوں جو قدم بھی اٹھاؤ وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھاؤ''۔

''بابا آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ جو سلمٰی نے ہماری ناک کے نیچے آفس کھول لیا ہے۔ یہ صرف آپ کی ڈھیل کی وجہ سے ہوا۔ آپ اب سیاست دان بن کر ہی سوچ رہے ہیں۔ اس علاقے کا بڑا زمیندار نہیں ورنہ یہ کبھی نہ کھلتا۔'' چوہدری کبیر نے غصے میں کہا۔

''تم رانی کے معاملے میں بے وقوفی نہ کرتے۔ یہی بات تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اور ایسے دفتر جو ہوتے ہیں نا ڈیرے داری کی طرح ہوتے ہیں۔ عوام چار دن کھا پی لے گی، پھر کون جائے گا ان کے پاس۔ کب تک چلا سکتے ہیں وہ ڈیرے داری''۔ چوہدری جلال نے کہا

''اگر ایسا ہی ہوتا نا تو پریشانی والی بات نہیں تھی۔ اس آفس کا باقاعدہ افتتاح ہے۔ پتہ ہے کون کرے گا؟'' چوہدری کبیر تشویش سے کہا۔

''کون ہے؟'' چوہدری جلال نے پوچھا۔

''ملک نعیم، وہی ملک نعیم جس کو آپ مات دیتے رہے ہیں۔ وہی آج ہمارے علاقے میں اپنی سیاست

چکانے کی کوشش میں ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا ہے"۔
چوہدری کبیر کے لہجے میں حقارت تھی تو چوہدری جلال بولا۔
"اس کی یہ جرأت ہوگئی"۔
"وہ چند دنوں میں یہاں آئے گا۔ عوامی حقوق کی نعرہ بازی میں لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکائے گا۔ بھوکے ننگے لوگوں کی باتیں کرے گا اور چلا جائے گا"۔ چوہدری کبیر نے یوں کہا جیسے ملک نعیم کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔
"کبیر! یہ صرف آفس ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے خلاف ایک مرکز بنایا جا رہا ہے۔ فہد بہت سوچ سمجھ کر چال چل رہا ہے۔ نذیر کی بیوی کے باعث وہ پہلے ہی لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہا ہے۔ یہ آفس نہیں ہونا چاہئے"۔ چوہدری جلال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا۔
"میں آج شام تک ہی....." اس نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے تیزی سے کہا۔
"نہیں کبیر۔ خود کچھ نہیں کرتے، یہ وقت ہوش کا ہے۔ جوش کا نہیں بلکہ چند دن صبر۔ فہد نے جو ماحول بنایا ہے نا وہ اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ نہ آفس رہے گا اور نہ ان کی سیاست اب کھیل میں مزہ آئے گا۔ انہیں لوگوں کی ہمدردیاں نہ لینے دو"۔
"وہ جو لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکائیں گے؟"
چوہدری کبیر نے حیرت سے کہا تو چوہدری جلال بولا۔
"اچھا ہے نا، ہماری دہشت کی بات ہی کریں گے۔ یہی وقت ہے جب لوگوں میں ان کے خلاف نفرت پھیلائی جا سکتی ہے، کرنے دو انہیں جلسے جلوس کرنے دو خیر! تم فریش ہو جاؤ پھر بتاتا ہوں کہ اب کیا کرنا ہے۔ منشی کو بھی بلوالو"۔
چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر اٹھ کر اندر چلا گیا۔

☆......☆......☆

ماسٹر دین محمد اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی منشی کی آواز آئی۔
"ماسٹر دین محمد، گھر پر ہی ہونا"۔
اس آواز کے ساتھ ہی منشی اندر آ گیا۔ اس نے دالان میں لیٹے ہوئے ماسٹر کو دیکھا اور اس کی جانب بڑھ گیا، پھر اس کے قریب بیٹھ گیا تو ماسٹر دین محمد نے یوں پوچھا جیسے خود پر قابو پا رہا ہو۔۔
"کیسے آئے ہو تم؟"
"یہی پوچھنے کہ تم نے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ چوہدری صاحب زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتے"۔ منشی نے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا
"اس نے اپنے گھر میں بلا کر ایسی گھٹیا اور نیچ بات کی تھی اور اب تم میرے گھر میں بیٹھ کر کمینی حرکت کر رہے ہو"۔
"سنو ماسٹر! کیا تو نہیں جانتا کہ تُو نے ذرا سی غلطی کی تھی اور تجھے بڑی سزا دی گئی۔ اب اگر کوئی ایسی بات کی تو یہ سزا تیری آئندہ نسل بھگتے گی۔ فہد کو پناہ دے کر تم نے اچھا نہیں کیا"۔ منشی نے کہا تو ماسٹر دین محمد بے خوف لہجے بولا۔
"وہ دن گزر گئے۔ اب مجھے اور میری بیٹی کو موت سے ڈر نہیں لگتا۔ چوہدری نے سکول بند کروایا، وہ اب کھل گیا ہے۔ تیرے چوہدری کی اب یہ اوقات نہیں کہ اسے بند کروا دے۔ کہہ دینا اپنے چوہدری کو اور سمجھا دینا اسے آئندہ ایسی فضول سوچ بھی نہ سوچے۔ ورنہ شریف آدمی جب اپنی آئی پر آ جائے تو تیرے چوہدری جیسے کئی بے غیرت بہا کر لے جائے"۔
"تُو نہیں جانتا۔ تیری بیٹی اگر کے چوہدری کی

دلہن نہ بنی تو اس کا حشر کیا ہوگا تیرے پاس یہی ایک موقعہ ہے۔ عزت سے اپنی بیٹی کو رخصت کر دے، ورنہ شاید اسے رانی کی طرح؟'' منشی نے دھمکی لگائی تو ماسٹر دین محمد نے غصے میں کہا۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ تو اچھا ہے، ورنہ ابھی تیرے جوتے مار دوں گا۔ دفعہ ہو جاؤ''۔

یہ سن کے منشی خباثت سے مسکرا دیا پھر اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ ماسٹر دین محمد نے بے بسی سے۔ آسمان کی طرف دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ دوبارہ لیٹ تو گیا لیکن کتاب نہ پڑھ سکا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ چوہدری نے مجھے ذلیل کرنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈا ہے۔ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ میں اپنی بیٹی انہیں کیسے دے دوں گا۔ نہیں وہ کوئی بہت گہری سازش کر رہے ہیں یا پھر وہ صفیہ کی مدد کرنے پر سلمیٰ کو انتقام کا نشانہ بنانا چاہ رہے ہیں۔ اب تو اس نے رانی کے بارے بھی اپنی آواز بلند کر دی ہے۔ ضرور یہ کوئی سازش ہے۔ میری پھول سی بیٹی! ان درندوں کے ظلم کا شکار ہو جائے، میں کبھی ایسے نہیں ہونے دوں گا۔

اس کے تصور میں ایک بھیانک منظر ابھرا۔ اس کی بیٹی سلمیٰ ایک صحرائی ویرانے میں درختوں کے درمیان اکیلی بھاگتی جا رہی تھی اور زور زور سے چیختے ہوئے پکار رہی تھی۔

''ابا! مجھے بچالو ابا مجھے بچالو مجھے بچالو''۔

ماسٹر دین محمد ایک دم سے چونکتے ہوئے بڑبڑایا۔

''نہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ صبر کی وہ حد آگئی ہے۔ جہاں زباں بندی جرم بن جاتی ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے فہد سے بات کرنی چاہئے''۔

یہ بڑبڑاتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے بھر گیا۔ وہ کچھ دیر ایسی کیفیت میں رہا اور پھر اچانک اپنا دل پکڑ کر رہ گیا۔

ماسٹر دین محمد بستر پر نڈھال پڑا ہوا تھا۔ سلمیٰ اور صفیہ اس کے پاس تھیں۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کراہتے ہوئے پوچھا

''فہد نہیں آیا ابھی تک؟''

''ابا! آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں آجائے گا وہ۔ آپ کتنی بار پوچھ چکے ہیں۔'' سلمیٰ نے دھیرے سے کہا

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ آئے گا۔ مجھے خود ہی جانا پڑے گا اس کے پاس''۔ ماسٹر دین محمد نے بے چارگی سے کہا۔ اتنے میں فہد دروازے میں نمودار ہوا تو صفیہ بولی۔

''وہ آگیا ہے فہد''۔

یہ سن کر ماسٹر دین محمد کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ فہد اس کے قریب آکر بولا۔۔

''حکم استاد جی۔ میں آگیا ہوں۔ لیکن آپ کو ہوا کیا ہے ایک دم سے؟''

''اچھا ہوا تو آگیا ہے پتر۔ میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔ اکیلے میں''۔ ماسٹر دین محمد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ اور صفیہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے اور وہ اندر چلی گئیں۔ تنہائی پاکر ماسٹر دین محمد نے کہا۔

''بیٹا! شاید چوہدری کوئی نئی سازش کر رہے ہیں۔''

''کیسی سازش، اور کیا۔ آپ مجھے کھل کر بتائیں۔''

فہد نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے حویلی میں بلوانے اور منشی کے آنے تک ساری بات اسے بتا دی۔ اس دوران فہد کا رنگ غصے میں سرخ ہوتا چلا گیا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''اپنی طاقت کے زعم میں یہ اس نے اچھا نہیں کیا استاد جی۔ میں اب تک بڑے صبر سے اس کا مقابلہ کرتا آیا ہوں۔ بات عزت تک آگئی ہے۔ اب وہ حد پار کر گیا ہے۔ اب صبر کرنا بزدلی ہوگی''۔

''صبر ہر حال میں کرنا ہے پتر اور خصوصاً اس وقت جب سامنے کوئی گھٹیا قسم کے دشمن سے ہوں''۔ ماسٹر دین محمد نے اس سے کہا تو وہ غصے میں بولا

''جیسے آپ کا حکم استاد جی، لیکن اتنی اجازت ضرور دیں کہ گھٹیا دشمن کو احساس ضرور دلاؤں کہ وہ کس قدر گھٹیا ہے۔ کمینے دشمن کے ساتھ اچھا سلوک، نیکی نہیں ہوتی''۔

''یہ تیری مرضی ہے پتر جیسے تُو چاہے لیکن سلمٰی کو بچا لو۔ وہ بڑا اوچھا وار کرنا چاہتے ہیں''۔

''میں جانتا ہوں استاد جی۔ یہ منافقت اسی دن سے شروع ہوئی تھی، جب سلمٰی نے مجھے یہاں آنے سے روکا تھا۔ میں نے بھی منفی پروپیگنڈا سنا ہے اور سن رہا ہوں۔ منافقوں سے نپٹنا مجھے آتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اپنا خیال رکھیں۔ میں یہ سب دیکھ لوں گا۔ اب یہ میرا معاملہ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے استاد جی کا ہاتھ تھپتھپایا اور اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ سلمٰی اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے بہت جلدی کی تھی۔

☆......☆......☆

چوہدری جلال اور بشریٰ بیگم حویلی کے اندرونی دالان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چوہدری جلال نے اپنی بیوی کے چہرے پر دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے بیگم! خیریت تو ہے نا، تم بہت اداس لگ رہی ہو؟''

''جی چوہدری صاحب! خیریت ہے۔ بس آپ کو ایسے لگ رہی ہوں''۔ بشریٰ بیگم نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ تو ہے۔ ویسے اگر تم نہ بتانا چاہو تو......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بس وہ سوچ رہی تھی کہ وہ ماسٹر دین محمد کی بیٹی ہے نا سلمٰی۔ اس نے عمر حیات والے گھر میں آفس بنا لیا ہے۔ اب باقاعدہ اس کا افتتاح بھی کرنے والی ہے۔ مجھے جہاں تک پتہ چلا ہے، وہاں بیٹھ کر یہ اعلان کر رہی ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرے گی۔ میں یہ سوچ رہی ہوں یہ سب وہ رانی کے لیے کر رہی ہے، یا اس کے ردعمل کے طور پر؟'' بشریٰ بیگم نے الجھتے ہوئے پوچھا تو چوہدری جلال مسکراتے ہوئے بولا

''وہ سلمٰی بے چاری، اپنا حق نہیں لے پائی، کسی کو کیا حق دلائے گی۔ یہ سب وہ فہد کے کہنے پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے''۔

''جو کچھ بھی ہے چوہدری صاحب، وہ گاؤں کی اتنی عورتوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' بشریٰ بیگم نے بتایا تو چوہدری جلال بولا۔

''ہاں مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اب اس کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی لمبی سازش ہو رہی ہے۔ خیر انہیں نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے''۔

''کیسی سازش کیا ہونے والا ہے؟'' بشریٰ بیگم نے چونکتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

''بیگم! میں کبیر کو صرف ایک جذباتی نوجوان سمجھتا تھا۔ لیکن اب پتہ چل رہا ہے وہ دور کی سوچتا ہے۔ اس نے جو سلمٰی کو اپنی دلہن بنانے کے لیے کہا ہے نا، تو بالکل درست کہا ہے۔ مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی شادی سلمٰی سے ہو جانی چاہیے''۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ کیا مان جائیں گے، ماسٹر دین محمد مان جائے گا جو ساری زندگی آپ کا عتاب سہتا رہا ہے؟'' بشریٰ بیگم نے حیرت سے پوچھا

''یہی تو بات ہے، وہ عتاب کیوں سہتا رہا۔ اگر اس میں ذرا سی بھی جان ہوتی تو یہاں سے چلا جاتا۔ اب

بھی وہ میری بات ٹال نہیں سکے گا۔ تم دیکھ لینا۔ ورنہ میں جو چاہوں وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔'' چوہدری نے غرور سے کہا تو بشریٰ بیگم بولی۔

''لیکن چوہدری صاحب، پہلے وہ اکیلے تھے۔ اب فہد ہے نا، ان کے ساتھ''۔

''جو میں سمجھتا ہوں۔ وہ تم نہیں سمجھ پاؤ گی بیگم، اب فہد کو اکیلا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب وہ سلمیٰ، عوام کی نہیں، ہماری خدمت کرے گی۔ تم دیکھنا، ان کے ساتھ ہوتا کیا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ مسکرایا تو۔ بشریٰ بیگم پریشان ہوگئی۔

وہ اس وقت باتیں کر رہے تھے جبکہ انہیں خبر نہیں تھی کہ حویلی کے باہر چینل کی وین پورچ میں آ رکی تھی۔ اس میں سے مائرہ کے ساتھ دوسرے لوگ اتر آئے تھے۔ انہیں ایک ملازم نے آ کر بتایا تو چوہدری جلال نے حیرت سے اسے دیکھا پھر بولا

''انہیں بٹھاؤ، میں آتا ہوں''۔

ملازم یہ سن کر واپس چلا گیا۔

چینل والے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان والے صوفے پر چوہدری جلال بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ نے اس سے سوال کیا۔ ''میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ رانی نامی جس ملازمہ نے آپ کی اس حویلی میں خودکشی کی، اسے آپ نے دفنانے کی اتنی جلدی کیوں کی؟''

''ہم نے تو اسے نہیں دفنایا۔ اس کے والدین آ کر اسے لے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں شرمندگی کی وجہ سے جلدی کی ہو کیونکہ اس نے چوری کی تھی''۔ چوہدری جلال نے بڑے تحمل سے جواب دیا تو مائرہ نے پوچھا

''کیا چوری کی تھی؟''

''یہی کچھ رقم تھی اور زیور، شادی قریب تھی نا اس کی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ہم اسے بیٹیوں کی طرح

رخصت کرتے۔ یہ حویلی کی روایات ہے''۔ وہ اعتماد سے بولا

''اسی گاؤں قسمت نگر کی لڑکی سلمٰی نے آپ کے بیٹے پر جو الزام لگایا ہے، اس میں کس حد سچائی ہے؟'' مائرہ نے سوال کیا تو چوہدری جلال بولا۔

''میرا چونکہ ایک سیاسی پس منظر ہے اور میرے مخالفین مجھ پر، میرے خاندان کے افراد پر، ایسے سنگین الزامات لگاتے رہتے ہیں۔ خودکشی کے فوراً بعد ہم نے پولیس کو بتایا، انہوں نے کارروائی کی''۔

''لیکن تفتیش سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس دن تھانے میں رپورٹ درج نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی ہسپتال سے میڈیکل رپورٹ لی گئی ہے۔ کارروائی پھر کیا ہوئی، کیا آپ غلط بیانی نہیں کر رہے ہیں؟'' مائرہ نے اسے گھیرا تو چوہدری جلال اسی تحمل سے بولا۔

''میں اس بارے کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے پاس اس کے ثبوت ہیں وہ میں آپ کو دکھا سکتا ہوں''۔

''یہ کاغذات آپ اپنے اثر و رسوخ سے بنوا سکتے ہیں''۔ مائرہ نے تیزی سے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

''اس پر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اب میں سیاست بھی تو اپنے اثر و رسوخ سے کر رہا ہوں۔ یہ صرف مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔ آپ خود جائیں اور تحقیق کریں''۔

''میں نے تحقیق کی ہے اور اس بنیاد پر آپ سے بات کر رہی ہوں۔ رانی آپ کے بیٹے کبیر کی ہوس کا نشانہ بنی ہے اور اسے قتل کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے صفیہ نامی خاتون کے شوہر کے قتل کا الزام آپ کے بیٹے پر ہے۔ جس کی باقاعدہ ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ اس پر آپ کیا کہیں گے؟'' مائرہ نے تلخی سے کہا تو چوہدری جلال غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا

''آپ اگر تحقیق کر چکی ہیں تو پھر آپ میرے پاس کیا لینے آئی ہیں۔ میں ان الزامات کا سامنا کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے مخالفین کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملے گا جس سے وہ میری سیاسی ساکھ کو خراب کر سکیں''۔

اس پر مائرہ سوال کرنے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ مائرہ نے حیران ہو کر دیکھا تو چوہدری جلال بولا۔

''بس بہت ہو چکے سوال، مجھے کچھ ضروری کام سے جانا ہے۔ باقی پھر سہی''۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ مائرہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر مایوسانہ انداز میں اٹھ گئی۔

قسمت نگر گاؤں کی ایک گلی میں کچھ لوگوں نے ایک لکھا ہوا بینر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اسے لگانا چاہ رہے تھے۔ ایک لڑکا دوسرے لڑکے کو صلاح دے رہا تھا۔

''ادھر ٹھیک ہے، ادھر لگا دیتے ہیں''۔

تبھی ان کے پاس سے ایک آدمی نے گزرتے ہوئے پوچھا۔

''اوئے لڑکو! یہ کیا کر رہے ہو؟''

''نور پور سے آنے والے مہمانوں کے لئے بینر لگا رہے ہیں''۔ لڑکے نے جواب دیا تو آدمی نے پوچھا

''کیا لکھا ہے اس پر؟''

''ہم ملک نعیم کی آمد پر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں''۔

یہ سن کر وہ سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ لڑکے چاچا عمر حیات والے اس گھر کے سامنے جھنڈیاں لگا رہے تھے جو اب سلمٰی کا آفس بن چکا تھا۔

سلمٰی اور صفیہ آفس میں تھیں۔ سلمٰی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھی ہوئی سامنے دھرے کاغذوں پر لکھ رہی تھی اور صفیہ ساتھ میں کھڑی تھی۔ باہر ہارن بجا تو سلمٰی چونک گئی۔ اس پر صفیہ نے کہا۔

''لگتا ہے فہد آیا ہے''۔

سلمٰی خاموشی سے لکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد فہد دروازے کے فریم میں آن کھڑا ہوا اور بڑے سنجیدہ لہجے

میں بولا

''اجازت ہے میں اندر آ سکتا ہوں؟''

سلمٰی نے اسے بڑی شاکی نگاہوں سے دیکھا، پھر سر کا اشارہ کر دیا۔ وہ آ کر کرسی پر بیٹھا تو سلمٰی نے صفیہ سے کہا۔

''تم جاؤ صفیہ۔'' پھر روئے سخن فہد کی طرف کر کے بولی ''یوں اجنبیوں کی طرح اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی''۔

''تم نے اپنے گھر میں آنے سے جو منع کر دیا تھا۔ سوچا کہیں یہاں بھی تو مجھ پر پابندی نہیں ہے۔'' فہد نے دھیمے لہجے میں کہا تو سلمٰی نے سکون سے کہا۔

''میں نے دل میں رہنے سے تو منع نہیں کیا نا اور آپ جانتے ہو''۔

''میں جانتا ہی نہیں، سمجھتا بھی ہوں۔ میں ایک بات تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم نے دنیا کے مطابق نہیں اپنے مطابق جینا ہے۔ دنیا تو سو طرح کی باتیں کرے گی اور جینے نہیں دے گی''۔ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ اچھا نہیں ہے، کسی کو بات کہنے کا موقع ہی نہ دیا جائے؟'' سلمٰی نے پوچھا۔

''ذرا سوچو سلمٰی! میرے آنے سے لے کر اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب اچانک کیوں؟ اسے سمجھو؟ کسی بدگمانی میں مت پڑنا ورنہ لمحوں کا فاصلہ صدیوں پر محیط ہو جائے گا۔ مت ڈرو۔ دنیا کیا کہتی ہے۔ بس ذرا وقت کا انتظار کرو''۔ فہد نے تحمل سے کہا تو سلمٰی بولی۔

''میں آپ سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتی۔ دور رہ کر بھی میں آپ کے ساتھ ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ آپ بھی مجھ سے غافل نہیں ہیں۔ اور مجھے یقین ہے یہ جدا جدا راستے ایک ہو جائیں''۔

''میں اس لیئے آیا ہوں کہ مائرہ، اپنی پوری ٹیم کے ساتھ یہاں قسمت نگر میں آ گئی ہے۔ اب وہ یہاں کچھ دن رہے گی، تمہارے گھر میں، تمہارے ساتھ''۔ فہد نے بتایا تو سلمٰی نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ گھر کیا اس کے شایانِ شان ہوگا وہ تو......''

''وہ ادھر اسی گھر میں رہے گی۔ بس تم اس کا خیال رکھنا''۔ فہد نے حتمی لہجے میں کہا تو سلمٰی بولی۔

''جیسا آپ چاہو۔ میں اس کا بہت خیال رکھوں گی''۔

''دوسری بات کہ تمہیں افتتاح پر رقم کی ضرورت ہوگی، یہ لو۔ اور رابطے کے لیے یہ سیل فون''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے نوٹوں کی گڈیاں اور فون میز پر رکھ دیا۔ اور پھر کھڑا ہوا۔ سلمٰی نے نوٹوں کو دیکھ کر پھر اس کی طرف حسرت سے دیکھ کر پوچھا۔

''یہ اتنی بڑی رقم اور فون؟''

''ہاں! یہ رکھو۔ میں چلتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سلمٰی اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہی وہ لمحات تھے جب اسے فہد پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ یہی تو وہ شخص تھا جس نے اسے اعتماد جیسی دولت سے نوازا۔ ایک دم ہی اس میں جوش بھر گیا۔ وہ اپنی حالت پر مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے صفیہ کو آواز دے کر بلایا۔ پھر خود ہی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

سلمٰی کے آفس کے دوسرے کمرے میں زمین پر دری بچھائے دو لڑکیاں بیٹھی کاغذ پر لکھ رہی تھیں۔ سلمٰی نے ان سے جا کر پوچھا۔

''فہرست تیار ہو گئی یا ابھی......''

''جی باجی، بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ ابھی مکمل ہو جاتی ہے۔'' ایک لڑکی نے سر اٹھا کر کہا تو سلمٰی خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''شاباش، جلدی کر لو۔ پتہ ہے دوپہر تک کام مکمل کرنا ہے، شام کو افتتاح بھی ہے''۔

لفظ اس کے منہ میں ہی میں تھے کہ صفیہ نے آ کر بتایا۔

''وہ باہر چینل والے آئے ہیں۔ تمہارے کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں''۔

''ادھر نہیں، میں ان کے پاس جاتی ہوں۔''

سلمٰی نے کہا اور فوراً اس طرف بڑھ گئی۔ مائرہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سلمٰی اسے والہانہ انداز میں ملتے ہوئے بولی۔

''بہت خوشی ہوئی تمہیں دوبارہ دیکھ کر''۔

''یقین جانو مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اب تو میں کچھ دن ادھر ہی رہوں گی''۔ مائرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو سلمٰی بولی۔

''ابھی فہد یہاں سے گئے ہیں۔ تمہارے بارے میں بتا کر، آؤ بیٹھو، نہیں بلکہ گھر ہی چلتے ہیں''۔

''وہ بھی چلے جائیں گے، پہلے تھوڑا سا کام کر لیں''۔ مائرہ نے کہا تو سلمٰی بولی۔

''جیسے آپ کی مرضی''۔

کچھ دیر بعد سلمٰی اور مائرہ آمنے سامنے بیٹھی ہوئیں۔ صفیہ ان کے پاس کھڑی تھی۔ کیمرہ مین نے اپنا کام کرنا تھا۔ تبھی مائرہ نے پوچھا۔

''رانی کے بارے میں آپ کا مؤقف کیا ہے۔ حویلی والے تو اس کی تردید کرتے ہیں''۔

''یہ حویلی والے اب تک ان بے زبانوں پر ظلم ہی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے رانی پر ظلم کیا، اس کے ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔ یہ ان کا کوئی پہلا ظلم نہیں ہے۔ نجانے کتنے ظلم کیے ہیں انہوں نے''۔ سلمٰی نے سخت لہجے میں جواب دیا تو مائرہ نے اگلا سوال کیا۔

''آپ نے یہ جو تنظیم بنائی ہے، اس کا بنیادی مقصد کیا ہے؟''۔

''یہاں کے لوگوں کو بتاؤں کہ ان کا حق کیا ہے۔ رانی جیسی عورتوں کے حق کے لیے میں نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے بھی پہلے میں اس خاتون صفیہ کو انصاف دلانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہوں۔ جس کے شوہر کو دن دیہاڑے چوہدری کبیر نے قتل کر دیا تھا''۔ سلمٰی نے کہا تو مائرہ نے پوچھا۔

''کیا آپ ظلم کے خلاف لڑ سکیں گی؟ آپ کے پاس کیا طاقت ہے؟''۔

''مجھے اب کوئی خوف نہیں ہے۔ کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں میں چاہے زندگی ہار جاؤں لیکن انہیں ہارنے نہیں دوں گی، جن عورتوں کا اب میں حوصلہ ہوں میں بھی اب ان ظالموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی''۔ سلمٰی نے جواب دیا

''کیا آپ تفصیل سے بتائیں گی کہ انہوں نے کیا ظلم کیے ہیں''۔ مائرہ نے پوچھا تو سلمٰی نے جرأت سے کہا۔ ''کیوں نہیں''۔ یہ کہہ کر وہ بتانے لگی۔ سلمٰی کے چہرے پر عزم جھلکنے لگتا تھا۔ اس دوران صفیہ نے بھی روتے ہوئے اپنا مؤقف ریکارڈ کروا دیا۔

سہ پہر ہو گئی تھی۔ سڑک پر گاؤں سے باہر فہد، چھاکا اور چند لوگ کھڑے تھے۔ ایک بزرگ بندے کے ہاتھ میں ہار تھا۔ وہ بھی راہ تک رہے تھے۔ فہد اس جانب دیکھ رہا تھا۔ سارے لوگ اسی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک سڑک پر کاروں کا قافلہ آتا ہوا دکھائی دیا، جو ذرا سی دیر بعد ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ایک کار میں سے ملک نعیم باہر نکلا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا۔ بزرگ آدمی نے اس کے گلے میں ہار ڈالا تو سب جلوس کی صورت میں چل پڑے۔

جیسے ہی وہ سلمٰی کے آفس کے سامنے پہنچے۔ وہاں کافی سارے لوگ ملک نعیم اور فہد یارے استقبالی لوگ نعرے لگ رہے تھے۔ ملک نعیم زندہ باد۔ دفتر کے باہر ربن لگا ہوا تھا۔ سلمٰی اور کچھ لوگ وہاں کھڑے تھے۔ ایک

لڑکی نے اس کی جانب پلیٹ میں رکھی قینچی بڑھائی۔ ملک نعیم نے ربن کاٹ دیا تو ہر طرف تالیاں بج اٹھیں۔ گھر کے صحن میں سٹیج بنا ہوا تھا۔ میز کے پار سلمیٰ، درمیان میں ملک نعیم اور گاؤں کا ایک بزرگ بندہ بیٹھ گیا۔

انہوں نے بڑا مختصر پروگرام رکھا تھا۔ پہلے سلمیٰ نے ڈائس پر آ کر اپنا مقصد بتایا اور پھر ملک نعیم اٹھ کر سٹیج تک آ کر بات کرنے لگا

"قسمت نگر کے معزز لوگو! میں یہاں کوئی سیاسی تقریر نہیں کرنے آیا۔ صرف اور صرف ان عظیم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے آیا ہوں۔ جنہوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ وہ بھی اس آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ کوئی انہیں غلام بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ ہمارے جمہوری ملک کی اصل طاقت عوام ہیں۔ جب تک عوام اپنے حقوق کا شعور حاصل کرے گی۔ اس وقت تک کسی بھی طرح کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ یہی شعور ایک محبِ وطن قیادت لے کر آئے گا۔ میں بھی آپ میں سے ہوں۔ ہم سب نے مل کر اس مشن کے لیے جدوجہد کرنی ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میں آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلوں گا"۔

وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بجائیں تو وہ سٹیج سے واپس آیا گیا۔ ملک نعیم زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔

وہ لوگوں میں آ گیا اور ان سے ہاتھ ملاتا رہا۔ وہ کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر اپنے ساتھ آئے قافلے کے ساتھ چلا گیا۔

شام ڈھل کر رات میں بدل گئی تھی۔ ماسٹر دین محمد کے ساتھ سلمیٰ اور مائرہ، تینوں صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے سارے کاموں سے فارغ ہو کر صرف گپ شپ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماسٹر دین محمد کہہ رہا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے بیٹی، مجھے بہت اچھا لگا کہ تم نے ہمارے گھر کو رہنے کے لیے پسند کیا۔ جیسا بھی ہے، اس میں تمہارے رہنے کے لیے وہ سہولیات تو نہیں ہوگی"۔

"انکل، گھر مکینوں سے ہوتا ہے۔ بندہ وہیں رہنا پسند کرتا ہے جہاں وہ سکون محسوس کرے۔ آپ سے مل کر، سلمیٰ سے مل کر، مجھے بہت سکون کا احساس ہوا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔ "اور دوسری بات انکل؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، گھر مکینوں ہی سے بنتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے بیٹی کہ تم نے جو بتایا کہ اس علاقے کی رپورٹ بناؤ گی تاکہ یہاں کا حال بیان کر سکو، یقین جانو تم وہ کام کر رہی ہو جو ان لوگوں کو کرنا چاہئے تھا جو یہاں کے نمائندے بن کر ایوانوں میں جا کر بیٹھے ہوئے ہیں"۔ ماسٹر دین محمد نے دکھی لہجے میں کہا تو سلمیٰ بولی

"وہ کیوں علاقے کی ترقی چاہئیں گے اس طرح تو ان کی علاقے پر حاکمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں کے لوگ ان کے شکنجے سے نکل جائیں گے"۔

"سلمیٰ تمہارے خیال میں اس کا حل کیا ہے؟" مائرہ نے پوچھا

"سمپل، عوام کے نمائندے وہ لوگ ہوں، جو ان کے مسائل حل کریں۔ کوئی مسائل حل کرنے کی سوچے گا تو حل ہوں گے نا"

اس دوران ماسٹر دین محمد چائے کا خالی کپ قریب پڑی میز پر رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"لو پتر، تم کرو باتیں، میں نماز پڑھ کر آتا ہوں"۔

وہ اٹھ کر باہر کی جانب گیا تو مائرہ بولی۔۔ ''پچھلی بار جب میں آئی تو بہت افراتفری میں تھی۔ اس بار بھی کچھ ایسے ہی تھا۔ لیکن پھر بھی میں تمہارے لیے کچھ گفٹ لانا نہیں بھولی۔ مجھے امید ہے تمہیں پسند آئیں گے''۔

''مائرہ، تمہاری مہربانی کہ تم نے مجھے یاد رکھا۔ تمہارے آنے سے ہمیں بہت سہارا ملا ہے، ورنہ یہ چوہدری اپنی گھناؤنی سازش میں کامیاب ہو جاتے''۔ سلمیٰ نیم ممنونیت سے کہا تو مائرہ بولی۔

''اب ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ میں پوری دنیا کو ان کا اصل چہرہ دکھاؤں گی کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ خیر چھوڑو یہ تو ہوگا اور مل کر ہی کریں گی۔ کوئی اور بات نہ کریں''۔

''مثلاً کیس باتیں؟'' سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو مائرہ نے بے تکلفی سے کہا۔

''کچھ اپنے بارے میں کہو کچھ میرے بارے میں پوچھو۔ دیکھو، ہم دوست تو بن گئی ہیں لیکن ایک دوسرے کے بارے ہم اتنا نہیں جانتیں''۔

''ہاں یہ تو ہے۔ چلو جان لیتی ہیں ایک دوسرے کے بارے میں''۔ سلمیٰ نے کہا تو اس پر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔

☆......☆......☆

تھکا ہوا، چھاکا صحن میں بچھی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اندر سے چاچا سوہنا نکلا۔ وہ خوب تیاری کیے ہوئے تھا۔ صاف ستھرے کپڑے، پگڑی وغیرہ باندھی ہوئی تھی۔ وہ آ کر چھاکے کے پاس بیٹھ گیا تو چھاکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ابا! خیر تو ہے یہ ٹھور شھور نکال کر، سرمہ ڈال کر کسی میلے میں جا رہا ہے؟''

''نہ، تو مجھے یہ بتا دعوے تو یہ کرتا ہے کہ پورے علاقے میں تیری دس پچھ ہے، تجھے پتہ ہے اس علاقے میں کوئی میلہ ہے؟'' چاچا سوہنا مصنوعی غصے میں بولا تو چھاکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میلہ تو نہیں ہے، پر یہ تیری تیاری ایویں ہی مغالطے میں ڈال رہی ہے نا''۔

''میں پتر کسی میلے پر نہیں اپنی نوں (بہو) تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا ہے اب تیرا ویاہ کر دوں۔ عورت کے بغیر گھر کتنا سونا سونا سا لگتا ہے''۔ چاچا سوہنا مسکراتے ہوئے بولا چھاکے نے حیرت نے پوچھا۔

''ابا تجھے خیر تو ہے یہ کیسی باتیں کرنے لگ گیا ہے؟''

''میں کلا رہ گیا ہوں پتر، جو باتیں میں ادھر اُدھر سے سن رہا ہوں نا وہ بڑی خطرناک ہیں۔ ٹھیک ہے سکول کھل گیا ہے تو چوہدری ایویں ہی چپ نہیں کر گئے، اس خاموشی کے بعد بڑا طوفان آنے والا ہے''۔ چاچے سوہنے نے تشویش سے کہا تو چھاکا بولا۔

''او ابا، تو ایویں ہی ڈر رہا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اس دن چوہدری مجھے مار دیتے تو کیا ہوتا؟ تو اب عیش کر، جہاں تاش کی پانچ بازیاں لگاتا ہے نا، وہاں دس لگایا کر۔ میں نہیں پڑھ سکا ابا تو آنے والی نسل تو پڑھے گی نا''۔

''پتر مجھے کلا نہ کر جائیں''۔ چاچا سوہنا جذباتی ہو کر بولا۔

''تجھے کلا ہونے کا اتنا ہی ڈر ہے نا تو سکول کے سامنے بیٹھ کر آلو چھولے بیچا کر، تیرا کچھ تو فائدہ ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پوچھا، ''کدھر ہے میرا شہزادہ؟''

تبھی قریب ہی کہیں مرغا بول دیا تو چاچا سوہنا ہنستے ہوئے بولا۔

''لے سن لے''۔

چھاکا اپنے مرغے کی طرف بڑھ گیا تو چاچا سوہنا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ چوراہے کی طرف تھا۔

چوراہے میں چاچا سوہنے کے اردگر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تاش کھیل رہا تھا۔ اردگرد لوگ بیٹھے ہوئے کھیل بھی دیکھ رہے تھے اور تبصرے بھی کر رہے تھے۔ حنیف دوکاندار بھی باہر نکل کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کے ساتھ اس کی درمیان باتیں چل رہی تھیں۔

''او یار! جب سے یہ فہد آیا ہے نا گاؤں میں کوئی نہ کوئی نئی بات ہی ہو رہی ہے۔ اللہ خیر ہی کرے''۔ حنیف دوکاندار نے کہا تو سامنے والے بندے نے پوچھا

''اب کیا کر دیا اس نے؟''

''دیکھو یار۔ ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے کوئی دفتر کھول لیا ہے۔ وہ بھی عوام کے لیے۔ اب وہ بھلا عوام کے لیے کیا کر سکے گی جو خود اکیلی نور پور تک سفر نہیں کر سکتی''۔ حنیف دوکاندار نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ آدمی بولا۔

''اس میں فہد کہاں سے آ گیا''۔

''او پاگل! وہ بھی تو ماسٹر دین محمد کے گھر رہتا ہے۔ اس کی پڑھائی پٹیوں پر ہی وہ چل رہی ہے۔ سنا ہے سلمٰی کے ساتھ اس کا بہت زبردست عشق چل رہا ہے، ورنہ اس کی جرأت کہاں تھی۔ پہلے یوں دیکھا تھا اس کو''۔ حنیف دوکاندار نے سمجھایا تو آدمی بولا

''بس یار، مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے، گاؤں میں کوئی طوفان ہی نہ آ جائے وہ بار بار چوہدری کو ہی للکار رہے ہیں''۔

تبھی چاچا سوہنا تاش ایک طرف رکھ کر بولا۔ ''تو کیوں ڈر رہا ہے۔ تیرا کسی طوفان سے کیا لینا دینا، تیرے جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ کسی کا درد، کسی کا احساس کوئی کوئی جانتا ہے۔ اگر تم لوگوں کا احساس کرنے والا کوئی آ ہی گیا ہے تو اسے پہچانو''۔

''چاچا یہ تُو کیا بات کر رہا ہے؟'' حنیف دوکاندار نے کہا تو چاچا سوہنا بولا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ شعور وہیں آتا ہے جہاں انقلاب آنا ہو۔ اس بات کو سمجھ۔ اور چھوڑ دے فہد کی مخالفت۔ تیرے یہ چوہدری تجھے بچانے نہیں آئیں گے۔ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے''۔

''یار! کل گاؤں میں ملک نعیم آ کر چلا گیا۔ اوئے مجھے ایک بندے نے بتایا ہے کہ اس کی اور چوہدریوں کی آپس میں بڑی مخالفت ہو گئی۔ اپنے اس نذیرے کے معاملے میں وہ صفیہ کی حمایت کر رہا ہے۔ اسی لیے تو وہ فہد کے پاس آیا تھا''۔ پاس بیٹھے آدمی نے بتایا تو ایک دوسرے آدمی نے کہا۔

''یار اگر چوہدریوں کی مخالفت ہے تو پھر یہاں کے حالات بھی اچھے بھلے خراب ہو جائیں گے''۔

''اُو حالات کیا خراب ہونے ہیں۔ انہوں نے ملک نعیم کے یہاں آنے کو اہمیت ہی نہیں دی۔ ورنہ اگر وہ چاہتے تو وہ یہاں آ کر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری ایسے بھی نہیں ہیں کہ اپنے مخالف کو نظر انداز کر دیں۔ یہ جو خاموشی ہے نا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی طوفان ہو گا۔ دیکھ لینا تم چند دنوں ہی میں دیکھ لینا''۔ حنیف دوکاندار نے کہا تو چاچا سوہنا تڑپ کر بولا۔

''اوئے سنو اوئے! جو طوفان آئے گا، اسے بھی دیکھ لیں گے۔ تم یہ بتاؤ، وہ جو باتیں کر کے گیا ہے۔ وہ کیسی تھیں۔ یار، عجیب بے وقوف آدمی ہو، کیا چوہدریوں کا ظلم کرنا ہی لکھا ہے۔ وہ کون سی آسمانی مخلوق ہے جو ہم غریبوں پر ظلم ہی کرتے رہیں اور ہم ظلم سہتے رہیں اور تیرے جیسے منافق لوگ ان کی خوشامد ہی نہیں، ان کے خوف سے ڈراتے رہیں۔ چوہدری کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہیں کہ ان کی مخالفت نہ کی جا سکتی ہو''۔

''نہیں باتیں تو اس کی ٹھیک ہیں۔ مگر ان سیاست دانوں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ ان پر عمل کم ہی ہوتا ہے''۔

حنیف دوکاندار نے دھیمے لہجے میں کہا تو چاچا سوہنا بولا۔
''اگر طوفان کی جگہ ملک نعیم لوگوں کے کام آنا شروع ہوجائے تو کیسا ہے؟''
''پھر تو چاچا ہمارے سارے مسئلے ہی نہ حل ہو جائیں''۔ پاس بیٹھے آدمی نے کہا تو چاچا سوہنا بولا۔
''تو بس پھر اس بات کو سوچو۔ غور کرو اس بات پر''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے پتے اٹھائے اور کھیل میں مصروف ہوگیا۔ لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے جس نے آج چوراہے میں بیٹھ کر چوہدریوں کی بھرپور مخالفت کردی تھی۔

☆......☆......☆

رات کے اندھیرے میں کاشی سڑک پر اپنی گاڑی بھگائے لے جارہا تھا۔ ایسے میں ڈیش بورڈ پر پڑا اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون اٹھایا اور اسکرین پر دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔
''جی چوہدری صاحب، اتنی رات کو یاد کرلیا؟''
دوسری طرف چوہدری جلال حویلی کے کاریڈور میں کھڑا فون کررہا تھا۔
''بول کاشی۔ کیا بات ہے۔ جو فون نہیں کیا۔ کیا میرا کام یاد نہیں ہے تمہیں؟''
''میں نے سب طرح کا جائزہ لے لیا ہے۔ صرف دو دنوں میں کسی بھی وقت گاؤں سے باہر فہد کا کام ہو جائے گا''۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال بولا۔
''ہاں اس کا کام اب ہوجانا چاہئے بہت دن دے دیئے اسے''۔
''میرا کام کب ہوگا، چوہدری صاحب؟'' کاشی اپنے مطلب پر اتر آیا تو چوہدری جلال نے دبے دبے غصے میں کہا۔
''تمہارا کام بھی سمجھ ہوگیا، بس علاقے میں یہ افواہ

ارشاد باری تعالیٰ

☆ کسی کو دکھ دے کے مجھ سے اپنے سکھ کی امید مت کرنا لیکن اگر تم کسی کو ایک پل کا سکھ دیتے ہو تو اپنے دکھ کی فکر مت کرنا۔

(فاطمہ)

بھی نہیں اُڑنی چاہئے کہ اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی تعلق ہے''۔
''کیا یہ آپ کی شرط ہے، میرے کام کے معاملے میں کہ میں کام کروں گا تبھی آپ میرا کام کریں گے؟'' کاشی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں شرط نہیں میں ابھی اوپر بات کرتا ہوں بس بہت محتاط ہوں تمہارا کام ہوگیا ہے سمجھو''۔ چوہدری جلال نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو کاشی بولا۔
''آپ جانیں اور آپ کی احتیاط۔ میں کام کر دوں گا۔ آپ بھی میرا کام کردیں۔ باتیں نہیں صرف کام''۔
''کہا ہے نا، ہوجائے گا۔ تم اپنا کام کرو، اوپر سے الیکشن بھی آنے والے ہیں''۔ چوہدری جلال نے کہا
''تو ٹھیک ہے آپ کا کام بھی سمجھو ہوگیا''۔ کاشی نے حتمی انداز میں کہا اور فون بند کردیا۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ آگئی تھی۔
چوہدری جلال کاریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں چوہدری کبیر باہر جانے کے لیے نکلا تو اپنے باپ کو دیکھ کر اس بڑھ گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر چوہدری جلال نے کہا
''ابھی کاشی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ دو دن میں فہد کا کام ہوجائے گا''۔
''یہ اس کی سزا تو نہ ہوئی نا، ایک دم ختم ہو جائے گا۔ میں سلمیٰ سے شادی کرکے اسے بتانا چاہتا ہوں کہ

جب ہم دشمنی کرتے ہیں تو وہ نسلوں تک جاتی ہے۔ میں اسے تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں"۔ چوہدری کبیر نے نفرت سے کہا۔

"وقت اور حالات کی نزاکت یہی ہے بیٹے۔ ملک نعیم کا اس علاقے میں اترنا خطرے کا بہت بڑا الارم ہے، مسائل بڑھ جائیں گے"۔ چوہدری جلال نے اسے سمجھایا تو چوہدری کبیر بولا

"محض سلمیٰ کو حاصل کرنا میری ضد نہیں ہے۔ میں فہد کے ساتھ علاقے کے لوگوں کو بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری خاموشی، ہماری کمزوری نہیں ہوتی"۔

"دیکھو! فہد کے بعد تم جو چاہو کرو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اب یہ فیصلہ تمہارا ہے۔ پہلے کیا کرنا ہے۔ سلمیٰ سے شادی یا پھر فہد"۔ چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر بولا

"چلیں بابا۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ آپ نے جو کہہ دیا ٹھیک کہہ دیا"۔

"یہ ہوئی نا بات۔ کاشی کو اپنا کام کرنے دو پھر دیکھتے ہیں"۔ بیٹے باپ کے کہنے پر چوہدری کبیر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر مڑ کر پورچ کی جانب چلا گیا۔

باپ بیٹے کو خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے عقب میں بشریٰ بیگم کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف زدہ حیرت چھائی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

دن کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جعفر ابھی آفس نہیں پہنچا تھا۔ ملک نعیم اور شیخ آفتاب اس کے آفس میں دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ملک صاحب۔ آپ نے وہاں کی ساری روداد سنا دی۔ ٹھیک ہے، لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ فہد نے وہاں بہت کام کیا ہے۔ اب آگے کا بھی تو سوچنا ہے،

کیا پلاننگ ہونی چاہیے۔ وہاں پر ہم نے بزنس ہی نہیں کرنا ووٹ بھی لینے ہیں۔ اور اس کا سارا دارومدار فہد پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ چوہدری جلال کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا۔ اب فہد کی حفاظت بہت ضروری ہو گئی ہے"۔ شیخ آفتاب نے دوراندیشی سے کہا

"یہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک چوہدری جلال نے اسے ڈرایا دھمکایا ہی ہے لیکن فہد بہت حوصلہ مند جواں نکلا۔ وہ مضبوطی سے ڈٹا رہا ہے لیکن کب تک شیخ صاحب۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں"۔ ملک نعیم نے بتایا

"جنگ وسائل سے نہیں جیتی جاتی ملک صاحب! اس کے لیے حوصلہ اور دفاع چاہیے۔ اگر وہ فہد کو راستے سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر......؟" شیخ آفتاب نے سوال اٹھایا۔

ملک نعیم بولا۔

"ہمارا وہاں سب کچھ ختم ہو جائے گا"۔

"تو پھر سوچیے۔ یہاں سے بندے بھجیں یا وہاں سے تیار کریں۔ فہد کے گرد ایک حفاظتی حصار بنانا ہوگا۔ اور میں نے یہی بات کرنے کے لئے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی کہ ہم اے ایس پی صاحب سے اس سلسلے میں بات کریں"۔ شیخ آفتاب نے احساس دلایا تو ملک نعیم۔۔نے سوچتے ہوئے کہا

"کیوں نا یہ بات فہد سے کر لی جائے۔ وہ جو مناسب ہوگا، ہمیں بتائے گا۔ ہم اس کے لیے کریں گے"۔

"جیسے آپ چاہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اے ایس پی سے بات کریں۔ اس کے نوٹس میں یہ بات ہونی چاہئے۔ وہ تعاون کر رہا ہے، کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہئے"۔

شیخ آفتاب کے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد جعفر اپنے آفس میں آ گیا تو دونوں سے بڑے تپاک سے ملا۔ بہت دیر باتوں کے دوران انہوں نے یہ خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔ جعفر نے سنا اور ان کی پوری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے تو جعفر نے فون اٹھا لیا۔

اس وقت فہد اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اس کا فون بج اٹھا۔

''ہاں بول، جعفر کیا بات ہے؟'' فہد نے خوشگوار انداز میں کہا تو جعفر سنجیدگی سے بولا۔ ''کیسے ہو، کیسا چل رہا ہے، تم آئے ہی نہیں صفیہ کی پیشی پر؟''

''بس یار ادھر ایک کام آ گیا تھا''۔ اس نے بتایا تو جعفر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا بات سن، آج ملک نعیم سے بات ہوئی تو اس نے ایک خدشہ ظاہر کیا، جو بہر حال درست بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری تجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں''۔

''او یار ان کا بس چلے تو مجھے ابھی ختم کر دیں۔ کوئی نئی بات بتا''۔ فہد نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''نہیں، میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں بالکل سیریس ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تُو بہت محتاط رہا کر۔ اگر کہو تو میں کچھ بندے......''

''او یار چھوڑ جو تھوڑی بہت آزادی ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ تُو کب آ رہا ہے میرے پاس؟'' فہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا

''دل تو بہت کرتا ہے کہ تیرے ساتھ رہوں۔ یہ ذرا معاملہ ختم ہو جائے تو پھر کھل کر تجھے ملا کروں گا۔ سنا مائرہ کدھر ہے وہ؟'' جعفر اس کی بات سمجھتے ہوئے بولا تو فہد نے بتایا۔

''سلمیٰ کے پاس اس کے گھر، باقی لوگ میرے پاس''۔

''اچھا آنا نور پور تو سلمیٰ کے ہاتھ کے دو چار پراٹھے تو لے آنا''۔ جعفر نے شوخی سے کہا تو فہد ہنستے ہوئے بولا

''تُو بھی بس''۔

اس پر دونوں ہنستے ہیں۔

☆......☆......☆

بشریٰ بیگم کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ جب حویلی سے کار نکالی تو اس نے ڈرائیور کو نہیں بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ راستے میں وہ اسے بتاتی گئی یہاں تک کہ سراج کا ڈیرہ آ جانے پر اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''گاڑی روکو''۔

اس نے فوراً کار روک دی۔ بشریٰ بیگم نے غور سے دیکھا۔ اسے کچھ دور فہد اور سراج بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ وہ گاڑی سے اتری اور ان کی جانب بڑھ گئی۔

فہد اور سراج درختوں کی چھاؤں میں چارپائیوں پر آمنے سامنے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ بشریٰ بیگم کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر چونک اٹھے۔ بشریٰ بیگم ان کے قریب آ کر رک گئی تو سراج نے حیرت سے کہا۔

''چوہدرانی جی آپ؟''

''ہاں میں چوہدرانی بشریٰ بیگم، میں فہد سے ملنے آئی ہوں''۔ بشریٰ بیگم نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تبھی فہد نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

''جی بولیں، میں سن رہا ہوں''۔

''بات صرف اتنی ہے بیٹا! پتہ نہیں تم میری بات پر یقین کرو بھی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ میرے سینے میں بھی اک ماں کا دل دھڑک رہا ہے۔ بیٹے! کیا یہ عقل مندی نہیں کہ طوفان آنے سے پہلے خود کو محفوظ کر لیا جائے''۔ بشریٰ بیگم نے سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا

تو فہد بڑے تحمل سے بولا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن جو طوفان میں گھر چکے ہوں۔ ان کا کیا کیا جائے اور جن لوگوں نے طوفان اٹھایا ہوا ہے، انہیں بھی روکنا ہے، طوفان تبھی تھمے گا''۔

''میں طوفان سے ہونے والی تباہی سے ڈرتی ہوں۔ وہ چاہے کسی کی بھی ہو۔ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ طوفان ہی نہ آنے دیا جائے''۔ بشریٰ بیگم نے پوچھا جسے سمجھتے ہوئے فہد نے کہا۔

''کیا چاہتی ہیں آپ، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، یہاں سے چلے جاؤ۔ سلمٰی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ ایک ماں ہونے کے ناطے میں وعدہ کرتی ہوں تم جو چاہو گے وہی ہوگا''۔ اس نے کہا تو فہد نے سکون سے کہا۔

''اس کے لیے تو بڑا وقت درکار ہے۔ میں پہلے ہی بہت انتظار کر چکا ہوں۔ یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں''۔

''بیٹے بات سمجھنے اور سمجھانے میں تھوڑا وقت لگتا ہے نا اور طاقت تو ویسے بھی اندھی ہوتی ہے۔ میں......'' بشریٰ بیگم نے کہنا چاہا لیکن فہد اس کی بات کاٹ کر جذباتی لہجے میں بولا

''اندھی طاقت کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں، جب کوئی اسے روکنے والا سامنے آ جائے۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ چوہدرانی جی آپ ظلم ہوتا تو دیکھ سکتی ہیں۔ مظلوم اگر کھڑا ہو جائے تو اسے یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ آپ اپنے بیٹے اور شوہر کو سمجھائیں۔ میں آپ کی بات مان بھی لوں تو کیا وہ آپ کی مان جائیں گے؟''

''بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ تم لمبی عمر گذارو۔ تم سمجھ دار ہو۔ سلمٰی ابھی......'' بشریٰ بیگم نے کہا تو فہد نے غصے میں کہا۔

''آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔ وہ بھی موت سے۔ میں بہت پہلے بچپن میں مر گیا تھا۔ ظالموں کا ساتھ دینے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔ آپ مجھے نصیحت نہ کریں اور نہ مشورہ دیں۔ بلکہ دیکھیں ظالموں کے ساتھ ہوتا کیا ہے، کیا میرے ماں باپ نہیں تھے، کیا قصور تھا؟ میرا، امین نذیر، رانی ان کا کیا قصور تھا ہے جواب آپ کے پاس؟ نہیں نا، تو اپنوں کو روکیں، مجھے نہیں''۔

''لیکن بیٹا اگر ہم......''

''نہیں چوہدرانی جی نہیں، جب رانی کو بے عزت کر کے مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تب آپ کہاں تھیں؟ حویلی ہی میں تھیں۔ آپ کا پتر آپ کی بات مان گیا تھا؟ اگر وہ نہیں مانا تھا تو مجھ سے بھی کوئی امید نہ رکھیں۔ جائیں'' فہد نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو بشریٰ بیگم نے انتہائی افسوس بھرے انداز میں اسے دیکھا اور پھر اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے واپس چل دی۔

وہ کار میں بیٹھ کر چلی گئی تو سراج نے دھیرے سے کہا

''لگتا ہے، چوہدری کوئی گہری چال چلنے والے ہیں۔ ورنہ یوں چوہدرانی کو نہ بھیجتے''۔

''سراج، جب ان کی جان پر بنتی ہے نا تو یہ غریب کے پاؤں بھی دھو کر پی جاتے ہیں۔ اس بات کو سوچو، جب رانی کی عزت اس بے غیرت کبیر نے پامال کی تھی یہ اس وقت کہاں تھی، آج یہ طوفان سے ڈرانے آ گئی ہے''۔ فہد نے غصے میں کہا تو سراج ہل کر رہ گیا۔ پہلی بار اسے فہد کی نفرت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

''چل چھوڑ۔ گھر چلیں، نور پور بھی تو جانا ہے''۔

''ہاں چل''۔ فہد نے اٹھتے ہوئے کہا تو دونوں ڈیرے سے چل پڑے۔

فہد گھر سے نکل کر اپنی گاڑی کے قریب آ کر بیٹھنے لگا تو چھاکا اندر سے آ کر بولا۔

''یہ اپنی ڈاک تو لے لو۔ جو پوسٹ کرنی ہے۔ ورنہ آج پھر رہ جانی تھی''۔

''او یار! اچھا ہوا تُو نے یاد دلا دیا ورنہ نور پور جا کر یاد آتا''۔ فہد نے کہا اور لفافے پکڑ کے ڈیش بورڈ پر رکھے پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کر کے بڑھا دی۔

اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ کاشی موٹر سائیکل پر سوار گلی کی نکڑ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ فہد کی کار قریب سے گذر گئی تو کاشی بھی اس کے پیچھے نکل پڑا۔

فہد پہلے سلمٰی کے آفس گیا جہاں لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ صفیہ تیار ہوئی کھڑی تھی۔ سلمٰی میز پر بیٹھی کاغذ پر لکھ رہی تھی۔ وہ لکھ چکی تو کاغذ صفیہ کی جانب بڑھا کر بولی

''صفیہ اگر ممکن ہو یا پھر تمہیں کچہری سے وقت مل جائے تو آتے ہوئے نور پور سے یہ چیزیں لیتی آنا''۔

صفیہ نے کاغذ پکڑ لیا تو سلمٰی نے کچھ رقم بھی دراز سے نکال کر دی۔ وہ بھی صفیہ نے پکڑ لی۔ پھر مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔

''پڑنی تو پیشی ہے۔ نجانے مقدمہ کب شروع ہو گا؟''

''اللہ کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس بار دیکھ لو، پھر ہم خود ملک نعیم سے بات کریں گے۔ وکیل بدل دیں گے''۔ سلمٰی نے اسے سمجھایا تو صفیہ بولی۔

''دیکھیں۔ کیا ہوتا ہے۔ وکیل بے چارہ تو بڑی کوشش کر رہا ہے''۔

وہ کہہ رہی تھی کہ دروازہ ہلکا سا بجا ہے اور فہد اندر آ کر بولا۔ ''صفیہ تم تیار ہو، چلیں''۔

''میں جی تیار ہوں بس آپ کا انتظار کر رہی تھی''۔ وہ آنچل سنبھالتے ہوئے بولی تو سلمٰی نے ہچکچاتے ہوئے کہا

''فہد! اگر میں کہوں کہ آج آپ نہ جاؤ تو......؟''

''کیوں میں کیوں نہ جاؤں''۔ فہد نے پوچھا

''آج نور پور سے محکمہ تعلیم کے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون آیا تھا ان کا۔ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ سراج کو بھیج دیں صفیہ کے ساتھ؟''

''میں دیکھتا ہوں''۔ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سلمٰی نے تیزی سے کہا۔

''آپ سراج بھائی سے کہہ دیں وہ چلے جائیں گے۔ آپ ٹالیں نہیں نا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے''۔

''اچھا، میں دیکھتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلا گیا تو صفیہ بھی پیچھے چلی گئی۔ سلمٰی متذبذب سی بیٹھ گئی۔

قسمت نگر سے باہر جانے والی سڑک کے کنارے کاشی گھات لگائے موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سڑک پر فہد کی گاڑی آ رہی ہے۔ جیسے جیسے کار نزدیک آ رہی تھی، کاشی مضطرب ہو رہا تھا۔ کاشی الرٹ ہو گیا۔ فہد کی گاڑی گذری تو اس نے موٹر سائیکل پیچھے لگا دیا اور اس کے ساتھ ہی ریوالور نکال لیا۔ وہ گاڑی کے قریب ڈرائیونگ سائیڈ سے پہنچا اور ریوالور سیدھا کیا۔ تبھی وہ چونک گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سراج تھا جس کی نگاہ ریوالور پر پڑی۔ کاشی نے کار میں جھانکا، فہد نہیں تھا۔ اس نے موٹر سائیکل آہستہ کر لی اور ایک دم سے پیچھے رہ گیا۔ سراج گاڑی بڑھاتا لے گیا۔

سراج کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک اجنبی کس مقصد کے تحت ان کے قریب آیا اور پھر پلٹ گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی صفیہ بھی سمجھ گئی تھی۔ سراج نے فون نکالا اور فہد کو کال کی۔ فہد اس وقت سلمٰی کے آفس میں تھا۔ سراج نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔

''تم پر جو قاتلانہ حملے کی بات جعفر نے کہی تھی، اور

چوہدرانی کی باتوں سے جو ہم نے اندازہ لگایا تھا، وہ بات حرف بحرف درست نکلی"۔

"تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟" فہد نے پوچھا تو سراج نے کچھ منٹ پہلے ہونے والے واقعہ کی روداد بتانے لگا۔ جسے سن کر اس نے کہا

"تم کچہری پہنچو، میں دیکھتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے جعفر کے نمبر پش کر دیئے۔

کاشی ایک جگہ رک گیا تھا۔ اس نے ریوالور اپنی جیب میں ڈالا اور فون نکال کر چوہدری جلال کے نمبر پش کر دیئے۔ وہ اپنے ڈرائینگ میں بیٹھا ہوا تھا، شاید وہ کسی خبر کا منتظر تھا اس لئے تیزی سے پوچھا۔

"ہیلو! بولو، کیا ہوا؟"

"میں تو اس تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور بندہ تھا۔ لگتا ہے اسے خبر ہو گئی ہے"۔ کاشی نے کہا تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ کہیں وہ بندہ......"

"نہیں، میں نے اسے جانے دیا۔ مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا کہ اسے اطلاع نہیں تھی، ورنہ میں صبح سے اس کے پیچھے ہوں۔ اسے ہی نور پور جانا تھا۔ پتہ کریں اسے خبر دینے والا کون ہے؟" کاشی نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔ تم میرا کام کرو، میں تمہارا کام کر رہا ہوں"۔

"ٹھیک ہے، بس ایک دو دن میں ہو جائے گا"۔ کاشی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جبکہ چوہدری جلال گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

☆......☆......☆

سلمیٰ اپنے آفس میں بیٹھی لڑکیوں سے بات کر رہی تھی۔ ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"باجی۔ گاؤں میں بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔ انہیں تو یہ یقین ہی نہیں تھا کہ دفتر کا افتتاح ہو جائے گا۔ اب تو یہ محکمہ تعلیم والے بھی آ گئے اور این جی او، والے بھی"

"ہاں! میں جانتی ہوں اور اب بہت سارے لوگ ہم سے رابطہ کر رہے ہیں۔ یہ سارے وہ لوگ ہیں جو صفیہ کی طرح ان چوہدریوں کے ستائے ہوئے ہیں"۔ سلمیٰ نے اسے بتایا تو وہ بولی۔

"ان کا ظلم کب تک چلے گا۔ آخر ایک دن تو ختم ہو گا"۔

"ایک اور بات بھی ہے، کوئی بھی ہم پر اس لئے ظلم کر جاتا ہے کہ ہم کمزور ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ ہم اپنی روٹی کے چکر میں اپنی اولاد کو پڑھا لکھا کر انہیں مضبوط نہیں بناتے ہمیں خود مضبوط ہونا ہے"۔ سلمیٰ نے سمجھایا تو وہ لڑکی بولی۔

"لیکن باجی۔ ہم غریب لوگ اتنے وسائل کہاں سے لائیں۔ ہمارے بچوں کو ہمارے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ پیٹ پالنا ہی اتنا مشکل ہے"۔

"میں مانتی ہوں۔ ایسا ہی ہے۔ میں کہتی ہوں حکومتیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں اگر ہم اپنے آپ کو بدل لیں۔ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ ہم خود اپنے بچوں کو پڑھائیں۔ انہیں ہنر مند بنائیں۔ خود قربانی دے لیں۔ پھر کل ہماری اگلی نسل کا ہے۔ بچے تو ہمارے ہیں نا۔ اب دیکھو! ہم سب نے ایک ہو کر یہ دفتر کھولا ہے نا جو چوہدری بھی جرات نہیں کر سکے۔ میں اکیلی تھی لیکن خدا نے ایسے حالات پیدا کر دیئے۔ لوگ میرے ساتھ ہوتے گئے۔ اب میں چوہدریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں۔ ہمیں خود کو بدلنا ہے۔ بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنے والے ہر دن میں لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ دیکھ لینا"۔ یہ کہہ کر وہ خوش کن خیال میں گم ہو گئی۔ جبکہ مائرہ صحن میں فون کان کو

لگائے جعفر سے بات کر رہی تھی۔ جعفر نے اسے بتا دیا تھا کہ فہد کیسے بچ گیا ہے۔ اس پر قاتلانہ حملہ کیسے ہونے والا تھا۔

''تم نے ابھی سلمیٰ کو نہیں بتانا، فہد خود ہی بتا دے گا''۔

''ٹھیک ہے۔'' مائرہ نے کہا پھر لمحہ بھر کو رُک کر بولی، ''میں نے رپورٹ بھیج دی ہے ایک دو دن میں اسے اچھی طرح بنا لیا جائے گا تو پھر آن ائیر کر دی جائے گی''۔

''بس رپورٹ ایسی ہونی چاہئے کہ ہلچل مچ جائے۔ اس کا کچھ اثر ہو خیر، کیسی لگی تمہیں سلمیٰ''۔ جعفر نے ایک دم موضوع بدل کر پوچھا تو مائرہ نے کہا۔

''اسے میں نے دیکھا ہے، وہ تو ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہے۔ اس نے تو بہت باتیں کی ہیں۔ بہت اچھی ہے وہ''۔

''اس نے بھی تو چوہدریوں کا ظلم سہا ہے۔ مطلب نکے چوہدری نے تو بہت کوشش کی لیکن یہ ہی اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ کبھی موقع ملا تو میں ان کی کہانی سناؤں گا۔ اس کے اندر کا دکھ بول رہا تھا۔ بلکہ میں ہی کیوں تم خود سن لینا۔ میرے خیال میں اب تک دوستی ہو گئی ہو گی''۔ جعفر نے کہا تو مائرہ نے بتایا

''اسی کے آفس میں ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگا ہے اس سے دوستی کر کے۔ میں اسے لے کر آؤں گی نور پور''۔

''یہ جب تمہیں فہد آنے کی اجازت دے گا نا تم تب ہی آ پاؤ گی''۔ جعفر نے چھیڑتے ہوئے کہا تو مائرہ اسے نظر انداز کر کے بولی۔

''اچھا پہلے مجھے بھی اس علاقے کی محرومیوں کے بارے میں اتنی سمجھ نہیں آتی تھی لیکن اب یہ رپورٹ بنا کر، لوگوں سے مل کر، سلمیٰ سے باتیں کر کے پتہ چلا''۔

''جب تم نے یہاں کے پورے علاقے کا ایک وزٹ کر لیا تو بہت کچھ مزید بھی سمجھ جاؤ گی۔ میں یہاں آیا ہوں تو مجھے معلوم ہوا تھا''۔ جعفر نے بتایا تو مائرہ نے پوچھا۔ ''یہاں آ کر تم نے فہد کی کیا مدد کی؟''

''پورے علاقے میں جو بھی چوہدریوں کے مخالف ہیں اپنی اپنی جگہ سب کو میں نے اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں فہد سے متعارف کرا دیا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس کا رابطہ ہے۔ ابھی تک لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے''۔

''ہوں میں سمجھ گئی۔ اوکے جعفر میں بھی کوشش کروں گی کہ اس کے کام آ سکوں''۔ مائرہ نے کہا تو جعفر بولا

''اس کے کام آ سکتی ہو۔ اسے روٹی بنا کر دینے والا کوئی نہیں ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے پاس تو سلمیٰ ہے، میرے پاس کوئی نہیں۔

''مجھے آنے تو دو پھر دیکھتی ہوں تجھے''۔ وہ مصنوعی غصے میں بولی تو جعفر ہنس دیا۔ وہ بھی ہنس دی۔ پھر فون بند کر کے سلمیٰ کی طرف چلی گئی۔

اس وقت جعفر نے فون رکھا ہی تھا کہ ملک نعیم کا فون آ گیا۔ اس نے فوراً ہی کہا

''ہیلو! جی۔ جعفر صاحب۔ یہ الیکشن کی خبر آ رہی ہے ٹیلی وژن پر، کیا آپ نے خبر دیکھی؟''

''جی۔ الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو گیا ہے۔ مجھے اطلاع ہو گئی ہوئی ہے۔ اب آپ کے لئے وقت بہت قیمتی ہے''۔ جعفر نے کہا تو ملک نعیم بولا۔

''یہ جو ملکی حالات اچانک بدل رہے ہیں۔ ان میں کچھ بھی متوقع تھا۔ بے شک اب وقت بہت قیمتی ہے الیکشن جیتنے کے لیے اب جتنا کچھ بھی کر لیا جائے وہ کم ہے''۔

''تو پھر الیکشن لڑنے کی بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔ لوگوں سے رابطہ کریں فوراً، باقی آپ کو معلوم ہے کہ کیا کچھ کرنا ہے۔ اب تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے''۔ جعفر

نے کہا تو وہ بڑے جوش اور جذبے سے بولا

''الیکشن کی تیاریاں تو کب کی شروع ہیں۔ بس یہ الیکشن شیڈول کا انتظار تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں دوستوں سے رابطے میں ہوں۔ ہم بھرپور طریقے سے الیکشن لڑیں گے۔

''بس یہی اعتماد اور حوصلہ چاہیے۔ میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم رابطے میں رہیں گے''۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا تو ملک نعیم نے کہا۔

''کیوں نہیں جی۔ یہ سب معاملات صلاح مشورے سے ہی چلتے ہیں۔ میں فہد سے ملتا ہوں اور الیکشن بارے پلان ترتیب دیتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، آپ کل مجھے آفس میں ملیں۔ باقی باتیں یہاں ہوں گی اللہ حافظ''۔ جعفر نے کہا

''اللہ حافظ''۔ وہ بولا اور فون رکھ دیا۔ جعفر نے بھی فون رکھا اور سوچنے لگا۔ اب فہد سے ایک ملاقات بہت ضروری تھی۔

☆......☆......☆

الیکشن کا اعلان ہوتے ہی حویلی کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ علاقے کے لوگ اس کے پاس آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی سماں تھا۔ چوہدری جلال بڑے کروفر سے ڈرائینگ روم میں تھا۔ جمیل اختر ایک طرف اور اس کے حمایتی وہ لوگ موجود تھے جو کسی نہ کسی طرح اس کی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وہ مفاد پرست ٹولہ تھا جو اسے الیکشن جتواتے اور اپنا مفاد پورا کرتے تھے۔ الیکشن کر کے ساتھ ہی یہ لوگ کھمبوں کی طرح اُگتے تھے۔ چوہدری جلال ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں پر آپ سب کو زحمت دینے کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہے۔ الیکشن ہو جائیں گے۔ اس کا پتہ تو تھا لیکن اس قدر جلدی ہونے والے ہیں یہ اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے ہم نے الیکشن میں حصہ تو لینا ہے۔ اب صلاح مشورہ کر لیں کہ کیا کرنا ہے''۔

''چوہدری صاحب۔ پہلے تو آپ بلا مقابلہ منتخب ہوتے آئے ہیں۔ چھوٹی سیٹوں پر ہی مقابلہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی ہمارے ہی بندے جیت گئے۔ لیکن اس دفعہ الیکشن مختلف ہوگا۔ آپ کے مقابلے میں ملک نعیم آچکا ہے''۔ جمیل اختر وکیل نے اسے حالات سے آگاہی دی۔ تو چوہدری جلال بولا۔

''میں جانتا ہوں۔ مقابلے میں ہر کوئی اتر سکتا ہے۔ یہ اس کا جمہوری حق ہے لیکن ووٹ لے کر جیتنا ایک دوسرا مقابلہ ہے۔ اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں''۔

''چوہدری صاحب! مقابلہ تو بن گیا ہے نا، باہر تو نکلنا پڑے گا نا آپ کو''۔ اس نے اپنا مدعا بتایا تو چوہدری جلال نے سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پہلے بھی تو نکلتے تھے۔ خیر! یہ فیصلہ آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے کہ چھوٹی سیٹوں پر الیکشن کسے لڑانا ہے؟''

''نہیں نہیں جی۔ یہ فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہے آپ نے تو ہمیں حکم دینا ہے۔ ہم دن رات ایک کر دیں گے۔ الیکشن ہم نے ہی جیتنا ہے''۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے کہا تو چوہدری جلال اسے دیکھ کر بولا۔

''الیکشن تو ہم ہی نے جیتنا ہے۔ ہم نور پور اور علاقے کے لوگوں سے صلاح مشورہ کر کے پھر بندے کھڑے کریں گے۔ کیوں وکیل صاحب''۔

''ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہم ایک دو دن میں یہ میٹنگ رکھ لیتے ہیں۔ اور اس میٹنگ میں ہم یہ طے کر لیں گے کہ ایم پی اے کی سیٹ پر کس نے الیکشن لڑنا ہے''۔ جمیل اختر نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

''ظاہر ہے ایم این اے کی سیٹ پر تو میں ہی الیکشن لڑوں گا۔ باقی چھوٹی سیٹوں کے لیے آپ جو مناسب سمجھیں''۔

یہ کہہ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے پارٹی ورکروں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ مرضی اسی کی چلنی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ گیا اور پارٹی ورکروں کو کھانے پر بلا لیا گیا۔

اسی دوپہر حویلی کے پورچ میں چوہدری جلال منتظر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی، جس پر فلیگ لگا ہوا تھا۔ اس میں سے پارٹی عہدیدار نکلا، جو اسی حکومت میں سینئر وزیر بھی تھا۔ وہ الیکشن کے لئے طوفانی دورے پر تھا۔ چوہدری نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی سے بولا۔

''خوش آمدید بہت خوشی ہوئی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ آئیں تشریف لائیں''۔

وہ دونوں اندر کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں آمنے سامنے صوفے پر تھے۔ ان کے سامنے لوازمات تھے۔ پارٹی عہدیدار وہاں موجود سیاسی ورکروں کو مل چکا تھا، ان سے وہی پرانی سیاسی گھسی پٹی باتیں اور وعدے کر چکا تھا۔ پھر چوہدری جلال کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''دیکھیں چوہدری صاحب میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے آگے بھی جانا ہے، بس آپ سے دو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس پر دھیان دیں گے''۔

''جی کہیں میں سن رہا ہوں''۔

''کل ٹی وی پر جو، آپ کے متعلق رپورٹ چلی ہے۔ اس نے نہ صرف ہلچل مچا دی ہے بلکہ پارٹی کو بھی اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ جو مرضی کریں، جو مرضی کہہ دیں اس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا؟ آپ اپنی باتوں ہی میں جھوٹے لگ رہے تھے ٹی وی رپورٹ میں۔ کیا آپ کو بات کرنا نہیں آتی؟''

تبھی چوہدری جلال نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''آپ کو کیا سمجھ آتی ہے۔ آپ کے بیٹے پر قتل اور عزت پامال کرنے کا مقدمہ ہے۔ ہوا آپ کی خراب ہو رہی ہے اوپر سے ادارے ہماری جان کو آئے ہوئے ہیں کہ آپ ہماری پارٹی کے ہیں کیا آپ نے الیکشن نہیں لڑنا؟'' پارٹی عہدیدار نے طنزیہ انداز میں کہا تو چوہدری جلال نے تیزی سے کہا۔

''الیکشن تو لڑنا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ ہماری آبائی سیٹ ہے، یہ پکی ہے۔ باقی رہے الزامات وہ محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے۔ میں ثابت کر دوں گا......''

''معاف کیجئے گا چوہدری صاحب۔ وہ جب ثابت ہو گا سو ہو گا، اس وقت تو ہوا آپ کے مخالف ہے۔ آپ کو پارٹی نے ٹکٹ دینا ہے اور آپ کو میڈیا کے ساتھ بات کرنا نہیں آتی''۔

''اب اس کا کیا حل ہے کیا چاہتے ہیں آپ؟'' چوہدری جلال نے پوچھا تو پارٹی عہدیدار اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں جی مجھے نہیں لگتا کہ اس بار آپ بلا مقابلہ جیت جائیں گے۔ الیکشن تو ہو گا۔ اگر آپ نے سیاست کرنی ہے تو اپنے آپ کو بدلنا ہو گا۔ یہ پرانی باتوں کو چھوڑنا ہو گا''۔

''ٹھیک ہے جی، میں دیکھتا ہوں''۔ وہ دھیمے سے لہجے میں بولا تو پارٹی عہدیدار نے کہا۔

''صرف دیکھنا ہی نہیں اس کا حل بھی نکالنا ہے۔ اداروں کا بہت دباؤ ہے ہم پر اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیسے''

یہ کہتے ہوئے وہ اُسے سمجھانے لگا۔

(شمارہ اکتوبر میں آخری قسط پڑھیں)

جھورا بٹ

جھورے بٹ کے لئے اب زندگی مشکل اور تنگ ہو کر رہ گئی۔ اس کا بڑا بیٹا تو پہلے ہی مفرور اشتہاری ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ڈاکوؤں سے مقابلے میں مارا گیا۔ تیسرا بیٹا شوکا بٹ اس کی زندگی بھی ہر وقت خطرے میں تھی کیونکہ وہ بھی پولیس کو مطلوب تھا۔

☆ حفیظ بشر

والدین نے نام ظہور دین رکھا، کشمیری تھا۔ ایک عرصہ ہوا اس کا خاندان سری نگر کشمیر سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں آباد ہو گیا۔ وہ بچپن میں گلی محلے یا دوستوں میں ظہور دین کی بجائے جھورا بٹ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اوائل عمر میں اسے تھوڑا بہت فن پہلوانی سے لگاؤ رہا لیکن بدقسمتی سے وہ زندگی بھر کوئی بھی کشتی جیت نہ سکا۔ اس کا قد کاٹھ، ڈیل ڈول بظاہر متاثر کن تھا۔ بس آپ جھورے کو ایک طرح کا درشنی پہلوان کہہ سکتے ہیں یعنی دکھاوے کا پہلوان۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ تھا لیکن اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ جھورا گلی محلے میں ہر چھوٹے بڑے مرد عورت، سب کو بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا جس کی وجہ سے لوگ بھی اس کی عزت کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ جھورا ہیر وارث شاہ کے بول بڑے شوق سے سنتا یا پھر وہ کبھی کبھار خود بھی گنگناتا۔

جھورے بٹ نے اپنی گزر اوقات کے لئے بازار میں مٹھائی اور دودھ دہی کی دُکان کھول رکھی تھی۔ اس کے اخلاق اور اچھی گفتگو کی وجہ سے لوگ دور دور سے دودھ دہی خریدنے کے لئے اس کی دُکان پر آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی غریب، ضرورت مند اس کی دُکان پر آجاتا تو وہ اس کو بھی مایوس نہ کرتا بلکہ ہر لحاظ سے اس کی امداد بھی کیا کرتا۔ لوگوں کو اس کی یہ عادت بھی پسند تھی۔ اولاد میں اس کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک دانا بینا پنچایتی قسم کا شخص تھا۔ جب گلی محلے میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو وہ صلح صفائی کروا دیتا۔ صحت بھی اس کی قابلِ رشک تھی۔ عمر کے لحاظ سے وہ چالیس پچاس کے پیٹے میں تھا۔ خالص دودھ، گھی اس کی کمزوری تھی اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے گھر میں ایک بھوری بھینس بھی پال رکھی تھی۔ وہ اپنی خوراک، کھانے پینے کے لئے اپنی بھینس کے دودھ گھی کو ترجیح دیتا۔

اس کے تینوں بیٹے بھی ایک لحاظ سے جوان تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد عارف بٹ تھا۔ گلی محلے کے لوگ اسے عارف بٹ کی جگہ آرا بٹ کے نام سے پکارتے۔ وہ بڑا ہی سرکش اور منہ زور جوان تھا۔ بات بات پر چاقو چھری نکال لیتا۔ مختصر یہ کہ وہ مار دھاڑ دنگا فساد کا عادی تھا۔ آئے دن اس کا نام گلی محلے میں کسی نہ کسی لڑائی جھگڑے میں ملوث پایا جاتا۔ جھورے بٹ نے اس کو مصروف رکھنے کے لئے اپنی دُکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک گوشت کی دُکان کھول کر دے رکھی تھی اور اسی وجہ سے اس کا قصائیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ تھا۔

قصائیوں کی دشمنی ایک عرصہ سے وہاں ہی کے مقیم ملکوں سے تھی جو علاقے میں وسیع پیمانے پر دودھ کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ مالی لحاظ سے دونوں پارٹیاں اپنی اپنی جگہ خاصی خوشحال اور اثر رسوخ رکھتی تھیں۔ قصائیوں کا کام منڈی مویشیاں میں ٹھیکے لینا دینا تھا اور ساتھ ساتھ حکومت کو گوشت کی سپلائی کرنا بھی تھا۔ دونوں پارٹیوں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا۔ کبھی ایک پارٹی کا کوئی آدمی قتل یا زخمی ہو جاتا تو کبھی دوسری پارٹی کا۔ علاقے میں خوف وہراس رہتا۔ ہر وقت دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتیں۔

جھورے بٹ کے دوسرے بیٹے کا نام افتخار بٹ تھا لیکن عام زبان میں لوگ اُسے کھاری بٹ کہتے۔ وہ نہایت ہی شریف طبع لڑکا تھا۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتا اس کی زیادہ توجہ تعلیم کے حصول کی طرف رہتی۔ غالباً اس وقت وہ میٹرک کا طالب علم تھا۔ اس کا تیسرا بیٹا شوکت تھا۔ لوگ اسے شوکا بٹ کے نام سے پکارتے۔ وہ اَن پڑھ اور گنوار تھا اور اپنے باپ کی دودھ دہی والی دُکان پر اس کی معاونت کرتا۔

شوکا بٹ بڑا ہی نڈر گبھرو جوان تھا۔ وہ اکثر بات بات پر لوگوں سے لڑائی جھگڑا مول لے لیتا۔ اگرچہ اس کے باپ جھورے بٹ نے اس کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اکثر دوسروں کے لڑائی جھگڑے میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے کود جاتا تاکہ گلی محلے میں اس کا ٹھکا رہے۔

جھورے بٹ کی بڑی بیٹی جوان تھی اور وہ اس کی شادی کرنے کی فکر میں کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھا۔ تھوڑی زیادہ کوشش کرنے کے بعد آخر اس کو اپنی بیٹی کے لئے ایک اچھا رشتہ مل ہی گیا۔ وہ جلد سے جلد اپنی بیٹی کی رخصتی کو یقینی بنانے کی کوشش میں تھا۔ اس کی دوسری بیٹی جو بدقسمتی سے بچپن سے ہی پولیو جیسی مہلک بیماری کا شکار بن کے اپاہج ہو کر رہ گئی تھی۔ جھورا بٹ اکثر اس کے متعلق پریشان رہتا۔ اس طرح شب و روز کا عمل جاری رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک دن میلہ منڈی مویشیاں پر قصائی پارٹی جس کا سرغنہ ملاں قصائی تھا اور دوسری پارٹی یعنی ملکوں کی پارٹی جس کا سربراہ اچھو ملک تھا، منڈی کی نیلامی کے مسئلہ پر دونوں پارٹیوں کے مابین تصادم اور لڑائی جھگڑا ہو گیا۔ معاملہ وقتی طور پر گالی گلوچ اور ہاتھا پائی پر رفع دفع ہو گیا لیکن دونوں پارٹیاں بدلہ لینے کی تلاش میں رہنے لگیں۔

پروگرام کے مطابق قصائی پارٹی نے ایک رات موقع غنیمت جان کر ملکوں کے ڈیرے پر شب خون مارا۔ اچانک حملے میں ملکوں کی پارٹی کے دو تین آدمی اندھی گولیوں کا نشانہ بن کے دم توڑ گئے لیکن اچھو ملک جو پارٹی کا سرغنہ تھا، کسی نہ کسی طرح بچ گیا۔ تھوڑا زیادہ زخمی ضرور ہوا۔ حملہ آور رات کی تاریکی میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اچھو ملک کو اس واردات پر بہت زیادہ رنج ہوا کہ قصائیوں کی یہ جرأت۔ بہر کیف پولیس موقع پر پہنچ گئی اور ملاں قصائی، عارف بٹ المعروف آرا بٹ اور دیگر نامعلوم افراد کے خلاف قتل کا پرچہ درج ہو گیا۔ پولیس نے مطلوب لوگوں کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا لیکن عارف بٹ گرفتار نہ ہو سکا اور وہ وقتی طور پر کہیں روپوش ہو گیا۔ پولیس دن رات اس کی گرفتاری کے لئے اس کے گھر اور اس کے ٹھکانوں پر چھاپے مارتی رہی لیکن عارف بٹ ہمیشہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا اور پولیس ناکام لوٹ آتی۔

دوسری طرف اچھو ملک نے بھی اپنے آدمیوں کو عارف بٹ کی تلاش میں چھوڑ رکھا تھا کہ پولیس کے پکڑنے سے پہلے پہلے ہی عارف بٹ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا ہے لیکن عارف بٹ بھی اس خطرے سے پوری طرح چوکنا اور آگاہ تھا۔ وہ خطرہ بھانپ کر اِدھر اُدھر غائب ہو جاتا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ اب اس کی زندگی ہر لمحہ اور ہر وقت خطرے سے دوچار ہے۔ کسی وقت بھی پولیس پارٹی یا پھر ملکوں کی پارٹی سے آمنا سامنا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت اسلحے سے لیس رہتا اور اپنا ٹھکانا بھی ہر روز بدلتا رہتا۔ کیونکہ پولیس نے علاقے میں اپنے مخبروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

دوسری طرف پولیس جھورے بٹ جو عارف بٹ کا والد تھا، اس کو برابر پریشان کرتی رہی کہ وہ اپنے بیٹے کی نشاندہی کرے کہ وہ کہاں اور کس جگہ روپوش ہے۔ ایک دو مرتبہ پولیس چھاپوں کے دوران جھورے بٹ کو اپنے ساتھ بھی لے گئی اور اس سے اس کے بیٹے کے ٹھکانوں کے متعلق پوچھتی رہی لیکن جھورا بٹ لاعلمی کا اظہار کر دیتا کہ اسے اپنے بیٹے کے ٹھکانوں کی کوئی خبر نہیں اور بڑی حد تک یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کا بیٹا کہاں روپوش اور چھپا ہوا ہے۔ ایک عرصے تک پولیس عارف بٹ کی تلاش میں رہی لیکن اُسے کوئی کامیابی نہ ملی۔ آخر مایوس ہو کر عارف بٹ کو اشتہاری قرار دے دیا گیا اور اس بات کا علم عارف بٹ کو بھی ہو گیا کہ اب وہ کسی وقت

بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور اس کی زندگی ہر لمحہ خطرے میں ہے۔ لہٰذا موت سے بچنے کے لئے وہ کسی نہ کسی طرح علاقہ غیر جانے میں کامیاب ہو گیا اور اس بات کی خبر اس کے مخالف اچھو ملک کو بھی مل گئی۔

علاقہ غیر میں جا کر عارف بٹ سے انتقام لینا ایک بہت ہی مشکل اور کٹھن کام تھا کیونکہ پولیس کے لئے بھی اس کو وہاں سے پکڑنے کے لئے کافی مشکلات تھیں لیکن اچھو ملک انتقام کی آگ میں صبح و شام جل رہا تھا اور وقتی طور پر عارف بٹ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک دن جھورے بٹ کو اپنے ڈیرے پر بلایا۔ وہ وہاں پہنچ گیا۔ اچھو ملک اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ جھورے بٹ کو اپنے سامنے دیکھتے ہی غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

''اوئے بڈھے! کیا تجھے خبر ہے کہ اس وقت تمہارا بیٹا عارف بٹ کہاں ہے؟'' اس نے بڑی حقارت سے پوچھا۔

''کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے''۔ جھورے بٹ نے بھی تلخی آمیز لہجے میں جواباً کہا۔

''اچھا، اگر یہ بات ہے تو میں تمہیں مہلت دیتا ہوں''۔ اچھو ملک نے کہا۔ ''وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ اسے ہر حالت میں ایک ہفتے کے اندر اندر میرے سامنے پیش کرو۔ بصورت دیگر اگر تم اسے یہاں لانے میں ناکام رہے تو پھر میں تمہارے گھر کو آگ لگا کر تمہارا نام و نشان تک مٹا دوں گا۔ تمہارے لئے مناسب یہی ہو گا کہ تم اس علاقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں بہت دور چلے جاؤ''۔ اچھو ملک کی گفتگو میں نفرت کا اظہار تھا۔

اچھو ملک کا یہ فیصلہ سن کر جھورا بٹ پریشان ہو گیا اور زمین اس کے پاؤں تلے سے کھسکنے لگی اور اسے چکر سے آنے لگے۔ جھورے بٹ نے اس کی منت سماجت بھی کی کہ وہ بے قصور ہے۔ اس کے بیٹے کی غلطی کی سزا اس کے گھر والوں کو نہ دے اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ کیونکہ سر دست گھر بار، کاروبار چھوڑنا اس کے لئے ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس کے علاوہ اگلے دو تین مہینوں تک اس کی بڑی بیٹی کی شادی بھی طے پا چکی ہے۔

جھورے بٹ نے اچھو ملک کے آگے بھری محفل میں ہاتھ بھی جوڑے۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود اچھو ملک اپنے کئے ہوئے فیصلے پر ڈٹا رہا اور اس نے جھورے بٹ کی ایک نہ سنی۔

جھورا بٹ مایوسی کی حالت میں وہاں سے اٹھ کر واپس اپنے گھر چلا آیا اور اپنے گھر والوں کو اچھو ملک کا فیصلہ سنایا۔ گھر کے افراد بھی اچھو ملک کا فیصلہ سن کر پریشان ہو گئے۔ جھورے بٹ کے رشتہ داروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بھی اس کو صلاح مشورہ دینے کے لئے اس کے گھر پہنچے۔ دیگر یار دوست یا ہم خیال اور ہمدرد لوگ تھے انہوں نے بھی متفقہ طور پر جھورے بٹ کو یہی مشورہ دیا کہ علاقے میں ملکوں کے دو تین آدمیوں کی ہلاکت سے ان کی علاقے میں بہت ذلت اور رسوائی ہوئی ہے اور ملکوں کی آنکھوں میں انتقام کا خون اترا ہوا ہے اور دن رات وہ انتقام لینے کی فکر میں ہیں۔ ایسے حالات میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ علاقے میں ان کا اثر رسوخ بھی ہے لہٰذا حالات کے پیش نظر مناسب یہی ہو گا کہ وقتی طور پر گاؤں کو چھوڑ دیں۔

جھورا بٹ ملکوں کے مقابلے میں ایک کمزور شخص تھا وہ ان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا حالات اور اپنی حیثیت کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنا گھر بار کاروبار اور علاقہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے وقتی طور پر ملکوں کی نظر سے دور رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی کیونکہ اس میں بھی اس کے گھر والوں اور اس کی سلامتی تھی۔

ورنہ جانی اور مالی نقصان ہونے کا خدشہ تھا۔ فوراً جھورے بٹ نے اپنی بڑی بیٹی کا نکاح بڑی سادگی سے کر کے اس کو اپنے گھر سے رخصت کیا۔ مکان اور دُکان اس نے فروخت نہ کی بلکہ اس نے اپنے اپنے ایک عزیز کو مکان اور دُکان کرائے پر دے دی اور اس سے وعدہ لیا کہ جب کبھی وہ واپس لوٹ کو آیا تو اپنی دُکان اور مکان جوں کا توں واپس لے لے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے گھر کا ضروری سامان باندھا اور کرائے کا ٹرک لے کر لاہور چلا آیا جہاں اس کی برادری کے اور لوگ بھی آباد تھے۔ تھوڑی بہت رقم اس کے پاس موجود تھی۔ اس کے رشتہ داروں نے اس کو شہر کے ایک متوسط علاقے میں مکان کرائے پر لے دیا۔

جھورے بٹ نے اپنے رشتہ داروں کو اچانک لاہور منتقلی کی وجہ بھی بتائی۔ انہوں نے سن کر حیرانگی کا اظہار کیا اور اسے حوصلہ دیا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی میں ایسے لمحات آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں انسان کو صبر اور حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ اچھے بُرے حالات انسانی زندگی کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔

جھورے بٹ کو قدرے تسلی ہوئی کہ اس کے رشتہ داروں نے اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا ہے۔ وہ ان کی باتوں سے بڑی حد تک مطمئن بھی ہوا اور عہد کیا کہ وہ حالات کا مقابلہ کرے گا۔

شہر میں آ کر سب سے پہلے اس نے اپنی گزر اوقات کے لئے اپنی رہائش کے قریب ایک دُکان کرائے پر لی جہاں اس نے مٹھائی اور دودھ دہی کا کاروبار شروع کر دیا۔ ملازم کی جگہ جھورے بٹ نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شو کو اپنے ساتھ رکھ لیا تا کہ وہ شہر آ کر آوارہ نہ پھرے اور مصروف رہے۔ شروع شروع میں اس کو قدرے مشکلات پیش آئیں لیکن پھر محنت اور اخلاق کی وجہ سے جھورے بٹ کا کاروبار خوب چل نکلا اور گاہکوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ جب اس کے مالی حالات قدرے بہتر ہوئے تو اس نے ایک بھینس بھی خرید لی اور گھر کے افراد کے لئے دودھ، لسی، گھی، مکھن میسر آنے لگا۔

اب جھورے بٹ کے گھر میں خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں اور اس کے مالی حالات خاصے مستحکم ہو گئے لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے آبائی گھر، یار دوستوں اور خاص کر اپنے بیٹے عارف عرف آرا بٹ کی یاد شدت سے محسوس ہوتی اور وہ خون کے آنسو پی کر خاموش ہو جاتا۔ پھر وہ یہ بھی سوچتا کہ اس کو اپنے بیٹے کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا اور گھر سے بے گھر ہو کر بے سروسامانی کی حالت میں لاہور چلا آیا۔ بہرکیف اس نے یہ سب کچھ اللہ کی رضا اور آزمائش سمجھ کر صبر کر لیا۔ اب جھورا بٹ پہلے کی نسبت خوش حال تھا لیکن یہ خوش حالی بھی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔

کیونکہ دُکان جو جھورے بٹ نے پانچ سال کے لئے کرائے پر لی تھی پانچ سال گزرنے کے بعد دُکان کے مالک نے دُکان خالی کرنے کا کہا جو جھورے کو منظور نہ تھا کیونکہ اس دُکان کی بدولت وہ شہر میں ایک خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُسے یہ خوف مارے جا رہا تھا کہ دُکان خالی کرنے کی صورت میں اس کا ذریعہ معاش ختم ہو کر رہ جائے گا اور ایسے حالات میں وہ اپنے گھر کے اخراجات کیسے پورے کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے مجبوری کی حالت میں دُکان کے مالک سے کہا کہ وہ دُکان خالی نہ کرائے بلکہ وہ دُکان کے کرائے میں اضافہ کرنے کو تیار ہے لیکن دُکان کا مالک نہ مانا اور کہا کہ وہ دُکان ہر حالت میں خالی کرانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کا بیٹا بے روزگار ہے اور وہ اپنے بیٹے کو اس دُکان میں کاروبار کرانا چاہتا ہے۔ دوسرے تمہارے ساتھ پانچ سالہ معاہدہ ہوا تھا وہ پورا ہو گیا۔ معاہدے میں مزید توسیع ممکن نہیں۔ بس اسے آپ

مجبوری سمجھیں اور مہربانی کریں دُکان خالی کر دیں۔

کچھ وقت اس طرح گزر گیا لیکن جھورے بٹ نے آخر کار دُکان خالی کرنے سے انکار کر دیا اور دُکان کے مالک نے جھورے بٹ کے خلاف بے دخلی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ جواب میں جھورے بٹ نے بھی جوابی دعویٰ عدالت میں دائر کر دیا۔ اس دوران جھورے کا منجھلا بیٹا کھاری بٹ پولیس میں بطور کانسٹیبل بھرتی ہو گیا۔ اب جھورے بٹ کی ہمت کچھ بندھی کہ چلو دُکان خالی ہونے کی صورت میں گھر کے اخراجات کا کچھ ذریعہ تو بنا۔ کیونکہ اسے یہ بھی یقین تھا کہ جائداد کا مالک آخر مالک ہی ہوتا ہے۔ فیصلہ کسی وقت بھی اس کے خلاف ہو سکتا ہے اور پھر اسے ہر حالت میں دُکان سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ لہٰذا کچھ عرصہ تک مقدمہ عدالت میں زیر التوا رہا۔ پھر حسب توقع وہ مقدمہ ہار گیا۔ اپیل کرنے پر بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوا کیونکہ دُکان کا مالک ہر لحاظ سے مضبوط اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ عدالت کے حکم پر سرکاری بیلف کے ذریعے اس کو دُکان سے بے دخل کر دیا گیا۔ سرکاری اہلکاروں نے اس کا سامان بڑی بے دردی سے دُکان سے نکال کر سرِ عام بازار میں پھینک دیا۔ جھورا بٹ تو قانون کو سمجھتا تھا اور وہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اس کا چھوٹا بیٹا شوکا بٹ نوعمر اور نادان تھا اور جذباتی تھا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کی ذلت اور رسوائی اسے برداشت نہ ہوئی۔ دُکان کا مالک جو یہ سارا تماشا اور منظر دیکھ رہا تھا، اس نے ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ کر اس کو للکارا لیکن جھورے بٹ نے اس کو خاموش رہنے کو کہا اور اسے سمجھایا۔ بیٹا جذباتی مت بنو ذرا صبر سے کام لو کیونکہ ہمارے اوپر آزمائش کی ایک اور گھڑی آئی ہے اس وقت لڑائی جھگڑا کرنے سے ہم پر مزید کوئی اور بڑی مشکل پیش آ سکتی ہے۔

''ابا! مجھے اچھی طرح یاد ہے''۔ شوکے نے پھٹ کر کہا۔ ''اس سے پہلے بھی گاؤں سے نکلتے وقت تم نے یہی کہا تھا کہ صبر کرو اور ملکوں نے ہمیں گھر سے بے گھر کر دیا۔ ہم گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ آج پھر ہمیں ذلت اور رسوائی کا سامنا ہے۔ اب میں یہ ظلم اور زیادتی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے جان سے ماردوں گا''۔

''نہیں، نہیں بیٹا! ایسا مت سوچنا''۔ جھورے بٹ نے گھبرا کر کہا۔ ''میں تو پہلے ہی اپنے بڑے بیٹے عارف بٹ کا کیا ہوا بھگت رہا ہوں۔ اس کی وجہ سے آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اگر تم بھی اپنے بڑے بائی کے نقشِ قدم پر چل نکلے تو پھر میرے لئے مزید مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں''۔

''ابا! مجھے مت سمجھا، مجھے مت روک ابا!'' شوکے نے بے قابو ہوتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ ''ابا! میں پاگل ہو جاؤں گا میں نے آج کچھ نہ کچھ کر گزرنا ہے میں اس حرامی کو ضرور آج اس کے کئے کی سزا دے کر رہوں گا۔ اس نے ہمیں بھرے بازار میں رسوا کیا ہے''۔

جھورے بٹ نے بڑی مشکل سے شوکے کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور اس کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ سارا دن شوکا گھر میں کسی زخمی شیر کی طرح ٹہلتا اور دھاڑتا رہا اور جھورا اسے سمجھاتا رہا مگر رات ہوتے ہی شوکا گھر سے بڑی رازداری کے ساتھ نکلا اس کے گھر سے نکلنے کی اس کے گھر والوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ وہ سیدھا مالک دُکان کے گھر کے سامنے کہیں اردگرد چھپ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار تک نہ تھا۔ جونہی دُکان کا مالک اپنے گھر سے باہر رات کو کسی کام کاج کے سلسلہ میں نکلا شوکا بٹ اس کو دیکھتے ہی انتقام کی آگ میں اندھا ہو گیا۔ آناً فاناً اس نے سڑک پر پڑی ہوئی ایک اینٹ پکڑی اور پیچھے سے مالک دُکان کے سر پر زور سے دے ماری۔ اینٹ کی ضرب نے تلوار کا

کام کیا اور اس کا سر پھوٹ گیا اور خون کا فوارہ اس کے سر سے پھوٹنے لگا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں زمین پر گر پڑا۔ بازار میں لوگوں کا ہجوم تھا فوراً اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ رات کی تاریکی اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے شوکا وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لوگوں نے زخمی مالک دُکان کو ہسپتال کے جانے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا کہ وہ ہسپتال نہیں جائے گا۔ گلی محلے کی ڈسپنسری سے اس کی مرہم پٹی کر دی گئی اور اس کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ حرکت شوکے بٹ کی ہے۔ وہ اگر چاہتا تو اس کے خلاف پولیس میں پرچہ درج کرا سکتا تھا لیکن اس نے دانستہ ایسا نہ کیا کیونکہ وہ ان لوگوں سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ کہیں آگے چل کر مزید جانی اور مالی نقصان نہ ہو۔ وہ ایک شریف النفس انسان تھا اور کسی حد تک ان سے خائف بھی تھا۔

اب جھورے بٹ کی آمدن کا سلسلہ ختم ہو گیا، بس اس کی آمدن کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ اس کا منجھلا بیٹا کھاری بٹ جو پولیس میں بطور کانسٹیبل بھرتی ہوا تھا اس کی تنخواہ سے گھر کا خرچہ چلتا اور گھر کا سارا بوجھ کھاری بٹ نے سنبھال لیا۔

جھورا بٹ اب پریشان سا رہنے لگا کیونکہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا شوکا بٹ بھی بے روزگار ہو گیا۔ نئے کاروبار کے لئے رقم درکار تھی اور جھورے بٹ کی مالی حالت کمزور تھی۔ اس طرح انتظار انتظار میں دو ڈھائی سال کا عرصہ بیت گیا۔ کسی بھی نئے کاروبار کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اس پریشانی اور کرب سے نکلنے کے لئے جھورے بٹ نے ہیروئن پینا شروع کر دیا۔ وہ سارا دن سگریٹ میں ہیروئن بھر کر نشے میں دھت گھر میں بے کار پڑا رہتا۔

شوکے بٹ نے جب باپ کی یہ حالت دیکھی تو گھر کے اخراجات کو سنبھالا دینے کے لئے ایک سریے کی

فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا، تنخواہ ملنے پر وہ آدھی تنخواہ اپنی ماں کو اور آدھی تنخواہ اپنے باپ کو نشے کے لئے دیتا۔ جس دن جھورے بٹ کے پاس ہیروئن خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے تو وہ اپنے بیٹے کو بُرا بھلا کہتا۔ شوکے بٹ سے اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تو پھر وہ اِدھر اُدھر سے رقم ادھار لے کر اپنے باپ کو دیتا اور وہ اپنا نشہ یوں پورا کرتا۔ وہ اپنے باپ کی خاطر ہر وہ جائز نا جائز کام کرنے کو تیار تھا۔

شوکا بٹ اکثر سوچتا رہتا کہ آخر کب تک ایسے کام چلتا رہے گا لہٰذا اس نے اپنے مالی حالات بہتر کرنے کے لئے ایک راہ نکالی اور نوکری چھوڑ دی۔ وہ اپنے ایک دیرینہ دوست کو ملا جو پشاور سے ہیروئن لا کر لاہور میں فروخت کیا کرتا تھا۔ شوکے بٹ نے اپنے گھر کے سارے حالات اس کو بتائے۔

''بدقسمتی سے ابا ہیروئن کا نشہ کرتا ہے''۔ شوکے نے کہا۔ ''جس مقدار میں وہ پوڈر پیتا ہے وہ خریدنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ کچھ راستہ نکالو یار!''

''دوست! اگر تم اس مشکل سے نکلنا چاہتے ہو تو پھر ایک ہی راستہ ہے''۔ شوکے بٹ کے دوست نے اسے جواباً کہا۔ ''تم خود ہیروئن چرس فروخت کیا کرو جیسا کہ میں کرتا ہوں۔ اس طرح تمہاری آمدن کا ایک ذریعہ بھی بن جائے گا۔ دوسرے تمہارے والد کے لئے ہیروئن بھی ملتی رہے گی''۔

بھوکے سے کسی نے سوال کیا کہ دو اور دو کتنے بنتے ہیں اس نے کہا کہ چار روٹیاں اس وقت شوکے بٹ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ فوراً اس نے اپنے دوست کے سامنے ہاں کر دی اور کہا کہ اسے سب کچھ منظور ہے لیکن اس کے لئے مشکل یہ ہے کہ اس کے پاس ہیروئن کی خریداری کے لئے رقم نہیں۔

''اس بات کی فکر مت کرو''۔ شوکے بٹ کے دوست نے کہا۔ ''سب کچھ بندوبست ہو جائے گا، بس تم تیار ہو کہ اپنی مارکیٹ بناؤ۔ مال تمہیں ہم پابندی سے مہیا کرتے رہیں گے۔ تم سودا بیچ کر ساتھ ساتھ رقم ادا کرتے رہنا اور ساتھ ساتھ اپنے باپ کو بھی پوڈر جی بھر کے چلاتے رہنا۔ تم، کیا یاد کرو گے دوست!''

شوکا بٹ وہاں سے بات پکی کر کے چلا آیا۔

دوسرے دن دو تین آدمی کار میں سوار ہو کر شوکے بٹ کے گھر آئے۔ پوچھا کیا تمہارا نام شوکا بٹ ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ہاں، میں شوکت بٹ ہوں۔ لوگ شوکا بٹ کے نام سے جانتے ہیں۔ انہوں نے جواباً کہا کہ ٹھیک ہے اور شوکے بٹ کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کے گھر کے نزدیک ہی ان کی کار کھڑی تھی۔ وہاں پہنچنے پر انہوں نے کار کی ڈکی کھولی اور کہا کوئی ایک اپنی مرضی کا ہتھیار اٹھا لو جلدی کرو، دیر مت کرو۔ کار کی ڈکی میں مختلف قسم کے ہتھیار اور چرس افیون پوڈر وغیرہ سے بھری پڑی تھی۔

''یہ ایک ماؤزر بھی ہے اس طرف سے اٹھا لو، کسی وقت بھی تمہارے کام آ سکتا ہے''۔ ان میں سے ایک شخص نے شوکے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں، بس پوڈر کے پیکٹ کافی ہیں۔ ماؤزر کی ضرورت نہیں۔ کیا میں نے کوئی جنگ لڑنی ہے؟'' شوکے بٹ نے جواباً کہا۔

''رکھ لو شوکے!'' ایک شخص نے کہا۔ ''اس قسم کے کاموں میں بعض اوقات جنگ بھی لڑنی پڑ جاتی ہے''۔

شوکا اب بخوبی سمجھ گیا کہ یہ مال کس نے بھیجا ہے۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے لہٰذا شوکت بٹ نے دو پیکٹ اور ماؤزر لے لیا اور سیدھا گھر چلا آیا اور وہ لوگ جو کار میں سوار ہو کر آئے تھے۔ اپنا مشن مکمل کر کے چلے گئے۔

گھر آتے ہی شوکا سب سے پہلے اپنے باپ ملا۔

''ابا! تم کیا یاد کرو گے''۔ اس نے کہا۔ ''اب تمہیں

پوڈر خریدنے میں مشکل نہ ہوگی۔ جی بھر کے پیو، تمہارے بیٹے کی زبانی یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔

''شاباش بیٹا! تم واقعی اپنے باپ کے بڑے خدمت گزار بیٹے ہو''۔ اس نے شوکے سے کہا۔

اب شوکا بٹ بڑی دلیری اور آزادی کے ساتھ اپنے علاقے میں ہیروئن پوڈر بیچنے لگا۔ پوڈر پینے والے نشئی قسم کے لوگ اس سے صبح وشام خریدتے اور اپنا نشہ پورا کرتے۔ شوکا بٹ فوراً اصل رقم واپس اپنے مالک کو پہنچا دیتا اور منافع اپنے پاس رکھ لیتا۔ اس طرح عرصہ ڈھائی تین سال تک اس کا یہ دھندہ خوب چلا۔ شوکا بٹ روپوں سے اپنی جیبیں بھر بھر کے گھر آتا اور سارے نوٹ اپنی ماں کے آگے پھینک دیتا لیکن اس کی ماں اسے ہمیشہ یہ کہتی کہ بیٹا مجھے تمہارے ان پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر تمہاری حلال کی کمائی ہوتی تو ضرور رکھ لیتی۔

''ماں! مجھ سے اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی''۔ شوکا جواب دیتا۔ ''نشہ نہ ملنے کی صورت میں وہ ہمیں گالیاں دیتا ہے۔ میں کیا کروں؟ اپنے باپ کی گالیاں سنوں یا پھر تمہارے لئے حلال کی روزی کماؤں؟ بس یہ میری ایک طرح کی مجبوری ہی سمجھیں۔ میں نے نوکری کر کے بھی دیکھا، حلال کی کمائی میں تو گھر کے اخراجات نہیں پورے ہوتے''۔

اس طرح ہیروئن فروخت کرتے کرتے کچھ عرصہ بعد اس کی مالی حالت بہتر ہوگئی۔ اب علاقے کی پولیس کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ پولیس جب بھی اس کو پکڑ لیتی وہ کچھ لے دے کر مک مکا کر لیتا۔ اس طرح آہستہ آہستہ بات اخباروں تک جا پہنچی کہ فلاں علاقے میں ہیروئن پولیس کی نگرانی میں سر عام بکتی ہے اور منشیات کی فروخت کا دھندہ شوکا بٹ کرتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ علاقے کی پولیس بھی خاموش اور اس مکروہ دھندے کا حصہ ہے۔ چنانچہ اب یہ بات پولیس کی ہائی کمان تک جا پہنچی تو اوپر سے علاقے کے ڈی ایس پی کو حکم ملا کہ کارروائی کر کے مجرموں کو پکڑا جائے۔ لہٰذا حکم کے مطابق ڈی ایس پی نے بھاری نفری کے ساتھ شوکے بٹ کے گھر پر اچانک چھاپہ مارا۔ علاقہ پولیس سے کسی نہ کسی طرح شوکے بٹ کو اس کارروائی کی خبر مل گئی اور چھاپے سے پہلے وہ کہیں روپوش ہوگیا اور وہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس نے اس کے والد جھورے بٹ سے شوکے بٹ کے متعلق پوچھا۔

جھورے بٹ نے دوٹوک پولیس کو جواب دیا کہ اسے کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ آپ اسے تلاش کرلیں، ہوسکتا ہے یہیں کہیں گلی محلے میں موجود ہو۔ پولیس کو جب شوکا ہاتھ نہ لگا تو پھر وہ اس کے باپ جھورے بٹ کو پکڑ کر ساتھ لے گئی اور اسے کہا۔ جب تمہارا بیٹا پیش ہوجائے گا تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس وقت تک تم پولیس کی حراست میں رہو گے۔ لہٰذا تھانے پہنچ کر پولیس نے جھورے بٹ کی جامع تلاشی لی اور اس کی جیب سے کچھ پڑیاں پوڈر کی برآمد ہوئیں۔ پولیس کو مواد ہاتھ لگ گیا اور افسران بالا کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے اس کے خلاف منشیات ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کرلیا گیا۔ پھر مجسٹریٹ کے سامنے کر کے دو تین دن ریمانڈ لیا گیا پھر پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کر کے اسے جیل بھیج دیا گیا۔

کچھ عرصہ تک مقدمے کی کارروائی عدالت میں چلتی رہی۔ مقدمے کی پیروی ان کا بیٹا جواب پولیس میں ملازم ہو چکا تھا، وہ کرتا رہا اور مقدمے کے اخراجات شوکا بٹ فراہم کرتا۔

ہفتہ پندرہ دن بعد جھورے بٹ کے گھر والے اس کی میل ملاقات جیل میں جا کر کر آتے اور اس کو گھی، فروٹ یا دیگر قسم کا راشن اور پوڈر وغیرہ کسی نہ کسی ذریعے اس کو دے آتے۔ جیل کے اندر بھی اس کے یار دوست

جو مختلف قسم کے جرائم میں سزا کاٹ رہے تھے، جھورے بٹ سے ملے۔ اس طرح اس کا وقت جیل میں خوب گزرنے لگا۔

شوکے بٹ کے پاس اب پیسے کی کمی نہ تھی۔ وکیلوں اور عدالتوں کے اخراجات اس نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ ادھر جیل میں جھورا بٹ بھی بڑی حد تک مطمئن حال تھا۔ اسے جیل میں دنیا کی ہر چیز میسر تھی۔ بس ایک چیز اُسے جیل میں اذیت دیتی وہ تھی اس کے بیوی بچوں کی جدائی۔

اس کا بڑا بیٹا عارف عرف آرا بٹ جو علاقہ غیر میں جا کر آباد ہو گیا تھا، وہ بھی گاہے بگاہے لاہور اپنے بہن بھائیوں کو ملنے آتا جاتا رہتا۔ اگر وہ چاہتا تو ملکوں کی مخالف پارٹی سے اپنے باپ کا انتقام لے سکتا تھا کیونکہ انہوں نے اس کے باپ کو گاؤں سے باہر نکال کیا تھا اور وہ مجبور ہو کر لاہور آ کر آباد ہو گیا اور یوں اس کے اہل خانہ کو اپنا آبائی گاؤں چھوڑنا پڑا لیکن آرا بٹ نے عقل ہوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مخالف پارٹی سے انتقام نہ لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں اسے ڈر تھا کہ اس کے گھر والوں کے لئے کہیں مزید مشکل نہ پیدا ہو جائے۔ اس نے اپنے آپ کو محفوظ اور زندہ رہنے کے لئے علاقہ غیر میں جا کر کسی بڑے خان کے پاس بطور باڈی گارڈ ملازمت اختیار کر رکھی تھی اور اس نے وہاں شادی بھی کر رکھی تھی۔

جھورے بٹ کا مقدمہ بھی عدالت میں زیر سماعت تھا آخر کار عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس کو پانچ سال کی قید بامشقت سنا دی گئی۔ چنانچہ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر کر دی گئی۔

اس دوران جب جھورا بٹ جیل میں تھا، اس پر ظلم کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا جس سے جھورے کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کا بیٹا جو پولیس میں ملازم تھا مفرور ملزموں کے ساتھ پولیس مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد جھورے بٹ کا داماد جس کے تین چار بچے بھی تھے، کسی روڈ ایکسیڈنٹ میں بُری طرح زخمی ہو گیا اور اس کی تین چار پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ زندگی تو اس کی بچ گئی لیکن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپاہج بن کر رہ گیا۔ اس کے گھر، علاج معالجے کے تمام اخراجات جھورے بٹ پر آن پڑے۔ جھورے بٹ کے لئے اب زندگی مشکل اور تنگ ہو کر رہ گئی۔ اس کا بڑا بیٹا تو پہلے ہی مفرور اشتہاری ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ڈاکوؤں سے مقابلے میں مارا گیا۔ تیسرا بیٹا شوکا بٹ اس کی زندگی بھی ہر وقت خطرے میں تھی کیونکہ وہ بھی پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ پوڈر فروخت کرنے کا دھندہ بڑے زور شور سے کرتا اور کسی وقت بھی پولیس کے ہاتھوں چڑھ جانے کی صورت میں آر یا پار ہو سکتا تھا۔

جھورے بٹ نے ان حالات کو سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور جیل میں اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی اب وہ پانچ وقت کی نماز اور قرآن مجید کی تلاوت جیل میں پابندی سے کرنے لگا۔ جب جیل حکام نے اس کو بدلتے دیکھا تو ایک دن جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل خود بھی نمازی اور پرہیزگار انسان تھا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جھورے بٹ کے بیٹے شوکے بٹ نے فقط اپنے باپ کو نشہ یا پوڈر مہیا کرنے کی خاطر یہ مکروہ دھندہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ذات کے لئے بالکل نہیں کرتا۔ یہ جو کچھ بھی تھا بہرکیف غلط تھا۔ جھورا بٹ جیل کے افسران بالا کے حکم پر فوراً پیش ہو گیا اور جیل سپرنٹنڈنٹ نے اس کو مشورہ دیا۔

”بٹ صاحب جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے درست نہیں۔ دو بیٹے تم پہلے ہی کھو چکے ہو، کیا تم اپنا تیسرا بیٹا بھی مروانا چاہتے ہو؟ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ

پوڈر پینا فوراً چھوڑ دو اور اپنے بیٹے کو بھی اس دھندے سے منع کرو۔ اس سے تمہاری دنیا اور آخرت سنور سکتی ہے۔ ورنہ تباہی اور ذلت کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم کیسے باپ ہو، لوگ تو اپنی اولاد کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں ایک تم باپ ہو جو اپنے بیٹے کو اپنی ذات اور مفاد کی خاطر اندھیرے کنوئیں آمیں دھکیل رہے ہو"۔

سپرنٹنڈنٹ جیل نے جھورے بٹ کی بہت زیادہ برین واشنگ کی اور اس گفتگو کو جھورے بٹ نے مثبت انداز میں لیا اور اسی وقت جیل کے اندر جو مسجد تھی، وہاں جا کر عہد کیا کہ آج کے بعد زندگی بھر کوئی نشہ وغیرہ نہیں کرے گا اور اپنے بیٹے کو بھی اس کام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منع کر دے گا اور اس دن سے جھورا تائب اور ایک عبادت گزار شخص بن گیا۔

سپرنٹنڈنٹ جیل بھی بہت خوش ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی بدولت ایک بھٹکا ہوا بے راہ شخص صراط مستقیم پر چل پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے جھورے بٹ سے وعدہ لیا کہ اپنا چال چلن درست رکھے، اس کی اپیل میں حکومت سے استدعا کریں گے کہ اس کے مقدمہ میں اسے زیادہ سے زیادہ رعایت دی جائے۔ کیونکہ یہ عدالت کا معاملہ ہے۔ حتمی وعدہ نہیں کرتے۔ بس اللہ پہ بھروسہ رکھو۔ وہ جو بھی کرے گا اس میں ہم سب کی بہتری ہوگی۔

اب جھورے بٹ کا زیادہ وقت اللہ کی یاد میں گزرتا۔ پانچ وقت کی باجماعت پابندی سے نماز ادا کرنے کے بعد، مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا رہتا۔ جیل میں اس کے یار دوست اس کی اچانک تبدیلی دیکھ کر پریشان اور حیران ہو گئے۔ دراصل جھورے بٹ کو اتنے زیادہ زخم لگ چکے تھے اور غموں نے اسے نڈھال اور بے بس سا کر رکھا تھا جن کا وہ اس عمر میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک ہفتہ بعد اس کے گھر والے اس کی ملاقات کرنے جیل آئے، اس کو کچا راشن گھی وغیرہ دیا اور ساتھ ہی اس کی خاص ضرورت یعنی پوڈر بھی۔

راشن تو جھورے نے قبول کر لیا اور پوڈر کے لئے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ہرگز نہیں لے گا اور ہاں تمہیں مزید تاکید بھی کرتا ہوں آئندہ یہ لانا بھی نہ۔ دوسرے شوکت کو میری طرف سے پیغام بھی دینا کہ یہ دھندہ اس نے اپنے باپ کے لئے شروع کیا تھا اور اب اپنے باپ کے کہنے پر اس کو ہمیشہ کے لئے ختم بھی کر دے۔ گھر والوں کو اچانک جھورے بٹ میں تبدیلی کا جان کر حیرت ہوئی۔ وہ خوشی خوشی گھر آئے اور شوکے بٹ کو ان کے باپ کا پیغام دیا۔ شوکا بٹ بھی باپ کا پیغام سن کر بہت خوش ہوا۔ وہ تو پہلے سے ہی اس کاروبار سے بیزار تھا۔ بہر کیف سب کچھ وہ ایک مجبوری کے تحت کر رہا تھا۔ وہ فوراً اپنے مالک کے پاس گیا اور اس سے اپنا حساب کتاب صاف کیا۔ جو مال اس کے پاس فروخت کرنے کے لئے آیا ہوا تھا جوں کا توں واپس کر دیا۔ مالک نے دھندہ بند کرنے کی وجہ پوچھی اور تھوڑا زیادہ ڈرایا دھمکایا بھی لیکن شوکے بٹ نے کہا۔ کچھ بھی ہو اب میں یہ کاروبار ہرگز نہیں کروں گا۔ گو شوکا ان پڑھ تھا لیکن وہ زبان کا پکا تھا۔ جو اس نے کہا اس پر عمل بھی کیا۔ یہ دھندہ ختم کرنے کے بعد اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور توبہ بھی کی کہ وہ آئندہ زندگی بھر یہ کام نہیں کرے گا۔ بے شک وہ محنت مزدوری کرے گا۔ لہٰذا اپنی یا اپنے گھر والوں کی گزر اوقات کے لئے جو تھوڑی زیادہ رقم اس کے پاس جمع تھی اپنے محلے سے ہٹ کر ایک دودھ دہی کی دکان کھول لی۔

دوسری طرف جھورے بٹ کو جیل میں گئے تقریباً ڈھائی سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اپیل میں فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا اور اس کی باقی ماندہ سزا معاف کر دی گئی اور وہ جیل سے رہا ہو کر اپنے بیوی بچوں میں گھر آ گیا۔

جھورا اب ایک مکمل اور باعمل انسان بن کے جیل سے گھر لوٹا۔ اس کی زبان پر اب ایک ہی دعا ہوتی یارب مرنے سے پہلے پہلے مجھے حج بیت اللہ نصیب فرمانا۔ گلی محلے والے بھی جھورے بٹ کی تبدیلی کو جان کر حیران ہو گئے کہ جیل جانے سے پہلے جھورا کتنا مختلف قسم کا انسان تھا، آج کل کتنا نیک اور باعمل انسان بن گیا ہے۔

اللہ کی قدرت اس کی حج بیت اللہ والی دعا بھی قبول ہوئی اس کی رہائی کی خوشی میں اس کا بڑا بیٹا عارف بٹ جو علاقہ غیر میں رہتا تھا، اسے خبر ملی کہ اس کا باپ جیل سے آزاد ہو کر گھر آ گیا ہے وہ اسے ملنے لاہور آیا۔ باپ بیٹا ایک عرصہ بعد ملے۔ جھورے نے بیٹے کو گلے لگایا۔ خوب رویا شاید اُسے اپنے منجھلے بیٹے افتخار کا غم یاد آیا جو ڈاکوؤں سے مقابلہ میں شہید ہو گیا تھا۔ بہرکیف اس نے اپنے بیٹے عارف سے کہا کہ یہ کام چھوڑ دو۔ واپس اس کے پاس لاہور آ جاؤ۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، وہ زندگی کے باقی ایام اکٹھے گزارنا چاہتا ہے۔

عارف بٹ نے کہا۔ ابا یہ بات ذرا مشکل سی ہے۔ پھر بھی اس ضمن میں سوچا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے دشمن ابھی اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے چھپ چھپا کر یہاں اپنے گھر والوں کو ملنے آتا ہے۔ تاہم تم مطمئن رہو اللہ بہتر کرے گا۔ جھورے بٹ کو بھی قدرے حوصلہ ملا۔ اکٹھے گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا۔

عارف بٹ کو کسی ذریعہ یہ بھی پتہ چلا کہ اس کا باپ فریضہ حج ادا کرنا چاہتا ہے اور اس کی یہ دلی خواہش ہے کہ اسے مرنے سے پہلے پہلے حج بیت اللہ نصیب ہو۔ عارف بٹ کے پاس تقریباً پچاس ہزار روپے کی رقم جمع تھی جو وہ کاروبار کے لئے اکٹھی کر رہا تھا۔ جب اس نے اپنے والد کی خواہش کا سنا تو اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور اپنے باپ سے کہا کہ وہ حج کے لئے تیاری کرے، رقم اس کو بہت جلد مل جائے گی۔ جھورا یہ جان کر بہت خوش ہوا کہ اللہ نے کیسے اس کی مدد کی جس کا وسیلہ اس کا بیٹا بنا۔ عارف واپس علاقہ غیر پہنچا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر رقم لا کر اپنے والد کو دے دی۔ چنانچہ جلد ہی پروگرام کے مطابق جھورا بٹ اسی سال حج بیت اللہ کی ادائیگی کے لئے روانہ ہو گیا۔ حج کی ادائیگی کے بعد جھورے بٹ کی دوسری بڑی خواہش یہ تھی کہ پروردگار اس کو مرنے سے پہلے پہلے ایک مرتبہ اس کا آبائی گھر اور اس کا گاؤں دکھا دے اور اس کی یہ بھی بڑی خواہش ہے کہ وہ مرنے کے بعد دفن بھی وہاں ہی ہو اور اس کے یار دوست عزیز و اقارب جن کے ساتھ اس نے زندگی کا ایک عرصہ گزارا ہے، وہ لوگ اس کے جنازے کو کندھا دیں۔ کیونکہ جب وہ گاؤں میں آباد تھا بہت ہی مطمئن حال تھا۔ جب وہاں سے لاہور منتقل ہوا، ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بنی رہی۔ اب اس کے دل میں ایک خلش ہے یہ اس کی زندگی کے باقی ایام اس کے آبائی گاؤں میں گزریں۔

جھورے بٹ نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جب کوئی بھی شخص حج پر جاتا ہے اور اس کی نظر خانہ کعبہ پر پڑتی ہے تو اس وقت جو بھی دعا مانگی جائے خدا اس کو منظور فرماتا ہے۔ چنانچہ جھورے بٹ نے جونہی اپنی نظر خانہ کعبہ کی طرف اٹھائی فوراً اپنی آنکھیں بند کر کے دعا کی کہ اے پروردگار اسے اس کے آبائی گاؤں میں آباد کر دے اور وہیں اسے دو گز زمین دفن کے لئے اس کے آبائی قبرستان میں جگہ دے۔ یہ اس کی دلی خواہش ہے۔ اسے قبول فرما۔ اللہ کی قدرت اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور جلد ہی رنگ بھی لائی۔ ایک دن وہ فجر کی نماز ادا کر کے بیت اللہ شریف سے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر وہاں حج پر آئے ہوئے ملک اچھو پر پڑی۔

دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھا کچھ اندھیرا اجالا بھی تھا اور دونوں ہی احرام

باندھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے میں کچھ مشکل پیش آئی تاہم انہوں نے پہچان لیا۔ پہلے تو ایک دوسرے کو ملنے سے گریز کیا پھر اللہ کے حکم سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ ہاتھ ملایا، گلے ملے، سلام دعا ہوئی، پھر وہیں بیٹھ گئے، اللہ کے گھر میں بیٹھے بیٹھے دونوں نے اپنے اپنے دلوں کو صاف کیا اور اپنی پرانی رنجشیں دور کیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو ضامن رکھ کر ایک دوسرے کو حلف دیا کہ ہم لوگ ماضی کو بھول جائیں جو ہوا سو ہوا سب دشمنیاں ماضی کی ختم کرتے ہیں۔

اچھو ملک نے وہیں بیٹھے بیٹھے اللہ کے گھر جھورے بٹ سے وعدہ کیا کہ وہ جب چاہے اپنے گاؤں آ سکتا ہے یہاں تک کہ اس کے بیٹا عارف بٹ سے بھی اس کی کوئی عداوت یا دشمنی نہیں۔ دونوں بہت خوش ہوئے، اکٹھے کھانا کھایا، فریضہ حج بھی اکٹھے ادا کیا۔ جھورے بٹ کی یہ آخری خواہش بھی اللہ نے پوری کر دی۔ حج کی ادائیگی کے بعد جھورا بٹ سیدھا اپنے گھر لاہور آیا، پھر خوشی خوشی اپنے اہل وعیال کو لے کر سیدھا اپنے گاؤں گیا اور اپنے بیٹے عارف بٹ کو بھی وہاں بلا لیا اور اسے کہا کہ اب اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں کیونکہ اچھو ملک سے اس کی صلح ہوگئی ہے اور اس نے اسے اپنے گاؤں آنے کی اجازت دے دی ہے۔ عارف بٹ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت اپنے گاؤں خوشی خوشی لوٹ آیا۔ ٹھیک ایک سال بعد جھورے بٹ کا انتقال ہوگیا۔ اللہ نے اس کی یہ دعا بھی قبول فرمائی کہ اس کی خواہش کے مطابق اس کو کفن دفن کے لئے اس کے آبائی قبرستان میں جگہ ملی۔ اللہ نے اس کی ساری دعائیں قبول فرمائیں کیونکہ جھورا بٹ توبہ کر کے ایک باعمل مسلمان بن گیا تھا۔ اللہ ہم سب کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ توبہ کا در آخری سانس تک کھلا ہے۔

اس لاش کے بعد تو پھول پور میں دہشت کی پرچھائیاں قائم ہوگئیں۔ پولیس نے بھی مان لیا کہ لاشوں کو ٹکڑے کر کے پھینکنے والا سیریل کلر قانون وانتظامیہ کے لئے ایک چیلنج تھا۔

ساتواں قتل

دستگیر شہزاد ---------- 0300-9667909 ----------

15 ستمبر 2012ء کی بات ہے۔ صبح 7:05 پر تھانہ پھول پور کے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ اُس وقت ایس آئی علی جان ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے فون اٹھا کر کان سے لگایا، دوسری طرف سنجیدہ آواز میں کہا گیا۔ میرا نام عرفان جٹ ہے۔

''بتایئے جٹ صاحب! آپ کہاں سے بول رہے ہیں اور ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟'' علی جان نے پوچھا۔

''سیوا تو میں پولیس والوں کی کر چکا، سیوا ابھی ایسی سردار حمزہ سنے گا تو اپنے بال نوچ لے گا''۔ تلخ لہجے میں کہا گیا، یہ براہ راست پولیس کی توہین تھی۔

علی جان نے پوری بات بتا کر فون سردار حمزہ کو پکڑا دیا۔

''سچ بتا تو ہے کون اور یہ کیسی بکواس کر رہا ہے؟''۔ سردار حمزہ کو غصہ آ گیا۔

''سن!''۔ دوسری طرف سے شیطانی قہقہہ لگایا گیا۔ ''رات کو میں نے ایک قتل کیا ہے۔ پہلے رسّی سے گلا گھونٹ کر میں نے اُس کا قتل کیا پھر چھرے سے اُس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔ سچ، ایسا کرنے میں مجھے بہت لطف آیا۔ اس کے بعد دھڑ کو میں اپنے گھر سے لے جا کر سینٹرل جیل کے سامنے پھینک آیا''۔ بات پوری کرنے کے بعد اُس نے پھر سے شیطانی قہقہہ لگایا۔

''مقتول کا سر کہاں ہے؟''

''ساری باتیں مجھ سے ہی پوچھے گا، کچھ اپنے کرنے کے لئے بھی تو باقی رکھ۔ پیسہ عوام کا ہو یا سرکار کا، تم پولیس والوں کو بغیر محنت کئے حرام کی کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ تم لوگ خود پتہ کرو کہ سر کہاں ہے۔ ایمانداری سے ڈھونڈو گے تو مل جائے گا''۔ اس کے بعد مبینہ عرفان

جٹ نے سردار حمزہ سمیت پوری پولیس فورس کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جواب میں سردار حمزہ نے ایک گالی دی تو دوسری طرف سے انہیں سو گالیاں سننے کو ملیں۔ فون کرنے والے نے ایک شعر بھی سنایا۔

پیدا ہوئی پولیس تو شیطان نے کہا
لو، آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

سردار حمزہ نے دماغی گھوڑے دوڑائے تو انہیں لگا کہ فون کرنے والا کوئی سنکی، پاگل، یا چرسی ہے جو انہیں مسلسل گندی گالیاں دیئے جا رہا ہے۔ انہوں نے فون رکھ دیا۔ مبینہ عرفان جٹ کے فون پر سردار حمزہ نے تب سنجیدگی سے سوچا جب پندرہ منٹ بعد ہی سات بج کر بیس منٹ پر بذریعہ وائرلیس اطلاع آئی۔ سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے بورے میں لاش پڑی ہے۔ بورے کا منہ کھلا ہے جس سے لاش دکھائی دے رہی ہے۔ بورے سے خون بھی رس رہا ہے۔ موقع پر پہنچ کر مناسب کارروائی کی جائے۔ اطلاع روزنامچہ میں درج کرنے کے بعد سردار حمزہ نے ایس آئی شاہد علی کانسٹیبل زاہد حسین کو ساتھ لیا اور سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پہنچ گئے۔ وہاں سڑک کنارے حقیقت میں ایک بورا رکھا تھا۔ جس پر مکھیوں نے بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ سردار حمزہ نے بورا الٹوایا تو اُس میں سے ایک لاش نکلی کسی نوجوان کی سر کٹی لاش۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ عرفان جٹ کی کال فرضی نہیں تھی۔ قاتل اپنا جرم بھی نہیں چھپانا چاہتا تھا، اس لئے اُس نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا۔ معاملہ اب معمولی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے سنجیدہ شکل اختیار کر لی تھی۔ اس لئے عرفان جٹ نے اپنے ایس ایچ او شہرام بٹ کو فون کر کے حادثہ اور حالات سے آگاہ کیا۔ شہرام بٹ سے جتنی جلدی ہو سکتا تھا انسپکٹر احتشام حسن کو ساتھ لے کر سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پہنچ گئے۔

وہ سر کٹی لاش قاتل کی حیوانیت کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ شہرام بٹ سوچنے لگے۔ قاتل نے کسی کا قتل کر ہی دیا تھا تو اُس کی پوری لاش کو ہی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ اس کے ٹکڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قاتل نے لاش کے ٹکڑے بے مقصد نہیں کیئے ہوں گے۔ شہرام بٹ ابھی لاش کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ ان کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ شہرام بٹ نے ہرا بٹن دبا کر فون کان سے لگا کر ''ہلو'' کہا۔ دوسری طرف سے شیطانی قہقہہ سننے کو ملا۔ اس بدتمیزی پر شہرام بٹ کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''ابے کون ہے تُو؟''

''عرفان جٹ''۔ جواب ملا۔ ''سر کٹی لاش دیکھ رہے ہو نا! کیسی لگی؟ میں ایکسپرٹ تو نہیں ہوں پھر بھی گردن صفائی سے کاٹنے کی کوشش کی ہے تا کہ تم پولیس والوں کو دیکھنے میں کٹی گردن بُری نہ لگے۔ یہ بھی جان لو کہ سر کٹی لاش کسی اور نے نہیں میں نے ہی سینٹرل جیل کے گیٹ نمبر 3 کے سامنے پھینکی ہے''۔ اس کے بعد فون کرنے والے نے شہرام بٹ کو بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ شہرام بٹ جانتے تھے کہ گالیاں سننے سے فائدہ نہیں اس لئے انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد مقتول کی شناخت اور قاتل کا سراغ ڈھونڈنے کے لئے شہرام بٹ نے موقع پر کرائم ٹیم بلا لی۔

کرائم ٹیم کے ساتھ پھول پور پولیس نے لاش کا باریکی سے معائنہ کیا تو پایا کہ اس کے بائیں شانے پر بچھو کا ٹیٹو بنا تھا۔ ایسا ہی ایک ٹیٹو دائیں ہاتھ پر بھی بنا تھا اور اس کے ساتھ اردو میں نام گدا ہوا تھا ثمر چوہدری۔ اس سے یہ امکان پیدا ہوا کہ مقتول کا نام ثمر چوہدری رہا ہو گا حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ ثمر چوہدری مقتول کا نام نہ ہو اور اس کے کسی رشتہ دار کا ہو۔ تقدیر کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ اپنی ہر اچھائی کو منجانب اللہ سمجھو لیکن برائی کے ضمن میں کوئی جواز پیش کرنے کے بجائے ایک واضح

احساس پشیمانی کے ساتھ کہو کہ یہ سب کچھ میرا اپنا کیا دھرا ہے۔

وہ بورا جس میں لاش رکھ کر پھینکی گئی تھی اس کی بھی اچھی طرح سے تلاشی لی گئی تو اس کے اندر نیلی پولی تھین رکھی ملی۔ پولی تھین کھول کر دیکھنے پر اس میں ایک خط ملا۔ پولیس کو چیلنج دینے والا یہ خط اردو میں لکھا تھا۔

"پولیس والو! پہلی لاش کا میرا تحفہ قبول کرو۔ ہر پندرہ دن میں میں تمہیں ایسی ہی کٹی لاشوں کے تحفے دیتا رہوں گا"۔

اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ قاتل کوئی سر پھرا یا سنکی ہے۔ اسی دوران علی جان کو مدعی بنا کر مقدمہ قتل کے تحت معاملہ درج کر لیا گیا۔ موقع پر موجود پولیس کو پنچ نامہ بنا کر لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے کی ہدایت دے کر شہرام بٹ نے اُس نمبر پر کال بیک کی جس سے فون کر کے انہیں گالیاں دی گئی تھیں۔ رابطہ قائم ہونے پر امید

> جس نے اپنی حقیقت نہ پہچانی ہو اُس سے بھی امید رکھو۔ شاید وہ انسانی جسم سے الگ دور دور پھیلی زندگی کی دھڑکنوں میں کوئی راستہ ڈھونڈ لے۔

کے مطابق وہ نمبر پی سی او کا تھا۔ پتہ پوچھ کر شہرام بٹ اور احتشام حسن پی سی او جا پہنچے جو پھول پور میں ہی تھا اور اس کا مالک عبدالقدیر تھا۔ پی سی او پر قدیر کا نوکر وارث علی ملا۔ ہاتھ جوڑ کر وہ بولا۔

"صاحب! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ آدمی فون پر کسی قتل کی بات کرے گا اور آپ لوگوں کو گالیاں دے گا"۔

شہرام بٹ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تم اُسے روک سکتے تھے"۔

"سر جی! میں نے اسے منع کیا تھا کہ ایسی باتیں ہمارے یہاں سے مت کرو۔ مگر وہ مجھے بھی دھمکی دینے

لگا۔ جیسے اس کے ٹکڑے کر کے پھینکے ہیں ویسے ہی تیرے بھی ٹکڑے کر دوں گا۔ فون کرنے کے بعد اس نے پیسے بھی نہیں دیئے اور مجھے گالیاں دیتا ہوا چلا گیا"۔

"یہ بتاؤ دوسری بار بھی تو وہ آدمی تمہارے یہاں فون کرنے آیا تھا"۔

"ہاں صاحب! آیا تھا"۔ وارث علی نے بتایا۔ "اس کی دھمکی سے میں اس قدر رہوا تھا کہ اُسے منع نہیں کر سکا۔ فون پر اُس نے پھر قتل کی بات کی، گالیاں دیں اور پہلے کی طرح مجھے گھورتے ہوئے چلا گیا"۔

"وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"عام آدمیوں جیسا تھا مگر اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ پولیس کو گالیاں دینے کے بعد وہ خوش نظر آ رہا تھا"۔

"تم ہمارے ساتھ چلو اور اپنی یادداشت سے اُس حیوان کا سکیچ بنواؤ"۔

وارث علی فوراً راضی ہو گیا۔ اُس نے پی سی او بند کیا اور پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پولیس آرٹسٹ کے پاس لے گئی۔ تھوڑا وقت ضرور لگا مگر سکیچ بن گیا۔

پھول پور پولیس نے اس سکیچ کی بنیاد پر قاتل کو پکڑنے کی مہم چلائی۔ اخباروں میں اشتہارات دیئے۔ نیوز چینل پر نشر کرایا، پوسٹر چھپوا کر عوامی مقامات پر لگوائے مگر نتیجہ صفر رہا۔

چونکہ قاتل نے ہر پندرہ دن میں پولیس کو کٹی ہوئی لاشوں کا تحفہ دینے کے لئے خط لکھا تھا۔ اس لئے صرف پھول پور ہی نہیں ضلع کے سبھی تھانہ علاقوں میں گشت بڑھا دی گئی اور خاص چوکسی برتی جانے لگی۔

پندرہ دن بعد پولیس کو کوئی سر کٹی لاش تو نہیں ملی لیکن اس دوران خود کو عرفان جٹ بتانے والے قاتل کا سراغ بھی نہیں ڈھونڈ پائی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پولیس کا جوش بھی ٹھنڈا پڑنے لگا اور تفتیش بھی ٹھنڈی ہو

> قافلہ سفر میں ہے۔ علم، نشان، پیادے، سوار، ہر شے تخت شاہی کے جلو میں ہے۔ جلاد، طائفے، اونٹ، خچر، مال غنیمت سے لدی بیل گاڑیاں، سردار مفتوح غلام، اجنبی دیار سے ہم رکاب ہونے والی وبا، چیل کوے، طرح طرح کے ماس خور اور خود سفر کی ہر بلا، سبھی تو سفر میں ہیں کہ زندگی کے ساتھ موت بھی پا پیادہ ہے۔ وقت آگے نکل جاتا ہے، مقبرے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

گئی۔ ثمر چوہدری کی سر کٹی لاش ملنے کے تقریباً 8 مہینے بعد سنکی قاتل نے پولیس کے سامنے پھر سے چیلنج کیا۔

24 اپریل 2013ء کی صبح 8 بجے جیل کے حفاظتی گارڈ فرخ رانا نے سینٹرل جیل گیٹ نمبر 3 پریڈ گراؤنڈ کے نزدیک ایک کارٹن لاوارث پڑا دیکھا۔ وہ کارٹن لاوارث ہونے کے ساتھ مشتبہ بھی تھا۔ فرخ رانا نے یہ بات اپنے ساتھ کام کرنے والے ذیشان کو بتائی اور اس نے 8 بج کر 28 منٹ پر پولیس وائرلیس ہیڈ کوارٹر فون کر دیا۔ بذریعہ وائرلیس مذکورہ اطلاع علاقائی تھانہ پھول پور کو دی گئی۔ وہاں سے ایس آئی کوثر علی اور کانسٹیبل تنویر احمد فوراً موقع پر پہنچے۔ احتیاط کے ساتھ کارٹن کھول کے دیکھا تو اُس میں سفید چادر میں لپٹا ہوا 20، 30 سالہ نوجوان کا دھڑ ملا۔ مقتول کا سر ہاتھ و پیر کٹے ہوئے تھے اور اُس کا عضو تناسل بھی کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ مقتول کے باقی اعضاء کو کہیں اور ٹھکانے لگایا گیا تھا۔ بہرحال موقع پر پہنچی پولیس نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد دھڑ کو سول ہسپتال کے مردہ گھر میں محفوظ رکھوا دیا۔ اس قتل کا تھانہ پھول پور میں

> سچ یہی ہے کہ ہم بے خبر ہیں۔ آگہی موسم کے پھولوں کی طرح کھلتی ہے، مرجھاتی ہے، پھر کھلتی ہے، پھر مرجھاتی ہے۔

کیس رجسٹرڈ کرلیا گیا۔

اسی دن نعمان قریشی نے گوگیرہ پل نہر کے قریب ایک بیگ دیکھا جس میں کسی شخص کے کٹے ہوئے پیر رکھے تھے۔ نعمان قریشی نے پولیس کو اطلاع دے دی تو علاقائی اسلام پورہ چوکی سے ایس آئی قمر عالم موقع پر پہنچے۔ انہوں نے وہ پیر تحصیل ہسپتال کے مردہ گھر میں رکھوادیئے۔

اسی روز فروٹ مرچنٹ آفتاب کو اس کی ریڑھی کے پاس لاوارث کارٹن ملا۔ آفتاب کی اطلاع پر تھانہ گلبرگ سے ایس آئی مبشر حسین وغیرہ موقع پر پہنچے۔ انہوں نے کارٹن کھولا تو اس میں سے کسی مرد کے کٹے ہوئے ہاتھ اور عضو تناسل ملا۔

کٹے ہوئے اعضا کو ایک مقام پر جمع کر کے جوڑا گیا تو علم ہوا کہ تین جگہوں سے ملنے والے کٹے ہوئے وہ اعضاء ایک ہی شخص کے تھے۔ قتل کرنے کے بعد مقتول کے ان اعضاء کو بے رحمی سے کاٹ کر انہیں جسم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اپنی طرف سے پولیس نے ساری کوششیں کرلیں لیکن نہ تو لاش کی شناخت ہوسکی نہ قاتل کا سراغ مل سکا۔

اسی طرح 18 مئی کو بھی ٹکڑوں میں ایک تیسری لاش ملی۔ قاتل نے اس لاش کے بھی ٹکڑے الگ الگ جگہوں پر پھینکے تھے۔ اس لاش کے ساتھ ہی پولیس کو ایک خط ملا جس میں ہر پندرہ دن میں ایک لاش کے ٹکڑوں کا تحفہ دینے کی بات کہی گئی تھی۔

اس لاش کے بعد تو پھول پور میں دہشت کی پرچھائیاں قائم ہوگئیں۔ پولیس نے بھی مان لیا کہ لاشوں کو ٹکڑے کر کے پھینکنے والا سیریل کلر قانون وانتظامیہ کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس کا آزاد رہنا لوگوں کے لئے زبردست خطرہ تھا۔ اس لئے اُسے پکڑنے کے لئے پولیس نے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ اُس کیچ کا بھی

وہ اکیلی تھی اور سناٹے کی کیفیت عجیب تھی۔ درد وسرور کی آمیزش سے بنی اس کیفیت نے اچانک اس کی نظریں اس رُخ پر موڑ دیں جدھر ایک دنیا آباد تھی اور وہ ساری ناتمام آرزوئیں ہنس کھیل رہی تھیں۔ جنہیں ہمیشہ ہی ناتمام رہ کر طاقت کے اس ذخیرے کو محفوظ رکھنا ہے۔ جو نفس پر حکومت کر سکے یہی طاقت ساتوں رنگوں اور ساتوں سروں میں گھل کر ساتوں آسمان ہمارے قدموں کے نیچے بچھا دیتی ہے۔

سہارا لیا جو ثمر چوہدری کے قتل کے بعد وارث علی نے بنوایا تھا۔

اس بار پولیس کی محنت کارگر ثابت ہوئی۔ ایک مخبر کی اطلاع پر 2 مئی 2013ء کو نشاط آباد کے قریب سے سیریل کلر کو گرفتار کرلیا گیا۔ پوچھ گچھ کرنے پر اُس نے اپنا نام ابوسفیان بتایا۔ ابوسفیان کو جس ٹیم نے پکڑا اُس میں سپیشل سٹاف کے انسپکٹر احتشام حسن، انسپکٹر ابوذر، ایس آئی علی حسن اور اے ایس آئی ناظم حسین شامل تھے۔

ابوسفیان کو کسی خفیہ مقام پر رکھ کر پوچھ گچھ کی گئی تو اُس کے سینے میں دفن راز، نفرت اور باغی جذبے سامنے آ گئے۔

41 سالہ ابوسفیان ولد علی اکبر راجہ جنگ کا باشندہ تھا۔ اس کا باپ سرکاری ملازمت میں تھا اور ماں ٹیچر تھیں۔ اس کے باوجود ابوسفیان کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ صرف ساتویں تک ہی وہ اسکول گیا تھا۔ ماں باپ نے بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ابوسفیان نے جو ایک بار اپنا بستہ کھونٹی پر ٹانگا تو پھر اُسے اتار کر دیکھنے پر بھی تیار نہ ہوا۔

کچھ عرصہ تک ابوسفیان گاؤں میں رہ کر مٹر گشتی کرتا رہا اس کے بعد روزگار کی تلاش میں پھول پور آ گیا۔ ابوسفیان نے پھول پور میں رہ کر سالوں تک چھٹ

پٹ کام کیئے، نوکری بھی کی۔ اسی دوران کسی بہی خواہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کاروبار شروع کر دے۔ اس نے ریہڑھی پر سبزی رکھ کر گلی گلی فروخت کرنا شروع کر دی۔ اُسے یہ کام راس آ گیا۔ اس دھندے میں منافع بھی اچھا تھا اور کوئی اس پر حکم چلانے والا نہیں تھا۔ اسی دوران مناہل سے ابوسفیان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اُن دنوں مناہل کی عمر 18 سال تھی اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ شالی پھول پور میں رہتی تھی۔ مناہل کے والد پان کی دُکان چلاتے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے اور دونوں نے شادی کر لی۔ یہ 2006ء کی بات تھی۔

ازدواجی زندگی کی شروعات کے لئے ابوسفیان نے علی پور میں واقع راؤ ضمیر کے مکان میں ایک کمرہ پہلے ہی کرائے پر لے رکھا تھا، مناہل کو وہ وہیں پر لے گیا۔ سال بھر گزرتے گزرتے اُن کے گھر میں ایک بیٹی نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹی ہوئی اور اخراجات اور بڑھ گئے۔ کنبے کے رچ پورے کرنے اور اسے سکھ سے رکھنے کے لئے ابوسفیان بڑی محنت کرنے لگا۔ پائی پائی بچاتا۔ پولیس والے تھے کہ اس کی کمائی پر دانت گڑائے رہتے۔ ہر جگہ بیٹ کانسٹیبل اسے روک کر بھتہ وصول کرتے۔ یہی نہیں ریہڑھی سے سبزی بھی اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیتے۔ ڈے گشت پولیس کی گاڑی ملتی تو بہت سارے پولیس والے بھی اس سے ریہڑھی پر سبزی فروخت کرنے کی رنگداری وصول کرتے۔

سبزی بیچنا مجبوری تھا۔ پولیس والوں کو پیسہ دینا بھی مجبوری تھی۔ نہ دیتا تو ان کے علاقے میں دھندہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوری میں وہ پیسہ اور سبزی مفت میں تو دے دیتا مگر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ابوسفیان دن بھر میں اتنا پیسہ کما بھی نہیں پاتا تھا جتنا سبزی اور نقدی کے طور پر پولیس والے اس سے

کوئی دیوار ہونی چاہئے، سو فیصد تعمیری سرگرمی، فارن ریڈ کا بہترین مصرف، سائے پر ٹیکس بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شہر کی تجزیاتی بنیادوں پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ بحالت مجبوری اس کی طرف منہ کر کے تھوکا جا سکتا ہے۔ فائرنگ سکواڈ والے مطلوبہ آدمی کو اس کے ساتھ کھڑا کر سکتے ہیں اور بعد ازاں مرنے والے کے لئے اس پر زندہ باد بھی لکھا جا سکتا ہے۔ دیوار گریہ کی طرح یہاں اپنی حماقتوں پر آنسو بہائے جا سکتے ہیں۔ دکھوں کا کوئی سامع نہ ہو تو ان کے ریلیے بنا کر چپکائے جا سکتے ہیں۔

وصول لے جاتے۔ محنت کش ابوسفیان کب تک برداشت کرتا۔ اس کے دل میں اس وصولی کے خلاف بغاوت پیدا ہونے لگی۔ اس نے احتجاج کرنا شروع کیا تو زور آور پولیس والوں کو یہ کہاں برداشت ہوتا۔ کوئی اس پر لات گھونسے برساتا، کوئی ڈنڈا پھنکارتا تو کوئی تھانے میں لے جا کر حوالات میں بند کر دیتا۔ اسی کے نتیجے میں ابوسفیان کو جیل بھی جانا پڑا۔

ابوسیان کو جیل کی سیر کرنی پڑی تو اسے پولیس سے نفرت ہو گئی۔ دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اُس کے ساتھ ناانصافی بھلے ہی چند پولیس والوں نے کی ہو لیکن وہ پوری پولیس قوم کو ایسا سبق سکھائے گا کہ تگنی کا ناچ ناچنے لگے۔ پھول پور میں مناہل کے علاوہ علاوہ ابوسفیان کا کون تھا۔ اس نے ہی اپنی کوششوں سے اُسے ضمانت پر رہا کرایا۔

جیل سے رہائی کے بعد ابوسفیان نے سبزی بیچنے کا دھندہ بند کر دیا اور اتوار بازاروں میں پلاسٹک کا گھریلو سامان فروخت کرنے لگا چونکہ ڈھیر سارا سامان لے کر دور جانا پڑتا تھا تو ابوسفیان نے رکشہ خرید کر اس میں سکوٹر کا انجن لگوا لیا۔

دھندہ تو بدل گیا مگر پولیس والوں کی وصولی کا طریقہ نہیں بدلا۔ اتوار بازاروں میں بھی وہ پٹری پر دُکان لگانے والوں سے پیسہ وصول کرنے آ جاتے تھے۔ پیسے کے ساتھ ضرورت کی چیزیں بھی جبراً اٹھالے جاتے۔ ایک طرف ابوسفیان پولیس کی زیادتیوں سے پریشان تھا۔ اِدھر مناہل لگا تار بیٹیاں پیدا کر رہی تھی۔ اس کے پانچ اولادیں ہوئیں جو پانچوں بیٹیاں تھیں۔ اس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ پولیس والوں کی جیب میں جا رہا تھا۔ اس لئے مایوسی، ناامیدی اور اپنے اندر کی تڑپ مٹانے کے لئے اس نے لاشوں کے ٹکڑے کر کے پولیس کو چیلنج دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی کرتوتوں کو انجام دینے کے لئے اس نے شاہ پور میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور مارشل آرٹ میں استعمال میں لایا جانے والا ننچکو (ایک زنجیر جس میں دونوں طرف مضبوط ڈنڈے لگے ہوتے ہیں) اور ایک چھرا لا کر کمرے میں رکھ دیا۔ پوری تیاری ہوگئی تو ابوسفیان نے شکار پھانسنا شروع کر دیا۔ وہ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا تھا جو روزگار کی تلاش میں پھول پور آتے تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ کام پر لگاتا، کھلاتا پلاتا پھر اُن کی کوئی بات اُسے کھٹکتی تو وہ اُن کا قتل کر کے لاشوں کے ٹکڑے کر کے پھول پور میں مختلف جگہوں پر پھینک آتا۔ اس کام کے لئے وہ اپنے کرشنہ کا استعمال کرتا تھا۔

پولیس کی پوچھ گچھ میں ابوسفیان نے سات قتلوں کا جرم قبول کیا۔ اس نے بتایا کہ 15 ستمبر 2012ء سینٹرل جیل گیٹ پر جو لاش ملی تھی وہ ثمر چوہدری کی تھی۔ جسے ابوسفیان نے اس کے جھوٹ زیادہ بولنے کی سزا کے طور پر مارا تھا۔ 24 اپریل 2013ء کو پولیس کو جو دھڑ اور اس کے ٹکڑے ملے تھے وہ علی زیب کے تھے۔ علی زیب کا قصور اتنا تھا کہ وہ رنگین مزاج تھا۔ خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کو دیکھتے ہی اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ رنگین مزاجی کے لئے ابوسفیان نے قتل کے بعد علی زیب کا عضو تناسل بھی سزا کے طور پر کاٹ دیا تھا۔ 18 مئی کو ملنے والی لاش فرحت شاہ کی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ گوشت خور تھا۔ فرحت شاہ کا گوشت کھانا ابوسفیان کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس لئے اس نے اس کے بھی ٹکڑے۔ ے کر دیئے۔

ابوسفیان سے گہری تفتیش کے بعد 21 مئی 2013ء کو پولیس نے ابوسفیان کو عدالت میں پیش کر کے آگے کی پوچھ گچھ کے لئے ریمانڈ لے لیا۔

ابوسفیان کی نشاندہی پر پولیس نے گلبرگ علاقہ سے اظہر علی کی کھوپڑی برآمد کی اور اگلے دن اُس نے راوی کے کنارے سے ایک کھوپڑی اور جبڑا برآمد کرایا۔ اس کے مطابق یہ کھوپڑی اور جبڑا فرحت شاہ کا تھا۔ 25 مئی کو ابوسفیان نے الہ آباد میں واقع اسٹیٹ بینک کے پاس اس جگہ کی شناخت کی جہاں اس نے علی زیب عرف زیبو کا دایاں ہاتھ اخبار میں لپیٹ کر پھینکا تھا۔

اسی دن یعنی 25 مئی کو ابوسفیان نے شالیمار باغ ریلوے پھاٹک کے پاس ایک مکان کی شناخت کی اس مکان میں اس نے وسیم نامی نوجوان کا قتل کر کے لاش سدھو پور کے گندے نالے میں پھینکی تھی۔ مجموعی طور پر ابوسفیان نے سات قتل کرنا قبول کئے۔ ان معاملوں پر عدالتوں میں کیس کی شنوائی ہوتی رہی آخر میں اُسے مختلف مدت کی سزا اور جرمانے کے ساتھ سزائے موت بھی دے دی گئی۔

عدالت نے پولیس پر بھی سخت ریمارکس دیئے کہ ان کی وجہ سے معصوم لوگ خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔

اس جنونی قاتل نے سات قتل کئے تھے اور آٹھویں لاش اس کی اپنی تھی جو پھانسی کے پھندے سے لٹک گئی۔

❋

عشق

ربانی عبدالجبار
نیوجرسی-امریکہ

عشق بحرِ ژرف ہے بے کنار
عشق ہے حیران نظر بے شمار

عشق سرودِ سرمدی جاوداں
دو جہاں ہیں عشق میں دِل فگار

عشق ہے اِک راستے کا جنوں
عقل ہے اِس راستے میں غبار

دید کا دِل منتظر عشق میں
اِک جھلک محبوب کی ہے قرار

عاشقی میں عشق ہے دِل گداز
عشق ہے مظلوم کا غمگسار

روگ ہے گر عشق تو زندگی
کر رہی ہے موت کا انتظار

عشق رازِ زندگی پا گیا
جو وطن کی آن پر ہے نثار

چلّہ

یہ مافوق العقل سچی کہانی مجھے ایک ایسے ریٹائرڈ فوجی نے سنائی ہے جو کہ 1967ء میں جب مشرقی پاکستان قائم تھا، وہ اس زمانہ میں محکمہ فوج میں جیسور کے مقام پر پاک آرمی کی ایک مشہور کور EME میں بحیثیت سپاہی تعینات تھا۔ اس ناقابل یقین واقعہ کی شروعات اس نے اس طرح کی۔

میرا نام عبدالقدوس ہے اور میرا تعلق چھرہ پانی جو کہ مری کے قریب علاقہ ہے، وہاں سے ہے۔

جی ایچ کیو راولپنڈی سے میں مخصوص فوجی جہاز C-130 کے ذریعہ 1967ء میں ڈھاکہ ای ایم ای ہیڈ آفس پہنچا۔ وہاں سے آگے ہمارا تبادلہ جیسور کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں جیسور ایک درمیانی سطح کا شہر تھا۔ پہلی نظر میں مجھے وہاں کی کوئی چیز بھی پسند نہ آئی۔ وہاں کے موسم میں چپچپاہٹ، مچھروں، کھٹملوں اور جونکوں کی بہتات، مغربی پاکستان سے نئے آنے والوں کے لئے اکتاہٹ، بے چینی کا باعث بنتی تھی۔

جس فوجی بیرک میں ہماری رہائش تھی وہاں پچانوے فیصد نفری مقامی بنگالیوں کی تھی۔ مجھے ان کے حلیہ اور لباس سے کوفت ہوتی تھی۔ ان کی تنگ نظری کی وجہ سے ہم چند مغربی پاکستان کے فوجی اہلکاروں نے اپنی علیحدہ لابی (گروپ) بنائی ہوئی تھی اور ہم مغربی پاکستان والوں کی تعداد بہ مشکل آٹھ دس ساتھیوں پر مشتمل تھی۔

اگرچہ اس بیرک میں میری تمام ساتھیوں سے علیک سلیک تھی لیکن وحید قریشی نامی سپاہی جس کا تعلق مندرا ضلع راولپنڈی سے تھا، اس سے میری دوستی بہت ہی زیادہ حد تک بڑھ چکی تھی، یہاں تک کہ میری اور اس کی دوستی پوری بیرک میں بہت مشہور ہو گئی تھی۔

وحید قریشی درحقیقت میری فطرت اور پسند کے عین مطابق تھا۔ وہ بے حد کم گو، سنجیدہ اور کتاب دوست ہونے اور کام سے کام رکھنے والے کے علاوہ دل کا بہت سخی تھا۔ وہ اکثر اتوار یا جمعہ کے روز مجھے بازار لے جا کر میری بہت خاطر تواضع کرتا تھا۔ ہم اس روز خاص طور پر جیسور کے اکلوتے بازار میں جا کر خوب ناریل، اناس وغیرہ اور کٹھل کا حلوہ لازماً کھاتے تھے۔ ڈیوٹی وقت کے بعد ہم زیادہ تر وقت اکثر اکٹھے گزارتے تھے۔ یعنی کھانا پینا ہم ساتھ ہی کرتے تھے۔

قبرستان کے گھٹاٹوپ اندھیرے اور پُر ہول ماحول میں نوجوان نے چلہ کشی کا
عمل شروع کیا کہ اچانک ایک نادیدہ قوت کی فلک شگاف چیخ سے پورا
قبرستان دہل گیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے دلخراش منظر رونما ہوا

☆ محمد رضوان قیوم

ہم دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف گہرے دوست تھے بلکہ ہم راز بھی تھے۔ وحید قریشی کے زیر مطالعہ کتب میں جہاں دیگر موضوعات کا ذخیرہ تھا وہاں چند کتب بڑی پُراسرار اور خفیہ علوم کے موضوعات پر بھی مشتمل تھیں جن کو میں نے اس سے مانگ کر پڑھنے کی کوشش بھی کی تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یار تو یہ کتب مجھے کیوں نہیں پڑھنے دیتا''؟'' ۔۔۔ میرے اس سوال کا جواب وہ اکثر ٹال دیتا تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعہ کے روز ہم نے اکٹھے جیسور کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑی اس کے بعد اس نے مجھے کہا۔۔۔ ''میں تمہیں اس مسجد سے سیدھا لالہ کے مشہور ہوٹل پر لے کر جاؤں گا۔ وہاں پہلے ہم کٹھل سبزی کھائیں گے پھر اناناس اور ناریل سے بنی ہوئی برفی کھائیں گے'' ۔۔۔ مجھے بھی لالچ آ گیا کیونکہ جمعہ کے روز ہمیں فوجی لنگر سے چنے کی پتلی دال ملا کرتی تھی۔ میں بہرحال اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے لالہ کے ہوٹل میں تو کیا ہی لے کر گیا۔ اس نے سب سے پہلے سائیکل رکشہ کو مسجد کے قریب روکا، پھر مجھے رکشہ پر بٹھا کر ایک ویران جگہ لے گیا۔ میں نے حیرانی اور پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''یار! کہاں لے کر جا رہا ہے؟''

وہ بولا ۔۔۔ ''چند منٹ کی بات ہے، مجھے ایک ضروری کام ہے وہ ذرا کر لوں پھر لالہ کے ہوٹل جا کر پیٹ پوجا کریں گے'' ۔۔۔ میں اس کی بات سن کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے رکشہ کو ایک ویرانے میں رکنے کو کہا تو رکشہ والے نے بھی حیرانگی کے عالم میں کہا۔

''جی، ادھر روک دوں لیکن یہ جگہ بہت ویران ہے، آپ یہاں رکیں گے؟''

''بس تُو اِدھر روک دے'' ۔۔۔ اس نے رکشہ والے سے کہا۔

''اچھا جی! جیسے آپ کی مرضی'' ۔۔۔ رکشہ والے نے کہا اور رکشہ روک دیا۔ میں بھی حیرت کے عالم میں وحید کو دیکھ رہا تھا کہ اس ویرانے میں اسے کیا کام پڑ گیا؟ بہرحال میں خاموش ہی رہا اور یہ سوچنے لگا کہ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔

وحید نے مجھے کہا ۔۔۔ ''یار! تُو چند منٹ ذرا اس درخت کے نیچے انتظار کر، میں ابھی آتا ہوں'' ۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ میرے بولنے سے پہلے ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ وہاں آدم نہ آدم کی ذات، رکشہ والا بھی اس عجیب ڈراؤنے ماحول سے جان چھڑا کر بھاگ گیا تھا، مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی تیزی سے وحید کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت آگے چل رہا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ آ رہا ہوں۔ اس ویرانے میں ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں ویرانے کے عین سامنے بڑی سی دیوار تھی جو غالباً کسی اسکول یا کسی سرکاری عمارت کی ہوگی۔ وہ اس دیوار کے سامنے بڑے عجیب انداز سے خاموشی سے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کیں جیسے کسی قدیم تصویر یا بدھ مذہب میں گوتم بدھ اپنے مخصوص انداز میں تپسیا کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ جانے کس زبان میں کوئی عبارت پڑھنا شروع کر دی اور پھر یک دم خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس عمل میں تقریباً چار پانچ منٹ تلک ساکت رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھٹکے سے کھول دیں۔ وہ پسینہ سے شرابور تھا۔ میں بھی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اس کی اس ناقابل یقین پُراسرار حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے خود بھی خوف سے لرزنے لگا۔

اس نے خلاف توقع مجھے اپنے قریب دیکھا تو شدید غصے کے عالم میں مجھے ڈانٹتے اور چلاتے ہوئے کہا

۔۔۔ ”تُو میرے پیچھے کیوں آیا؟ میں نے تجھے کہا تھا کہ تُو اس درخت کے نیچے ذرا رک کر میرا انتظار کر لیکن تُو نے میرا کہا نہیں مانا“۔

”وحید بھائی! میں دراصل اس ویرانے میں ڈر گیا تھا اور دوسرے میں کچھ بولتا کہ آپ تیزی سے آگے بڑھ گئے“۔

پہلے تو اس نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھا لیکن بعد میں پُرسکون ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔ ”یار! مجھے معاف کر دے میں نے خواہ مخواہ تجھ کو ڈانٹ پلا دی، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے“۔

”یہ کیا ماجرا ہے؟“۔۔۔ وحید سے میں نے سوالیہ انداز میں استفسار کیا تو اس نے ایک لمحہ کو توقف اختیار کیا اور کچھ سوچنے کے بعد گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولا۔۔۔ ”اب جبکہ تُو نے سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا ہے تو مجھ سے وعدہ کر کہ یہ بات کسی اور سے کہے گا نہیں...... یہ میرا ایک راز ہے“۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس نے جب محسوس کیا کہ میں اس کے اعتماد کا آدمی ہوں تو اس نے مجھ سے کہا۔۔۔ ”پہلے تو میں تجھے اپنے وعدے کے مطابق لالہ کے ہوٹل سے بہترین لنچ کرواتا ہوں، بعد میں تجھے اپنا ایک خفیہ اور اہم راز بتاؤں گا“۔

میری آتش اشتیاق بھڑک اٹھی، میں نے اس سے کہا۔۔۔ ”پہلے تُو مجھے بتلا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“

”میں تجھے یہ بات آرام اور سکون سے بتاؤں گا لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے ہیں“۔۔۔ اس نے کہا۔

وہ مجھے لالہ کے ہوٹل لے گیا۔ وہاں ہم نے خوب سیر ہو کر لنچ کیا۔ پھر اس نے مجھے بتلایا۔۔۔ ”میں تجھے اپنی زندگی کا ایسا راز بتا رہا ہوں جس کی اصلیت کا سن کر تجھے یقین نہیں آئے گا لیکن میں تجھے تیری آنکھوں سے ایک بڑی عجیب چیز دکھلاؤں گا“۔

میں نے عالم تجسس سے پوچھا۔۔۔ ”وہ کیا چیز ہے؟“

وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔۔۔ ”اگر تجھ میں ہمت ہے تو تیرے سوال کا جواب سامنے آ جائے گا لیکن تُو نے اپنے دل کو تھام کر رکھنا ہے“۔۔۔ اس کے بعد ہم دونوں سیدھا اس مقام پر سائیکل رکشہ کے ذریعہ پہنچے۔ اس نے ایک مخصوص جگہ کھڑے ہو کر کہا۔۔۔ ”اس دیوار کو غور سے دیکھ اور جو میں پڑھوں اسے تُو بھی دہراتا اور پھر جو چیز بھی تجھے نظر آئے اسے دیکھ کر تو گھبرانا نہیں میں تیرے پیچھے ہوں“۔

بہرحال میں نے ہمت کو یکجا کیا اور خوف و تجسس کی آمیزش کے جذبہ کے ساتھ اس دیوار کی جانب بغور دیکھتا رہا۔ وہ اپنے منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا، میں کافی دیر تک دیوار کی جانب دیکھتا رہا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اس سے کہا۔۔۔ ”مجھے بے وقوف بنا رہا ہے، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے“۔

اس نے فوراً اپنا عمل بند کیا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ ”ابھی جو چیز میں تجھے دکھلانا چاہتا تھا، وہ تجھے دیوار میں نظر آنے والی تھی لیکن تُو درمیان میں بول پڑا۔ اب مجھے یہ عمل پھر سے دہرانا پڑے گا۔ تُو آرام اور صبر سے صرف دیوار کی طرف دیکھ...... اور اگر اب تُو نے مجھے ڈسٹرب کیا تو میں تجھے تھپڑ مار دوں گا“۔۔۔ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

میں دوبارہ غور سے دیوار کی جانب دیکھنے لگا، سات آٹھ منٹ مسلسل دیوار کی طرف دیکھنے پر واقعی دیوار پر ایک نسوانی شبیہ نمایاں طور پر نظر آئی۔ بال کھلے لہراتے ہوئے، نقش دلکش اور انتہائی سحر انگیز تھے لیکن یک دم ایک جھماکے سے میری نظروں سے وہ غائب ہو گئی۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر واقعی میری گھگی بندھ گئی تھی۔ "یہ تو کوئی بہت خوب صورت پُراسرار مخلوق محسوس ہو رہی تھی" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"ہاں تم نے صحیح پہچانا"۔

"لیکن یہ کیسے ہوا؟" ۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یار! چل، اب دیر ہو رہی ہے، بیرک میں رات کے وقت میرے پاس آنا"۔

رات ہوئی تو میں اس کے پاس خصوصی طور پر پہنچ گیا اور اس سے پُرتجسس انداز میں دیوار پر نظر آنے والی ماورائی حسینہ کے متعلق پوچھا۔ وہ ایک لمحہ کو مسکرایا اور مجھے شدید نیند کے غلبہ کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

دوسری صبح پورے بیرک میں خبر مشہور ہو گئی ۔۔۔ "وحید قریشی کی آؤٹ آف ٹرن ترقی ہو گئی ہے اور اسے ایک سال کی بنیادی تنخواہ کے برابر Arrear بھی مل گیا ہے" ۔۔۔ مجھ سمیت بیرک کے تمام فوجی اہلکار وحید کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اس نے دراصل اپنی پرموشن کے لئے ہیڈ آفس میں اپیل کی ہوئی تھی۔ وہ خلاف توقع منظور ہو گئی، اس کا رکا ہوا اور مشکل ترین کام ہو گیا تھا۔

یہ راز میں ہی جانتا تھا کہ وحید قریشی جادو، ٹونہ اور عمل کرنے والا شخص ہے لیکن کیونکہ میں نے اسے زبان دی ہوئی تھی اس لئے میں اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خاموش تھا۔ اس دوران جونیئر کمشنر کے لئے ڈھاکہ میں چند پوسٹیں آئیں۔ ہماری کور کے تقریباً 200 لوگوں نے اپلائی کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وحید قریشی اس اسکیم میں سلیکٹ ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر قسمت کا دھنی رہا۔ یعنی وہ سپاہی رینک سے نکل کر براہ راست سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا۔

ہم سب پے درپے اس کی کامیابیاں دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ کئی بار لوگوں نے اس کا راز اس سے جاننے کی کوشش کی لیکن وہ بہت چالاکی سے بات کو ٹال جاتا تھا۔ وہ تھا تو میرا گہرا دوست مگر افسر بننے کے بعد بھی وہ بالکل نہ بدلا۔ مجھ سے اس کا رویہ پہلے جیسا ہی رہا جیسے کہ سپاہی دور میں تھا۔ ذرا بھی مغرور نہ ہوا تھا، وہ بدستور مجھے ہر اتوار اور جمعہ کے دن لالہ کے ہوٹل میں کھانا کھلاتا لیکن حسب معمول ان دنوں بھی اس دیوار کے پاس جا کر اپنی پُراسرار محبوبہ سے ضرور ملتا تھا۔

میں ایک روز اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے مجھ سے کہا ۔۔۔ "عبدالقدوس! میں جس کام میں پڑا ہوا ہوں وہ تُو نہیں کر سکتا"۔

"نہیں، میں کر سکتا ہوں بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی ترقی کرنی ہے اور اس کے لئے میں کر سکتا ہوں"۔

"اچھا، اس وقت تُو چاہتا کیا ہے، تیرا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟" ۔۔۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے یوں تو بہت سارے مسائل ہیں لیکن سرِ دست بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پیچھے گاؤں میں میرے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مجھ سے چھوٹے دو بھائیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔ مجھ سے یعنی دوسرے نمبر والا بھائی آج کل بے روزگار ہے۔ کاش! اسے کوئی نوکری مل جائے۔ ہمارے گھر کے معاشی حالات درست ہو جائیں" ۔۔۔ میں نے اسے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا ۔۔۔ "ایک کام کرے گا، اگر کر سکے تو تیری تقدیر بدل جائے گی جیسے میری بدل رہی ہے"۔

"ہاں، میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری ترقی کے لئے بہتر ہوگا"۔

اس نے مجھے جوش دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آج کل ایک جن کو قابو کیا ہوا ہے جو کہ ابھی میرے مکمل قابو میں نہیں ہے۔ مجھے جس عامل نے جن کو قابو کرنے کا طریقہ یعنی چلہ کاٹنا بتلایا ہے وہ تین مرحلوں میں ہے، ہر مرحلہ کا علیحدہ اور بڑا صبر انگیز سخت چلہ ہے''۔

''کتنا سخت ہوگا؟''

''ابے اتنا سخت ہوگا کہ تُو دیکھے گا تو تیرے اوسان خطا ہو جائیں گے اور اس چلہ کو شروع کرنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی بہت سخت ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تُو کر نہیں سکتا''۔

''یار! تیری ترقی اور شان و شوکت کو دیکھ کر میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی تیری طرح محنت کروں''۔

''اچھا اگر تُو بضد ہے تو سن۔ ہمارے اس کام کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے یعنی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو''۔

''لیکن کرنا کیا ہے؟'' ___ میں نے اس سے پوچھا۔

''کرنا یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے کسی نئی قبر میں سے کسی مردے کا تھوڑا سا گوشت کا ٹکڑا درکار ہوگا''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ___ میں نے چونک کر کہا۔

''تیری ہوا نکل گئی ناں...... کیسے ہوگا؟ ارے بے وقوف! یہ کام اتنا آسان نہیں...... اب جن کو قابو کرنا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ ویسے تُو پروا نہ کر میرے پاس اس کا بندوبست ہے''۔

''وہ کیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں نے قریبی قبرستان کے لالچی گورکن کو پھنسا رکھا ہے، جب بھی میں نے اپنا مخصوص چلہ کاٹنا ہوتا ہے اس کی ہتھیلی پر 200 روپے رکھ دیتا ہوں وہ مجھے کسی نہ کسی طرح لاش کے جسم سے کاٹ کر گوشت کا ٹکڑا لا دیتا ہے''۔

''اس ٹکڑے کو تُو کیا کرتا ہے؟'' ___ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا کرتا ہوں؟''۔۔۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔۔۔ ''ابے، اسے قیمہ بنا کر کھاتا ہوں''۔

''تُو اسے کھاتا ہے!''

''تو اور کیا، یہ چلّہ کی پہلی شرط ہے''۔۔۔ وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا ہے کہ تجھ میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے''۔

''نہیں، میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ وہ ہر عمل کرنے کو تیار ہوں جو میرے مسائل کو حل کرے اور مجھے ترقی میں مدد دے''۔

''تو پھر ہمت کر اور مجھ سے دن طے کر۔ میں نے بھی اپنے دوسرے مرحلہ کا چلّہ کاٹنا ہے لیکن تیرا ابھی معاملہ شروع اور پہلے مرحلہ میں ہے، میں تجھے اس کے لئے چند ابتدائی شرائط اور طریقہ بتلا دوں''۔

''وہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی شرط، یہ ہے کہ تُو نے میرے ساتھ قبرستان جانا ہوگا اور پھر وہاں ہمیں گورکن ایک تازہ لاش کے گوشت کا ٹکڑا دے گا پھر اسے ہم قیمہ بنا کر آدھا آدھا کھائیں گے''۔

''کچا گوشت اور وہ بھی کسی مُردے کا؟''۔۔۔ یہ بات میرے دل میں آئی لیکن میں نے اس کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔

اس نے پھر مجھ سے کہا۔۔۔ ''ہفتہ کی رات کو فلاں قبرستان میں آ جانا اور کوشش کرنا کہ ململ کی قمیص اور کاٹن کی دھوتی پہن کر آنا''۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟''

''یہ بات میں تجھے قبرستان میں بتلاؤں گا اور ہاں، کسی کو کانوں کان ہمارے اس فعل کی خبر نہ ہو''۔

ہفتہ کی رات آٹھ بجے کا وقت طے ہوا، اس نے کہا۔۔۔ ''میں ٹھیک وقت پر قبرستان آ جاؤں گا، تُو دل دماغ سے تیار ہو کر سیدھا شکور خان گورکن کی جھونپڑی میں آ جانا''۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات جیسور کی آب و ہوا میں سخت سردی تھی لیکن خوش قسمتی سے بارش نہ تھی۔ میں وعدے کے مطابق پورے آٹھ بجے مذکورہ قبرستان پہنچا۔ ایک طرف سخت سردی اور قبرستان میں کیڑے مکوڑوں کی رنگ برنگی آوازیں دل کو دہلا رہی تھیں۔ میں خوفزدہ قدموں سے چلتا ہوا جب شکور خان کی جھونپڑی میں پہنچا تو وہ وہاں اس وقت موجود نہ تھا صرف وہاں ایک دیا جل رہا تھا۔ میں وہاں ایک طرف سہما ہوا اکیلا کھڑا ہو گیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس شہرِ خموشاں کے مُردوں کے درمیان صرف میں ہی زندہ انسان ہوں۔

''پتا نہیں وحید آتا ہے کہ نہیں''۔۔۔ میرے دل و دماغ میں مختلف اندیشے منڈلانے لگے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھی مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔۔۔

''وہ جی! آپ ہی عبدالقدوس ہیں؟''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک کھردری شکل کا ایک منحنی بوڑھا شخص اپنے ہاتھوں میں کسی کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئے تھا۔۔۔ ''میں شکور خان گورکن ہوں، یقیناً آپ وحید قریشی کے دوست ہیں جنہوں نے آج آنا ہے''۔

''ہاں میں عبدالقدوس ہوں''۔

''آپ بیٹھ جائیں''۔۔۔ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''آج بہت سردی ہے''۔۔۔ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں، آج واقعی کچھ زیادہ ہی سردی ہے''۔۔۔ گورکن نے جواب دیا۔

''میں لکڑیاں جلا کر آگ جلاتا لیکن اس لئے جلا نہیں رہا کیونکہ آج رات فجر تلک آپ دونوں نے ایک

قبر میں ننگے بدن سے جن کو قابو کرنے کے لئے عمل کرنا ہے، آپ ابھی سے اپنے آپ کو ذہنی و جسمانی طور پر تیار کرلیں اور ہاں، میں تمہارے لئے جن کو قابو کرنے کے لئے پہلی شرط کے مطابق لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لایا ہوں"۔

"پتا نہیں وحید قریشی آئے گا کہ نہیں"۔۔۔ میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"وہ ضرور آئے گا۔ اس نے مجھے 200 روپے ایڈوانس دیئے ہیں"۔

"تم بھی کوئی جادو وغیرہ یا جنوں کو قابو کرنے کا کوئی عمل کرتے ہو؟"۔۔۔ میں نے کہا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے، میں ایک غریب انسان ہوں، ہم تو اس قبرستان کی مٹی کے ڈھیر میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں مر جائیں گے۔ تم نے سنا ہو گا کہ ملا کی دوڑ مسجد تک محدود ہوتی ہے، بس ہم نے اسی مٹی میں مٹی ہو جانا ہے۔ باؤ جی! آپ لوگوں کی طرح ہماری کوئی بڑی خواہش یا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا"۔

"ہر انسان کی فطرت کے اندر کوئی نہ کوئی مسئلہ یا آگے بڑھنے کا لالچ تو ضرور ہوتا ہے"۔۔۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہوتا ہو گا لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا جو آپ لوگ کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے تو صرف اپنی مزدوری سے غرض ہے۔ مجھے تو ویسے بھی اس دور میں 200 روپے بھاری معاوضہ مل جائے گا اور مجھے کیا چاہئے"۔۔۔ اس نے کہا۔

ابھی اس کے اور میرے درمیان بات جاری تھی کہ اس دوران گورکن کے دروازے پر دستک کی آواز گونجی۔

"لگتا ہے صاحب جی آ گئے"۔۔۔ اس نے دروازہ کھولا تو وحید قریشی ہمارے سامنے باریک ململ کی قمیص اور سیاہ رنگ کی مختصر بنگالی دھوتی پہنے کھڑا تھا۔

"دیکھو میں نے کہا تھا ناں کہ وحید صاحب وعدے کے پکے ہیں، ضرور آئیں گے"۔

وحید نے شکور خان سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔ "گوشت تیار ہے"۔

"ہاں جی!"۔۔۔ اور شکور نے اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز وحید کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

"ویری گڈ، یہ تو بڑا اچھا کام کر دیا لیکن یہ بڑا ٹکڑا ہے تو اسے آدھا کر کے اس کو قیمہ بنا دو تاکہ عمل پڑھتے وقت اسے آسانی سے کھایا جا سکے"۔

مجھے اسے دیکھ کر ابکائی اور کراہت محسوس ہونے لگی لیکن میں نے بالکل بھی اس کا اظہار ان کے سامنے نہ کیا۔

میرے لرزتے پاؤں اور سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کو دیکھتے ہوئے وحید نے مجھ سے کہا۔۔۔ "دیکھو، عبدالقدوس! تم میرے دوست اور ہم راز ہو، اب بھی وقت ہے تم یہاں سے جا سکتے ہو۔ دیکھو جو کام میں اور تم کرنے جا رہے ہیں وہ بہت کٹھن ہے، تکلیف دہ اور خطرے والا ہے اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے یعنی تخت یا تختہ۔ سیدھا ہو گیا تو وارے نیارے اور اگر الٹا ہو گیا تو تختہ ہو جائے گا یعنی اگر جن قابو میں نہ آیا اور وہ بگڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے"۔

میں نے وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس وقت اتنے مسائل کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ میں ذہنی طور پر تمہاری ہر بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں"۔

یہ سن کر وحید نے گہرا سانس لیا اور مجھے کہا۔۔۔ "اچھا یہ بات ہے تو تمہاری مرضی، میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جن قابو کرنے کے لئے پہلے مرحلہ کا عمل کرواتا ہوں۔ اس مرحلہ میں سب سے پہلے تمہیں یہ مردہ انسان کا قیمہ کھانا پڑے گا اور ساری رات ایک خالی قبر

میں میرے پیچھے بیٹھ کر وہ پڑھنا پڑے گا جو میں پڑھوں گا۔ پھر آخر میں تمہیں ایک بدشکل جن نظر آئے گا اسے دیکھ کر ڈرنا نہیں، بس اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا لیکن ہاں، اس عمل میں تمہیں قمیص اتارنی ہوگی اور یہ عمل فجر کی نماز سے پہلے تلک جاری رہے گا اور ایک بات میں تمہیں بتلانا بھول گیا، تم نے عمل کرنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تلک کوئی چھوٹا بڑا پیشاب نہیں کرنا جو کرنا ہے پہلے کر لو لیکن استنجے کے ساتھ"۔

"آپ کا تو غالباً دوسرا مرحلہ ہے"۔۔۔ شکور خان نے وحید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میرا دوسرا اور عبدالقدوس کا پہلا مرحلہ"۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کا آج کے بعد آخری اور تیسرا مرحلہ رہ جائے گا، اس کے بعد مطلوبہ جن آپ کے مکمل قابو میں آ جائے گا"۔۔۔ شکور خان نے کہا۔

"ہاں، میں پھر اپنی زندگی کی ہر خواہش اس کے ذریعے پوری کر پاؤں گا"۔۔۔ وحید نے فخریہ انداز میں کہا۔

"چلیں صاحب! میں اس گوشت کا قیمہ بنا کر اسے دو حصوں میں لاتا ہوں"۔۔۔ شکور خان نے کہا۔

وحید پہلے قبر کے اندر کودا اور پھر مجھے خالی قبر میں اترنے کے لئے کہا۔ میری روح و جسم پر لرزا طاری ہو گیا لیکن میں ہمت کے سہارے اس میں اتر گیا۔ قمیص اپنے بدن سے علیحدہ کر دی، اتنے میں شکور خان قیمہ لے آیا جس میں سے بہت کراہت آمیز کی بدبو آ رہی تھی، قیمہ دو حصوں میں اخباری کاغذ کے اندر رکھا ہوا تھا۔

"اسے دو حصوں میں کھانا پڑے گا ایک حصہ عمل شروع کرتے وقت جب اس کی نیت کی جائے گی اور دوسرا جب تمہیں کچھ نظر آئے گا اور جیسے میں پڑھتا رہوں تم بھی زیر لب پڑھتے رہنا اور اپنی آنکھیں بند کر کے اور جب تمہیں کچھ نظر آئے تو پھر اس سے اپنے دل کا مدعا بیان کر دینا لیکن تم نے ننگے بدن پر سردی کے جھونکوں اور کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کے باوجود ذرا بھی اپنی آنکھ نہیں کھولنی اگر کھول دی تو سوچ لو کوئی نقصان ہوا تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا"۔۔۔ وحید نے کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے انسانی مردہ گوشت کا قیمہ سٹکا، اسے منہ میں رکھتے ہی ایسی کراہت، اور کوفت ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وحید نے بھی میری طرح قیمہ کھایا۔ وہ جو بھی عمل پڑھتا رہا میں اسے دہراتا رہا۔ دونوں کی پیٹھ قمیصوں سے محروم تھی اوپر سے شدید سردی کی اذیت اور قبرستان کی خون خشک کرنے والی کیفیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی لیکن بہتر مستقبل اور مسائل کے حل کے جوش و جذبہ کے تحت ہم خصوصاً میں، یہ کر رہا تھا۔ رات تقریباً ایک بجے اس نے خاموشی اختیار کر لی اور میں نے اپنی آنکھیں مسلسل بند کی ہوئی تھیں کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ اپنی آنکھیں اس وقت تلک نہیں کھولنی جب تلک میں نہ کہوں۔

میں آنکھیں بند کئے بے سدھ رہا۔ سخت سردی اور انسانی مردار کا کچا قیمہ کھانے سے میرے پیٹ میں شدید ناقابل برداشت مروڑ ابکائیاں آ رہی تھیں لیکن میں نے اپنے دانتوں کو بُری طرح بھینچا ہوا تھا۔ اس دوران رات کے تقریباً دو بجے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے آگے کوئی شبیہ بن رہی ہے، وہ لمحاتی طور پر کچھ بنتی پھر غائب ہو جاتی ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے کچھ سیکنڈوں کے لئے اپنی مکمل شکل اختیار کر لی وہ بہت خوفناک اور بدصورت بچے کی طرح تھی جس کے بڑے سے چہرے پر ماتھے کے درمیان صرف ایک سرخ آنکھ تھی۔ اس کو جب میں نے دیکھا، شکر ہے میرا شعور قائم تھا، میں نے فوراً دل میں کہا۔۔۔ "خدا کے لئے میرے معاشی مسائل حل کر دو۔ بھائیوں کو کہیں نوکری دلوا دو"۔۔۔ وہ جھٹ پٹ غائب ہو گیا۔ اگرچہ میں بے سدھ آنکھیں

بند کئے ہوئے تھا، میرا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اب شاید مرنے والا ہوں۔ میرے دل میں آیا کہ آنکھیں کھول دوں لیکن میں وحید کی آواز پر قائم تھا۔ چند لمحوں بعد وحید کی آواز سنائی دی۔۔۔ ''عبدالقدوس اپنی آنکھیں کھول لو'' ۔۔۔ مجھے ایک لمحے کو تسلی ہوئی پھر مجھے خوشی ہوئی۔

وحید نے اپنی قمیص پہنی اور مجھ سے کہا کہ تم بھی قمیص پہن لو۔ پوری رات خالی قبر میں ساکت حالت میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے پورا جسم سن ہو گیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد عبدالشکور گورکن دو پرانے کمبل لے کر آیا، ایک اس نے میرے اوپر اور دوسرا وحید پر ڈالا۔ وہ سہارا دے کر پہلے وحید کو اور پھر مجھے اپنی جھونپڑی میں لے کر گیا۔ وحید اور میں سردی اور پیٹ کے درد سے تڑپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گرم دیسی مچھلی کے سوپ کے پیالے کے ساتھ ایک کالی سی گولی ہمیں دی۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''یہ کیا ہے؟'' ۔۔۔ اس پر اس نے کہا۔

''باؤ جی! مچھلی کا سوپ آپ کو گرمی اور درد کو راحت دے گا اور یہ کالی گولی آپ کا معدہ نہ صرف صاف کرے گی بلکہ آپ کے پیٹ کے اندر سے انسانی قیمہ کی گندگی اور اثرات زائل کرے گی'' ۔۔۔ واقعی اس کے دیئے ہوئے سوپ اور گولی نے بڑا مؤثر کردار ادا کیا۔

ہم دونوں کے ہوش اور ذہن ٹھکانے آئے تو وحید نے مجھ سے پوچھا ۔۔۔ ''اور بھئی! سناؤ رات کیسی گزاری؟''

میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا ۔۔۔ ''مجھے تو تارے نظر آ گئے لیکن مجھے جن بچہ بھی نظر آ گیا''۔

''تو تم نے اپنا مدعا بیان کیا کہ نہیں''۔

''ہاں کیا تھا''۔

''چلو بہتر ہو گا''۔

میں صبح ہوتے ہی سیدھا ہسپتال گیا کیونکہ میرے جسم، پیٹ کا درد اور ناک سے بہتا نزلہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک دوا کھاتا رہا، جس سے میرے بہتے نزلہ اور درد کو آرام ملا لیکن میرے پیٹ میں مستقل مروڑ اور اسہال کا مرض گھر کر گیا۔

چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان اپنے گھر سے خط ملا کہ مجھ سے چھوٹے بھائی کو دفتر خارجہ میں نوکری مل گئی ہے۔ میری تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ اب یہ بات مجھ پر عیاں ہو گئی کہ واقعی جن کو قابو کرنے کا میرا پہلا مرحلہ صحیح طور پر مکمل ہو گیا۔ دل کو تسلی ہوئی کہ بچہ جن نے میرا کام کر دیا۔

چند روز بعد مجھے وحید نے بلایا اور اس نے مجھے بتایا ۔۔۔ ''وہ مزید ترقی کر گیا ہے اور اب اسے علیحدہ چھوٹا سا بنگلہ مل گیا ہے اور دوسری طرف گاؤں سے خبر آئی ہے کہ مجھے خدا نے اولاد نرینہ سے نوازا ہے''۔

میں نے بھی اسے اپنے بھائی کی اچھی جاب کے بارے میں بتلایا۔ یہ سن کر وہ خوش ہوا لیکن اس نے مجھ سے کہا ۔۔۔ ''اگر تم اپنی زندگی میں مزید ترقی و خوشحالی چاہتے ہو تو تمہیں اب جن کو قابو کرنے کے لئے دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے'' ۔۔۔ اور نیز اس نے یہ بھی بتلایا کہ وہ اب جن کو قابو کرنے کے لئے آخری مرحلہ طے کرے گا جس سے وہ اس کے مکمل قابو میں آ جائے گا، وہ پھر اپنے قابو شدہ جن کے ذریعہ کئی کام کرائے گا۔

میرا یقین تو پختہ ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے دوسرا مرحلہ طے کر کے جن کو مزید قابو کر کے اس سے مزید افادیت حاصل کرنی چاہئے۔

وحید نے پھر ماضی کی طرح تاکید اور تنبیہ کی ۔۔۔ ''اس بار بھی یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے'' ۔۔۔ میں مان گیا اس بار ہمارا خالی قبر میں عمل کرنے کا دن اتوار کے روز طے پایا

کیونکہ دوسرے دن (یعنی سوموار کے دن) کوئی قومی دن کی وجہ سے چھٹی تھی۔ وحید نے مجھ سے کہا۔ ”تم اس قبرستان میں شکور خان گورکن کے پاس آٹھ بجے آ جانا“ ۔۔۔ اور اس نے یہ بھی بتایا۔ ”اس دفعہ ذرا عمل سخت ہو گا لیکن اگر یہ ہو گیا تو پھر میرے اور تمہارے وارے نیارے ہوں گے اب تمہارا دوسرا اور میرا تیسرا اور آخری مرحلہ رہ گیا ہے اور ہاں یہ چلہ پہلے سے ذرا سخت اور طویل نوعیت کا ہو گا۔ تم ہر قیمت پر وہاں آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا“ ۔۔۔ وحید نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے 300 روپے گورکن کو ایڈوانس دے دیئے ہیں۔

”میں ضرور آؤں گا“ ۔۔۔ میں نے بادل نخواستہ ہامی بھر لی۔

اتوار کے دن صبح ہی سے بہت سرد ہوائیں جیسور کی فضاؤں کو چیر کر اسے خنک بنا رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ رات کو قبرستان کی سخت سردی میں ننگے بدن خالی قبر میں چلہ کشی کرنی ہے لہٰذا کیوں نہ میں مچھلی کی یخنی پی لوں، لہٰذا میں بنگال کی مخصوص مچھلی خرید کر لایا۔ میں نے بیرک کی کینٹین کے ایک ویٹر کو کہا۔ ”ذرا اس کا سوپ بنا دے“ ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ میں سوپ کے ایک دو پیالے پی کر قبرستان جاؤں گا تاکہ جسم کسی حد تک گرم رہے۔

ویٹر کے بنائے ہوئے سوپ کے دو پیالے پینے کے بعد میرے پیٹ میں ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بارود پی لیا ہے اور وہ پھٹنے کو بے تاب ہے، ناقابل برداشت مروڑ کے ساتھ مجھے ہیضہ ہو گیا۔ میری بگڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر میری بیرک کے سپاہی مجھے قریبی آرمی ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ابتدائی طور پر مجھے درد کش ٹیکہ اور چند مکسچر وغیرہ دیئے لیکن مجھے آرام نہ آیا۔ درد تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دوسرے میں نے قبرستان چلہ کاٹنے کے لئے لازماً جانا تھا۔ میں نے ہسپتال میں جھوٹا بہانہ کیا کہ میں نے بہت ضروری کسی عزیز کی شادی میں جانا ہے لیکن وہاں کے ڈاکٹرز میرے ساتھیوں اور عملہ نے مجھے سختی سے روکا کہ تمہاری حالت بہت خراب ہے۔

بہرحال جب میرا درد شکم شدید بڑھنے لگا اور مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو فوری طور پر ڈاکٹروں نے مجھے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ صبح غنودگی کے عالم میں میری آنکھ کھلی تو میرا درد شکم ختم ہو چکا تھا البتہ گلوکوز کی بوتل کی پتلی ٹیوب میرے بازو میں لگی ہوئی تھی۔

میں نے ہونقوں کی طرح اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو وہاں ایک نرس، میرے چند بیرک کے ساتھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں سے میرا ایک دوست بولا ۔۔۔ ”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے اور دوسری منحوس خبر“۔

میں نے اچنبھے اور حیرت سے پوچھا ۔۔۔ ”کیا اچھی اور منحوس خبر ہے؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔ ”شکر ہے کہ بڑی جدوجہد اور مشکل کے بعد تمہاری جان بچ گئی لیکن تمہارے لئے یہ بُری بلکہ منحوس خبر ہے کہ آفیسرز کالونی سے یہ خبر آئی ہے کہ تمہارے جگری دوست لیفٹیننٹ وحید قریشی قریبی قبرستان کی ایک قبر میں ننگے بدن مردہ پائے گئے ہیں۔ گورکن سے پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک جن کو قابو کرنے کے لئے ننگے بدن کوئی چلہ کر رہا تھا۔ لگتا ہے اس سے عمل کے دوران کوئی غلطی ہو گئی ہو گی جس کی وجہ سے جن نے مشتعل ہو کر وحید قریشی کو ہلاک کر دیا“۔

یہ سن کر میرا دماغ چکرانے لگا اور میں نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور شکر ادا کیا کہ اس نے بیماری کے ذریعے مجھے بچا لیا۔

❁

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

معزز جاسوس

قسط: 7 ☆ میاں محمد ابراہیم طاہر

1997ء کی بہار کی ایک صبح کو ڈیوڈ کمشے (David Kimche)، تل ابیب کے نواح میں اپنے عرب مالیوں اور زمین ہموار کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ اُس کے باغیچے کی لینڈ سکیپنگ کس طرح کی جانی چاہئے۔ اُس کا طرز عمل، لب ولہجہ اور بات چیت کا انداز ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسے کسی تعلیمی ادارے میں طلباء سے مخاطب ہو، عام مزدوروں اور محنت کشوں سے نہیں۔ اُس کی پرورش اور تعلیم وتربیت انگلینڈ میں ہوئی تھی جہاں اُس کے آباؤاجداد حکومت برطانیہ کے انتظامی امور اور برطانوی جھنڈا ''یونین جیک'' دنیا کے دور دراز علاقوں، ملکوں اور خطوں میں لہرانے میں سرکاری خدمات انجام دے رہے تھے۔ کمشے ایک متوسط درجے کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کا رویہ اور طرز عمل بالکل انگریزوں جیسا ہی تھا۔ وہ بہترین اور عمدہ لباس پہنتا تھا لیکن اپنی خوراک کے بارے بہت محتاط تھا۔ ہمیشہ مستعد اور ہوشیار نظر آتا تھا اور جسمانی طور پر دبلا پتلا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بیس سال چھوٹا دکھائی دیتا تھا اور 60 سال کی عمر میں بھی اُس میں جوانی کے آثار نظر آتے تھے۔ مالیوں کو ہدایات دیتے وقت اُس کا طرز عمل، ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا انداز، ہر چیز کو عمیق اور گہری نظروں سے دیکھنے کا طریقہ، کسی تعلیمی ادارے میں عمر بھر پڑھاتے رہنے والے کسی پروفیسر جیسا تھا۔

دراصل ڈیوڈ کمشے موساد کے سربراہ میئر امیت (Meir Amit) کی الفاظ میں دانش ودانائی کا ایک منبع تھا اور موساد کے اکثر اہم مہمات کے پیچھے اسی کا دماغ کام کرتا تھا۔ اس کی سوچ کا انداز اور طرز استدلال فوراً اسے ہر معاملے کی تہہ تک پہنچا دیتا تھا اور اسی وجہ سے اس کی اپنے ساتھیوں میں بڑی عزت اور قدر ومنزلت تھی لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ ذہانت اور دانشوری کی وجہ سے وہ قدرے اُس سے فاصلہ بھی رکھتے تھے۔ وہ خود بھی قدرے تنہائی پسند اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ رافی ایتان کے الفاظ میں ''اگر کوئی اُسے گڈ مارننگ یا صبح بخیر کہتا تھا تو فوراً سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اس صبح (مارننگ) میں ''گڈ'' کیا ہے اور ابھی صبح باقی کتنی ہے؟''

موساد کے اندر کمشے کو ایسا معزز اور شریف جاسوس سمجھا جاتا تھا جیسے محلے کی ہوشیار اور عیار بلی اُس کا موساد کی طرف آمد کا سفر اس وقت شروع ہوا جب اس نے 1968ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی اسے فرسٹ گریڈ میں سوشل سائنس میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی اسے موساد کا جاسوس بنا لیا گیا جو اس وقت نئی قائم ہوئی اور میئر امیت کی کمانڈ میں کام کر رہی تھی، جو اُس وقت کوشش کر رہا تھا کہ تنظیم میں یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شامل کر کے جاسوس تنظیم کے بے رحم، سنگدل اور ظالم ہونے کے تاثر کو زائل کیا جا سکے جو رافی ایتان کے دور میں قائم ہو گیا تھا۔

کیسے، کب، کہاں اور کس نے اسے جاسوس بھرتی کیا؟ اس نے کبھی نہیں بتایا۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی کے اندر گردش کرنے والی افواہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لندن کے ایک یہودی پبلشر نے جو خود بھی موساد کا شروع سے ہی ایجنٹ تھا، کمشے کو ایک پُرتکلف عشائیے کی دعوت پر بلا کر اسے موساد کے لئے خدمات سرانجام دینے پر آمادہ کیا تھا۔ اس یہودی پبلشر کے تعلقات گولڈر گرین، لندن کے علاقے کے سینا گون (معبد) کے ربی سے بھی تھے جہاں کمشے کا ایک دور کا رشتہ دار بھی آیا کرتا تھا جس نے لڑکے کی ذہانت کی تعریف اور تعارف کرایا تھا۔

کمشے کے بارے میں جو یقینی بات سب کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ 1968ء کے موسم بہار کی ایک صبح کو وہ تل ابیب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کی نئی بلڈنگ میں

پلاننگ اینڈ سٹریٹیجی ڈویژن کے نئے ممبر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اس بلڈنگ کے شروع میں ایک طرف بنک آف اسرائیل کی برانچ، کئی کاروباری دفاتر اور ایک کیفے تھا۔ کمشے وہاں درمیان میں حیران و پریشان کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کدھر جائے۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی تختی یا دروازہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے امریکن انٹیلی جنس ایجنسی کے بارے میں تو پڑھ رکھا تھا۔ لینگلے (Langley) (واشنگٹن کے نواح میں ورجینیا کی ریاست میں) میں واقع سی آئی اے (CIA) کی بلڈنگ کے باہر ماربل کی ایک بہت بڑی پلیٹ پر ایک گنجے عقاب کی تصویر بنی ہوئی ہے اور 16 انچ کا سٹار بنا ہے اور ساتھ میں یہ الفاظ کندہ ہیں۔

''سینٹرل انٹیلی جنس آف یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ''۔

اس کے بعد دیوار پر پیغمبر یونس علیہ السلام کا یہ قول کندہ تھا۔ ''انسانوں کی نجات سچائی میں ہے''۔ ہر طرف لفٹوں کے دروازے تھے جن پر مسلح محافظ مستعد کھڑے تھے۔

لیکن یہاں کنگ ساؤل (King Soul) بلیوارڈ پر، موساد کے ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ میں خزانچیوں کی کھڑکیاں تھیں یا کیفے کی پلاسٹک کی کرسیوں پر لوگ براجمان تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی موساد کا ملازم نظر نہیں آتا تھا۔ ہال کے آخری کونے پر ایک بے نشان سا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک جانی پہچانی شکل باہر نکلی۔ یہ لندن میں اسرائیلی سفارتخانے کا وہ قونصلر تھا جس نے کمشے کے سفری کاغذات تیار کئے تھے۔ اس نے کمشے کی دروازے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے وضاحت کی وہ لندن میں اس سے تعارف کے دوران اپنی سفارتی مجبوری کی وجہ سے موساد سے اپنی وابستگی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ وہ لندن میں موساد کا ایجنٹ ہی تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اُس نے دو چابیاں اُس کے حوالے کیں اور بتایا کہ اب یہی دو چابیاں اس کے موساد کے ہیڈ کوارٹر میں داخلے کا ذریعہ ہوں گے۔ ایک چابی سے ہیڈ کوارٹر کا دروازہ کھلے گا اور دوسری سے بلڈنگ کی آٹھ منزلوں تک پہنچانے والی لفٹ کا۔ یہ ہیڈ کوارٹر ایسا بنا ہوا تھا کہ بلڈنگ کے اندر بھی کئی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی اپنی سہولیات، بجلی، پانی، صفائی کا نظام بلڈنگ کے باقی حصوں سے بالکل الگ تھا۔

یہ بلڈنگ 1956ء کی نہر سویز کی جنگ کے فوراً بعد موساد کا ہیڈ کوارٹر بن گئی تھی۔

اُس سال ماہ اکتوبر میں برطانوی، فرانسیسی اور اسرائیلی افواج نے مشترکہ طور پر نہر سویز پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے مصر پر حملہ کیا تھا کیونکہ مصری صدر جمال ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دے کر اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ حملہ بعدازاں ایک عرصے تک ''گن بوٹ ہال مارک'' کے نام سے جانا جاتا رہا۔ تینوں حملہ آور طاقتوں نے حملے سے قبل نہ تو امریکہ سے مشورہ کیا اور نہ ہی واشنگٹن کو حملے کی اطلاع دی تھی جس سے وہاں یہ تاثر قائم ہوا کہ برطانیہ اور فرانس اکیلے ہی مڈل ایسٹ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے چکر میں ہیں لہٰذا واشنگٹن نے پُرزور سفارتی مہم چلائی کہ جنگ فوری طور پر بند کی جائے ورنہ مصر کی حمایت میں سوویت یونین کے جنگ میں کود پڑنے کا خطرہ ہے جس سے سوپر پاورز کے درمیان مڈل ایسٹ میں تصادم کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ جب نہر سویز کے کناروں پر جنگ بند ہوگئی تو برطانیہ اور فرانس کی جگہ مڈل ایسٹ میں امریکہ اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکا ہے۔ اسرائیل نے ضد پکڑ لی کہ وہ صحرائے سینائی میں مصر سے چھینے گئے علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا۔ چنانچہ امریکن انٹیلی جنس تنظیم سی آئی اے کے آئندہ بننے والے سربراہ رچرڈ ہیلمز جہاز پکڑ کر تل ابیب پہنچے جہاں اپنے

ہیڈ کوارٹر میں موساد کے سینئر حکام نے اُس کا استعمال کیا۔ یہ لوگ ہیلمز کو پراپرٹی ڈیلروں جیسے لگے جو اپنی بیچی جانے والی جائداد کی خوبیوں بارے رطب اللسان ہوں۔

لفٹ سے اوپر لے جاتے ہوئے کمشے کے گائیڈ نے اُسے بتایا کہ نچلی منزل پر آلات سماعت اور مواصلات کا مرکز ہے۔ اگلے فلور پر جونیئر سٹاف کے دفاتر ہیں۔ اگلی منزلوں پر تجزیہ کار، منصوبہ بندی کے ماہرین اور مختلف آپریشن پر عمل درآمد کرنے والے افراد کے دفاتر ہیں۔ ریسرچ اور ڈیویلپمنٹ والوں کا اپنا ایک الگ فلور ہے۔ سب سے اوپر کی منزل پر ڈائریکٹر جنرل اور اس کے سینئر معاونین کے دفاتر واقع ہیں۔

کمشے کو پلانرز اور سٹریٹجسٹ (Planners and Strategist) کے درمیان جگہ دے دی گئی۔ اُس کا دفتر بھی دوسروں کی طرح کم قیمت اور معمولی قسم کی میز، ایک لوہے کی فائلوں کے لئے الماری جس کی صرف ایک ہی چابی تھی، ایک کالے رنگ کا ٹیلیفون، ایک دفتر کے اندر کی ڈائریکٹری، جس پر لکھا تھا "اسے یہاں سے باہر لے کر مت جائیں" اور فرش پر ایک قالین کا ٹکڑا۔ یہی اس کے دفتر کا کل فرنیچر تھا۔ دیواروں پر زیتونی سبز رنگ کیا گیا تھا اور وہاں سے شہر کا منظر بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ موساد کے اس ہیڈ کوارٹر کو بنے تیرہ سال گزر چکے تھے اور اب کئی جگہ سے خستگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ دیواروں پر سے کئی جگہ رنگ اڑ چکا تھا اور قالینوں کی تبدیلی کی بھی ضرورت تھی۔

ان سب کمیوں کے باوجود کمشے نے محسوس کیا کہ وہ بڑے موزوں وقت پر یہاں آیا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل میئر امیت جلد ہی رخصت ہونے والا تھا اور اُس کی جگہ لینے کے لئے رافی ایتان اور موساد کے دیگر سینئر افسران تیار تھے۔

ڈیوڈ کمشے کے فرائض اور ذمہ داریوں میں مراکش کے حالات و واقعات اور وہاں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں پر نظر رکھنا بھی تھا کیونکہ وہاں ابھی تک بے شمار یہودی، کنگ حسن (King Hassan) کی جابرانہ حکومت کے تحت رہ رہے تھے۔ مراکشی یہودیوں کی زندگی میں کچھ بہتری لانے کے لئے موساد کے سربراہ میئر امیت نے مراکش کے بادشاہ کی سکیورٹی سروس اور انٹیلی جنس کے ساتھ باہمی تعاون اور مشترکہ مفادات کے لئے ورکنگ ریلیشن شپ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ مصر کے جمال ناصر کا تختہ الٹا جا سکے جو کہ شاہ حسن سے بھی اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی کہ اسرائیل سے۔ ناصر مڈل ایسٹ میں ایک عرب قومیت پر مبنی مضبوط عرب بلاک کی تعمیر کا خواب دیکھ رہا تھا جو نہر سویز سے مراکش کے ساحل اٹلانٹک کوسٹ تک کے علاقے پر مشتمل ہو اور کنگ حسن کو اس میں رکاوٹ خیال کرتا تھا۔ ایسا عرب بلاک، اسرائیل کے لئے خطرات کا باعث تھا لہٰذا میئر امیت نے مراکش کی انٹیلی جنس اور کنگ حسن کی سکیورٹی کو کونٹر انٹیلی جنس اور جدید خطوط پر تربیت کا انتظام کیا تھا جس میں ٹارچر، تشدد اور قتل و غارت کے موساد کے ایجاد کردہ طریقے شامل تھے۔

مراکش کے اندر بھی بادشاہ کے خلاف مہدی بن برکا (Mehdi Ben Burka) نے ایک چھوٹی سی پُرتشدد مہم کا آغاز کر رکھا تھا۔ کمشے نے مہدی بارے جو تحقیق کی تھی اُس کے مطابق وہ کسی وقت بادشاہ کا اتالیق، قومی مشاورتی اسمبلی کا صدر، حالانکہ اس اسمبلی کا کام صرف بادشاہ کے اپنی رعایا کے خلاف جاری کردہ ظالمانہ احکامات کی بطور ربر سٹمپ اسمبلی، تصدیق و توثیق ہی تھا لیکن ایک وقت ایسا آ گیا یہی سابقہ سکول ٹیچر، کنگ حسن کے مخالفین کا رہبر بن گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے کئی دفعہ برکا کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر دفعہ بچ نکلا اور آخرکار یورپ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں

سے وہ کنگ حسن کے زوال کی کوششوں میں اپنے لوگوں کی رہنمائی کرتا رہا۔

مراکش میں دو دفعہ برکا کی چھوٹی سی لیکن انتہائی منظم تحریک نے بادشاہ کو بم سے اڑانے کی ناکام کوشش کی۔

اشتعال میں آئے ہوئے بادشاہ نے بن برکا کے خلاف اس کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا کر سزائے موت کا حکم دے دیا۔ اس کے جواب میں بن برکا نے بھی اپنی تحریک کو بادشاہ کے خلاف مزید حملوں کی ہدایت کر دی۔

مئی 1965ء میں کنگ حسن نے بن برکا سے نمٹنے کے لئے موساد سے تعاون مانگا۔ موساد نے اس کام کے نتائج و عواقب کے جائزے کا کام کمشے کے سپرد کر دیا۔ اسی ماہ کے آخر میں بظاہر وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے برطانوی پاسپورٹ پر لندن پہنچا۔ دراصل وہ اپنے ایکشن پلان پر عمل پیرا تھا۔ ایک دوسرے جعلی برٹش پاسپورٹ پر جو لندن میں موساد کے مقامی ایجنٹ نے اسے دیا تھا اور جس پر مراکش کا ویزہ لگا ہوا تھا، وہ روم پہنچا۔ وہاں اُس نے ایک پورا دن سیر سپاٹے اور تفریح میں گزارا۔ دراصل وہ وہاں ٹھہر کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی اُس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ پھر وہ وہاں سے مراکش روانہ ہو گیا۔

رباط ائر پورٹ پر اُس کی ملاقات نڈر اور بے خوف مراکش کے وزیر داخلہ محمد اوفکیر سے ہوئی۔ اُس رات عشائیے پر جس میں وہاں کے بہترین بیلے ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے، اوفکیر نے کمشے کو اپنے بادشاہ کی خواہش سے آگاہ کیا یعنی بن برکا کا سر۔ ہنسی مذاق میں اوفکیر نے یہودی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ”تمہاری یہودیت کے سلوم نے بھی تو تمہارے کنگ ہاروڈ سے ایک شر پسند کا سر مانگا تھا“۔

کمشے نے کہا کہ اگرچہ یہ بات سچ ہے لیکن اس وقت وہ کسی ایسے مشن پر نہیں۔ اس کے لئے اوفکیر کو اس کے ساتھ اسرائیل آنا ہوگا۔ اگلے روز دو افراد روم روانہ ہو گئے جہاں سے اگلا جہاز پکڑ کر تل ابیب پہنچ گئے۔ موساد کے سربراہ میئر امیت نے ایک محفوظ ٹھکانے پر ان سے ملاقات کی وہ بہت دھیما لیکن محتاط تھا۔ اُس نے کمشے کو بتایا کہ وہ اوفکیر کا گھناؤنا اور گندہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ البتہ ان کو تربیت فراہم کر سکتے ہیں۔

میئر امیت کے علم کے بغیر ہی اوفکیر فرانس کی انٹیلی جنس کے ایک شعبے کے ساتھ بن برکا کے قتل کا منصوبہ طے کر رہا تھا، بشرطیکہ بن برکا کو کسی ترغیب سے جنیوا میں اُس کے قلعہ نما گھر سے نکال کر فرانس کی حدود میں لایا جا سکے۔ میئر امیت اب بھی اس معاملے میں ملوث ہونے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا اور اس کا اصرار تھا کہ وزیراعظم اسرائیل لیوی اشکول (Levi Eshkol) خود اس کی منظوری دے۔ وزیراعظم نے منظوری دے دی۔

موساد نے کام کی تیاری شروع کر دی۔ مراکش میں جنم لینے والے موساد کے ایک ایجنٹ کو جنیوا بھیجا گیا جس نے جلد ہی بن برکا کے حلقہ احباب میں رسائی حاصل کر لی۔ کئی مہینے کی کوشش کے بعد وہ بن برکا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کی رسائی فرانس کے ایک ایسے کروڑ پتی سے ہے جسے بن برکا کی تحریک سے ہمدردی ہے اور وہ شاہ حسن کو مراکش سے معزول کر کے جمہوریت کے فروغ کا حامی و ہمدرد ہے۔ مراکشی ایجنٹ کے دماغ میں یہ خیال ڈالنے کے پیچھے کمشے کی سوچ اور منصوبہ بندی کام کر رہی تھی۔

26 اکتوبر 1965ء کو کمشے کو معلوم ہوا کہ بن برکا پیرس کا سفر اختیار کر رہا ہے۔

موساد کے کمیونیکیشن سینٹر نے کوڈ ورڈ میں ایک خفیہ پیغام اوفکیر کو بھجوا دیا۔ اگلے روز وزیر داخلہ اوفکیر اپنے

محافظوں کی مختصر ٹیم کے ساتھ پیرس پہنچ گیا۔ اسی رات فرانسیسی انٹیلی جنس کے متعلقہ شعبے نے بھی اوفکیر سے رابطہ کیا اور ملاقات کی لیکن موساد کا جو ایجنٹ بن برکا کے ساتھ جنیوا سے آیا تھا۔ اُسے اس میٹنگ میں نہیں بلایا گیا۔ اس ایجنٹ نے ایک خفیہ ٹیلیفون لائن کے ذریعے صورتِ حال سے کمشے کو آگاہ کیا۔ کمشے نے اپنے ڈائریکٹر جنرل میئر امیت سے مشورہ کیا۔ دونوں اس بات پر متفق ہوگئے کہ کوئی گندہ کھیل کھیلا جا رہا ہے لہٰذا ہمیں اس معاملے سے دور ہی رہنا چاہیئے۔

اگلی شام کو جب بن برکا رات کے کھانے کے لئے پیرس کے علاقے سینٹ جرمین کے ایک ریسٹورنٹ میں آیا تو فرانسیسی ایجنسی سڈیسے (Sdece) نے اُس پر نظر رکھنے کے لئے باہر ایک وین متعین کر دی۔ بن برکا تو اس یقین کے ساتھ وہاں آیا تھا کہ جیسا کہ موساد کے مراکشی ایجنٹ نے جنیوا میں اُسے باور کرایا تھا کہ وہاں اُس کی اس کروڑ پتی فرانسیسی شخصیت سے ملاقات ہوگی جو اُس کی تحریک کا حامی اور ہمدرد تھا۔ بن برکا نے وہاں اُس خیالی کروڑ پتی کا ایک گھنٹہ تک انتظار کیا لیکن کوئی شخص اُس سے ملنے کے سامنے نہ آیا۔ آخر وہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے ہی اُس نے ریسٹورنٹ سے باہر فٹ پاتھ پر قدم رکھا فرانسیسی انٹیلی جنس سڈیسے کے دو ایجنٹوں نے اسے دبوچ لیا اور قابو کر کے وین میں ڈال لیا۔ اُسے پیرس کے علاقے فاؤنٹانے لی ویکومٹے میں واقع سڈیسے کے اُس تفتیشی مرکز میں لایا گیا جہاں فرانسیسی جاسوس ایجنسی اپنے مشکوک افراد سے پوچھ گچھ کیا کرتی تھی۔ اوفکیر کی ذاتی نگرانی میں تمام رات اُس سے پوچھ گچھ اور بے پناہ تشدد کیا جاتا رہا۔ آخر صبح صادق کے وقت، جب بوڑھے کمزور سے بن برکا کی ہڈی پسلی ایک ہو چکی تھی، اُسے ہلاک کر دیا گیا۔ اُسی بلڈنگ کے باغیچے میں بن برکا کی لاش دبانے سے پہلے اوفکیر نے اُس کے مردہ جسم کی تصویریں بنائیں۔ اس کے بعد وزیر صاحب یہ فلم اپنے بادشاہ کو دکھانے کے لئے واپس رباط روانہ ہوگئے۔

جب بن برکا کی باقیات اس بلڈنگ کے احاطے سے برآمد ہوئی تو پورے ملک میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور شور مچ گیا جس کی آواز قصرِ صدارت تک پہنچ گئی۔ اور صدر چارلس ڈیگال نے اپنی انٹیلی جنس ایجنسی سڈیسے کے خلاف انتہائی سخت قسم کی تحقیقات اور طرزِ عمل کا جائزہ لینے کا حکم جاری کر دیا۔ ایجنسی سڈیسے کے فرسٹ ڈائریکٹر نے اپنے دوسری خفیہ ایجنسیوں کے ساتھیوں سے مل کر کوشش کی کہ کسی بھی طرح اس معاملے میں موساد کے ملوث ہونے کا ثبوت سامنے نہ آئے لیکن صدر ڈیگال جو کبھی بھی اسرائیل کا ہمدرد نہیں رہا تھا، مُصر تھا کہ موساد اس میں ملوث ہے۔ اس نے اپنے مشیروں اور قریبی لوگوں کو بتایا اس آپریشن کا طریق کار تل ابیب کے طریق کار کی نشاندہی کرتا ہے۔ (ڈیگال خود بھی دوسری جنگ عظیم کا عظیم جنرل اور انٹیلی جنس، جاسوسی اور خفیہ سرگرمیوں کا ماہر تھا (مترجم) صرف اسرائیلی ہی بین الاقوامی قوانین کی اس طرح دھجیاں اڑانے کی جرأت کر سکتے ہیں (کسی دوسرے ملک میں آ کر کسی تیسرے ملک کے شہری کو قتل کرنا)۔ 1956ء کی نہر سویز کی جنگ کے دوران اسرائیل اور فرانس کے جن دوستانہ تعلقات اور باہمی تعاون کا آغاز ہوا تھا۔ وہ ایک دم ختم ہو گئے۔ ڈیگال نے فوری طور پر حکم دے دیا کہ اسرائیل کو فرانسیسی ہتھیاروں کی سپلائی روک دی جائے۔ اس کے علاوہ دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے درمیان تعاون، رابطے اور اطلاعات کے تبادلے فوراً ختم کر دیئے جائیں۔

موساد کا ڈائریکٹر جنرل میئر امیت پیرس سے لگنے والی ان چوٹوں کو ابھی تک سہلا رہا ہے۔

کمشے کے الفاظ میں میئر امیت نے اُس مشکل دور میں حالات کا جس جرأت اور بہادری سے سامنا کیا وہ

اس کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔ وہ مجھ پر یا آپریشن میں شامل دوسرے لوگوں پر الزام دھر سکتا تھا لیکن اس نے تمام آپریشن کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ وہ حقیقتاً ایک سچا لیڈر تھا۔

پیرس سے اس انتہائی سخت ردعمل کے بعد وزیراعظم اشکول کی حکومت نے موساد کے ڈائریکٹر جنرل سے فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ تند و تیز تنقید ایک ایسے ذریعے سے آنے لگی جس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔ میئر امیت جس طرح وضاحتیں پیش کرتا تھا کہ اس آپریشن میں موساد کا کردار بہت معمولی تھا۔ اُس نے تو صرف چند (جعلی) پاسپورٹ سپلائی کئے تھے اور کچھ گاڑیاں کرائے پر حاصل کی تھیں لیکن اُس کی جگہ نئے آنے والے ڈائریکٹر ایسر ہیرل (isser Harel) کا اصرار تھا کہ اُس کے دور میں بن برکا آپریشن پر کبھی عمل درآمد نہ کیا جاتا۔ میئر امیت نے وزیراعظم کو انتباہ کیا کہ اس طرح کی تنقید و نکتہ چینی سے ہم دونوں ہی ڈوبیں گے لیکن وزیراعظم نے اس کو اس طرح جواب دیا کہ اُس وقت کی وزیر خارجہ گولڈا میئر (Golda Meir) کی سربراہی میں ایک۔ انکوائری کمیٹی قائم کر دی۔ کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ میئر امیت استعفیٰ دے دے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ لہٰذا وزیراعظم اشکول کو بھی مستعفی ہونا پڑا لیکن اس آپریشن کے پچھتاوے نے میئر امیت کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ تاہم ایک سال بعد اُس نے اعتراف کیا کہ بن برکا کی موت اب مرے لئے کسی پچھتاوے کا باعث نہیں رہی۔

اسی دوران کمشے کے لئے کچھ دوسری پریشانیاں کھڑی ہو چکی تھیں۔ فلسطینیوں نے ایک ایسا تربیت یافتہ کمانڈو یونٹ تیار کر لیا تھا جو حفاظتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دوران پرواز ہوائی جہاز اغوا یا تباہ کر سکنے کی صلاحیت رکھتا تھا جس کے بارے میں موساد نے سوچا بھی نہ تھا۔ کسی بھی وقت کسی اسرائیلی ہوائی جہاز کا کنٹرول حاصل کر کے کسی دوست عرب میں اتارا جا سکتا تھا۔ جہاز کے مسافروں کو یرغمال بنا کر یا تو بھاری تاوان کے بدلے یا اسرائیلی جیلوں میں قید عرب قیدیوں کی رہائی کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس سے تحریک آزادی فلسطین کو بین الاقوامی سطح پر وسیع پیمانے پر ذرائع ابلاغ میں پبلسٹی بھی حاصل ہو جائے گی۔

جولائی 1968ء میں اسرائیلی ائرلائن ایل آل کی روم سے روانہ ہونے والی فلائٹ کو ہائی جیک کر کے الجزائر میں جا اتارا گیا۔ فلسطینیوں کی طرف سے اس انتہائی دلیرانہ، آپریشن نے موساد کو چکرا کے رکھ دیا۔ چنانچہ موساد کے ایجنٹوں کی ایک ٹیم الجزائر روانہ کی گئی ساتھ ساتھ کمشے نے اپنے خوفزدہ مسافروں کی رہائی کے لئے دوسرے طریقوں پر غور شروع کر دیا۔ اگر اغوا شدہ جہاز پر اچانک یلغار کی جاتی تو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندے اُسے گھیرے میں لئے ہوئے تھے جو خبریں بنانے میں مصروف تھے اور اسرائیلی ایکشن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ کمشے کی سفارش تھی کہ فوری کارروائی کی بجائے معاملے کو ٹھنڈا ہونے دیا جائے اور وقت حاصل کیا جائے۔ اس دوران ان کے ایجنٹ ایکشن کے لئے تیاری کر لیں گے۔ ہائی جیکروں کو بھی اسرائیل کی طرف سے ردعمل کا احساس تھا لہٰذا انہوں نے خون خشک کر دینے والی دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور فوری طور پر اسرائیلی جیلوں سے عرب قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ الجزائری حکومت نے ہائی جیکروں کے مطالبے کی حمایت کر دی۔ کمشے نے محسوس کیا کہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پھنس چکا ہے لہٰذا اُس نے بے دلی سے مسافروں کے بدلے قیدیوں کے تبادلے کی سفارش کر دی۔ حالانکہ اُسے احساس تھا کہ اس فیصلے سے آئندہ کے لئے ہائی جیکروں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ اس کے

علاوہ فلسطین کی تحریک آزادی کو دنیا بھر میں وسیع پیمانے پر پبلسٹی ملے گی۔ اسرائیل کے ساتھ ساتھ اُس کی حمایتی مغربی طاقتوں کو بھی دفاعی پوزیشن اختیار کرنا پڑی۔ کیونکہ کسی کے پاس بھی ہائی جیکنگ کا کوئی علاج نہ تھا سوائے اس کے کہ اگلی ہائی جیکنگ کا انتظار کریں، سب بے بس تھے۔

اپنی شرائط منوا کر فلسطین کے ہائی جیکروں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور انہوں نے اگلی واردات کے لئے زیادہ بہتر طریقے سے ٹریننگ، تیاری اور منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اب ہائی جیکروں کو جہاز خود اڑانے کی تربیت، جہاز کے تکنیکی نظام کو سمجھنے کی پریکٹس اور پائلٹ کیبن کے اندر لڑنے کی عملی تربیت بھی شامل تھی کیونکہ پہلے جہاز کے اغوا کے بعد اسرائیل نے اپنے مسافر جہازوں کے اندر مسلح گارڈ متعین کرنا شروع کر دیئے تھے۔ فلسطینی ہائی جیکروں کی یہ تمام تعلیم و تربیت لیبیا کے صحرا میں ہو رہی تھی۔

اسرائیل کے فلسطینیوں کے ہاتھوں پہلے جہاز کے اغوا کے بعد دنیا بھر میں کچھ ہی عرصے میں ایسی ایک درجن وارداتیں وقوع پذیر ہو گئیں۔ اس واقعہ نے نہ صرف فلسطین کی تحریک آزادی میں نئی روح پھونک دی تھی بلکہ دنیا بھر میں آزادی کے لئے لڑنے والوں اور اپنی جابرانہ حکومتوں کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے حوصلے بلند کر دیئے تھے اور انہوں نے بھی اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہائی جیکنگ کا طریقہ اپنا لیا تھا۔

کمشنے کو جیسا کہ توقع تھی کہ فلسطین دوبارہ ایسی کوشش ضرور کریں گے، اُس نے دوسری حفاظتی کوششوں کے علاوہ اسرائیلی مسافروں کے اندر مسلح محافظ تعینات کرا دیئے تھے۔

27 جون 1976ء کو ایک اسرائیلی مسافر بردار جہاز جو یہودی مسافروں کو لے کر تل ابیب سے پیرس جا رہا تھا۔ جب راستے میں ایتھنز ائرپورٹ پر رکا تو ہوائی اڈے پر مناسب حفاظتی انتظامات نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فلسطینیوں کے ایک علیحدہ گروپ ''وادی حداد'' (Wadi Haddad) نے اغوا کر لیا انہوں نے صرف دو مطالبات پیش کئے، اوّل اسرائیلی جیلوں سے 40 فلسطینی اور یورپی قید خانوں سے مزید ایک درجن افراد کی رہائی۔ دوم اُن دو جرمن نژاد دہشت گردوں کی آزادی جو کینیا میں قید تھے اور جنہوں نے اسرائیلی مسافر بردار جہاز کو نیروبی ائرپورٹ سے اڑتے وقت سام-7 راکٹ سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

کاسا بلانکا اور خرطوم میں اترنے کی اجازت نہ ملنے کے بعد اغوا شدہ جہاز یوگنڈا کے ہوائی اڈے اینٹے بے پر لینڈ کر گیا۔ وہاں پر ہائی جیکروں نے اعلان کیا ''جہاز کو مسافروں سمیت اڑا دیا جائے گا اگر 30 جون تک ان کے مطالبات پورے نہ کئے گئے''۔

تل ابیب میں کابینہ کے اجلاسوں میں وزراء نے فلسطینیوں کی رہائی کے حق میں رائے دی جبکہ وزیراعظم نے مذہبی کتاب کا حوالہ دیا جس میں جرائم پیشہ افراد کی رہائی کی مثال موجود تھی۔ دوسری طرف پبلک شور مچا رہی تھی کہ دہشت گردوں کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے جائیں۔

چیف آف سٹاف موردیشائی غور (Mordechai Gur) نے اعلان کر دیا کہ اینٹے بے کے بارے میں انٹیلی جنس معلومات کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ ملٹری ایکشن نہیں لے سکتا۔ اسی دوران اینٹے بے سے خبر موصول ہوئی کہ یہودی مسافروں کو الگ کر کے باقی جہاز پر موجود مسافروں کو رہا کر دیا گیا ہے اور انہیں اپنی منزل پیرس کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔

موساد کو اسی موقع کی تلاش تھی۔ اس وقت کے موساد کے سربراہ یزہاک ہوفی (Hizhak Hofi) نے اسے ایک سنہری موقع جانتے ہوئے زوردار طریقے

سے ریسکیو آپریشن پر زور دیا اور وہ کابینہ کو قائل کرنے کے لئے دلائل دیتے دیتے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اب وہ کابینہ کے ارکان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگر ہم اپنے لوگوں کو مرنے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے تو اس سے طوفان کے نئے دروازے کھل جائیں گے۔ کوئی یہودی کہیں بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ ہٹلر کو قبر میں لیٹے لیٹے فتح حاصل ہو جائے گی۔

''بہت بہتر''۔ وزیراعظم رابن نے کہا۔ ''ہم کوشش کر دیکھتے ہیں''۔

کمشے اور دوسروں نے اسی وقت منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلی ترجیح تل ابیب اور نیروبی کے درمیان خفیہ مواصلاتی نظام کا قیام تھا۔ میئر امیت نے اپنے دور میں موساد اور کینیا کی انٹیلی جنس ایجنسی کے درمیان کچھ روابط قائم رکھے تھے۔ ہوفی نے ان روابط سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ موساد کے آدھا درجن ایجنٹ پہلے ہی نیروبی کے ایک محفوظ ٹھکانے پر جو کینیا کی انٹیلی جنس سروس نے انہیں مہیا کر رکھا تھا، موجود تھے۔ ان سے جلد ہی رابطہ قائم ہو گیا اور حملے کی راہ ہموار ہونے لگی۔ اگلا مسئلہ ریسکیو مشن کے جہازوں کے لئے نیروبی ائرپورٹ سے ایندھن بھرنے کا تھا۔ انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر کمشے نے کینیا کے حکام سے چند گھنٹوں کے اندر ٹیلیفون پر اس کی بھی اجازت حاصل کر لی۔

اینٹے بے پہنچنے کے راستے میں اب بھی ایک فوری رکاوٹ موجود تھی۔ فلسطینی مجاہدین نے اس ائرپورٹ کو اپنے یوگنڈہ میں داخلے کا دروازہ بنا رکھا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنا ایک مرکز قائم کر کے وہاں سے اسرائیل کی ہمدرد سفید فام جنوبی افریقن حکومت کے خلاف کارروائیاں کیا کرتے تھے۔ یوگنڈا کے معزول ڈکٹیٹر عیدی امین نے اسرائیل سے 1972ء میں سفارتی تعلقات ختم کرنے کے بعد اسرائیلی سفیر کی رہائش گاہ فلسطینیوں کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کے لئے دے رکھی تھی۔

ایکشن سے پہلے کمشے کے لئے یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ پی ایل او اب بھی ملک میں موجود ہے یا نہیں۔ کیونکہ فلسطینی گوریلے اسرائیل کے چند منٹ کے زمینی آپریشن کو جوابی حملے سے ناکام بھی بنا سکتے تھے۔ کمشے نے نیروبی سے کشتی کے ذریعے وکٹوریہ جھیل کے راستے سے فلسطینی ہیڈ کوارٹر کی نگرانی کے لئے دو جاسوسوں کو بھیجا۔ اینٹے بے کے قریب انہیں فلسطینیوں کا ہیڈ کوارٹر خالی ملا۔ وہ کچھ عرصہ قبل ہی اپنا ہیڈ کوارٹر انگولا لے جا چکے تھے۔

موساد کے جاسوسوں کی رہنمائی کے لئے کینیا کی سکیورٹی ایجنسی کا جو افسر اُن کے ساتھ موجود تھا اُس کو یاد آ گیا کہ اس کی بیوی کا ایک رشتہ دار یرغمالیوں کی نگرانی پر مامور ہے۔ یہ کینیا کا افسر کسی نہ کسی بہانے سے ائرپورٹ میں داخل ہو گیا اور دیکھا تمام یرغمالی زندہ سلامت ہیں اور پندرہ کے قریب ان کی نگرانی کرنے والے نوجوان بڑے تناؤ اور اضطراب کی کیفیت میں نظر آتے ہیں۔ یہ اطلاع بھی ریڈیو کے ذریعے تل ابیب پہنچا دی گئی۔

اسی دوران موساد کے دو مزید ایجنٹ جو مصدقہ پائلٹ تھے، نیروبی پہنچے اور ایک چھوٹا سیسنا طیارہ بظاہر اس غرض کے لئے کرائے پر حاصل کیا کہ وہ ایک سیاحتی کتابچے کے لئے جھیل وکٹوریہ کی تصویریں اتارنا چاہتے ہیں۔ یہ جہاز براہِ راست اینٹے بے ائرپورٹ کے اوپر سے گزرا اور ایک ایجنٹ نے نہایت صفائی اور مہارت کے ساتھ رن وے اور اردگرد کی بلڈنگوں کی نہایت واضح تصویریں اتار لیں۔ یہ فلم تل ابیب بھیج دی گئی۔ اب کمشے نے ہائی جیکروں کو چکر دینے کے لئے ایک نئی حکمت عملی ترتیب دی۔

تل ابیب سے عیدی امین کے قصر صدارت میں بے شمار ٹیلیفون کالیں کی گئیں اور آخر میں یقین دہانی کرائی گئی کہ اسرائیلی حکومت ہائی جیکروں کے مطالبات

ماننے پر تیار ہے۔ یوگنڈا میں متعین ایک یورپی سفارتکار کو معاہدے کا مناسب الفاظ میں ڈرافٹ تیار کرنے کی ڈیوٹی لگائی گئی جو ہائی جیکروں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسرائیلی حکومت اغوا کنندگان کی شرائط ماننے میں واقعی سنجیدہ ہے۔

کمشے نے سفارتکار پر واضح کر دیا کہ معاہدے کی شرائط نہ تو اسرائیل کے لئے بہت سخت ہونی چاہئیں اور نہ ہی ایسی کہ ہائی جیکر ماننے سے ہی انکار کر دیں۔ چنانچہ سفارتکار فوراً ائرپورٹ پہنچا اور معاہدے کی شرائط بارے ہائی جیکروں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ اِدھر یہ ڈرامہ رچایا جا رہا تھا اور اُدھر آپریشن تھنڈربال (Operation Thunderball) کی تیاری آخری مراحل میں پہنچ چکی تھی۔

ایک بے شناخت اسرائیلی بوئنگ 707 جہاز، جسے بطور ہسپتال استعمال کیا جانا تھا، کو لے کر آئی ڈی ایف کے پائلٹ لے کر نیروبی ائرپورٹ پہنچے۔ یہ پائلٹ اینٹبے ائرپورٹ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس دوران موساد کے چھ ایجنٹوں نے جن کے پاس انتہائی طاقتور ریڈیو اور ریڈار کو جام کرنے کے آلات تھے، اُس ائرپورٹ کے اردگرد اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ریڈار کو جام کرنے والے الیکٹرونک آلات کو اس سے قبل کبھی جنگی صورتِ حال میں آزمایا نہیں گیا تھا۔

اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس پیراٹروپر ہسپتال والے جہاز سے نکل کر پوری تیز رفتاری سے جھیل وکٹوریہ کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے اپنی ربڑ کی کشتیوں میں ہوا بھری اور جھیل میں سے گزر کر یوگنڈا کے ساحل کے ساتھ انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ اینٹبے ائرپورٹ پر جھپٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ تل ابیب میں انہوں نے ریسکیو مشن کی اچھی طرح مشق کر رکھی تھی۔ وقتِ مقررہ پر طاقتور C-130 ہرکولیس ٹرانسپورٹ جہازوں نے بحرِ سرخ (Red Sea) کو عبور کیا اور ایندھن بھرنے کے لئے نیروبی ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ ایندھن لینے کے بعد یہ جہاز درختوں کی چوٹیوں پر نیچی پرواز کرتے ہوئے اینٹبے ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ کمانڈوز نے اس بلڈنگ کی طرف دوڑ لگا دی جہاں مغوی مسافروں کو رکھا گیا تھا۔ اُس وقت وہاں صرف یہودی مسافر ہی رہ گئے تھے۔ دوسری قومیتوں کے تمام مسافروں کو عیدی امین نے رہا کر دیا تھا جس سے پوری دنیا میں اُس کی سراہنا کی جا رہی تھی۔ جو پیراٹروپر جھیل کنارے ایکشن کے انتظار میں بیٹھے تھے انہیں بلایا ہی نہیں گیا۔ وہ اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر واپس نیروبی پہنچ گئے جہاں سے انہیں ایک اور اسرائیلی ٹرانسپورٹ جہاز واپس لے گیا۔

پانچ منٹ کے اندر متوقع وقت سے بھی دو منٹ پہلے ہی تمام یرغمالی آزاد کرا لئے گئے اور تمام ہائی جیکر موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، ان کے ساتھ 16 یوگنڈا کے فوجی بھی مارے گئے جو ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ حملہ آور فورس کا صرف ایک افسر کام آیا جس کا نام لیفٹیننٹ کرنل جوناتھن نیتن یاہو تھا جو آئندہ ہونے والے (اور موجودہ) وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کا بڑا بھائی تھا۔ تین یرغمالی بھی مارے گئے۔

ڈیوڈ کمشے کی یہ خواہش بھی اُس کی توقع سے بڑھ کر پوری ہو گئی کہ اُس کے ریسکیو آپریشن کی خبر ہائی جیکروں کی خبر سے بڑی بنے۔ یہ کہانی موساد کی تاریخ میں جرمن نازی اوڈولف ایجمن کے پکڑے جانے سے بھی بڑی کہانی ہے۔

پی ایل او فلسطینی تحریک آزادی کے خلاف موساد کی سرگرمیوں کمشے نے اپنے آپ بہت زیادہ ملوث کر لیا تھا۔ وہ یہ جنگ اسرائیلی سرحدوں سے دور، یورپ کی گلیوں تک میں لڑ رہا تھا۔ یہ اُسی کی حکمت عملی تھی کہ اُس

نے موساد کی اپنی قاتلوں کی ٹیم تیار کی تھی جو کیڈون (Kidons) کہلاتے تھے۔ یہ قاتل یا کیڈون پیرس، میونخ، سائپرس اور ایتھنز جیسے یورپی شہروں میں مصروف عمل تھے۔ کمشے کے لئے قتل ایک عام سی بات تھی۔ وہ ایک ایسے پائلٹ کی طرح تھا جسے یہ نہیں معلوم کہ اُس کے بم کس جگہ گر رہے ہیں۔

ایک صبح کمشے کام پر آیا تو اس کے ساتھی بڑی غمگین اور سنجیدہ شکلیں بنائے بیٹھے تھے۔ اُن کے ایک انتہائی تجربہ کار ایجنٹ کو میڈرڈ (سپین) میں فلسطینی تحریک آزادی کے ایک بندوق بردار نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ قاتل اُس گروپ کا ایک مخبر تھا جس میں موساد کا ایجنٹ سرایت کرنے کی تگ و دو میں تھا۔

لیکن اب سوگ منانے کا وقت نہیں تھا کمشے کے الفاظ میں یہ نہ رحم کھانے کا وقت ہے اور نہ رحم کی امید رکھنی چاہیے۔

کمشے پر بے پناہ دباؤ آ رہا تھا کہ فلسطینی تحریک مزاحمت کے لیڈروں تک رسائی حاصل کر کے تنظیم کے اندرونی طریق کار کو سمجھنے اور اس کے رہنماؤں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ کمشے کے الفاظ میں "سر کاٹ کر ہی دُم کے دس گھولنے کو روکا جا سکتا ہے"۔ یاسر عرفات کا سر موساد کے قاتلوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔

1973ء تک کمشے کے دماغ میں ایک اور نہایت سنجیدہ اور خطرناک خیال نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ مصر کی رہنمائی میں عربوں کی طرف سے اسرائیل کے خلاف ایک اور بھرپور جنگ کا خطرہ تھا۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان موساد ہی واحد جاسوس ایجنسی تھی جو جنگ کے اس خطرے کا اظہار کر رہی تھی۔ کمشے کے اظہار تشویش کو اس کے اپنے افسران بالا اور ملٹری انٹیلی جنس "امان" نے قطعی مسترد کر دیا تھا۔ ملٹری

کے تجزیہ کاروں کا کہنا تھا کہ مصر کے صدر انور سادات نے حال ہی میں 20 ہزار روسی مشیروں کو ملک سے رخصت کر دیا ہے لہٰذا وہ کسی سیاسی مفاہمت کی تلاش میں ہے تاکہ مڈل ایسٹ کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔

لیکن کمشے اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس کی اپنی اطلاعات کے مطابق سادات اچانک ہی اسرائیل پر حملہ آور ہوگا کیونکہ اسرائیل، عربوں کے مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہا۔ مصر اپنے مفتوحہ علاقے واپس لینے کے علاوہ اسرائیل کے اندر فلسطینی ریاست کے قیام کے مطالبے پر بضد تھا۔ کمشے کا خیال تھا کہ اگر اسرائیل مصر کی شرائط مان بھی لے تو پی ایل او اپنی ہلاکت خیز تحریک کے ذریعے اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کے لئے اپنی کارروائیاں جاری رکھے گی۔

کمشے کو اس وقت اور زیادہ خطرہ محسوس ہوا جب صدر سادات نے اپنا وزیر جنگ ایک ایسے شاہین صفت شخص کو لگا دیا جس نے آتے ہی نہر سویز کے گرد دفاعی تنصیبات کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ مصری جرنیل بھی دوسرے عرب ممالک کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے دارالحکومتوں کے دورے کر رہے تھے۔ سادات نے روس سے اسلحہ کی خریداری کے ایک نئے معاہدے پر بھی دستخط کئے تھے۔

کمشے کی نظر میں یہ تمام آثار بدشگونی کی علامت تھے۔ اب یہ سوال نہیں تھا کہ جنگ کب مسلط ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ کس دن شروع ہوگی"۔

لیکن ملٹری انٹیلی جنس امان کے کرتا دھرتا موساد کی طرف سے آنے والی ان وارننگوں پر کان دھرنے کو ہی تیار نہ تھے۔ انہوں نے آئی ڈی ایف کے کمانڈروں کو باور کرا دیا کہ بالفرض جنگ شروع بھی ہوتی ہے تو ہمارے پاس پانچ دن کا وارننگ پیریڈ ہوگا جو اسرائیلی ائرفورس کی تیاری کے لئے کافی ہوگا تاکہ وہ چھ روزہ جنگ میں اپنی کامیابی کی تاریخ دہرا سکے۔

کمشے کا خیال تھا کہ عربوں نے ماضی کی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھ لیا ہوگا لیکن دوسری اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے اُسے جنگی جنونی موساد کے نام سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اگرچہ یہ اصطلاح اس محتاط آدمی کے بارے میں درست نہ تھی لیکن اس نے مصری تیاریوں بارے جاسوسی اور تجزیے کا کام جاری رکھا اور اب وہ متوقع حملے کی حتمی تاریخ بارے اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

تل ابیب میں 1973ء کا اگست کا مہینہ انتہائی گرم اور خشک گزرا تھا لیکن ستمبر کی آمد سے موسم قدرے تبدیل اور معتدل ہو گیا۔ نہر سویز کی طرف صحرائے سینائی میں متعین اسرائیلی موساد کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ حملے کی مصری تیاریاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں۔ مصری انجینئرز نہر سویز پار کرنے کے لئے کشتیوں کے پلوں کو آخری شکل دے رہے ہیں تاکہ پیدل فوج اور انفنٹری و توپ خانہ وٹینک وغیرہ نہر کراس کر کے سینائی کی طرف آ سکیں (جس پر چھ روزہ جنگ کے وقت سے اسرائیل قابض تھا)۔ جب موساد نے اپنی وزارت خارجہ پر دباؤ ڈالا کہ مصر کی جنگی تیاریوں بارے اقوام متحدہ میں آواز بلند کرے تو جواب میں مصری نمائندے نے بتایا کہ "یہ تو معمول کی مشقیں ہیں"۔ کمشے نے اپنی حکومت کو باور کرایا کہ یہ تو وہی الفاظ ہیں جو جاپانی سفیر نے واشنگٹن میں پرل ہاربر پر حملے سے قبل دہرائے تھے۔

تاہم اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی امان نے مصری کی نمائندے اس بات کو درست تسلیم کر لیا۔ کمشے تک اُس کے جاسوسوں کے ذریعے جو اطلاعات پہنچ رہی تھیں اور وہ ناقابل یقین حد تک اکتوبر میں خطرے کی علامات دیکھ رہا تھا۔ لیبیا نے انہی دنوں اپنے ملک میں تیل نکالنے والی مغربی ملکوں کی کمپنیوں کو قومی ملکیت قرار

دے دیا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کی تیل پیدا کرنے والی ریاستوں میں مغربی ممالک کو تیل کی سپلائی محدود کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی امان اب بھی خطرے کی بو سونگھنے میں ناکام تھی۔ جب اسرائیلی جہازوں پر شام کے اوپر مگ (MIG) جہازوں نے حملہ کیا تھا تو اسرائیلی آئی ڈی ایف کے پائلٹوں نے اس وجہ سے کامیابی حاصل کی تھی اور شام کے ایک درجن جہاز مار گرائے تھے کہ انہوں نے شام سے چرائے گئے مگ جہاز سے ان جہازوں کی بہت سی کمزوریوں کا سراغ لگا رکھا تھا۔ لہٰذا امان اسی زعم میں مبتلا تھی کہ اگر عربوں نے حملہ کیا تو اسرائیلی ائرفورس ان کا یہی حشر کرے گی۔

صبح 6 بجے موساد کے سربراہ زوی ضمیر آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں ملٹری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں سے ملنے کے لئے گیا۔ ہیڈ کوارٹر کی بولڈنگ تقریباً خالی پڑی تھی۔ یہ یوم کپور (Yom Kippur) تھا، یہودیوں کے سب سے متبرک تہوار کا دن، غیر مذہبی یہودی بھی جس دن آرام کرتے ہیں۔ ایسا مقدس دن جس دن ہر کام حرام ہے حتیٰ کہ ریڈیو کی نشریات بھی بند کر دی جاتی ہیں اور تمام دیگر سرکاری و غیر سرکاری ادارے بھی بند ہوتے ہیں۔ صرف ریڈیو ہی ہنگامی حالت کی صورت میں ریزرو فوجیوں کو خبردار کرنے کا فریضہ ادا کرتا تھا۔

موساد کی طرف سے پیش کئے گئے ناقابل تردید ثبوتوں کے بعد پورے اسرائیل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں کہ شمال سے شام اور جنوب سے مصر بیک وقت حملہ کر کے اسرائیل کو نگل جانا چاہتے ہیں۔

مقامی وقت کے مطابق جنگ 1:55 بجے شروع ہو گئی جبکہ اسی وقت اسرائیلی کابینہ اپنا ہنگامی اجلاس منعقد کر رہی تھی اور اُس وقت بھی ملٹری انٹیلی جنس کی طرف سے کابینہ کو بتایا جا رہا تھا کہ حملہ 6 بجے شام شروع ہوگا۔ بعد ازاں ثابت ہوا کہ یہ وقت صرف خیال و قیاس پر مبنی تھا۔

اسرائیل کی تاریخ میں انٹیلی جنس کی ناکامی کی اس سے بڑی مثال کوئی نہیں ملتی۔ ڈیوڈ کمشے اور موساد کے دوسرے ذرائع نے جو بھی اطلاعات مہیا کی تھیں انہیں بالکل ہی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔

جب جنگ ختم ہوئی تو اسرائیل ایک دفعہ پھر یقینی شکست کے جبڑوں سے اپنی فتح کو چھین کر لے جا چکا تھا لیکن ملٹری انٹیلی جنس امان کے بالائی حلقوں میں کافی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی موساد نے ایک پھر انٹیلی جنس کمیونٹی میں اپنی بالادستی کا لوہا منوالیا لیکن اس میں بھی بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ضمیر (Zmir) کو اس بنا پر ہٹا دیا گیا کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی امان پر دباؤ ڈالنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ اس کی جگہ یزہاک ہوفی (Yitzhak Hofi) کو موساد کا نیا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا گیا۔

موساد کی سربراہی کے عہدے پر ہوفی کی آمد پر کمشے کے جذبات ملے جلے تھے۔ وہ اسے میئر امیت جیسا تجربہ کار، میدان جنگ کا آزمودہ سپاہی، اسی قسم کے عادات و خصائل اور کسی بھی قسم کی حماقتوں کو ناقابل برداشت سمجھنے والا انسان سمجھتا تھا لیکن ہوفی میں خودسری، تکبر اور غرور انتہا کو پہنچا ہوا تھا جس کی وجہ سے دونوں میں ابتدا سے پُرخاش چلی آ رہی تھی۔ موساد کے ٹریننگ سرکل میں نئے ریکروٹس کو تربیت دینے کے لئے جب دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے تو ہوفی اپنے ساتھی کمشے کی ذہانت، انگریزی زبان پر عبور اور دیگر خوبیوں کا بالکل اعتراف نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کمشے کی جاسوسی کی مہارت کو مانتا تھا لیکن اب ضمیر کے اختتامی دور میں کمشے کو بھی موساد کا ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا تھا لہٰذا اب اُسے موساد میں ہوفی

کے نائب کے طور پر کام کرنا تھا، اس لئے دونوں نے کوشش کی کہ اپنے ذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے موساد کے امور کو پہلے سے زیادہ مہارت، ہنرمندی اور باہمی تعاون سے انجام دیا جائے۔

اب کمشے کو موساد میں انتہائی مشکل اور خطرناک شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہ "لبنان کا دردسر"۔ لبنان میں خانہ جنگی، جنگ کپور کے دو سال بعد (مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان) شروع ہوئی تھی اور کمشے کے لبنان سیکشن کا انچارج بننے کے وقت عیسائی جنگ ہار رہے تھے۔ جس طرح کئی سال پہلے سلمان (Salman)، عراقی مگ کی چوری کا منصوبہ لے کر پیرس کے اسرائیلی سفارت خانے میں پہنچا تھا، اسی طرح ایک عیسائی ایلچی پیرس کے سفارت خانے میں ستمبر 1975ء میں پہنچا اور درخواست کی کہ قبل اس کے کہ لبنان سے عیسائیوں کا مکمل خاتمہ ہو جائے، اسرائیل انہیں ہتھیار سپلائی کرے۔ یہ درخواست کمشے کے میز پر پہنچ گئی۔ اس نے لبنان میں دخل اندازی کے لئے اسے ایک سنہری موقع جانا۔

اس نے سربراہ ہوفی کو بتایا کہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلمان اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُس کا استدلال تسلیم کر لیا گیا۔ اسرائیل لبنانی عیسائیوں کو معقول مقدار میں اسلحہ دے گا تا کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں جو بعدازاں اسرائیل کے لئے ہی خطرے کا باعث بن جائے۔ چنانچہ اسرائیل سے اسلحہ اور گولہ بارود بحری کشتیوں کے ذریعے لبنان پہنچنا شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ کمشے نے لبنان کی کرسچین ہائی کمان کے اندر موساد کے افسر بھی داخل کر دیئے۔ موساد کے یہ ایجنٹ بظاہر اسرائیلی اسلحے کا مؤثر استعمال سکھانے کے لئے تھے لیکن اُن کا اصل کام لبنان کی اندرونی صورتِ حال بارے مسلسل خفیہ معلومات فراہم کرنا تھا تا کہ وہ خانہ جنگی پر تیل ڈالنے کا کام مؤثر طور پر کر سکے۔ انہی اطلاعات انٹیلی جنس معلومات کی بنیاد پر اسرائیل نے پی ایل او کے خلاف جنوبی لبنان کے فلسطینی تحریک مزاحمت کے مضبوط ٹھکانوں پر کئی کامیاب آپریشن کیئے۔

لیکن عیسائیوں کے ساتھ موساد کے تعلقات اس وقت خراب ہو گئے جب جنوری 1976ء میں عیسائیوں نے ایران کی حمایت یافتہ حزب اللہ کے خلاف شامی فوج کو مداخلت کی دعوت دی۔ حزب اللہ (Hizbolla) گروپ کو دمشق میں بھی ایک خطرہ سمجھا جا رہا تھا۔ چند ہی دن میں ہزاروں تربیت یافتہ اور جنگ کے ماہر شامی فوجی لبنان میں داخل ہو رہے تھے اور اسرائیلی سرحد کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ عیسائی لیڈروں کو کمشے کے الفاظ میں بہت بعد میں احساس ہوا کہ انہوں نے گیدڑوں سے بچنے کے لئے بھیڑیوں کو دعوت دی ہے۔

ایک دفعہ پھر عیسائی لیڈروں نے امداد کے لئے موساد کی طرف دیکھنا شروع کر دیا لیکن کمشے نے محسوس کیا کہ اُس نے لبنانی عیسائیوں کو ہتھیار سپلائی کرنے کا جو منصوبہ نہایت احتیاط سے تیار کیا تھا وہ مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسرائیل کی طرف سے ایک بھرپور آپریشن ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ان گنت آئی ڈی ایف ٹینک، اینٹی ٹینک میزائل اور بڑی مقدار میں گولہ بارود عیسائیوں کو بھجوا دیا گیا، جس کے نتیجے میں لبنان کی خانہ جنگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمشے نے اسرائیل کی سب سے بڑی دشمن، فلسطین کی تحریک مزاحمت (PLO) کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی۔ پھر اس گوریلا وار کو لبنانی شیعیوں تک پھیلا دیا۔ اس طرح لبنان کی خانہ جنگی کو بھڑکا کر اسرائیل اور اُس کی خفیہ انٹیلی جنس ایجنسی موساد نے اسے

اپنی گوریلا اور نفسیاتی جنگ کی قتل گاہ اور تجربہ گاہ بنالیا۔
یہی وہ سنہری وقت تھا جب موساد کے ایجنٹ، کنگ ساؤل بلیوارڈ، تل ابیب پر واقع اپنے ہیڈ کوارٹر سے دور، عملی میدان میں جاسوسی، قتل اور گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کررہے تھے۔

موساد کے ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ کے اندر ڈائریکٹر جنرل ہوفی اور اُس کے ڈپٹی کمشے کے درمیان تعلقات پھر کشیدہ ہورہے تھے۔ وہاں یہ افواہ گشت کررہی تھی کہ اوپریشنل معاملات کے سلسلے میں دونوں کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہوفی کو یہ بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کمشے اس کی ڈی جی کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف کمشے کو شکوہ تھا کہ اُس کی کارکردگی کو قدر کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور اس کی ستائش نہیں ہوتی۔

1980ء کے موسم بہار کی ایک صبح کو ہیڈ کوارٹر میں داخلے کے لئے لامحدود اختیارات والا وہ ''داخلہ کارڈ'' استعمال کیا جو پرانی دو چابیوں کے بدلے میں اُسے ملا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا اُسے بتایا گیا کہ ڈی جی ہوفی نے اُسے فوراً ملاقات کے لئے بلایا ہے۔
کمشے انہی پیروں پر برآمدے میں چلتا ہوا ڈائریکٹر جنرل کے دفتر تک پہنچا اور دروازے پر دستک دی، اندر داخل ہوا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔

اندر کیا گرما گرمی ہوئی، دونوں میں سے کوئی بھی بتانے کو تیار نہیں لیکن الزامات اور جوابی الزامات اور اونچی آواز میں بولنے کی کہانی اب تک ہیڈ کوارٹر میں گشت کر رہی ہے۔ یہ گرما گرمی تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی۔
پھر کمشے ڈی جی کے کمرے سے نکلا لیکن مہر بہ لب۔ موساد میں اُس کا کردار اختتام کو پہنچ چکا تھا لیکن اس کا جاسوسی اور انٹیلی جنس کا تجربہ ایک نئی شکل میں سامنے آنے والا تھا۔ مگر امریکہ میں ...... یہ نیوکلیئر میٹریل کی چوری تھی لیکن یہ وہ معاملہ تھا جس نے ایران گیٹ (Irangate) کے نام سے شہرت حاصل کی۔

ڈیوڈ کمشے نے کچھ عرصہ تک اپنے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کرنے کے بعد آخرکار وزارت خارجہ، اسرائیل میں ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ قبول کرلیا۔ یہ عہدہ اسے اپنی سوچ کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لئے بہترین عہدہ تھا۔ اس سے کمشے کو اپنی صلاحیت، تجربہ اور ذہانت کو صرف لبنان کی بجائے پوری دنیا میں آزمانے کا موقع مل گیا۔

اُدھر امریکہ میں صدر نکسن اور واٹر گیٹ (Watergate) سکینڈل کا ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ حالیہ امریکن ہسٹری میں صدر کینیڈی کے قتل کے بعد سی آئی اے کی بداعمالیوں کا اتنا بڑا اسکینڈل کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ نکسن کے دورِ حکومت میں امریکہ کی انٹیلی جنس ایجنسی اپنی غیر قانونی سرگرمیوں میں بے قابو ہوچکی تھی اور اس کے خلاف ہر نئے انکشاف کے بعد اس کی شہرت داغدار ہورہی تھی۔

کمشے نے اس ڈرامے کے ہر منظر کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صدر نکسن کو، اس کی تباہی کا باعث بننے والی ایسی ٹیپیں اپنے پاس ہرگز نہیں رکھنی چاہئیں تھیں۔ اگر یہ تباہ کن ٹیپیں نہ ہوتیں تو وہ آج بھی امریکہ کا صدر رہتا۔

کمشے کے اپنے گھر، اسرائیل، کے قریب، ایران میں جو واقعات ظہور پذیر ہورہے تھے، اُسے اُن میں گہری دلچسپی تھی کیونکہ وہ اسرائیل کے لئے باعث تشویش تھے۔ ایران میں (انقلاب کے بعد) خمینی اور اُس کے آیت اللہؤں کا کنٹرول نہایت محکم تھا اور امریکن سی آئی اے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ایران کے بارے میں صحیح اندازے قائم کرنے میں بُری طرح ناکام رہے تھے اور سی آئی اے کا مورال بہت گر گیا تھا۔
لیکن اب وائٹ ہاؤس (امریکن ایوان صدر) میں

ایک نیا صدر رونالڈ ریگن آ چکا تھا اور اُس نے سی آئی اے کو ایک نئی صبح کی امید دلا دی تھی۔ کمشے نے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ نئے صدر (ریگن) کی خارجہ پالیسی میں اب سی آئی اے بنیادی کردار ادا کرے گی۔ اب سی آئی اے کا نیا سربراہ ولیم کیسی تھا۔ کمشے نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کیسی کو اسرائیل سے کوئی ہمدردی نہ تھی لیکن ضرورت کے وقت اُسے اسرائیل کا ہمدرد بنایا جا سکتا تھا۔

اگلے دو سال تک کمشے نے سی آئی اے کے افغانستان اور سینٹرل امریکہ میں کیئے گئے آپریشن کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اس نے محسوس کیا امریکن ایجنسی جاسوسی کے وہی پرانے طور طریقے اپنائے ہوئے ہے جن میں کوئی نیا پن نہیں اور ان میں چند بے رحمانہ قتل بھی شامل ہیں۔

ایک دفعہ پھر کمشے کی توجہ ایران اور بیروت میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرف مبذول کرائی گئی۔

وزارتِ خارجہ میں کمشے کے اپنے فرائض منصبی سنبھالنے کے چند ماہ بعد ہی امریکہ کی خفیہ شہ پر اسرائیل نے ایران کو ہتھیار دینے شروع کر دیئے۔ اس کا مقصد بغداد کے حکمرانوں (صدام حکومت) کو کمزور کرنا تھا، جو یروشلم کی دیرینہ پالیسی تھی کہ پہلے اپنے دو دشمنوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کرو اور پھر باری باری دونوں سے نبٹو۔

تین سال بعد دو ایسے واقعات رُونما ہوئے جنہوں نے صورتِ حال بالکل تبدیل کر دی۔ بیروت میں ایک کار بم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں 241 امریکن بحریہ کے فوجی ہلاک ہو گئے۔ امریکہ میں اسرائیل کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانے لگا کہ موساد کو اس دھماکے کی، جس کی منصوبہ بندی ایران کی خفیہ ایجنسی نے کی تھی، پہلے سے خبر تھی لیکن اُس نے امریکہ کو آگاہ نہیں کیا۔ لہٰذا امریکہ کی طرف سے اسرائیل پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی روک دے۔ یہ شک وشبہ اور دباؤ اور بھی بڑھ گیا جب بیروت میں متعین سی آئی اے کے سٹیشن چیف ولیم بکلی (William Buckley) کو اغوا کے بعد تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی ایران کے حمایت یافتہ گروپوں نے سات مزید امریکی فوجی اغوا کر کے یرغمال بنا لئے۔

اس پر امریکہ میں ریگن حکومت کے خلاف سخت ردعمل سامنے لگا کیونکہ اس حکومت نے برسر اقتدار آتے وقت دہشت گردی کے خلاف سخت اقدامات کا اعلان کیا تھا۔ لہٰذا بیروت کے واقعہ کے بعد امریکن پبلک حکومت کی طرف سے زوردار ردعمل کا مطالبہ کر رہی تھی۔ انتقامی کارروائی کے لئے ریگن کا خیال تہران پر بم برسانے کا تھا لیکن اس کی اُس کے اپنے مشیروں اور سخت گیر معاونین نے بھی مخالفت کر دی۔ یرغمالیوں کی رہائی کے لئے ریسکیو آپریشن کی اُس کے ڈیلٹا فورس کے چیفس نے مشن کی ناکامی کے خطرے کے پیش نظر مخالفت کر دی۔

اسی دوران صدر ریگن کی اپنے سکیورٹی ایڈوائزر رابرٹ میک فرلان (Robert McFarlane) سے گفتگو ہوئی۔ کمشے کے مطابق بعد میں فرلان نے اس گفتگو کی بابت جو کچھ بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔

"جنابِ صدر! ایرانیوں کو کس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟"

"تم مجھے بتاؤ، باب"۔

"ہتھیار، تاکہ وہ عراق سے جنگ کر سکیں"۔

"سو ہم اُنہیں وہ کچھ دے دیتے ہیں جس کی انہیں ضرورت ہے، بدلے میں ہم اپنے بندے واپس لے لیتے ہیں"۔

کیسی (Casey) اور دوسروں کے مشورے کے برعکس ریگن اور فرلان کا نقطۂ نظر تھا ایران کو مسلح کرنے کے نتیجے میں نہ صرف ایرانی ملا بیروت میں اپنے گروپوں

پر امریکن یرغمالیوں کی رہائی کے لئے دباؤ ڈالیں گے بلکہ امریکن حکومت اور تہران کے درمیان تعلقات میں بہتری آئے گی اور اس پر مزید سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تہران میں ماسکو کی پوزیشن کمزور ہو گی لہٰذا بعد میں جو ''ایران گیٹ'' کے نام مشہور ہوا اس منصوبے کی بنیاد رکھ دی گئی۔

بحریہ کے کرنل اولیور نارتھ (Oliver North) کو ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی کا انچارج بنا دیا گیا۔ نارتھ اور فلران نیف یصلہ کیا کہ سی آئی اے کو اس منصوبے سے الگ رکھا جائے۔ دونوں آدمی عملی تجربے کے حامل تھے۔ دونوں نے ویتنام میں اپنی کامیاب حکمت عملی کی بنا پر نام کمایا تھا اور انہوں نے سن رکھا تھا کہ اسرائیلی بھی عملی کارروائیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ نارتھ کے اپنے الفاظ میں۔

''یہی وقت تھا کہ اسرائیل کو اعتماد میں لیا جائے''۔

نارتھ ایک پکا عیسائی تھا لہٰذا سرزمین مقدس کی یاترا اور حضرت مسیحؑ کے نشانات قدوم کی زیارت کی دیرینہ خواہش اس مشن کی وجہ سے پوری ہو رہی تھی۔

اسرائیل کے نئے وزیراعظم یزہاک شامیر (Yitzak Shamir) نے فیصلہ کیا کہ واشنگٹن کی طرف سے تعاون و مدد کی درخواست پر عمل درآمد کے ساتھ ساتھ اسرائیلی مفادات کے تحفظ کا فریضہ صرف ایک ہی شخص ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ 3 جولائی 1983ء کو ڈیوڈ کمشے ہوائی جہاز کے ذریعے میک فارلان سے ملاقات کے لئے وائٹ ہاؤس پہنچا۔ کمشے نے کہا کہ یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے میں ہتھیاروں کی فراہمی کی ڈیل (Deal) کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر اس میں سی آئی اے کو سرگرم کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اسے بتایا گیا کہ انٹیلی جنس ایجنسی اس مشن میں شامل نہیں ہے۔ جواب میں میک فرلان نے پوچھا کہ اس مشن میں

عجیب ایما

☆ہم قرآن پاک پر حلف سے تو فیصلے کرنا چاہتے ہیں مگر قرآن پاک کے حکم پر عمل سے فیصلے نہیں چاہتے۔

(حکیم محمود۔ساہیوال)

موساد کس حد تک ملوث ہو سکتی ہے۔ آخر کار اس نے بیان کیا۔ ''یہی لوگ تو ہیں جو دوسرے ملکوں میں تمہارے خفیہ کام کرتے ہیں''۔

کمشے نے اُسے بتایا کہ یزہاک رابن، وزیر دفاع اور وزیراعظم شامیر نے موساد کو اس میں ملوث نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور تمام ذمہ داری اسے سونپ دی ہے۔ میک فرلان نے کہا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کمشے نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت کے موساد کے سربراہ ناہوم ادمونی کا پہلے ہی سی آئی اے کے سربراہ کیسی سے تبادلہ خیال کے بعد اتفاق ہو چکا ہے کہ یرغمالیوں کے بدلے ہتھیاروں کی سپلائی کے سودے میں بہت زیادہ آپریشنل خطرات موجود ہیں۔

میک فرلان نے گاڑی پکڑی اور صدر ریگن کو، جو ریڑھ کی ہڈی کے آپریشن کے بعد صحت یاب ہو رہے تھے، کمشے کے خیالات سے آگاہ کرنے کے لئے باتھسڈا نیول ہسپتال (Bathesda Naval Hospital) پہنچا۔ صدر کا صرف ایک سوال تھا۔ ''کیا کمشے یہ یقین دہانی کرا سکتا ہے کہ اسرائیل اس ڈیل کو خفیہ رکھے گا۔ کیونکہ اس راز کا ذرا سا افشاء بھی اعتدال پسند عرب ملکوں سے امریکہ کے تعلقات بگاڑ سکتا ہے، جو پہلے ہی تہران کی سخت قسم کی رجعت پسندی سے خوفزدہ ہیں۔ کمشے کے مطابق میک فرلان نے صدر کو یقین دہانی کرائی کہ اسرائیل منہ بند رکھے گا۔ دو ہفتے بعد کمشے دوبارہ واشنگٹن میں موجود تھا۔ کھانے کی میز پر اس نے اپنا گیم پلان

(Game Plan) میک فرلان کے سامنے پیش کر دیا۔ کمشے کی اپنی یادداشت کے مطابق گفتگو کچھ اس طرح سے ہوئی تھی۔

"تم پہلے اچھی خبر سننا چاہتے ہو یا بُری خبر؟" کمشے نے میک فرلان سے پوچھا۔

"اچھی خبر۔"

"ہم اُسی راستے سے بحری کشتی کے ذریعے ہتھیار بھیج دیں گے جس راستے کو پہلے بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔"

میک فرلان نے کہا۔ "نو پرابلم"۔

کمشے کا طریقہ کار یہ تھا کہ امریکہ کا ایران کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ قائم نہ ہوتا کہ انتظامیہ نے دہشت گردی کے خلاف جو سخت مؤقف قائم کر رکھا تھا اُس پر اثر نہ پڑے۔ امریکہ نے ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی پر جو پابندیاں لگا رکھی تھیں وہ بھی قائم رہیں اور جب یرغمالی رہا ہوں تو یہ نہ ظاہر ہو کہ انہیں اسلحے کے بدلے میں چھوڑا گیا ہے۔

"اور بُری خبر؟" میک فرلان نے فوراً پوچھا۔

کمشے نے بتایا کہ تہران میں موجود اس کے اپنے ذرائع نے بتایا ہے کہ انہیں اس بات میں شک ہے کہ تہران کے ملا بیروت میں یرغمالیوں کی رہائی میں کوئی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

"وہاں کے بنیاد پرست تہران کے کنٹرول سے باہر ہو رہے ہیں"۔ کمشے نے اپنے میزبان کو بتایا۔

اگر میک فرلان مایوس ہوا تھا تو اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اگلے روز صدر کو، جو صحت یاب ہو کر اپنے اوول آفس میں واپس آ چکے، ان کے وزیر خارجہ جارج شولز نے بتایا کہ اس ڈیل میں شدید خطرات ہیں۔ فرض کیا ایرانی ہتھیار بھی لے لیتے ہیں اور پھر "شیطانِ اعظم" جیسا کہ ملاؤں نے امریکہ کا نام رکھا ہوا تھا، کو ہراساں کرنے کے لئے سودے کا انشاء بھی کر دیتے ہیں تو اس سے عراق مزید روسی کیمپ میں نہیں چلا جائے گا؟ اور یرغمالیوں کا کیا بنے گا؟ اُن کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ تمام صبح اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے تک ریگن بالکل تھک چکا تھا کہ اچانک صدر نے اس تجویز کی منظوری دے دی کہ اسرائیل جو ہتھیار ایران کو فروخت کرے گا امریکہ ان کا تبادل اپنے پاس سے مہیا کر دے گا۔ کمشے ایک دفعہ پھر ہری جھنڈی لئے گھر لوٹا۔ تاہم شامیر نے پھر اس بات پر زور دیا کہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں تا کہ کوئی بھی مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں وہ اپنے ملوث ہونے سے صاف انکار کر سکے۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کمشے نے اس ڈرامے کے لئے مختلف کرداروں کا انتخاب شروع کر دیا۔ ان میں پہلا تو تھا پٹرول کی آمدنی بناء ارب پتی سعودی عدنان خشوگی، جسے نہانے کے تالاب کے کنارے بیٹھ کر مچھلی کا اچار کھانے اور رسالوں کے کور کی زینت بننے والی لڑکیوں کو تاڑنے کی عادت تھی۔ دوسرا تھا منوچہر جہانگیر، جو شاہِ ایران کے وقت کی بدنام زمانہ خفیہ پولیس ساواک (Savak) کا ایجنٹ تھا جس کا طرز عمل اور رویہ اب بھی جاسوسوں جیسا ہی تھا کیونکہ وہ اپنے میل ملاپ والوں کو رات کے پچھلے پہر کا وقت دیا کرتا تھا۔ تیسرا کردار یاکوف نمرودی تھا جو اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی امان کا انچارج اور شاہ کے دورِ حکومت میں تہران میں اسرائیلی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی رہا تھا۔ اس کے ساتھ اسرائیلی ائر کرافٹ انڈسٹری کا خاموش طبع بانی الشویمر بھی شامل تھا۔

خشوگی نے اس ڈیل کا آغاز اپنی طرف سے اس طرح کیا کہ مختلف کمپنیوں کا ایک کنسورشیم (Consortium) بنایا اور امریکہ کو اس سودابازی

سے بری الذمہ قرار دیا۔ دوسری طرف نمونے اور سپیسفیکیشن (Specification) کے مطابق نہ ہونے اور ایران کی طرف سے قبول نہ کئے جانے کی صورت میں ایرانی مفادات کے تحفظ کی ضمانت دی۔ امریکن پیسے کی مدد سے خریدے گئے تمام ہتھیاروں پر کنسورشیم دس فیصد کمیشن حاصل کرے گا۔ اس کے علاوہ کنسورشیم ایران اور امریکہ کے درمیان کسی تنازعہ کی صورت میں وچولے کا کردار ادا کرے گا۔

ہر فریق نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ کنسورشیم سیاسی جھمیلوں سے الگ، صرف نفع کمانے کے لئے تجارتی بنیادوں پر کام کرے گا۔

اگست 1985ء کے اختتام پر ہتھیاروں سے لدا ہوا پہلا اسرائیلی جہاز تہران کے ہوائی اڈے پر اترا۔ 14 ستمبر کو ایک امریکی یرغمالی، پادری، بنجمن ویر (Benjmin Weir) کو بیروت میں آزاد کر دیا گیا۔ جیسے ہی حالات و واقعات میں تیزی آئی کچھ اور کھلاڑی بھی کنسورشیم میں شامل ہونے لگے۔ ان میں سی آئی اے کا ایک سابق افسر مائلز کوپلینڈ بھی شامل تھا جس نے شاہ کے زوال کے وقت اور ایران کے اسلامی جمہوریہ بننے سے پہلے تہران کے بازاروں میں سو سو ڈالر کے نوٹ ان لوگوں میں لٹائے تھے جو "شاہ زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ کچھ دیگر گمنام لوگ بھی کنسورشیم میں شامل ہوئے جن میں سے ایک سپیشل ائرفورس سروسز کا سابقہ افسر بھی تھا جو لندن میں اپنی کمپنی چلا رہا تھا اور جس نے کسی وقت موساد کو کچھ خصوصی خدمات پیش کی تھیں۔ اسی دوران اسرائیل اور واشنگٹن میں پالیسی سازوں نے کسی دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا چنانچہ آپریشن ختم کر دیا گیا۔

مجموعی طور پر ایران کو 126 امریکی ٹینک، لبنان سے پکڑے گئے دو لاکھ کاتیاشا (Katyasha) راکٹ، دس ہزار ٹن توپوں کے گولے، تین ہزار فضا سے فضا میں نشانہ لگانے والے میزائل، چار ہزار رائفلیں اور تقریباً مختلف سائز کی پانچ کروڑ گولیاں۔

برازیل کے آری زونا میں واقع ماراما ائرفورس بیس سے دو ہزار "ٹو" (TOW) میزائل گوئٹے مالا پہنچائے گئے جہاں سے انہیں ہزاروں میل دور تل ابیب پہنچایا جانا تھا۔ پولینڈ اور بلغاریہ سے آٹھ ہزار زمین سے فضا میں مار کرنے والے سام-7 میزائل بحری کشتیوں سے بھیجے گئے۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ AK-47 رائفلیں بھجوائی گئیں۔ چین نے بھی سینکڑوں کی تعداد میں "سلک ورم" سمندر سے سمندر میں مار کرنے والے میزائل مہیا کئے۔ اس کے علاوہ اس نے بکتر بند گاڑیاں اور بڑے فوجی ٹرک دیئے۔ سویڈن نے 105 ایم ایم کے توپوں کے گولے اور بلجیم نے فضا سے فضا میں مار کرنے والے میزائل مہیا کئے۔ بحری کشتیوں سے جہاں سے بھی اور جس قدر اسلحہ بھیجا گیا اس کے ساتھ یہ سرٹیفکیٹ موجود ہوتا تھا کہ "یہ اسلحہ صرف اسرائیل کے استعمال کے لئے ہے"۔

اسرائیل کے ناغیو صحرا (Negev Desert) میں قائم شدہ آئی ڈی ایف ملٹری چھاؤنی سے یہ اسلحہ کنسورشیم والے اپنے چارٹرڈ ٹرانسپورٹ طیاروں کے ذریعے ایران پہنچا دیتے تھے۔ کنسورشیم ہر پھیرے کے بار برداری کے اخراجات وصول کرتا تھا جو ایرانی اپنے سوئٹزرلینڈ میں موجود خفیہ اکاؤنٹ سے ادا کرتے تھے۔ یہ رقم کل 70 لاکھ ڈالر بن گئی تھی۔ اسرائیل کو اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا بلکہ وہ اس بات پر خوش تھا کہ عراقیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو قتل کرنے کے سلسلے میں ایران کی صلاحیت اور طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان جنگ طویل ہو رہی ہے۔ ڈیوڈ کمشے اسی بات پر پھولا نہیں سما رہا تھا کہ اس کی ترتیب دی ہوئی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔

لیکن اب کمشے کی چھٹی حس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کی انتہائی محنت اور احتیاط سے ترتیب ہوئی پالیسی قابو سے باہر ہونے جا رہی ہے کیونکہ کنسورشیم میں شامل کچھ غلط کار لوگوں نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی ہے۔

معاملات کو سنبھالنے کے لئے کمشے نے ایک دفعہ اسرائیل کی حقیقی سیاسی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اسرائیل دراصل اس لئے اس معاملے میں امریکہ کی مدد کر رہا تھا کہ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ واشنگٹن کی حمایت اور سرپرستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسرائیل دنیا کی نظروں میں دھول جھونک کر خفیہ طور پر ایسے بڑے آپریشن بھی کر سکتا ہے۔

لیکن یرغمالیوں کے بدلے میں ہتھیار آپریشن جیسے طوالت پکڑتا جا رہا تھا، اتنے ہی اس آپریشن کے افشاء کے خطرات بڑھتے جا رہے تھے۔ چنانچہ دسمبر 1985ء میں اس نے کنسورشیم کو بتا دیا کہ وہ ان سے مزید تعاون کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کیونکہ اس پر وزارت خارجہ کی ذمہ داریوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔

کنسورشیم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تل ابیب کے ایک ہوٹل میں اُسے الوداعی عشائیہ دیا اور اسے بتایا کہ اس کا قائم مقام پیریز کے دہشت گردی کے مشیر امیرام نیر (Amiram Nir) کو بنایا جا رہا ہے۔

بعدازاں کمشے نے اعتراف کیا کہ اس وقت یرغمالیوں کے بدلے ہتھیار کا آپریشن تیزی سے خود اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے تباہی کے دہانے پر جو شخص پہنچا سکتا تھا، وہ نیر تھا۔

نیر (Nir) ایک سابقہ صحافی تھا اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ حقیقی جاسوسی کو بھی جیمز بانڈز کی فلموں جیسی ہی کوئی چیز سمجھتا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ ایک صحافی بھی ایک اچھا جاسوس ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی کمزوریوں کے بارے میں موساد کے کارندوں سے تبادلۂ خیال شروع کر دیا اور موساد والوں نے سوچا کہ ایک صحافی کو بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے (حالانکہ ابتدا سے ہی موساد کو اس سارے آپریشن سے باہر رکھا گیا تھا)۔

اپریل 1999ء میں کمشے نے بتایا کہ مشرق وسطیٰ کی سیاسی صورت حال کے بارے میں وہ اب بھی باخبر رہتا ہے۔ یاسر عرفات، جسے قتل کرنے کے لئے میں منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔

"کیونکہ وہ میرا خونی دشمن تھا اور اس کی موت، اسرائیل کے لئے ایک عظیم فتح کی علامت ہوتی"۔

لیکن اب کمشے کے خیال میں "یاسر عرفات امن کے لئے مڈل ایسٹ میں اسرائیل کی آخری امید ہے"۔

"اگرچہ میری نظر میں یاسر عرفات اب بھی بہترین ہمسایہ نہیں لیکن فلسطین کا وہ واحد لیڈر ہے جو اپنے لوگوں میں اپنی مقبولیت کھوئے بغیر اسرائیل کو کچھ رعایتیں دے سکتا ہے"۔ (یہ تحریر یاسر عرفات کی وفات سے پہلے کی ہے)

کمشے نے اب یاسر عرفات کے خیالات کے ساتھ ہم آہنگی کی ایک بنیاد تلاش کر لی ہے یعنی فلسطین کی تحریک آزادی کے رہنما نے بھی اس خطرے کا احساس کر لیا ہے جسے کمشے نے ربع صدی قبل بھانپ لیا تھا یعنی کہ "نئی صدی کو حقیقی خطرہ اسلامی بنیاد پرستی سے ہے"۔

اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھ کر باہر اپنے باغیچے کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں پودوں پر پھل آ رہا ہے، کمشے نے متوازن اور جچے تلے الفاظ میں کہا۔

"میں اپنے پرانے دشمنوں کو، جو دہائیوں پہلے مرے ہم وطنوں کے قتل کا حکم دیتے رہے ہیں، معاف نہیں کر سکتا لیکن عرفات کی اہمیت سے انکار بھی ناقابل معافی ہے، اسرائیل اس کے تعاون سے خون خرابے کا خاتمہ کر سکتا ہے"۔

(جاری ہے)

پُراسرار بندے

اللہ کے دوستوں کے ایمان افروز واقعات

☆------------------------0301-4845557------------------- حبیب اشرف صبوحی

اس جہانِ آب وگل میں بہت سی ایسی مخفی قوتیں ہیں جو خاموشی سے اپنا کام انجام دیئے جاتی ہیں اور ان کے گرد و پیش بسنے والوں کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ایسا کیسے اور کیوں کر ہوا؟

قرآن پاک میں اس کی مثال سورۃ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعات میں ملتی ہے۔ خود حضرت موسیٰؑ کو پتہ نہ تھا کہ حضرت خضرؑ ایسا کیوں کر رہے ہیں لیکن خضر علیہ السلام کیونکہ مامور من اللہ تھے لہٰذا وہ ایک فرض ادا کئے جا رہے تھے۔

تاہم بعض اوقات ان ہستیوں سے آمنا سامنا بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کو بھی ایسے "پُراسرار بندوں" کا مشاہدہ ضرور کرایا گیا ہوگا۔ علامہ نے خود ایک نظم میں بیان کیا ہے

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اپنی ایک طویل نظم میں بھی اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے

اور یہ بھی احسانِ ربی ہے کہ مجھے بھی کچھ ایسی شخصیات سے شرف ملاقات حاصل ہوئی ہے جس کا ذکر کر کے مجھے خود حیرت اور خوشی ہوتی ہے اور جن کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

☆......میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں میرا تبادلہ پشاور کر دیا گیا اور کہا کہ صرف چھ ماہ کے بعد واپس لاہور بلا لیا جائے گا۔ 2 سال کا عرصہ گزر گیا لیکن تبادلہ نہ ہوا۔ بے شمار درخواستیں بھی دیں اور سفارشیں بھی کروائیں۔ ایک روز میں اس ادارے سے پشاور سے لاہور کے لئے روانہ ہوا کہ اعلیٰ آفیسر سے مل کر اُن سے تبدالہ کی درخواست پیش کراؤں گا اور اگر انہوں نے میری درخواست نہ مانی تو استعفیٰ دے دوں گا۔

جب لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ آفیسر جن

سے میں ملنے آیا تھا، سرکاری دورے پر کراچی گئے ہوئے ہیں، ایک ہفتہ بعد آئیں گے۔ میں بہت دل برداشتہ ہوا اور سوچا کہ پشاور جا کر استعفیٰ پیش کر دوں گا۔ انہی پریشان حالات میں رات کو عشاء کی نماز محلے کی مسجد میں ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں مسجد کے امام صاحب سے ملا اور اپنی پریشانی بتائی اور درخواست کی کہ میرے لئے دعا کرائیں کہ میرا تبادلہ لاہور ہو جائے۔ مسجد کے امام صاحب ایک اللہ والے آدمی تھے۔ ہمیشہ سفید کپڑے پہنتے تھے۔ بہت مختصر گفتگو کرتے تھے اور جب مسجد سے باہر جاتے تو اپنے چہرہ اور سر پر ایک بڑا رومال ڈال لیا کرتے تھے کہ کہیں ان کی نظر کسی غیر محرم پر نہ پڑ جائے۔ حافظ قرآن تھے اور ہر سال رمضان کے مہینے تراویح سناتے تھے۔ جب میں نے اپنی پریشانی اُن کو بتائی تو کہنے لگے کہ صبح فجر کی نماز کے بعد ملیں۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔

صبح میں فجر کی نماز کے بعد اُن سے ملا۔ کہنے لگے کہ اگلے ہفتہ تم ان شاء اللہ لاہور بیٹھے ہو گے۔ میں نے کہا۔ جناب یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ کہنے لگے اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ پشاور کے لئے ٹوٹے دل کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میرے پشاور پہنچنے کے چار روز بعد میری ٹرانسفر کے احکامات معجزاتی طور پر آ گئے۔ جس کا مجھے یقین بھی نہیں آتا تھا اور میں ایک ہفتہ کے اندر لاہور پہنچ گیا۔ میں نے آ کر سب سے پہلے مولانا صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ ایک ہفتہ میں میرا تبادلہ ہو جائے گا۔ کہنے لگے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے آپ کی پریشانی کو دور کرنے کی دُعا کی تھی، اس نے قبول کر لی۔ میں اللہ کے اس بندے کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

☆...... چالیس سال ملازمت کے دوران بے شمار اچھے اور بُرے افسروں سے واسطہ پڑا۔ ایک افسر ایسا بھی آیا جس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ اس کا رویہ صرف میرے ساتھ ہی بُرا نہیں تھا بلکہ وہ ہر شخص کو تنگ کرتا تھا۔ اس کے شر سے بچنے کے لئے میں نے کوئی وظیفہ نہیں چھوڑا نہ کوئی دعا لیکن کسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ میرا ایک ایک دن بڑی مشکل سے گزرتا تھا۔ میں نے اپنی اس پریشانی کا ذکر اپنے ایک بہت کرم فرما دوست ڈاکٹر اصغر صاحب سے کیا انہوں نے کہا کہ میرے ایک ملنے والے ہیں جو بہت اللہ والے ہیں، ہفتہ میں ایک روز لوگوں کے مسائل سنتے ہیں۔ جمعرات کی صبح دس بجے سے ظہر تک بیٹھتے ہیں اور خواتین کے مسائل سنتے ہیں اور رات کو 3 بجے سے فجر کی نماز تک مردوں سے ملتے ہیں۔ میں ایک خط اُن کے نام لکھ دیتا ہوں آپ اپنی بیگم کو خواتین میں بھیج دیں جب اُن کی باری آئے تو اُن کو یہ خط دے دیں۔ مقررہ دن میری بیگم اُن سے ملیں اور میرا مسئلہ بتایا۔ انہوں نے بات سن کر کہا کہ صبر کریں اللہ بہتر کر دے گا۔

یہ سن کر میری بیگم واپس آ گئیں۔ میں بہت مایوس ہوا میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کوئی وظیفہ پڑھنے کے لئے دیں گے یا کوئی تعویذ وغیرہ لیکن انہوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ ہم نے ان بزرگوں کو کوئی نیاز یا نذرانہ پیش نہیں کیا۔ اس لئے اُن کا رویہ اتنا سرد تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا اور بتایا کہ بزرگوار نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شاید ہم نے ان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ کوئی نیاز یا نذر وغیرہ قبول نہیں کرتے، فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ لوگ ایک دفعہ اور جائیں اور میرا خط ایک بار پھر پیش کریں۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد میری بیگم دوبارہ اُن کے پاس حاضر ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خط پیش کیا اور اپنی پریشانی بیان کی۔

انہوں نے دوبارہ وہی الفاظ استعمال کئے۔ ”صبر کریں اللہ بہتر کرے گا“۔ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا

تھا۔ ہم پھر مایوس ہوئیں اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر اصغر صاحب سے کہا کہ مجھے بھی اور آپ کو رات کالی کرنی پڑے گی۔ ایک روز رات کو اُن سے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہامی بھر لی۔ ایک رات میں اور ڈاکٹر صاحب اُن سے ملنے اُن کی مقررہ جگہ پر پہنچے جو ایک دُکان تھی۔ اُس میں سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور سائلین اُن کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ہم بھی دُکان کے باہر کھڑے ہو کر بزرگوار کا انتظار کرنے لگے۔ بعد میں اُن کا نام چشتی صاحب معلوم ہوا۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ ایک دراز قد صاحب قراقلی ٹوپی پہنے لڑکوں کے جھرمٹ میں آ رہے ہیں۔ لوگوں کے مسائل سنتے آ رہے ہیں اور اُن کو فارغ کرتے جا رہے ہیں۔ جب وہ دُکان پر پہنچے تو تمام لوگ اُن کے استقبال کے لئے باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملائے اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے وہ خصوصی طور پر گلے ملے اور اُن کے لئے چائے منگوائی۔ ہر شخص سے انہوں نے کہا کہ اپنے مسائل مختصر الفاظ میں بتائیں تاکہ میں سب کو جلد از جلد فارغ کر دوں۔ جب ہم لوگ چائے پی چکے تو انہوں نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ اپنے افسر کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی دو دفعہ آپ کے پاس آ چکی ہیں۔ چشتی صاحب نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب آج آپ آ گئے ہیں، اپنے دوست سے کہیں کہ صرف ایک ہفتہ انتظار کریں۔ اگر اُس کے بعد بھی ان کی تسلی نہ ہو تو پھر میرے پاس آئیں۔ ہم چشتی صاحب کا شکریہ ادا کر کے آ گئے۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ ایک ہفتہ بعد یا میرا تبادلہ ہو گا یا متعلقہ افسر کا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ایک ہفتہ بعد اُس افسر نے صبح ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ کل صبح 8 بجے مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ تم صبح 7 بجے میرے گھر آ جانا اور مجھے ائیر پورٹ چھوڑ دینا۔ دوسرے روز جب ڈرائیور صبح 7 بجے افسر کے گھر گیا تو کافی لوگ کھڑے تھے۔ پوچھنے پر اُسے بتایا گیا کہ رات کو 2 بجے اُن کو ہارٹ اٹیک ہوا اور 3 بجے انتقال ہو گیا۔ یہ اُن کو پہلا اٹیک تھا اور اس سے پہلے ان کو کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی بیماری کی دوا کھاتے تھے۔ عمر بھی پچاس سال سے کم تھی۔ ڈرائیور نے آ کر دفتر اطلاع کی۔ ظہر کی نماز کے بعد تدفین ہو گئی۔

اگلے ہفتہ ہم چشتی صاحب سے ملے۔ چشتی صاحب کہنے لگے۔ آپ کا مسئلہ حل ہو گیا؟ ہم نے کہا۔ جناب مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن اُس مسئلہ کا حل اس طرح نہیں ہونا چاہئے تھا۔ چشتی صاحب نے صرف اتنا جملہ کہا۔ ’’میں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا‘‘۔

☆......میرے بڑے بھائی کی گاڑی جو ایک ہفتہ قبل بالکل نئی خریدی تھی، چوری ہو گئی۔ میں چشتی صاحب کے پاس گیا اور دعا کی درخواست کی۔ کہنے لگے۔ ایک ہفتہ کے اندر گاڑی صحیح حالت میں مل جائے گی۔ ایک ہفتہ بعد بڑے بھائی اپنے دوست کی گاڑی میں کسی عزیز کی عیادت کے لئے ہسپتال پہنچے۔ جب اُن کے دوست نے ہسپتال میں گاڑی پارک کی تو بھائی صاحب نے دیکھا کہ اُن کی گاڑی وہاں کھڑی ہے۔ انہوں نے فوری طور پر گاڑی کے دونوں پہیے پنکچر کئے۔ گھر جا کر گاڑی کی چابیاں لیں اور پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ کرائی۔ وہاں سے پولیس والوں کو ساتھ لیا، گاڑی کے ٹائر تبدیل کئے اور گاڑی چلا کر گھر لے آئے۔ اُن کی جو چیزیں گاڑی میں پڑی تھیں وہ جوں کی توں تھیں۔ کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

☆......ہمارے ادارے کا فیلڈ کیمپ آفس کبیر والہ میں لگا۔ وہاں نزدیک ترین شہر خانیوال تھا۔ میں اور میرا ایک ساتھی خانیوال شہر آئے تاکہ ہم کسی ایسے دکاندار سے رابطہ کر لیں جو ہر ماہ دفتر کی صفائی کے لئے کثیر تعداد

صابن، فینائل، وِم، ڈسٹر اور دیگر اشیاء کریڈٹ کی بنیاد پر ہمیں سپلائی کرے۔ ہم اس شہر میں بالکل انجان تھے اور پہلی دفعہ آئے تھے۔ ہم مارکیٹ میں مختلف دُکانیں دیکھتے جا رہے تھے کہ ہمیں ایک دُکان پر ضرورت سے زیادہ سجاوٹ دکھائی دی۔ دُکان کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے سجایا گیا تھا اور مختلف درود شریف کے فریم بھی لگے ہوئے تھے۔ دُکان کا نام بھی بہت پُرکشش تھا اور بہت صاف ستھری دُکان تھی۔ ہم نے اُس دُکان میں جانے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی ہم دُکان میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے باریش بزرگ کھڑے ہو گئے۔ ہمیں خوش آمدید کہا اور پُرتپاک طریقے سے ملے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کاروباری انداز ہے لیکن اچھا انداز ہے۔ اُن بزرگ نے ہمیں بٹھا کر سب سے پہلے ملازم کو کہا کہ ان کے لئے آم کا شیک لے کر آؤ۔ ہم نے اُن کو منع کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کی خاطر کرنا اوّلین سنت ہے۔ وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ آپ لاہور سے کب تشریف لائے؟ میں بڑا حیران ہوا کہ اُن کو کیسے پتہ چلا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔ اُس کے بعد انہوں نے اپنے کلام کا سلسلہ شروع کیا تو میں کافی دیر تک سحرزدہ ہو گیا کہ انہوں نے میرے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا کہ میں حیران رہ گیا۔ بعض باتیں روحانیت کے متعلق ایسی کہیں کہ ان باتوں کا علم میرے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ مثلاً دو تین خواب بتائے جو میں نے کسی کو نہیں بتائے تھے۔ اس کے علاوہ میرے ورد میں کیا کیا چیزیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اُن سے کہا کہ ان تمام چیزوں کا علم آپ کو کیسے ہو گیا ہے۔ کہنے لگے یہ سب چیزیں آپ کے چہرے پر لکھی ہوئی ہیں۔ میرے ساتھ میرے ایک اسسٹنٹ تھے جو باریش تھے۔ میں نے کہا کہ ان کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو دنیادار آدمی ہوں یہ تو بڑے شرعی شخصیت کے مالک ہیں۔ کہنے لگے ان کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ ہم نے اُن کو اپنے آنے کا مقصد بتایا اور کہا کہ ہمیں اپنے کیمپ کے لئے کثیر تعداد میں چیزیں چاہئیں، اور "کریڈٹ" پر۔ پیسے پندرہ روز بعد چیک کی صورت میں ملیں گے۔ کہنے لگے مجھے منظور ہے۔ جہاں تک قیمتوں کا تعلق ہے۔ ہر چیز کی قیمت اُس پر لکھی ہوئی ہے اور ہمارے پاس منظور شدہ "پرائس لسٹ" بھی ہے ان شاء اللہ ریٹ مناسب ہوں گے۔ جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے میرے پیسے کہیں نہیں جاتے۔ جتنا سامان لینا ہے لے جائیے۔ ہم نے اُن سے کئی ہزار کا سامان خریدا اور انہوں نے بغیر کسی ضمانت کے سامان دے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم نے چیک اُن کو دے دیا اور جب تک ہمارا کیمپ کبیر والہ میں رہا اُن سے سامان لیتے رہے۔ اس "پُراسرار بندے" کو میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

☆......میرے بیٹے کی ملازمت چھوٹ گئی تھی اور تقریباً آٹھ ماہ سے بے روزگار تھا۔ اس دوران بے شمار وظائف پڑھے اور جس نے جو کہا وہ عمل کیا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کسی نے ایک باباجی کا پتہ بتایا۔ اُن کے پاس گئے اور اپنا مسئلہ بتایا۔ انہوں نے عشاء کے بعد پڑھنے کے لئے ایک ورد دیا اور کہا کہ چالیس روز پڑھیں، اس کے بعد آئیں۔ یہ ورد کرنے کے بعد ہم اُن کے پاس پہنچے اور کہا کہ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے۔ ہم نے آپ کا دیا ہوا ورد مکمل کر لیا ہے۔ کہنے لگے۔ "آپ امتحان دینے کے بعد رزلٹ کا انتظار کرتے ہیں یا نہیں"۔ ہم نے کہا۔ بالکل ہم انتظار کرتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "آپ کے پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں، ان شاء اللہ رزلٹ بہت جلدی آنے والا ہے اور بہت اچھا ہو گا"۔

ایک ہفتہ بعد بچے کو ملازمت مل گئی۔ اُس نے ایک سال پہلے ایک کمپنی میں انٹرویو دیا تھا اور اُس کو بھول گیا تھا۔ وہاں سے ملازمت کا پروانہ آ گیا۔ ہم نے

شکرانے کے نفل ادا کئے اور بابا جی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں۔

☆......ملازمت کے دوران ایک جنرل منیجر کے ساتھ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں دفتر سے باہر جانا تھا مقررہ تاریخ اور وقت پر جب میں اُن کے دفتر گیا تو اُن کے سیکرٹری حامد صاحب نے کہا کہ صاحب ایک بڑی ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔ آپ کے لئے یہ پیغام ہے کہ آپ یہیں پر بیٹھے رہیں۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ آپ کے ساتھ چلیں گے۔ میں اُن کے سیکرٹری صاحب کے پاس بیٹھ گیا اور اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔ اُن کے سیکرٹری صاحب نے میرے لئے چائے منگوائی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ میرا تبادلہ فیصل آباد سے ایک ہفتہ قبل ہوا ہے اب میں لاہور مستقل آ گیا ہوں۔ انہوں نے دوبارہ میرا نام پوچھا اور ایک کاغذ پر لکھ لیا۔

کچھ دیر بعد حامد صاحب نے کہا کہ چار کا ہندسہ آپ کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے اور آپ کے لئے بڑا مبارک ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے پتہ نہیں ہے آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کہنے لگے کہ آپ کے نام کے چار اعداد ہیں۔ آپ کی بیگم کے نام کے بھی چار اعداد ہیں۔ آپ بھی چوتھے مہینے پیدا ہوئے ہیں اور آپ کی بیگم بھی۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اُس کے بعد انہوں نے ایک لمبی لسٹ چار کے اعداد کے بارے میں بتائی۔ کہنے لگے آپ کے گھر کے نمبر میں بھی چار ہے۔ آپ کے فون نمبر میں بھی چار ہے۔ آپ کے موبائل میں بھی چار ہے۔ آپ کے بنک اکاؤنٹ میں چار ہے۔ آپ کی شادی چار تاریخ کو ہوئی ہے۔ آپ کا بیٹا چار تاریخ کو پیدا ہوا۔ آپ کی گاڑی نمبر میں چار۔ آپ کی موٹر سائیکل نمبر میں چار ہے۔ آپ کی بیوی بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر اور آپ بھی بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار چیزیں بتائیں جس میں چار آتا تھا۔ (اس سلسلے میں مَیں نے ایک طویل مضمون ''چار کا ہندسہ'' لکھا ہے جو ''حکایت'' میں شائع ہو چکا ہے)

انہوں نے ایک سال قبل ہی مجھے حج کی سعادت کی خوشخبری سنائی تھی۔ اس پر میں نے اُن سے کہا تھا کہ نہ میں نے حج کے لئے درخواست دی ہے اور نہ میرے مالی وسائل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب بلاوا آ جائے تو تمام چیزیں آسان ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام تفصیلات میں نے اپنے مضمون ''حج وعمرہ بلاوا خداوندی'' میں لکھی ہیں۔ اس ''پراسرار بندے'' کو میں اکثر یاد کرتا ہوں۔

☆......میں ملازمت کے سلسلے میں شیخوپورہ بھی رہا ہوں۔ ایک روز چھٹی کے عہد میں بس سٹینڈ پر لاہور کی ویگن کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک ملنگ بابا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اللہ کے نام پر کچھ دو۔ میں نے کہا۔ بابا جی معاف کرو، پیسے نہیں ہیں اور ویسے بھی آخیر مہینہ ہے۔ بابا جی کہنے لگے کہ تمہاری جیب میں اتنے پیسے ہیں۔ میں نے کہا۔ بابا جی یہ جو پیسے ہیں یہ لاہور تک کا کرایہ ہے۔ یہ پیسے میں آپ کو دے دوں گا تو لاہور تک کیسے جاؤں گا اور میرا یہاں کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔ بابا جی کہنے لگے کہ لاہور جانے کی فکر نہ کرو اس کا انتظام میں کروا دوں گا۔ بس تم پیسے مجھے دے دو۔ بابا جی نے جس انداز میں کہا اور جس طریقہ سے میری جیب میں پیسوں کی صحیح تعداد بتائی تو میں اُس سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے سارے پیسے اُسے دے دیئے۔ اب میں سوچنے لگا کہ اگر لاہور جانے کا انتظام نہ ہوا تو اس صورت میں مجھے دفتر جانا پڑے گا یا کسی دکاندار سے پیسے ادھار مانگنے پڑیں گے۔

میں نے تقریباً دس منٹ انتظار کیا۔ اتنے میں ایک گاڑی میرے سامنے سے گزری اور تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی اور وہاں سے وہ ریورس ہوئی اور میرے پاس آ کر

کھڑی ہوگئی۔ دیکھا تو وہ ہماری کمپنی کا ایک ٹھیکیدار تھا۔ کہنے لگا۔ تشریف لائیں، میں لاہور جا رہا ہوں جہاں کہیں کے آپ کو چھوڑ دوں گا۔ جب میں اُس کی گاڑی میں بیٹھ گیا تو میں نے اُسے باباجی والی بات بتائی اور اُس کی پیشین گوئی کا ذکر کیا کہ باباجی نے کہا تھا کہ تمہاری جیب میں جتنے پیسے ہیں دے دو، لاہور جانے کا انتظام میں کروا دوں گا۔ آپ آ گئے تو میرا لاہور جانے کا انتظام ہو گیا۔ ٹھیکیدار صاحب کہنے لگے واقعی یہ انتظام باباجی نے کروایا ہے۔ میں لاہور دوسرے راستے سے جا رہا تھا۔ وہاں سڑک کسی وجہ سے بند تھی۔ میں نے سوچا ادھر دیر لگے گی چلو دوسری طرف سے چلتے ہیں۔ ادھر سے آپ کو لینا تھا اللہ کے حکم سے باباجی کی روحانیت کام کر گئی۔

☆......نومبر 2003ء میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر کراچی گیا۔ کراچی میں کچھ دنوں کے قیام کے بعد میں نے وہاں اپنے دفتر فون کیا۔ اُس دفتر کا انچارج میرا دوست تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں یہاں ایک ماہ کی چھٹی گزارنے آیا ہوں۔ کوئی دفتر کی نئی تازہ خبر سناؤ۔ وہ کہنے لگا کہ جو میں خبر تمہیں سنانے لگا ہوں اُسے سن کر تمہارے پاؤں تلے کی زمین نکل جائے گی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا خبر ہے جلد بتاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ ہماری کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے ایک خط تمام افسران کو لکھا ہے اور کہا ہے کہ ایسے تمام آفیسر جن کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے اور 30 سال سے زیادہ ملازمت ہو گئی ہے۔ اُن کی خدمات کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ وہ 31 دسمبر 2003ء تک استعفیٰ دے دیں ورنہ ہم اُن کو فلاں رولز کے تحت نکال دیں گے اور ہاں اگر کوئی آفیسر استعفیٰ دیتا ہے اور مینجنگ ڈائریکٹر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آفیسر کمپنی کے لائق ہے تو اُس کا استعفیٰ نامنظور ہو جائے گا۔ میں یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوا کیونکہ میری ملازمت ابھی تقریباً آٹھ سال بقایا تھے اور بہت سی ذمہ داریاں بھی سر پر موجود تھیں۔ دوسرے روز میں آفس گیا، دو صفحے کا خط تھا۔ تفصیلی پڑھا جس کو پڑھ کر پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ایک ہمارے ساتھی نے اُسی روز استعفیٰ دے دیا۔ حالانکہ اُس کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور

صفا

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو!
صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالہ لبِ آبجو!
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی، ایک مری آرزو!
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و پرویز!
میرا نشیمن بھی تُو، شاخِ نشیمن بھی تُو!
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہُو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی مری آرزو، تُو ہی مری جستجو!
پاس اگر تُو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تُو ہے تو آباد ہیں اُجڑے ہوئے کاخ و کُو!
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر، کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو!
چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو!
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرُو!

(کلیاتِ اقبال)

وہ وقت سے پہلے انتقال کر گیا۔

میں نے اپنی پریشانی کا ذکر بڑے بھائی سے کیا۔ بڑے بھائی نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے خاندان کے ایک بڑے بزرگ سید احمد اشرف شاہ صاحب سے رابطہ کیا جائے۔ جن کے روحانی فیوض کے بڑے تذکرے تھے۔ ایک روز بڑے بھائی کے ساتھ عصر کی نماز کے بعد اُن کے آستانے پر گئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مغرب کی نماز سے قبل انہوں نے دعا کروائی۔ اُس کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ بہت خوشی کا اظہار کیا۔ چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کیسے تکلیف کی؟ میں نے کہا جناب آپ کے روحانی فیوض سے دُنیا فیضیاب ہوتی ہے اور ہمیں آج تک فیض حاصل نہیں ہوا۔ کہنے لگے کہ تم کس قسم کا فیض چاہتے ہو؟ میں نے کہا۔ فی الحال تو ایک دنیاوی پریشانی لاحق ہے جس کے حل کے لئے ہم حاضر ہوئے ہیں۔ کہنے لگے بتاؤ۔ اُن کو دفتری پریشانی بتائی انہوں نے بغور سنی اور کہا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مینیجنگ ڈائریکٹر مجھے بلائیں اور کہیں کہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے، تم استعفیٰ نہ دو اور اپنی نوکری کی مدت پوری کرو۔ شاہ صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور کہا۔ ”یہ تو بہت معمولی بات ہے“۔ میں نے کہا کہ آپ اللہ والے آدمی ہیں۔ آپ کے لئے یہ بات معمولی ہے مگر میں دنیادار آدمی ہوں میرے لئے مشکل بات ہے۔

کہنے لگے۔ ”مینیجنگ ڈائریکٹر تمہیں بلائے گا، تمہیں چائے پلائے گا اور کہے گا کہ استعفیٰ نہ دو، نوکری پوری کرو“۔

میں نے کہا۔ ”آپ اللہ والے آدمی ہیں، آپ کے لئے یہ معمولی بات ہے اگر اس طرح ہو جائے تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا“۔

کہنے لگے۔ ”ان شاء اللہ، اسی طرح ہو گا لیکن تم میرے مرید نہیں ہو گے، اس بات کو لکھ لو“۔ اتنے میں چائے وغیرہ آ گئی۔ ہم نے چائے پی۔ اُن کا شکریہ ادا کیا۔ چلتے وقت انہوں نے تاکید سے کہا کہ استعفیٰ کسی صورت نہ دینا اور گھبرانا نہیں اور مجھے مطلع رکھنا۔ اُن کی باتوں سے بڑی تقویت ہوئی اور میں لاہور آ گیا۔ دسمبر 2003ء کو جنرل مینیجر نے مجھے اور افسران کے ہمراہ بلایا اور کہا کہ آپ لوگوں کا استعفیٰ کیوں نہیں آیا۔ فوراً استعفیٰ دیں، اکثریت افسران کا استعفیٰ آ گیا ہے۔

ہم نے کہا کہ جناب 31 دسمبر کا آخری تاریخ ہے جب تک ہم استعفیٰ دے دیں گے لیکن وہ کہنے لگے کہ جتنی جلدی ہو سکے استعفیٰ دے دو۔

29 دسمبر 2003ء کو سینئر جنرل مینیجر نے افسران کو بلایا اور استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے بھی اُن کو کہا کہ 31 دسمبر آخری تاریخ ہے۔ ابھی دو دن بقایا ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ آپ 31 دسمبر کی تاریخ میں استعفیٰ دے دیں۔ کچھ لوگوں نے دے دیا لیکن میں نے نہیں دیا۔ اس پر اعلیٰ آفیسر بہت ناراض ہوئے۔ میں نے کہا۔ جناب میں 31 دسمبر صبح کو خود آ کر استعفیٰ دے دوں گا، پہلے نہیں دے سکتا۔

30 دسمبر کو صبح میرے کچھ مہمان جو میرے قریبی عزیز تھے، اور امریکہ سے آئے ہوئے تھے کہا کہ ہمیں شام کو ماڈل ٹاؤن میں اپنے ایک قریبی دوست کے ولیمے میں جانا ہے۔ ہمیں لے کر چلیں یہ دوست امریکہ میں ہمارے گھر رہا ہے اور ہمارے بہت قریبی دوستانہ تعلقات ہیں شام کو میں اپنے مہمانوں کو لے کر ولیمے میں پہنچا۔ میرے مہمانوں کے دوستوں نے بڑا استقبال کیا۔ اپنے گھر کے ایک ایک فرد سے ملوایا اور بہت زیادہ عزت دی۔ وہ لوگ ایک بڑی صنعتکار فیملی سے تعلق رکھتے تھے اُن کی ٹیکسٹائل ملیں تھیں۔ ان کے والد خالد صاحب بہت پُرتپاک طریقے سے ملے جب ولیمے کا کھانا شروع ہوا تو میں نے دیکھا کہ ہمارے مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب

کے ہم زلف بھی اس ولیمے میں شامل تھے۔ میں نے سوچا اگر یہ آئے ہیں تو ہمارے مینجنگ ڈائریکٹر صاحب بھی ضرور آئے ہوں گے۔ کافی تلاش کیا، نظر نہ آئے۔ میں اپنے میزبان خالد صاحب کے پاس گیا اور متعلقہ صاحب کے بارے میں پوچھا۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا نہیں میں نہیں جانتا۔ میرے بیٹے یا کسی اور حوالے سے مدعو ہوں گے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ ہمارے مینجنگ ڈائریکٹر صاحب کے ہم زلف ہیں۔ میرے میزبان نے کہا کہ آپ کے مینجنگ ڈائریکٹر صاحب کا کیا نام ہے۔ جب میں نے اُن کا نام بتایا تو بولے۔ آپ کل شادی میں کیوں نہ آئے؟ وہ آئے ہوئے تھے۔ میں آپ کی اُن کے ساتھ تصویر کھنچوا دیتا، وڈیو بنوا دیتا۔ میں نے کہا کہ آپ اُن کو کیسے جانتے ہیں؟ کہنے لگے۔ یہ جو میری بہو دلہن بنی بیٹھی ہے اس کے سگے چچا ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ہمارے آفیسر اعلیٰ ہیں، وہ مجھے کمپنی سے نکال رہے ہیں۔ کل استعفیٰ دینے کی آخری تاریخ ہے۔ خالد صاحب نے کہا کہ آپ اپنا نام اور عہدہ وغیرہ بتائیں تاکہ میں اُن سے بات کروں۔ میں نے اُن کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ آرام سے گھر جا کر سوئیں۔

31 دسمبر کو صبح خالد صاحب کا فون آیا کہ رات کو مینجنگ ڈائریکٹر صاحب سے بات ہوگئی ہے وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں، وہ یکم جنوری کو آپ کو اپنے دفتر میں بلائیں گے۔ آپ استعفیٰ نہ دیں، اُن سے بات ہوگئی ہے۔

یکم جنوری کو صبح مینجنگ ڈائریکٹر صاحب کے سیکرٹری کا فون آ گیا کہ آپ فوری طور پر ایم ڈی صاحب کے دفتر پہنچیں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ میں جب ایم ڈی صاحب کے سیکرٹری کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ایم ڈی صاحب کے پاس دو ایم این اے بیٹھے ہیں۔ میں اندر بات کرتا ہوں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں آپ کو اندر بھیج دوں گا، ورنہ آپ انتظار کریں۔

جیسے ہی اُن کے سیکرٹری نے میرے آنے کی اطلاع کی تو انہوں نے کہا کہ فوراً بھیج دو۔ جب میں ایم ڈی صاحب کے کمرے میں گیا تو وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ٹی بوائے (Tea Boy) چائے لے آیا۔ اس نے چائے ایم این اے کے سامنے رکھی تو ایک پیالی میرے آگے بھی رکھ دی۔ ایم ڈی صاحب فون سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام عرض کی۔ انہوں نے سلام کا جواب بڑی اچھی طرح سے دیا اور کہا کہ آپ یہاں آگئے ہیں تو اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ استعفیٰ نہ دیں، چائے پئیں۔ میں نے چائے پی اور شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

میں نے شاہ صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ آپ کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی ہے۔ ایم ڈی صاحب نے خود بلایا۔ چائے پلائی اور عزت افزائی کی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں بہت جلد آؤں گا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو جاؤں گا۔ شاہ صاحب کہنے لگے تمہاری بیعت میرے ہاتھ پر نہیں ہوگی۔ اُس کے بعد انہوں نے بہت سی دعائیں دیں۔ میں کراچی جانے کی سوچ رہا تھا کہ شکریہ ادا کروں اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کروں کہ ایک روز خبر آگئی کہ شاہ صاحب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

☆......لاہور میں ایک اللہ والے سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے میں نے کہا کہ گھریلو و دفتری پریشانیوں کو دور کرنے اور مستقبل میں آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کے لئے پڑھنے کے لئے کوئی ''ورد'' عطا فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ عشاء کی نماز کے بعد 500 دفعہ ''یاحیی یا قیوم برحمتک استغیث'' شروع

اور آخر میں درود شریف گیارہ دفعہ پڑھیں، ان شاء اللہ ہر پریشانی سے بچتے رہیں گے۔ کچھ عرصہ بعد میں کراچی گیا اور اپنے خاندان کے ایک بزرگِ سید احمد اشرف صاحب سے ملا۔ باتوں باتوں میں میں نے اُن سے کہا کہ مجھے پڑھنے کے لئے کچھ بتائیں تاکہ میں پریشانیوں سے محفوظ رہوں۔ کہنے لگے تمہیں لاہور میں بزرگ نے جو ورد بتایا ہے وہ کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے انجان بن کر اور اُن کو آزمانے کے لئے پوچھا کہ کون سا ورد بتایا تھا۔ ہنس کر کہنے لگے تم مجھے آزمانا چاہتے ہو اور میری روحانیت کا امتحان لینا چاہتے ہو۔ تمہیں سب معلوم ہے۔ میں نے اتنی بڑی بات سن کر اُن کے قدموں کو دبایا اور کہا کہ آپ واقعی پہنچے ہوئے ہیں۔

☆...... کئی سال پہلے ڈاکٹروں نے میری طبیعت کی ناسازی کو دیکھتے ہوئے مجھے انجیو گرافی کا مشورہ دیا۔ انجیو گرافی کے پیسے وغیرہ جمع کرا دیئے اور ہسپتال والوں نے ایک تاریخ مقرر کردی کہ فلاں روز آ کر ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ انجیو گرافی کے عمل سے گزرنے سے تقریباً چار پانچ روز قبل میں نے اپنے ایک قریبی دوست ڈاکٹر اصغر امام صاحب سے ذکر کیا اور اپنی بیماری وغیرہ کے سلسلے میں تفصیل سے بتایا۔ جب انہوں نے انجیو گرافی کا سنا تو گھبرا گئے۔ دوسرے روز وہ میرے گھر آئے اور کہا کہ میرے ساتھ چلیں۔ ایک بزرگ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ''دم'' کرتے ہیں اور اُن کے دم کرنے سے انجیو گرافی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دو لوگ اُن کے ''دم'' سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ کافی تلاش کے بعد سانده کے علاقے میں اُن سے جا کر ملے۔ انہوں نے کہا کہ آپ صرف 3 دن مجھ سے دم کرائیں۔ ان شاء اللہ انجیو گرافی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے اُن سے دم کروایا۔ جس کا انہوں نے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ جب اُن سے پوچھا کہ آپ کے ذرائع آمدن کیا ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ گورنمنٹ کالج سے اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں اور ہومیو پیتھک پریکٹس کرتے ہیں۔ تین دن دم کرانے کے بعد جب انجیو گرافی ہوئی تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔ ڈاکٹر صاحبان بڑے حیران ہوئے کیونکہ گزشتہ رپورٹیں ان کے سامنے تھیں جو انتہائی خراب تھیں۔ اس پُراسرار بندے کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ جو ڈاکٹر صاحب مجھے ان بزرگ کے پاس لے کر گئے تھے وہ خود دل کے مریض تھے۔ وہ اپنا علاج ان بزرگ سے نہ کرا سکے اور ایک روز مریضوں کو دیکھ رہے تھے کہ ایک دم اُن کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆...... 1997ء میں مجھے حج کی سعادت نصیب ہوئی جب میں مکہ شریف پہنچا تو میں بالکل صحت مند تھا لیکن جب میں مدینہ شریف پہنچا تو ایک دم سے میرے گھٹنوں میں درد ہونا شروع ہو گیا اور وہ درد اتنا تکلیف دہ تھا کہ میں صحیح طریقے سے عبادت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز میں عصر کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا ٹوٹی پھوٹی عبادت میں مصروف تھا۔ جب مغرب کی اذان شروع ہوئی تو میں نے دل میں یہ دعا کی۔

''حضور! ہم آپ کے مہمان ہیں، مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیسا؟'' مختصر الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا اور صحت کے لئے دعا کی۔ میرے ساتھ ایک غیر ملکی بیٹھا تھا جو تلاوت کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے تلاوت بند کی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اُس سے میں نے کہا کہ میرے گھٹنوں میں سخت درد ہے اور اشارے سے اس کو بتایا اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ چند لمحے دعا کی اور اس کے بعد اس نے میرے گھٹنوں پر پھونک ماری اور اپنا ہاتھ پھیرا۔ میں معجزاتی طور پر ٹھیک ہو گیا۔ میں اس ''پُراسرار بندے'' کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

❁❁❁

یہ مت بھولئے کہ سر اُٹھا کے جینے کا راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن یہی ایک واحد راستہ ہے پہنچنے کا، سنورنے کا، بننے کا۔

سر اٹھا کے جیو

آخر کب تک؟

☆ ----------0300-8450558---------- قیصر عباس

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں جب ہر چیز میں ناکامی ہو رہی ہو تو "کب تک" کوشش کرتے رہنا چاہئے؟

میرا جواب ہے۔ "جب تک"۔

"کب تک" کا جواب "جب تک" سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے؟

"جب تک" سے مراد کیا ہے آپ کی؟

"جب تک" سے میری مراد ہے۔ "تب تک"۔

"تب تک؟"

"ہاں، جب تک...... آپ کو وہ مل نہ جائے جس کے آپ آرزومند ہیں، تب تک کوشش جاری رہنی چاہئے"۔

آرزو صرف مقصد کی ہی کی جاسکتی ہے اور مقصد تو ہوتا ہی وہ ہے جو خالص ہو، سچا ہو، جس سے منہ موڑنا آپ کے لئے مشکل ہو جس سے دستبردار ہو جانا آپ کے بس میں ہی نہ ہو۔

ایسے مقصد میں وقتی ناکامی یا چند مشکلات کے بعد آپ کنارہ کشی کیسے کرسکتے ہیں؟

"تو پھر مقصد کو پانے کی جستجو کب تک جاری رکھیں؟"

"جب تک...... جب تک آپ اسے پا نہ لیں"۔

کیونکہ ہم سب کی زندگی میں دو راستے ہوتے ہیں، ایک روٹی روزی کمانے کا راستہ، گھر چلانے کا راستہ، بل چکانے کا راستہ، کرائے بھرنے کا راستہ اور پیٹ بھرنے کا راستہ۔ جبکہ دوسرا راستہ ہے زندگی بنانے کا راستہ، کر دکھانے کا راستہ، کل سنوارنے کا راستہ، اپنا راستہ خود بنانے کا راستہ۔

آپ کا انتخاب کیا ہوگا؟

آج تک کس راستے پر آپ نے زیادہ چہل قدمی کی ہے؟

ہم میں سے اکثر کی سوچ میں۔ "کر دکھانے کا" ۔ جبکہ قدموں کے نیچے۔ "گھر چلانے کا راستہ" ۔ ہی کیوں ہوتا ہے؟ روز مر مر جانے سے اور اٹھ جانے کا راستہ، ڈٹ جانے کا راستہ، اچھی زندگی کو آنکھ اٹھا کر اپنی

طرف متوجہ کرنے کا راستہ ہمیں کیوں ایک آنکھ نہیں بھاتا؟

آپ جس راستے کو اپنائیں گے وہ راستہ آپ کو اپنائے گا۔ اگر آپ نے گزارے کا راستہ اپنا لیا ہے تو گزارے کا راستہ آپ کو اپنالے گا۔

آپ اپنے مقصد کے لئے کام کریں گے تو آپ کا مقصد آپ کے لئے کام شروع کردے گا۔ اگر آپ اپنے پلان کو وقت دیں گے تو آپ کا پلان آپ کو وقت دینا شروع کردے گا۔ اگر آپ اپنی سوچ کو تقویت دینا شروع کریں گے تو آپ کی سوچ آپ کو تقویت دینے لگ جائے گی۔ آپ خوشی کی پروا کرنے لگیں تو خوشی آپ کی پروا میں لگی رہے گی۔ آپ اپنے رویوں کی ذمہ داری لینی شروع کردیں، رویے آپ کی ذکہ داری اٹھانے لگیں گے۔ آپ خوابوں کو ذرا سا راستہ دے کر دیکھیں، آپ کے خواب آپ کے لئے کتنے ہی خوبصورت راستے بچھادیں گے۔

یہ اصول میرا بنایا ہوا نہیں ہے، یہ کائنات کا اصول ہے۔ ہم جس چیز کو بناتے ہیں بالآخر وہی چیز ہمیں "بنا" جاتی ہے۔

جس چیز کو بنانے میں آپ اپنا دم، دل اور لگن لگا دیتے ہیں، وہ چیز آپ کو اس طرح بنا جاتی ہے، اپنا جاتی ہے کہ آپ کی پہچان بن جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے مزاح معین اختر کی پہچان ہے، کرکٹ وسیم اکرم کی، ڈرامہ امجد اسلام امجد کی، کالم منو بھائی کی، شاعری فیض احمد فیض کی، ایکٹنگ احسن خان کی، کمنٹری چشتی مجاہد کی، ہاکی حسن سردار کی، گانا نور جہاں کی، غزل غلام علی کی، خبریں محمد جنید کی، ٹاک شو حامد میر کی، پینٹنگ صادقین کی، افسانہ اشفاق احمد کی، ہوٹل مسعود علی خان کی، سیاست عمران خان کی، ایٹم بم ڈاکٹر قدیر کی، ٹیکنالوجی فرحان مسعود کی، ایونٹ مینجمنٹ اظفر احسن کی، ٹریننگ کامران رضوی کی، بیوٹی مسرت مصباح کی، تعلیم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کی، پنجابی فلم سلطان راہی کی، لوک موسیقی عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی، دل دل پاکستان جنید جمشید کی اور تیز ترین سنچری شاہد آفریدی کی۔

لیکن کچھ لوگ اپنے کام سے عشق میں یوں گم ہوتے ہیں کہ ان کا کام اُن کی نہیں بلکہ وہ اپنے کام کی شناخت بن جاتے ہیں۔ جیسے قوالی کی شناخت نصرت فتح علی خان سے جڑ گئی۔ سکوائش کی جہانگیر خان سے، خدمتِ خلق کی عبدالستار ایدھی سے، ورلڈ کپ کی عمران خان سے، کوہ پیمائی کی نذیر صابر سے، ایکٹنگ کی نعمان اعجاز سے، فیشن کی حسن شہریار سے، ماڈلنگ کی نادیہ حسین سے، ٹی وی اینکرنگ کی طلعت حسین سے، مزاح کی انور مقصود سے، آرکیٹیکچر کی نیئر علی دادا سے، شاعری کی علامہ اقبال سے، بزنس کی سید بابر علی سے، کوکنگ کی شیف ذاکر سے، سنوکر کی محمد آصف سے، فلم کی شان سے، حسبِ حال کی سہیل احمد سے، سائنس کی ڈاکٹر عبدالسلام سے اور پاکستان کی قائداعظم سے۔

آپ کس کام کی شناخت بننا چاہتے ہیں؟ کس فن کو آپ ان بلندیوں سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے نام سے جانا جائے؟ کیا آپ اپنے کام کو وہ توجہ، وہ لگن، وہ وقت، وہ محبت اور وہ تڑپ دینے کے لئے تیار ہیں کہ بالآخر آپ کا کام ایک دوسرے کی پہچان بن جائیں۔

میرے دوست! آپ کی ضرورت ہمدردی کے بول، سہارے اور امداد نہیں ہے۔ آپ جس بھی کٹھن صورت حال میں ہیں، آپ کی جیت وقتی دلاسوں، جھوٹی تسلیوں اور وقتی ڈھارسوں میں نہیں بلکہ مستقبل سے وابستہ مقاصد کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر آپ کی آنکھوں میں کل کے خواب ہیں تو آج کی مشکلات سے لڑنا آپ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

"کل" سے جڑے خواب "آج" کے کانٹوں کا

درد سہنے کی طاقت دیتے ہیں، تکلیف میں کھڑے رہنے کی ہمت دیتے ہیں، ٹوٹتی امیدوں کا سہارا بنتے ہیں اور یقین کی فراوانی کا سبب بنتے ہیں۔ تاہم اگر ''کل'' کا کوئی خواب آپ کی آنکھوں میں جھلملا نہیں رہا ہو تو کانٹے آبلے بن جاتے ہیں، مشکلیں پہاڑ دکھائی دیتی ہیں، امیدیں دم توڑ جاتی ہیں اور زندگی 'کر دکھانے' کی منزلوں سے منہ موڑ کر گزارے کی چکی میں پسنے لگتی ہے۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ کس راہ پر چلنا ہے؟ پہلے آپ نے راہ چننی ہے یا راہ نے آپ کو چننا ہے (غلط راہ چنی تو وہ راہ آپ کو دیواروں میں چنوا دے گی)۔

کس راہ کو اپنانا چاہ رہے ہیں آپ؟ گھٹنے کی راہ؟ جینے کی راہ؟ سمجھوتوں کی راہ؟ بے سروسامانی کی راہ؟ پچھتاووں کی راہ؟ بہانوں کی راہ؟ بربادی کی راہ؟ بے منزل راہ؟

تو پھر کون سا راستہ؟ خوشحالی کا؟ کامیابی کا؟ ترقی کا؟ یا پھر خوابوں سے منہ موڑنے کا راستہ؟ ہمتوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کا راستہ؟ مشکلات کے آگے گھٹنے ٹیکنے کا راستہ؟ مقاصد سے آنکھیں پھیر لینے کا راستہ؟ شاندار مستقبل کی آنکھوں میں دھول جھونک دینے کا راستہ؟

یہ مت بھولئے کہ سر اُٹھا کے جینے کا راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن یہی ایک واحد راستہ ہے پہنچنے کا، سنورنے کا، بننے کا۔ سر جھکا کے جینے کا راستہ صرف چننے میں آسان ہے، اس پہ چلنا بے انتہا کٹھن ہے، تکلیف دہ ہے، مشکل ہے۔

سر اُٹھا کے جینے کے راستے پر چل نکلے تو پہنچتے رہیں گے۔ سر جھکا کے جیو کے راستے پر چل نکلے تو ہمیشہ پستے رہیں گے۔ آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

پسنے کا راستہ یا پہنچنے کا راستہ!

ایک آدمی کا قصہ جو ایک فاحشہ کا مقصودِ نظر تھا مگر اس کا اپنا مقصودِ نظر کوئی اور تھا۔
اس نے اپنی ذات کے تمام روزن بند کر لئے تھے مگر ایک روزن کھلا رہ گیا تھا

یک در گیر

☆ اشرف صبوحی

جنوں والی مسجد کے حاجی صاحب کو جانتے ہو؟ وہ نہ جھاڑا پھونکی کرتے ہیں، نہ تعویذ گنڈا۔ کوئی پچیس برس ہوئے، جب انہوں نے اِس مدتوں کی غیر آباد مسجد میں ڈیرا جمایا تو دس پانچ ہی دن میں وہ شہرت ہو گئی تھی کہ ہر وقت عورتوں اور مردوں کا تانتا لگا رہتا۔ جنوں کی مسجد کے متعلق ہزاروں روایتیں مشہور تھیں کہ فلاں فقیر رات کو بھلا چنگا وہاں ٹھہرا، صبح مرا ہوا ملا۔ فلاں عامل نے چلا کھینچنا چاہا، آدھی رات نہ گزری تھی کہ کسی نے گردن مروڑ دی۔ لوگوں کو دن دیہاڑے وہاں جن دکھائی دیتے تھے۔ ایسی جگہ کوئی آ کر ٹھہرتا اور سلامت رہتا تو اُس کے کامل ہونے میں کیا شک ہو سکتا تھا لیکن حاجی صاحب نے ایک کو منہ نہیں لگایا۔ اوّل تو کسی سے بات ہی نہ کرتے پھر اگر کوئی زیادہ سر ہوتا تو وضو کر، نماز پڑھنے لگتے یا کہیں نکل جاتے اس لئے رفتہ رفتہ آنے والوں نے بے فیض سمجھ کر اُن کے پاس آنا چھوڑ دیا اور یہ جب تک زندہ رہے خدا کی یاد کے سوا کسی نے کبھی کوئی شغل کرتے نہیں دیکھا۔ کھانے پینے کا کیا سامان تھا؟ اس کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلا۔ کب مرے؟ اس کی خبر نہیں۔ ہاں کئی برس ہوئے مسجد کے صحن میں ایک پختہ قبر بنی ہوئی ضرور دیکھی گئی جو پہلے نہ تھی۔ قبر حاجی صاحب کی ہے یا کسی اور کی، اور اگر انہی کی ہے تو کس نے دفن کیا؟ خدا ہی خوب جاننے والا ہے۔

اچھا تو یہ حاجی صاحب کون تھے؟ ڈوم بچے۔ چاندنی محل کے رہنے والے۔ محبوب نام تھا۔ امیر خاں

قوال کا بیٹا۔ امیر خاں کی جوانی تو رنڈیوں کی استادوں میں گزری، چکنا چپڑا سانولا سلونا ناک نقشے کا درست لڑکا تھا۔ آواز بھی بھنبیری تھی گلے کے ساتھ آنکھیں کچھ اس طرح چلتیں کہ صوفیوں کی رال ٹپکنے لگتی۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دن میں محبوب صوفیوں کا ایمان مشہور ہو گیا۔

محبوب کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی ہو گی کہ امیر خاں کا انتقال ہو گیا۔ قوالوں کی دوسری چوکیوں نے اُسے اپنے ساتھ ملانا چاہا اور یہ دو برس کے قریب کئی چوکیوں کے ساتھ عرسوں میں جاتا بھی رہا لیکن اُسے بہت جلد ان صوفیوں سے نفرت سی ہو گئی۔ جس کو حال آتا، وہ اچھلتا ناچتا اُسی پر آ گرتا۔ آخر ان داڑھیوں کے ہجوم سے نکل کر اُس نے طوائفوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ ہر جگہ طبلچی سارنگیے عموماً اُسی کے بھائی بند تھے۔ پھر وہ جو کہتے ہیں کہ مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ اگرچہ محبوب نے نہ باقاعدہ گانا سیکھا تھا، نہ بجانا لیکن اُس کی گھٹی میں تو یہی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ استاد نہ سہی، امیر خاں کا بیٹا سمجھ کر سب اُس کی خاطر کرتے۔

ہرمزی ایک طوائف اُس کے باپ کی شاگرد تھی۔ رنڈیاں عمر سے اتر کر عموماً مرد پرست ہو جاتی ہیں۔ محبوب کا اٹھتا شباب تھا۔ اُس کی جو نظر پڑی، بلائیں لینے لگی، محبوب کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اچھے سے اچھا کھلاتی اور کپڑے لتے سے ایسا بنا سنوار کر سکتی کہ نوچیاں تک جلنے لگیں۔

ادھیڑ عمر کا اٹھتی جوانی سے کیا میل۔ اُدھر تو محبوب کو قدرتی طور پر ہرمزی کی لگاوٹ بازیاں پسند نہ تھیں۔ اِدھر بندی جو ہرمزی کی لے پالک تھی، وہ بیچ میں آ کودی۔ محبوب اور بندی میں وہ سہاگ بڑھا کہ بی ہرمزی جان آخر صبر نہ کر سکیں۔ پہلے تو دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے طریق پر سمجھایا۔ جب سمجھانے سے کام نہ بنا تو ایک دن چولھے میں سے جلتا ہوا سوختہ نکال لائی اور بندی سے کہنے لگی توبہ کر، نہیں تو تیری جوانی کو ابھی آگ لگائے دیتی ہوں۔"

محبوب اُس وقت تھا نہیں۔ بندی بے چاری نے ڈر کر توبہ کر لی۔ محبوب آیا تو اُسے بھی آنکھیں دکھائیں۔ محبوب اور بندی میں پہلے ہی سے صلاح مشورے ہو چکے تھے۔ اُسی رات موقع پا کر دونوں نکل بھاگے قطب صاحب میں جا کر دونوں نے پناہ لی۔ ہرمزی نے صبح اٹھتے ہی شور مچا دیا۔ کوتوالی پہنچی، رپٹ لکھوائی کہ محبوب، میرا نوکر، میری بیٹی بندی کو پانچ ہزار روپے کے زیورات کے ساتھ بھگا لے گیا ہے۔

پولیس والے رنڈیوں کے ایسے معاملات میں رقمیں چیرنے کے سوا کبھی کچھ نہیں کرتے چنانچہ نہایت معمولی تفتیش کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہرمزی رو پیٹ کر بیٹھ رہی اور وہ دونوں مہرولی میں چھپے مزے اڑایا کیے۔

مہرولی کی بستی میں آئے پورے بارہ مہینے ہو گئے تھے۔ بندی ایک پوٹلی میں کچھ زیور ضرور لائی تھی لیکن خالی بیٹھے بیٹھے قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ دوسرے چونکہ ابھی ان دونوں میں میاں بیوی کا پکا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا جو آئندہ زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی دھندا لے کر بیٹھتے اس لئے دونوں وقت اچھا کھاتے اور گھر کے اندر ہی پڑے پڑے ملہار گاتے رہتے۔

اتفاق سے انہی دنوں میں ایک روز رنڈی کو کسی نے قتل کر دیا۔ محبوب اور بندی ناسمجھ بچے تو تھے نہیں جو اس واردات کو اس کان سنتے اور اُس کان اڑا دیتے۔ دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ ہماری حرام کاری کا انجام دیکھئے کیا ہوتا ہے کیونکہ جوں جوں رقم کم ہوتی جاتی تھی اور ساتھ ہی عیش سے دل بھرتا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے کے ساتھ دلچسپی کم ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن یوں ہی ذرا سی بات پر کھٹ پٹ ہونے لگتی۔ آخر ایک دن محبوب نے کہا۔ "دیکھو بی! اس رات دن کے کھولنے

اور جلانے سے کیا فائدہ۔ میرے ساتھ نباہ نہیں کر سکتیں تو اپنا راستہ لو"۔

بندی بولی۔ "میاں! ہوش کی دوا لو۔ اندر باہر سے لوٹ کر اب رستہ دکھاتے ہو۔ مجھے نباہ نہ کرنا ہوتا تو تمہارے ساتھ آتی کیوں۔ تم اپنی کہو، مجھے دوزخ کے دروازے میں دھکیل کر اگر تمہیں کہیں جنت مل جائے تو شوق سے میرا پاپ کاٹ دو۔"

محبوب کی فطرت بُری نہ تھی۔ بندی کی ان باتوں سے اُس پر بڑا اثر ہوا اور کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گیا۔ بندی کچھ اور بھی لیکن پھر خود بخود اُسے ایک قسم کی تسکین سی ہو گئی کہ محبوب ایسا بے مروت نہیں۔ میں نے اُسے کیا دکھ دیا ہے جو وہ مجھے اس طرح چورا ہے پر چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا اور گھر کے دھندوں میں جا لگی۔

اگر طبیعت میں کھوٹ نہیں اور دل کا آئینہ صاف ہے تو دوسرے کی صورت کچھ دھندلی نظر نہیں آتی۔ بندی نے چونکہ محبوب کے ساتھ اب تک کسی قسم کی بے وفائی یا محبت میں کوتاہی نہیں کی تھی اس لئے اُسے یقین تھا کہ وہ بھی میری ناقدری نہیں کرے گا اور درحقیقت محبوب کے خیالات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سوا کہ وہ کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ آئندہ زندگی بسر کرنے کے لئے کیا تدبیر کرنی چاہئے؟ اسی سلسلے میں بعض اوقات اُس کی طبیعت میں خلجان سا پیدا ہو جاتا۔ ہاں جس دن سے قتل ہرمزی کا واقعہ ہوا تھا، اُس کے مزاج کی کیفیت برابر بدلتی جا رہی تھی چنانچہ اب اُس کے جذبات کچھ اور ہو گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یا تو نکاح ہو جائے یا بالکل علیحدگی۔

محبوب پڑھا لکھا نہ تھا، نہ اُسے پڑھے لکھوں کی صحبت میسر آئی تھی تاہم اُس کے جذبات اچھے تھے۔ آج جو بندی سے جھڑپ ہوئی اور اپنی تلخ بات کے جواب میں اُس کی نیت کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً بستی کے قاضی صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ قاضی صاحب غیر معمولی نیک آدمی تھے۔ پڑوس میں رہنے کے سبب محبوب سے اُن کی جان پہچان بھی تھی۔ عرسوں کے موقعوں پر اُسے گاتے بھی سنا تھا۔ پوچھنے لگتے۔ "کیوں میاں! کس لئے تکلیف کی؟"

محبوب نے ساری داستان کہہ سنائی اور درخواست کی۔ "آپ ہم دونوں کا نکاح پڑھا دیں"۔

قاضی جی بڑی خوشی سے تیار ہو گئے اور کہا۔ "جاؤ اُس کو بھی نہلاؤ، آپ بھی نہاؤ۔ پاک کپڑے پہنو۔ میں ابھی آتا ہوں"۔

قصہ مختصر یہ کہ عصر کے بعد قاضی جی نے آ کر پہلے دونوں سے توبہ کرائی، گناہوں سے بچنے، نیکی کے راستے پر چلنے اور نماز روزے وغیرہ کی تاکید کر کے دونوں کے سر جوڑ دیئے۔ محبوب اور بندی کا نکاح ہو گیا۔ چلتے وقت قاضی جی نے یہ بھی کہا کہ حلال کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ گانا بجانا چھوڑ دو، کوئی اور دھندا کرو۔ ٹوکری ڈھو کر سوکھے ٹکڑے کھانا حرام کی آمدنی کے قورمے پلاؤ سے بدرجہا بہتر ہے"۔

اللہ جس کو توفیق دے، قاضی جی کے کہنے کا اُن دونوں پر ایسا اثر ہوا کہ محبوب نے تو مزدوری شروع کر دی اور بندی بستی میں جاتی اور چکی پیستی۔ ساتھ ہی محبوب کو نماز کی بھی لو لگ گئی۔ نماز آتی نہ تھی۔ قاضی جی سے پانچ سات دن میں سیکھ لی اور اب وہ پانچوں وقت مسجد میں دکھائی دینے لگا۔

لیکن مہرولی کی بستی دلّی کے قریب تھی، اس کے علاوہ حضرت قطب صاحب کا مزار شریف۔ رنڈیاں، ڈوم، صوفی برابر آتے رہتے کچھ تو شرم کہ کسی نے مزدوری کرتے دیکھ لیا تو کیا کہے گا، کچھ یہ ڈر کہ کسی کی اگر نظر پڑ گئی تو پکڑا نہ دے اس لئے مصلحت یہ سمجھی کہ کسی ایسی جگہ چل کر رہنا چاہئے جہاں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ صلاح کر کے دونوں اپنا بوریا بستر سمیٹ بلب گڑھ روانہ

ہو گئے۔ بلب گڑھ پہنچ کر سرائے میں اُترے پھر مکان تلاش کیا۔ مکان کے بعد ایک چرخا اور چکی خریدی۔ بندی چرخا کاتتی، چکی پیستی اور محبوب بھی اِدھر اُدھر سے مزدوری کر کے کچھ نہ کچھ کما لاتا۔ پیٹ بھرنے کے لئے اس سے زیادہ کیا چاہئے۔

اتفاق سے مکان کے برابر ہی شہر کی بڑی مسجد تھی۔ محبوب ہر نماز کے وقت سویرے سے جا بیٹھتا اور اللہ اللہ کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اذان بھی دینے لگا۔ آواز سریلی اور گلا لوچ دار تھا۔ لوگ اُس کی اذان کے مزے لینے لگے اور کچھ دن بعد وہ باقاعدہ موذن بن گیا۔ اللہ کی شان ہے، ایک ڈوم بچے کی کیا کایا پلٹ ہوتی ہے۔ چند روز پہلے محبوب نہ خدا کو جانتا تھا، نہ رسول کو۔ قوالی میں یہ الفاظ صرف اُس کے منہ سے نکلا کرتے تھے۔ کیسی نماز، کیسا روزہ، یا اب مسجد کے سوا کہیں اُس کا دل ہی نہ لگتا۔ انجان آدمی یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ محبوب سدا کا نمازی نہیں۔ جو دیکھتا، یہی جانتا کہ کسی اچھے نمازی گھر کا لڑکا ہے۔ اسی طرح بندی کا بھی خدا نے ایکا یک ایسا دل پھیرا کہ رنڈی پنا اس میں نام کو نہیں رہا۔ بننے سنورنے کے سارے جذبات فنا ہو گئے۔ معشوقانہ انداز جن کی تعلیم اُس نے برسوں پائی تھی، سب چرخے اور چکی میں صرف ہونے لگے۔ اندھیرے سے اٹھ کر چکی پیستی پھر کھانے پکانے سے فارغ ہو کر چرخا کاتتی۔ ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے لیکن اُس کی زبان سے کبھی نہ خدا کی شکایت سنی، نہ قسمت کا گلہ۔ نہ اُس نے ہنسی مذاق کے طور پر بھی محبوب سے یہ کہا کہ تمہارے ساتھ آ کر تو میری تقدیر پھوٹ گئی، وہاں رہتی تو نہ جانے کیسی کیسی میری ناز برداریاں ہوتیں، چاہنے والے مجھے آنکھوں پر بٹھاتے، عطر میں نہاتی، سونے کا نوالہ کھاتی، بلکہ جب پایا مگن، اپنے حال میں خوش۔ مذہب سے البتہ اُسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اوّل معلوم نہیں کہ کس کی لڑکی تھی، دوسرے جس گھر میں پلی بڑھی، وہاں دین ایمان کا کیا کام۔ شراب کباب، گانے اور حرام کاری کی باتوں کے سوا نماز روزے وغیرہ کا ذکر بھولے سے کبھی آ جاتا ہو گا۔

محبوب کے ساتھ بھاگنے تک بندی صرف اتنا جانتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ کلمہ بھی اُسے یاد تھا۔ مہرولی میں آنے کے بعد روزے نماز اور اسی قسم کے دو چار دوسرے فرائض بھی اُس نے پاس پڑوس کی عورتوں سے سن لئے تھے لیکن اب تک نہ رمضان میں ایک روزہ رکھا تھا، نہ ایک وقت کی نماز پڑھی تھی۔ پڑھتی کس طرح؟ نہ وضو کرنا آتا تھا، نہ یہ کہ نماز میں کیا پڑھتے ہیں۔ محبوب کو روزانہ اپنے ساتھ اٹھتا دیکھتی۔ مسجد سے اُس کی اذان سنتی اور مزے لیتی۔ بہت دل چاہتا کہ خود بھی نماز پڑھے، دل مسوس کر رہ جاتی۔

اسی طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ محبوب اب پکا نمازی تھا۔ کچھ بھی حال ہوتا کیسی ہی سردی پڑتی یا گرمی، آندھی چلتی یا مینہ برستا، وہ سارے نمازیوں سے پہلے مسجد میں جا پہنچتا۔ محبوب کے اِس رنگ کا آخر بندی پر اثر پڑتا تھا اور پڑا۔ خدا کو کب تک بھولی رہتی۔ شوہر نماز کا اتنا پابند اور بیوی اتنی آزاد۔ ناممکن سی بات تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل میں بھی نماز کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر جو محبوب گھر میں آیا تو بندی کہنے لگی۔ ”اب تو تم ملاجی ہو گئے ہو۔ ایک بات پوچھتی ہوں، بتاؤ گے؟“

محبوب:۔ نیک بخت! ملاؤں کے تو بڑے درجے ہیں۔ چار ٹکریں مارنے سے کوئی ملا تھوڑی بن جاتا ہے مگر خیر تم کیا پوچھتی ہو، پوچھو۔ مجھے نہیں معلوم ہو گا تو کسی دوسرے سے پوچھ کر بتا دوں گا۔

بندی:۔ میں یہ پوچھتی ہوں کیا عورت ذات کو نماز معاف ہے؟

محبوب:۔ نماز تو کسی کو معاف نہیں، عوت ہو یا مرد۔

بندی:۔ پڑوس والی سیدانی کہتی تھیں۔ شادی ہونے کے بعد عورت کی نیکی بدی کا ذمے دار مرد ہوتا ہے۔

محبوب:۔ میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔

بندی:۔ جب تک ہم تم آشنا رہے۔ اُس کو جانے دو جیسی میں تھی ویسے تم تھے مگر نکاح کے بعد بھی تم نے تو مجھے ویسا ہی سمجھ رکھا ہے۔

محبوب:۔ بات کیا ہے؟ کھل کر کیوں نہیں کہتیں؟

بندی:۔ تم نے کبھی مجھ سے نماز کے لئے کیوں نہیں کہا؟

محبوب:۔ میں نے تو نکاح کرنے کو بھی تم سے نہیں کہا تھا۔

بندی:۔ اے واہ، کیا کہنا۔ میں ہی تو قاضی کو بلا کر لائی تھی۔

محبوب:۔ بُرا کیا، تمہیں گناہوں سے بچا لیا۔

بندی:۔ میں کب کہتی ہوں لیکن دوزخ کے دروازے کا ایک پٹ بند کر کے دوسرا تو کھلا رکھا۔

محبوب:۔ ایک پٹ اگر میں نے بند کر دیا تھا تو دوسرا تم بند کر لیتیں۔

بندی:۔ مجھے بند کرنے کی ترکیب تو بتائی ہوتی۔ ایک دفعہ تو نماز پڑھنے کو کہا ہوتا۔

محبوب:۔ ایک دفعہ نہیں، دن میں پانچ مرتبہ کہتا ہوں۔

بندی:۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟

محبوب:۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ منہ سے نماز پڑھنے کو نہیں کہتا مگر تمہیں جتا کر نماز پڑھنے جاتا ہوں تاکہ تمہیں بھی نماز کا خیال آ جائے۔ اب تم نہ سمجھو تو اس کا کیا علاج۔

بندی نے شرما کر آنکھیں نیچے کر لیں اور محبوب کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ''اچھا اب مجھے نماز سکھا دو۔ کتنے دن میں آ جائے گی؟''

محبوب:۔ نماز کوئی گانا بجانا تو ہے نہیں کہ برسوں سیکھو پھر بھی کسر رہ جائے۔ اس سے آسان کون سی بات ہوگی۔ اللہ شوق دے تو دو چار دن میں نماز سیکھ سکتی ہو۔ قرآن کی دس پانچ چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کر لو اور بس۔

بندی نے اُسی وقت سے نماز میں جو پڑھا جاتا ہے، یاد کرنا شروع کر دیا۔ حافظہ اچھا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس قابل ہو گئی کہ اپنی جبیں عبودیت بارگاہِ ایزدی میں جھکا سکے۔

اب محبوب کی اذان میں پہلے سے زیادہ حقانی اثر لگنے لگے۔ جب وہ اذان دینے کھڑا ہوتا تو اُس کے دماغ کی عجیب کیفیت ہوتی۔ یہ تصور اُس کے اندر کچھ اور لطف پیدا کر دیتا کہ بندی بھی چرخا چھوڑ کر وضو کے لئے کھڑی ہو گئی ہوگی۔ بندی کو بھی اذان کی آواز سنتے ہی کام میں مزہ نہ آتا۔ یوں تو چکی پیسنے کی غرض سے وہ سورج نکلنے سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے ہی اٹھ بیٹھتی تھی، دو سیر آٹا پیس چکتی تو سورج نکلتا اور اس میں اسے خاص قسم کی مسرت محسوس ہوتی لیکن وہ مسرت اور اطمینان کچھ اور ہی تھا جو پہلے دن صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اُس نے اپنے قلب و دماغ کے اندر پایا۔

گندگی سے نکل کر پاکیزگی کے ساتھ رہتے سہتے کئی برس ہو گئے تھے۔ محبوب بھی اپنی اس حالت میں خوش تھا اور بندی بھی ایسی نہال کہ کسی نواب کے محل میں جا کر بھی شاید یہ اطمینان اور مسرت کی زندگی میسر نہ آتی۔

مزدوری کے سلسلے میں ایک مرتبہ صبح سے چار بجے تک کے لئے محبوب کو قریب کے کسی گاؤں میں جانا پڑا۔ واپس آ کر کیا دیکھتا ہے، ایک سفید لمبی داڑھی والے بزرگ مسجد میں رونق افروز ہیں۔ مولوی قسم کے پردیسی عالم اس مسجد میں ٹھہرا کرتے تھے۔ گویا ان شرعی تحصیل داروں کا یہ ڈاک بنگلا تھا۔ مولوی صاحب کی ظاہری

صورت اور وضع نہایت متبرک تھی۔ تقریر بھی ایسی دلچسپ اور وقت کے لحاظ سے اس قدر برجستہ اور موزوں کرتے کہ دیہاتی مسلمان اُن کا کلمہ پڑھنے لگتے۔ مولانا کے وعظوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو دن میں دو دو بار لوگ بلا کر لے جاتے۔ اس اثنا میں محبوب تو اُن کی صورت کا ایسا دیوانہ ہو گیا کہ سارے کام چھوڑ کر مولوی صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ اُن کی باتوں میں شیرینی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ محبوب کے لئے اُن سے بڑھ کر پیر نہ تھا۔ جھٹ مرید ہو گیا اور بیوی کو بھی مرید کرا دیا۔ عورت اس معاملے میں مردوں سے بہت زیادہ خوش اعتقاد ہوتی ہے۔ بندی جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتی تھی، پیر کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی۔ پیروں کو ایسے ہی مرید چاہئیں۔ مولانا نے بھی پاؤں پھیلا دیئے۔ جس دن کہیں دعوت نہ ہوتی، محبوب کے ہاں کھانا تناول فرماتے۔ بندی بڑے شوق اور محبت سے اُن کے لئے کھانا پکاتی۔ اگر خود جَو کھاتی تو انہیں گیہوں کھلاتی۔ آپ تیل میں گزر کرتی تو پیر کی خاطر گھی منگاتی۔

کوئی پندرہ سولہ دن بعد مولانا اپنا کام کر کے چلنے لگے تو جتنا محبوب اور بندی کو اُن کی جدائی کا صدمہ تھا، بستی بھر میں شاید کسی کو نہ ہوگا۔ رات کو جب آخری دعوت کا کھانا دونوں میاں بیوی کھلا رہے تھے تو محبوب نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ’’حضور! حج کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو ہمارے حالات تو معلوم ہی ہیں۔ ہمارے گناہوں کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے گھر کا طواف کرتے دیکھ کر ہماری خطاؤں سے چشم پوشی کرے‘‘۔

پیر صاحب:۔ بڑا مبارک خیال ہے لیکن تمہارا روپیہ تو گندہ نہیں؟

محبوب:۔ میری بیوی نے چکی پیس پیس کر اور چرخا کات کات کر کئی برس میں سو روپے جمع کئے ہیں۔ اگر اتنے میں کام ہو جائے تو خدا کے لئے مجھے کسی کے ساتھ کر دیجئے کہ میں نبیؐ جی کے روضے کی زیارت کر آؤں۔

وقت کی بات ہے اور سچے شوق کا اثر۔ محبوب نے یہ فقرے کچھ ایسے مؤثر لہجے میں کہے کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو بھر آئے۔ رانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگے۔ ’’محبوب! تمہاری روح بڑی سعید ہے اور واقعی تم خدا کے محبوب بنے ہو۔ تمہارے پاس صرف سو روپے ہیں اور تم نے ان کو حج کے سفر کی نذر کر دینے کی ہمت کی۔ شاباش، صد رحمت۔ افسوس ہے میری حالت پر اور لعنت ہے میرے جھوٹے وعظوں اور پیری مریدی کے ڈھکوسلوں پر۔ اس وقت میرے پاس کئی ہزار روپے نقد موجود ہیں، ذاتی مکان بھی رہنے کو ہے لیکن میرے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا۔ آہ، جس کے نام سے دنیا کو دھوکا دیتا پھرتا ہوں، اُس کی راہ میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتا، بے شک محبوب! بے شک۔ روپے کا جو مصرف تم نے تجویز کیا ہے، وہ سب سے بہتر ہے‘‘۔ وہ دیر تک اپنی گندم نمائی اور جو فروشی کے تصور میں سر دھنتے اور اشک ندامت بہاتے رہے۔ محبوب بھی اُن کے ساتھ روتا رہا۔ تھوڑی دیر میں جب مولوی صاحب کی رقت کم ہوئی تو انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھ کر فرمایا۔

’’میاں محبوب! میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تم جیسا مرید ملا اور میں نے وہ راہ دیکھی جس سے آج تک بھٹکتا پھرتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ دو چار دورے اور لگا کر پندرہ ہزار کر لوں تو سو روپے ماہوار کی جائداد خریدی جا سکتی ہے اور پھر میں بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ پیری مریدی کا سلسلہ الگ رہے گا۔ حیف، دنیا کی یہ ساری باتیں سوچیں لیکن دین کا ایک کام نہ کیا۔ کماتے کماتے عمر گزر گئی اور پیٹ نہ بھرا، میں بارہ مہینے گشت کرتا ہوں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی وضع قطع اور چرب زبانی سے خدا کی بھولی بھالی مخلوق کو مغالطہ دوں اور جس داؤ سے ہاتھ

لگے، اُن سے روپیہ وصول کر، اپنی پونجی بڑھاؤں۔ کہیں مسجد کے نام سے چندا کرتا ہوں، کہیں اسلامی و دینی مدرسہ کا مہتمم یا یتیم خانے کا منتظم بن کر لوگوں کی جیبیں کاٹتا ہوں۔ شکر ہے کہ آج میری خدا کے ساتھ فریب کاری ختم ہو گئی۔ تم نے مجھے خوابِ غفلت سے چونکا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ انسان کو کس راہ چلنا چاہئے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم میرے مرید نہیں، پیر ہو۔ میں تمہارا صرف ممنون ہی نہیں بلکہ تم کو اپنا مرشد، ہادی اور نجات دہندہ سمجھوں گا۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ اگر میں حج کو جاؤں تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں''۔

محبوب:۔ (بے تابی کے ساتھ) تو پھر حضور کا کب ارادہ ہے؟

پیر صاحب:۔ اسی سال ان شاء اللہ، جن آنکھوں کو تم نے کھولا ہے، وہ کیا اب گنبد خضرا دیکھے بغیر بند ہو سکتی ہیں۔

محبوب:۔ یہ شب رات کا مہینہ ہے، رمضان گزرتے ہی چلنا چاہئے۔

پیر صاحب:۔ شب برأت اور رمضان کیا۔ تم تو میرے ساتھ ابھی سے ہو لو۔ اپنے سو روپے بیوی کے واسطے چھوڑ دو۔ میں اتنا روپیہ لے چلوں گا جو ہم دونوں کے لئے کافی ہوگا۔

محبوب:۔ نہیں قبلہ! میری نیت ڈانواڈول نہ فرمایئے۔ حضور کے صدقے میں حج ہو جائے گا، یہی میرے لئے بڑی دولت ہے۔ یہ روپیہ تو میں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گا۔ میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو محنت کر کے گزارا کر لوں گا۔

بندی:۔ واہ مولوی صاحب! واہ۔ آپ مجھے ثواب سے محروم کرتے ہیں۔ میں حج کو نہیں جا سکتی تو اسی طرح مجھ کو حج میں شریک ہونے دیجئے۔

مولوی صاحب پر بندی کے اس کہنے کا بڑا اثر ہوا۔ حقیقت میں جب ایک گنہگار نیکی کے راستے پر آتا ہے تو اُس کی ساری ادائیں نرالی ہوتی ہیں۔ اُس کی صداقت، اُس کے جذبات، اُس کی نیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم اُن دونوں میاں بیوی کی غربت کا خیال کر کے بہت اصرار اور طرح طرح سمجھایا مگر محبوب نے مولوی صاحب کی نقد امداد منظور نہیں کی۔

عید کے چوتھے دن پیر اور مرید اسبابِ سفر باندھ کراچی کے لئے سوار ہو گئے۔ پیر صاحب کے جاننے والے یہاں بھی تھے۔ کئی روز تک دعوتیں رہیں، دعوتیں ختم ہو گئیں تو روانگی کا انتظام شروع ہوا۔ پیر صاحب پڑھے لکھے، نہایت تیز طرار اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ سفر میں ایسے ہی انسان آرام اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے بڑی سہولت کے ساتھ سارا بندوبست کر لیا۔ ٹکٹ خریدنا، پاسپورٹ حاصل کرنا، ضروری سامان کی بہم رسانی۔ یہ سب پیر صاحب کے سپرد تھا۔ محبوب تو صرف اسباب کی نگرانی کیا کرتا۔

جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو پیر صاحب سرزمین وطن دفعتہً چھوٹنے سے اور سمندر کی موجیں دیکھ کر بہت پریشان اور افسردہ خاطر تھے لیکن محبوب کی خوشی کا کیا پوچھنا اُس کے قلب پر خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول پاک کی کشش اس قدر غالب تھی کہ جہاز جتنی دور نکلتا جاتا، اُسی قدر اُسے زیادہ خوشی محسوس ہوتی۔ سمندر کی موجوں میں وہ تسکین قلب کے عجیب وغریب ترانے سنتا، اُسے ہر لمحے اپنے سینے کے اندر ایک خاص قسم کا جذبہ بڑھا معلوم ہوتا۔ تیسرا دن تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر مرید اور پیر دونوں بیٹھے تھے کہ محبوب نے پیر صاحب کو مخاطب کیا۔ ''پیر صاحب! بندی کے نہ آنے کا بڑا قلق ہے، کیا کروں، اتنا روپیہ نہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ حج کرتے۔ میں نے تو کہا بھی کہ اب کے نہ سہی، بارہ مہینے اور دل لگا کر محنت کر لیں لیکن اُس نے نہ مانا کہ روپے کے انتظار میں دوسرے سال پر اپنا ارادہ

ٹال دوں۔ کہنے لگی۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے، تم کسی بات کا خیال نہ کرو، اگر میرے نصیب میں حج ہوگا تو اگلے سال ہم دونوں چلیں گے، تم مجھے حج کرالانا"۔

پیر صاحب بولے۔ "کڑھو نہیں۔ ایک حج کا ثواب اب بھی اُسے مل جائے گا۔ اُس نے تمہیں حج کرایا ہے۔ خدا توفیق دے تو اگلے برس تم اُسے حج کرادینا۔"

یوں تو کراچی سے روانہ ہوتے ہی پیر صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ متلی قے نے پہلے ستایا، پھر بخار آ گیا اور اس کے بعد تو یکایک اُن کی حالت ایسی بگڑی کہ زیادہ بات بھی نہ کرسکے۔ آنکھیں بند کرکے لیٹ گئے۔

دورانِ علالت محبوب نے پیر صاحب کی حد سے زیادہ خدمت کی۔ خدمت کے علاوہ اُن کی صحت کے لئے دعائیں بھی مانگیں مگر جب وقت آجاتا ہے تو دوا دعا سے کچھ نہیں ہوتا۔ پیر صاحب اچھی پکی عمر کے آدمی تھے۔ اختلافِ آب و ہوا کے اثرات ایسی بُری طرح اُن پر پڑے کہ عدن پہنچتے پہنچتے حالت بالکل ردّی ہوگئی۔ جاں بَری کی کوئی امید نہ رہی۔

جس رات پیر صاحب کا انتقال ہوا، شام کے وقت محبوب اُن کے پاؤں سہلا رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ دوا پلانے کی غرض سے محبوب نے انہیں آواز دی۔ پیر صاحب نے آنکھیں کھول کر اپنے مرید کی طرف دیکھا۔

محبوب:۔ حضور! دوا پی لیجئے۔

پیر صاحب:۔ "دوا نہیں، اسے پھینک دو (چند منٹ خاموش رہنے کے بعد) محبوب! میں بڑا بدنصیب انسان ہوں، تم ملے تو کب کہ عمر ختم ہوچکی۔ حج کا ارادہ بھی کیا تو اُس وقت جب بقول شخصے قبر میں پیر لٹک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ سعادت میری تقدیر میں نہیں لکھی۔ آہ!

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

غالباً میں چند گھنٹے کا مہمان ہوں۔ تم گھبرانا نہیں خدا تمہارے ساتھ ہے۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر میرے لئے بھی دعا کرنا۔ میری ساری عمر ریاکاری میں بسر ہوئی، وعظ کہے تو روٹیوں کے، پیر بنا تو جھوٹا، خدا اور رسولؐ دونوں کا چور، تمہاری صحبت سے یہ مرض دور ہوا تھا اور تمہاری رہنمائی سے تمنا تھی کہ کعبے کا پردہ پکڑ کر توبہ کروں گا۔ آستانِ نبوی کی خاک سر پر ڈال کر اُس شفیع المذنبین کے طفیل مغفرت چاہوں گا لیکن مولا کی مرضی نہیں۔ اعمال کی سیاہی شاید اتنی گہری ہے کہ سمندر میں غوطے کھانے ہیں۔ اپنا سارا سامان تمہیں دیتا ہوں، جس طرح چاہو صرف کرو"۔ یہ کہتے کہتے پیر صاحب کی زبان بند ہوگئی۔ محبوب نے بہت کوشش کی کہ پیر صاحب بولیں، جہاز کے ڈاکٹر کو بھی لایا کہ کوئی دوا دیں لیکن بے سود۔ پیر صاحب کا وقت آگیا تھا۔ اُسی رات انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

محبوب کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس برس ہوگی۔ پھر جاہل، ذوق و شوق اور توفیق الٰہی کے سوا کوئی اُسے ڈھارس دلانے والا نہ تھا۔ اتنا لمبا سفر جس میں کوئی کسی کا پُرسان نہیں، سب نفسا نفسی میں مبتلا۔ یہ ناتجربہ کار اور تنہا۔ پہلے تو کسی قدر گھبرایا، دل میں ہول اٹھے لیکن پھر اُس نے طبیعت مضبوط کرکے کہا، دنیا میں تنہائی سے گھبرانا اور خدا کے سوا بندوں کا سہارا ڈھونڈنا سب سے بڑی حماقت ہے اور جہاز کے کپتان کو پیر صاحب کے متعلق اطلاع دی۔

پیر صاحب کو سمندر کی گہرائیوں میں دفن کرنے کے بعد محبوب نے اُن کے سامان کا جائزہ لیا۔ ایک ٹرنک کے سوا جتنی چیزیں تھیں، وہ تقریباً مشترک تھیں۔ محبوب نے انہیں دو برابر کے حصوں میں تقسیم کرکے ایک اپنے لئے رکھ لیا اور دوسرا اللہ کے نام پر خیرات کردیا۔ ٹرنک

کھول کر دیکھا تو اُس میں کپڑوں کے چھ جوڑے اور نو سو روپے تھے چنانچہ اُن کا ذاتی سامان یعنی کپڑے اور روپ اس نیت سے اپنی حفاظت میں لے لئے کہ اگر زندہ پلٹا تو اُن کے وارثوں کو پہنچادوں گا۔

خدا نے محبوب کو اپنے حبیبؐ کے صدقے میں صحیح و سلامت مکہ معظمہ پہنچا دیا۔ نہایت خوش اعتقادی اور سچے جوش کے ساتھ اُس نے مناسک حج ادا کئے۔ ہر جگہ پیر صاحب کے لئے دعائیں مانگیں۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ روضۂ اطہر کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور کیں۔ یہاں آتے آتے اُس کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ پیر صاحب کی پوری رقم اُس کے پاس تھی جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ضرورت کے مطابق بطور قرضۂ حسنہ لے لیتا، گھر آ کر رقم پوری کر لیتا مگر ایک امانت کو اُس نے ہاتھ لگانا کسی نیت سے سہی، حرام سمجھا اور اِدھر اُدھر چل پھر کر ایک دُکان پر ملازمت کر لی اور اس طرح وقت گزاری کے ساتھ غیبی مدد کا انتظار کرنے لگا۔

حاجیوں کی واپسی کا وقت آ گیا۔ قافلے روانہ ہونے لگے۔ محبوب کے پاس کچھ نہ تھا کہ وہ بھی گھر کا رُخ کرتا۔ محبوب کو محبوبِ رب العالمین کی گلی میں کچھ ایسی راحت ملنے لگی کہ وطن کی یاد اُس کے دل سے جاتی رہی۔

پورے پانچ برس محبوب مدینہ منورہ میں مقیم رہا۔ اس عرصے میں اُس نے نوکریاں بھی کیں اور مزدوری بھی۔ بیمار بھی رہا اور تندرست بھی۔ تکلیفیں بھی جھیلیں اور راحتیں بھی پائیں۔ اُسے سخت ضرورتیں بھی پیش آئیں لیکن اللہ نے اُسے ایسی استقامت عطا فرمائی تھی کہ پیر صاحب کے روپے پر کبھی بھولے سے بھی للچائی ہوئی نظر تک نہ ڈالی۔ آخر بندی کی کشش اور دعاؤں کے اثر سے محنت مزدوری کے صدقے میں اتنی رقم جڑ گئی کہ لشتم پشتم وطن پہنچ جائے۔ اب کچھ دن قافلے کا انتظار کیا اور ایک دن واپسی کے قصد سے ارضِ بطحا کو نہایت رنج و ملال کے ساتھ الوداع کہا۔

اِدھر بندی نے پہلے سال تو بڑی خوشی سے انتظار کیا۔ روز محلے والوں سے پوچھتی رہتی کہ حاجی کتنے دن میں آ جائیں گے۔ بستی کے بھی کئی آدمی حج کو گئے ہوئے تھے، جب تک وہ نہیں آئے، اُس وقت تک تو بے چینی سے انتظار رہا لیکن جب وہ آ چکے اور اُن سے پوچھ لیا اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے تو نہ جہاز میں محبوب کو دیکھا، نہ ریل میں، اُسے ایک قسم کی مایوسی ہو گئی۔ سمجھی کہ ضرور کوئی واقعہ پیش آ گیا۔ دوسرا سال آیا۔ حاجی جانے لگے۔ پڑوس کے شیخ جی بھی چلے تو بندی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اُن سے تاکید کی کہ ذرا محبوب کو بھی معلوم کرنا۔

لیکن دنیا میں کون کسی کا خیال کرتا ہے، خاص کر ایسے مذہبی ہنگاموں میں۔ شیخ واپس آئے اور بندی نے اُن سے اپنے شوہر کی نسبت پوچھا تو انہوں نے حاجی ہو کر پہلا جھوٹ یہ بولا کہ میں نے بہت تلاش کیا، محبوب کہیں دکھائی نہیں دیئے، اس میں ایک ہفتے کی مجھے دیر بھی ہو گئی۔ اب بندی کو مایوسی سی ہونے لگی۔ دل میں طرح طرح کے وسواس آنے لگے۔ ہر سال حاجیوں کی واپسی کے وقت شوہر کا انتظار کرتی اور جب یہ سن لیتی ہے کہ حاجیوں کے آنے کا وقت نکل گیا، کوئی جہاز باقی نہیں آ رہا تو سمجھ لیتی کہ اُن کی خاک مدینہ منورہ کی خاک میں مل گئی تاہم یہ وہم ہی وہم یا قیاس ہی قیاس ہوتا، دل گواہی نہ دیتا بلکہ جب خواب میں دیکھتی، یہی دیکھتی کہ محبوب کہہ رہا ہے۔

”گھبراتی کیوں ہو، میں زندہ ہوں۔ سامان بندھا رکھا ہے۔ جہاز کا ٹکٹ ملا اور سوار ہو، سوار تمہارے پاس پہنچا“۔ وہاں محبوب جہاز سے اُتر کر بمبئی میں داخل ہوا تو اُس کے زادِ راہ میں صرف اتنی گنجائش رہ گئی تھی کہ تین چار روز تک کھا پی سکے۔ گھر تک پہنچنے کے لئے ریل کا کرایہ نہ تھا۔ مجبوراً مزدوری کرنی پڑی اور ایک ہفتے کی سخت محنت

کے بعد جب کچھ جمع ہوگیا تو آگے چلا پھر بھی بلب گڑھ کا پورا ٹکٹ نہ لے سکا۔ جہاں ریل نے اتار دیا، وہاں سے اب اُس نے پیدل چلنا شروع کیا اور بڑی مشکل سے چوتھے دن بلب گڑھ پہنچا۔ جمعے کا دن تھا، نمازی جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ بندی نماز سے فارغ ہو کر چرخا کاتنے بیٹھی تھی کہ یکا یک اُس کی بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ رات کو اُس نے خواب میں دیکھا تھا کہ محبوب مجھے مدینہ منورہ کی کھجوریں کھلا رہا ہے۔ اس وقت جو اُس کی آنکھ پھڑکی تو اُس کا دل بڑے زور سے اچھلنے لگا۔ عورتوں کا اعتقا ہے کہ آنکھ پھڑکے بائیں، بیر ملے یا سائیں''۔ بندی کو ایسے شگونوں پر اعتقاد تھا۔ وہ چرخا پونی کرنا تو بھول گئی، دیر تک دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کی۔ گویا محبوب آرہا ہے۔ کب اُس کی آہٹ پائے اور کب جھپاکے سے اٹھ کر کنڈی کھولے۔

دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے عصر کا وقت ہوگیا۔ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز نکل کر فضا میں پھیلی۔ آواز سنتے ہی بندی چونک پڑی، بے تاب ہوگئی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ باہر جا کر دیکھے کیونکہ یہ آواز محبوب کی تھی۔ ''کیا آ گئے؟ آواز تو بالکل انہی جیسی ہے۔ سامان رکھ کر مسجد جاتے۔ کیا خبر میرے کان بجے ہوں''۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا کہ اتنے میں اذان ختم ہوئی اور اذان ختم ہوتے ہی محلے میں غل مچ گیا کہ محبوب آ گئے۔ پڑوس کی سیدانی بی نے پکار کر کہا۔ ''ہمسائی! مبارک ہو، تمہارے میاں جی بن آئے''۔

بندی کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی روتی، کبھی ہنستی، کبھی سجدے میں گر پڑتی۔ نماز سے پہلے اور نماز کے بعد ایک گھنٹے تک محلے کے بوڑھے جوان حاجی محبوب کے ہاتھ چومتے رہے۔ لوگوں سے فرصت ملی تو گھر آئے۔ بندی دروازہ کھولے کواڑوں سے لگی کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ محبوب نے بھی آنسوؤں کا جواب آنسوؤں سے دیا اور صحن میں آ کر کھڑا ہوگیا۔ بندی (آنسو پونچھتے ہوئے) بیٹھو گے نہیں؟ کیا کہیں جانا ہے؟

محبوب:۔ ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا۔ ایک بڑا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ جب تک اُسے نہ اتار لوں گا، حج پکا نہیں ہوگا۔

بندی:۔ دور جاؤ گے یا پاس؟

محبوب:۔ کل رات کو آ جاؤں گا۔

بندی:۔ تو ابھی جاؤ گے؟

محبوب:۔ زندگی کا کیا اعتبار، جلدی سے دو روٹیاں پکا دو اور دو چار روپے ہوں تو دے دو۔

بندی نے جلدی جلدی آٹا گوندھ، روٹیاں ڈالیں۔ محبوب اتنی دیر کھڑا ہی رہا اور جب بیوی نے روٹیاں رومال میں باندھ کر دیں تو وہ فوراً باہر نکل گیا۔

فیروز پور جھرکہ میں مرحوم پیر صاحب کا مکان تھا۔ صبح ہوتے ہی وہاں پہنچ کر اُن کی امانت اُن کے بیوی بچوں کے سپرد کی اور اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز کے بعد لوگوں نے پوچھا۔ ''حاجی جی! چار وقت نہ تم نے اذان کہی، نہ جماعت میں آئے۔ کیا کہیں چلے گئے تھے؟''

محبوب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سچ مچ کے حاجی ہونے میں ایک کسر رہ گئی تھی۔ فیروز پور جھرکہ جا کر اُسے پورا کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس سے فرصت پالی''۔

حج کے بعد تقریباً دس سال میاں محبوب اپنی بیوی کے ساتھ نہایت پاکیزہ زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ لوگ اُسے درویشِ کامل سمجھتے تھے لیکن یکا یک بندی کا انتقال ہوگیا۔

بلب گڑھ سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ گھر یوں ہی چھوڑ چھاڑ دتی آ گئے اور جنوں والی مسجد میں رہنے لگے۔

ایک عورت کی انوکھی خواہش کا قصہ جو اپنے شوہر کو تاریخ کے صفحات میں امر کر دینا چاہتی تھی۔ تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ حیرت انگیز داستان

نازیہ لیاقت

وقت کبھی نہیں رُکتا۔ یہ اپنی رفتار سے گزرتا رہتا ہے اور ہمیشہ گزرتا ہی رہے گا۔ اس کی آغوش میں حرارت بھی ہے اور ٹھنڈک بھی۔ یہی وقت کسی کے لئے پھولوں کی سیج بن جاتا ہے اور کسی کے لئے کانٹوں کا ہار۔ وقت جس پر مہربان ہو جائے اُس کی تقدیر بدل جاتی ہے اور جس پر اس کا مضبوط ہاتھ گھوم جائے اس کے لئے اپنی تباہی سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔

بڑے بڑے طاقتور بادشاہوں نے اس وقت کے ہاتھوں شکست کھائی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اسی وقت کی مٹی میں دب کر تباہ ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ حکومتیں بنتی رہیں گی اور بگڑتی رہیں گی اور جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے، وقت نئی نئی انوکھی اور حیرت انگیز کہانیوں کو تاریخ کے صفحات پر رقم کرتا رہے گا۔ یہ وقت کی رفتار ہی تو تھی جس نے بڑے بڑے شاہوں، بڑے بڑے راجوں اور مہاراجوں کے کس بل آن کی آن میں نکال کر رکھ دیئے تھے۔ وقت نے بڑے بڑے تخت نشینوں کو اس طرح خاک نشین کر دیا کہ انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ مل سکی لیکن آج سے پانچ ہزار سال قبل ایک ملکہ کے دل میں ایک ایسی خواہش نے آنکھ کھولی کہ اس کے سامنے وقت کے مضبوط پنجوں کی گرفت بھی ڈھیلی ہو گئی۔ ایک ملکہ کی خواہش زمانے کی رفتار سے کھیلنے لگی اور پھر اُس کے اس کھیل نے تاریخ کے صفحات پر ایک حیرت انگیز داستان رقم کر دی۔

ایک رات جب ساری دنیا کی دھرتی کے کنارے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے تب مصر کی زمین روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مصر کے شاہی خاندان کی چوتھی پشت کا بادشاہ صنف روح نیا نیا شاہی تخت پر براجمان ہوا تھا۔ مصر میں میدم نامی ایک مقام پر بادشاہ صنف روح کا ایک شاندار محل تھا جو اس رات موی شمعوں اور مشعلوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ شاہی محل کا یہ چراغاں شاہی خاندان اور مصری عوام کے لئے بے حد اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا کیونکہ شاہی خاندان کے دستور کے مطابق یہی سب سے بڑا خوشی کا جشن تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد وہاں کا ہر بادشاہ اپنے محل میں چراغاں کر کے اس طرح کا ایک جشن منعقد کراتا تھا۔ یہ جشن پورے آٹھ دنوں تک بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا اور بادشاہ کا محل پورے آٹھ دنوں تک جگمگاتا رہتا۔ اس موقع پر شہر کے امیر، مالدار، رئیس اور سلطنت

کے درباری وزیروں، اہلکاروں اور عوام کی بہت بڑی تعداد اپنے بادشاہ تک اپنی نیک تمنائیں اور نیک خواہشیں پہنچانے کے لئے حاضر ہوتے۔ اس موقع پر بادشاہ کے سامنے قیمتی تحفوں اور نذرانوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ بادشاہ کے لئے ان تحفوں اور نذرانوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اس موقع پر جو لوگ بھی نیک خواہشوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آتے تو اُسے قبول کر لیا جاتا۔ یہ دستور بن کر رہ گیا تھا کہ اس موقع پر جو بھی بادشاہ کو مبارک باد دینے آتا تو وہ اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ تحفے کے طور پر ضرور لاتا تھا۔

آج اس جشن کا آخری دن تھا اور آخری رات تھی۔ آٹھ دنوں تک شہریوں اور سلطنت کے درباریوں کے تحفے قبول کرنے کے بعد بادشاہ اب اپنی ملکہ کے تحفے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آج رات مہارانی جیرا اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ بادشاہ کے حضور نذرانہ لے کر آنے والی تھی اور بادشاہ سراپا اشتیاق بنا اپنی ملکہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنی اس ملکہ کا جسے وہ بے حد پیار کرتا تھا۔ اس ملک کے لئے جو صرف سلطنت کی ہی نہیں بلکہ حُسن کی بھی ملکہ تھی۔ اس وقت کے بادشاہ اپنے محل میں ایک ہی ملکہ رکھا کرتے تھے۔ ان میں ایک شادی کا رواج تھا اور صنف روح اپنے سے اونچے اور بڑے بادشاہ کی لڑکی جیرا کو بیاہ کر لایا تھا۔ یہ بات اُس کے لئے بڑے فخر کی تھی اور جیرا صنف روح کے لئے نہایت خوش قدم بیوی ثابت ہوئی تھی۔ جیرا سے شادی کرنے کے بعد آس پاس کے کسی بادشاہ نے بھی مصر کی سرحدوں پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جیرا کا باپ اس زمانے میں سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا، جس سے دشمنی مول لینے کی ہمت کسی بادشاہ میں ہمت نہیں تھی۔ جیرا سے شادی کی درخواستیں کئی حکمرانوں نے کی تھیں لیکن جیرا نے صنف روح کی مانگ پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا اور اسی سے شادی کا اقرار بھی کیا۔ جب جیرا کی شادی صنف روح سے ہوگئی تو کئی بادشاہوں کے سینوں پر مایوسیوں کے سانپ رینگ گئے تھے۔

جیرا کے انتظار میں بادشاہ صنف روح اپنے محل کے دیوان خانے میں بیٹھا تھا اور اس عظیم الشان دیوان خانے میں سجا کر رکھے گئے۔ قیمتی نذرانوں پر نظریں گھما رہا تھا۔ ان نذرانوں میں نہ جانے کتنے قیمتی ہیرے تھے اور نہ جانے کتنے قیمتی زیورات تھے۔ سونے چاندی کی ہزاروں قیمتی چیزیں پڑی تھیں۔ وہ چپ چاپ اپنی چیزوں کو دیکھتا رہا اور پھر اچانک اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اُسے بے چینی سے اپنی ملکہ کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کنیز نے آ کر ملکہ جیرا کے آنے کی اطلاع دی تو اس کی نگاہیں بے اختیار دیوان خانے کے صدر دروازے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ ملکہ کے استقبال کے لئے دروازے کی جانب دوڑ گیا۔ دیوان خانے میں خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔ پھر جیرا کے آگے کتنی ہی کنیزیں اور داسیاں خوشبودار پھولوں کی چادریں پھیلاتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ملکہ جیرا نے آج ایسا سنگھار کیا تھا کہ پل بھر کے لئے بادشاہ صنف روح کو یوں لگا کہ جب جیرا دلہن بنی تھی تب بھی اُس نے ایسا خوبصورت سنگھار نہیں کیا تھا مگر آج کے جشن کی خوشی میں اس نے لاثانی سنگھار کیا تھا۔ جیرا کو دیکھ کر بادشاہ صنف روح نے بڑھ کر جیرا کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''ملکہ جیرا! آج میں اتنا خوش ہوں کہ خوشی میں پاگل ہوا جا رہا ہوں لیکن افسوس کہ میں اپنا پاگل پن ظاہر نہیں کر سکتا''۔ اتنا کہہ کر اس نے جیرا کی کنیزوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ جب کنیزیں چلی گئیں تو اس نے ملکہ جیرا کو دیوان خانے کے ایک جھروکے کے قریب ایک آرام دہ دیوان پر بٹھا دیا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ملکہ جیرا نے بادشاہ کو اس طرح مسکراتے دیکھا تو

بولی۔

''سرتاج! آج کی یہ خوشیاں صرف آپ کی نہیں ہیں یہ میری بھی ہیں۔ ایک عورت جب اپنے شوہر کے سامنے سکھ اطمینان اور لمبی عمر کی نیک تمنائیں اور دعائیں لے کر آتی ہے تو اس وقت کی تمام خوشیاں اسی عورت کی ہوتی ہیں اور آج کی پاک رات میں سچے دل سے اپنی ساری نیک تمنائیں آپ کی نذر کر رہی ہوں اور آج کی اس پاک رات میں مجھے بھی زندگی کی وہ تمام خوشیاں حاصل ہوں گی، اس کی دعا کر رہی ہوں''۔

یہ سن کر بادشاہ صنف روح نے ملکہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ''ملکہ جیرا! میں تمہارے احسانوں تلے دبا ہوا ہوں تم نے مجھ سے شادی کر کے ہی مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ تمہارے قدموں سے میرا محل روشن ہوا اور میری بادشاہت کے ستون مضبوط ہوتے گئے۔ تمہاری نظر مجھ ایسے معمولی بادشاہ پر پڑی اور دشمنوں کی نظریں ہمیشہ کے لئے جھک گئیں۔ یہ مجھ پر تمہارا احسان کم ہے؟''

بادشاہ صنف روح اپنی ملکہ جیرا کی محبت جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جیرا کو چاہتا تھا، یہ بات اپنی جگہ بالکل درست تھی لیکن آج دستور میں نذرانہ دینے والی بات اس کے دل سے ہٹ نہیں سکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ملکہ نے ابھی تک اپنے نذرانے کے متعلق کوئی بات کیوں نہیں چھیڑی ہے۔ ملکہ کے نذرانے کی بات اس لئے اہم تھی کہ اس کے دیئے ہوئے تحفے کو تمام آئے ہوئے تحفوں سے زیادہ خوبصورت، قیمتی اور اونچا ہونا چاہئے۔ بادشاہ صنف روح کے دماغ میں یہ خیال گردش کرتا رہا لیکن اس سلسلے میں اُس نے خود ملکہ سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ وہ ملکہ کے سامنے اس کے احسانوں کا ذکر کر کے اُسے اس بات کا بھی احساس دلا رہا تھا۔ ملکہ جیرا اس کا اشارہ سمجھ گئی، وہ بولی۔

''میرے مالک! آپ بادشاہ ہیں، میرے شوہر ہیں، آپ کی زبان پر میری تعریفوں کے الفاظ اس طرح بار بار آئیں یہ بات کچھ زیب نہیں دیتی۔ میں دوسروں کے لئے ملکہ ہوں لیکن آپ کی کنیز ہوں۔ میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے رشتے ٹھکرا کر آپ سے شادی کی ہے مگر یہ تو آپ کی سحر انگیز شخصیت کا اثر تھا، یہ آپ کی شرافت کا جادو تھا، یہ سب تو آپ کے جوہر تھے جنہوں نے مجھے مجبور کر دیا''۔ ملکہ جیرا کی باتوں میں شہد گھلا ہوا تھا۔

''ملکہ جیرا!'' صنف روح بڑے پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری ان باتوں کے پیچھے میرا پیار بول رہا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ بلندیوں پر ہی بٹھانا چاہتی ہو اور ہر ایک کے دل میں میری عظمت کا سکہ جمانا چاہتی ہو اور خود بھی مجھے اونچے مقام پر دیکھنا چاہتی ہو''۔

''یہ درست ہے میرے مالک! میری یہ سوچ غلط بھی نہیں ہے۔ میری ایک ایک بات سچی ہے''۔ ملکہ جیرا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ نہیں کہ آپ کی عظمت کے آگے مصر کے سرکش لوگوں اور پاس پڑوس کے راجہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ کیا وہ سب آپ کی ہیبت میں آ کر اپنا سر جھکانے پر مجبور نہیں ہیں؟ آپ نے اپنے آپ کو جب مصر کا سب سے عظیم حاکم کہا تب بھی کسی نے انکار کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور کیا یہ آپ کی عظمت کی دلیل نہیں ہے کہ میرے باپ دادا کے تعمیر کیے ہوئے عظیم الشان محل کو بھی مات کر دینے والا محل آپ نے تعمیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے مصر کی سب سے خوبصورت عورت سے شادی کر کے اسے اپنی ملکہ بنایا ہے۔ کیا یہ آپ کی عظمت نہیں ہے کہ آج تک سوڈان کے جس ملک پر کوئی بھی بادشاہ اپنے مورچے کھڑے کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اس ملک کو آپ نے فتح کر کے پندرہ ہزار سوڈانی قیدیوں اور پچاس ہزار

سونے کی مویشیوں کو تاوان کے بدلے میں دشمن سے نذرانے کے طور پر لائے ہیں''۔

ملکہ جیرا کی بات سن کر صنف روح مسکرا دیا اور ایک بار پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند اپنی بھرپور چاندنی کے ساتھ آدھی رات کے سفر تک پہنچ گیا تھا۔ صنف روح تھوڑی دیر تک اس چاند کو دیکھتا رہا پھر اس کی طرف اشارہ کر کے ملکہ جیرا سے بولا۔

''عزیز ملکہ! یہ سب میں نے اس لئے کیا تھا کہ ان تمام کارناموں میں سے کوئی ایک کارنامہ شاید آسمان کے اس چاند کو پسند آ جائے اور وہ آسمان سے زمین پر اُتر آئے۔ بس یہی میری تمنا تھی''۔ صنف روح نے اپنی ملکہ کا چاند سا چہرہ غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بادشاہ صنف روح کی جس عظمت کی بات ملکہ جیرا نے کہی تھی اس کا جواب دیتے ہوئے صنف روح نے آگے کہا۔

''ملکہ جیرا! میری ان فتوحات اور میرے ان کارناموں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ کیونکہ آئندہ کوئی اور بادشاہ کھڑا ہو جائے، کوئی ایسا بادشاہ اپنی فتح مندی کے ایسے جھنڈے گاڑے گا کہ جس کے کارناموں کے آگے میری ساری عظمت اور ساری بلندی زمین بوس ہو کر رہ جائے گی۔ جس کے آگے میری شہرت ماند پڑ جائے گی اور میرا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا جائے گا۔ میں تو صرف......''

''نہیں سرتاج!'' صنف روح کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے ملکہ جیرا نے کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوگا اور نہ ہی آج میں ایسی کوئی بات سننا چاہتی ہوں۔ آج اس خوشی کے موقع پر میں آپ کے لئے ایک ایسا نذرانہ لے کر آئی ہوں کہ جس سے آپ کا نام رہتی دنیا تک امر ہو جائے گا۔ لوگ آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ دنیا میں بے شک ہزاروں بادشاہ جنم لیں اور چاہے جتنے بھی فاتح پیدا ہوں لیکن ان کے کارناموں کے آگے نہ آپ کی شہرت ماند پڑے گی اور نہ ہی آپ کا نام پھیکا پڑے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا سرتاج!''

''ملکہ!'' بادشاہ ایک دم چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ رہتی دنیا تک لوگ مجھے یاد رکھیں اور میرا نام امر ہو جائے؟''

''اس میں حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں سرتاج! ایسا ہو سکتا ہے اور ایسا ہی ہوگا''۔ ملکہ جیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک بیوی اپنے شوہر کے لئے اس خواہش سے بڑی اور کیا خواہش کر سکتی ہے کہ اس کے شوہر کو لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھیں''۔

''تو کیا میری ملکہ اپنی اس خواہش کا نذرانہ لے کر آئی ہے؟'' بادشاہ صنف روح ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ میرے مالک ہیں''۔ ملکہ جیرا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ جس طرح سمجھنا چاہیں سمجھ سکتے ہیں لیکن مجھے تو صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ میرے دل میں جس خواہش نے جنم لیا ہے، یہ خواہش ہر ایک عورت کے دل میں اپنے شوہر کے لئے جنم لے سکتی ہے لیکن ہر عورت اس خواہش پر عمل کرنے کا منصوبہ نہیں بنا سکتی۔ مگر میں نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ بنا لیا ہے کیونکہ میں کوئی عام عورت نہیں ہوں۔ جس کے اختیارات میں بہت کچھ ہے نہیں اور جو اپنے منصوبے پر عمل کر سکتی ہے نہ کرا سکتی ہے۔ میں بادشاہ صنف روح کی ملکہ ہوں جس کے اختیارات میں بہت کچھ ہے اور جو اپنے منصوبے پر عمل کر سکتی ہے اور کرا سکتی ہے اور آج کے اس خوشی کے موقع پر میں اپنی خواہش کا تحفہ لے کر آئی ہوں''۔

''پیاری ملکہ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے دل میں ایسی کون سی خواہش ہے جو میرے نام کو رہتی دنیا تک امر بنا سکتی ہے؟'' بادشاہ صنف روح نے بڑی محبت سے پوچھا۔ دراصل بادشاہ صنف روح نے تھوڑی دیر تک

اس معاملے پر چاروں طرف سے سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے دماغ میں ایسی کوئی بات سمائی نہ تھی جو اس کے نام کو امر بنا سکے۔ اس کے باوجود اسے ملکہ جیرا کا یہ خیال پسند آیا تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ ہر ایک کو اپنے نام کی عظمت اور اپنی شہرت کی تمنا ہوتی ہے۔ بادشاہ صنف روح کا سوال سن کر ملکہ جیرا دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور تھوڑی دیر کے لئے چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر کچھ سوچ لینے کے بعد دھیمے لہجے میں بولی۔

''مصر کے بادشاہ اور میرے مالک! آج اس پُرمسرت موقع پر میری خواہش ہے کہ آپ کے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ ایسا مقبرہ جس کی نظیر دنیا میں نہ ہو اور نہ ہی آئندہ دنیا اس کی نظیر پیش کر سکے''۔

''ملکہ!'' بادشاہ صنف روح یہ سن کر بہت زور سے چیخا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا ملکہ جیرا نے اسی میٹھی آواز میں دھیمے لہجے میں کہا۔

''میرے سرتاج! آپ پہلے میری بات تو سن لیں پھر چاہے میری گردن بھی اڑا دینے کا حکم دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا''۔

بادشاہ صنف روح غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خون کی سرخی دوڑ رہی تھی لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس نے تو کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ جس عورت کی محبت اس کی رگ رگ میں سما چکی ہو وہی عورت اس کے لئے ایسی بات بھی سوچ سکتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ملکہ جیرا نے محبت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُسے خاموش ہو جانا پڑا۔ بادشاہ تھوڑی دیر تک تیز تیز سانسیں لیتا رہا۔

''سرتاج! یہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے لئے ایک ایسا مقبرہ تعمیر کرنا چاہتی ہوں جو آپ کے جسم کو بھی تاقیامت محفوظ رکھ سکے اور جو آپ کے نام کو بھی رہتی دنیا تک تاریخ کی بلندیوں پر بٹھا رکھے۔ میرے مالک! بیٹھ جائیں اور دھیان سے میری بات سنیں''۔ یہ کہہ کر آدھی رات کی بھرپور چاندنی میں جھروکے کے اندر جیرا نے بادشاہ صنف روح کو ایک دیوان پر بٹھا دیا اور پھر خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ''یہ مقبرہ اتنا خوش قسمت ہوگا کہ دنیا میں اس کے مقابلے کی کوئی عمارت کسی زمانے میں اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ آپ کا وہ مقبرہ تقریباً تیرہ ایکڑ زمین پر تعمیر کیا جائے گا اور اس کی بلندی تقریباً چار سو اسی فٹ کی ہوگی۔ اس کی چوڑائی اور اس کے حصار کا رقبہ نو لاکھ چار سو فٹ ہوگا اور اس میں تقریباً ستر لاکھ ٹن وزنی پتھروں کو استعمال کیا جائے گا۔ ان بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک ایک پتھر کا وزن تین ٹن کا ہوگا اور تین تین ٹن کے یہ وزنی پتھر جن کی کل تعداد تیس لاکھ ہوگی، اس مقبرے میں استعمال کئے جائیں گے۔ اس مقبرے کا نقشہ ایک پہاڑ کی طرح ہوگا''۔ ملکہ جیرا اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہی تھی جیسے وہ بادشاہ سے چار اینٹ کا گھر بنانے کی بات کر رہی ہو لیکن اس کی بات سن کر بادشاہ صنف روح کی تو آنکھیں پھٹ گئی تھیں، وہ پلکیں جھپکائے بغیر جیرا کی طرف دیکھ رہا تھا اور چپ چاپ اُس کی باتیں سن رہا تھا۔

''اس مقبرے کو جب بند کر دیا جائے گا تو پھر کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کا دروازہ کدھر ہے''۔ ملکہ نے بات آگے بڑھائی۔ ''نہایت قابل حکیموں اور ویدوں کی تیار کی ہوئی خاص دواؤں کی مدد سے اور ان کی خاص نگرانی میں آپ کے جسم کو ایک ایسی چیز میں حفاظت سے رکھ دیا جائے گا کہ زمانے کے سرد و گرم کا کوئی اثر آپ کے جسم پر کبھی نہیں ہو سکے گا اور اس طرح آپ کا جسم امر ہو جائے گا''۔

''لیکن پیاری ملکہ! اتنی عظیم الشان اور اتنی مضبوط

عمارت بنانا کیا ممکن ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔ "اس منصوبے پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا تم نے اس پر غور کیا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی عمارت تعمیر کرنا کسی زمانے میں ممکن نہیں ہے"۔

"ممکن ہے میرے مالک یہ سب ممکن ہے"۔ ملکہ جیرا اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "میں نے صرف منصوبہ ہی تیار نہیں کیا بلکہ کئی ماہروں سے اور تعمیراتی کام کرنے والوں سے مہینوں تک اس سلسلے میں صلاح مشورے کیئے ہیں۔ پھر یہ منصوبہ مکمل کیا ہے۔ اس مقبرے کی تعمیر کے لئے تقریباً ایک لاکھ مزدور روزانہ مسلسل بیس برس تک کام کریں گے اور تب جا کر کہیں یہ مقبرہ تعمیر ہوگا۔ اس کا منصوبہ مکمل طور پر میں نے تیار کرلیا ہے۔ میرے سرتاج! اس پُرمسرت موقع پر میں اپنا یہ منصوبہ آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ میرے سرتاج! یہ تحفہ آپ اُس عورت کی خاطر قبول کرلیں جو آپ کے نام کو تاریخ کے صفحات پر آپ کی محبت کی خاطر امر کر دینا چاہتی ہے۔ سرتاج! میری یہ خواہش آج نذرانے کے طور پر آپ کے سامنے پیش ہے"۔ ملکہ جیرا کی باتوں میں جادو تھا اور وہ باتیں کر رہی تھی تو اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ چند لمحوں تک بادشاہ صنف روح اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنی ملکہ کی بات مان لی۔ اپنی خوبصورت ملکہ کی خواہش اور اُس کا جذبہ اسے پسند آیا تھا۔

دوسرے ہی دن سے اس منصوبے پر کام شروع کر دیا گیا۔ ہزاروں مزدور بلائے گئے اور ماہرین کی نگرانی میں گیزا نامی میدان میں مقبرے کی بنیاد کھودی جانے لگی۔ دن ہفتے، ہفتے مہینے اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بیس سال کے طویل عرصے کے درمیان بادشاہ صنف روح کی جوانی پر بڑھاپا آ گیا تھا۔ اس کی طبیعت بھی اب بہت خراب رہنے لگی تھی۔ شاید اس کے چل چلاؤ کا وقت آ چکا تھا لیکن اس کی سانس شاید اس لئے اب تک چل رہی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنے مقبرے کو دیکھ لے۔ آخر ایک دن مقبرہ تیار ہو ہی گیا۔

پھر جس دن بادشاہ صنف روح اپنا مقبرہ دیکھنے گیا تو مقبرے کے اندر اس کی تعمیر اور اس کی مضبوطی دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اُسی عالم میں وہیں اس کا دم نکل گیا۔ اس کی شاہی سواری جس شان سے مقبرے کو دیکھنے آئی تھی اسی شان سے مقبرے کے بہت بڑے کمرے میں دفن کر دیا گیا۔ ملکہ جیرا نے بادشاہ صنف روح کو دفنانے کے بعد مقبرے کا دروازہ بند کرا دیا۔ ملکہ جیرا کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ اس عظیم الشان مقبرے کے ساتھ بادشاہ صنف روح کا نام بھی تاریخ کے صفحات پر امر ہوکر رہ گیا۔

بادشاہ صنف روح کی موت کے بعد ہی مصر میں اہرام کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے ایک عورت کے دل میں اپنے شوہر کا نام رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کی خواہش جاگی تھی لیکن وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی بلکہ مصر کی ملکہ تھی۔ اُس نے اپنی خواہش کروڑوں بلکہ اربوں روپے خرچ کر کے پوری کر لی۔ بادشاہ صنف روح کے مقبرے کی تعمیر کے ساڑھے چار ہزار سال بعد ہندوستان کی ایک ملکہ کے دل میں جب اپنا نام امر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو مرتے وقت اُس نے اپنے شوہر بادشاہ سے اپنی اُس خواہش کا اظہار کیا اور وصیت کی کہ اس کے لئے ایک ایسا مقبرہ تعمیر کیا جائے جس کی مثال دنیا میں نہ مل سکے۔ ملکہ ممتاز محل کی اس خواہش کو شاہ جہاں نے پورا کر دیا اور اس طرح تاج محل جیسی بے نظیر عمارت عالم وجود میں آئی۔

❀

''عورت'' کا لفظ پھولنے لگا۔ سطریں ہولے سے تیرنے لگیں۔ الفاظ ایک جھٹکے سے درہم برہم ہو گئے اور آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

حمام کے اندر

مسعود مفتی

ٹرین ایک بھاری گھسیٹ سے رُک گئی۔ اسلم نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ہینڈ بیگ ہاتھ میں لے کر اترنے لگا۔

نیلے کپڑوں والے ایک آدمی نے لپک کر فرشی سلام کیا۔ اترنے میں سٹیشن ماسٹر کا پاؤں ذرا لڑکھڑایا تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''بسم اللہ...... یا اللہ فضل''۔

پھر اس نے جھپٹ کر اسلم کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور پاس کھڑا خوشامد سے مسکرانے لگا۔

دوسری طرف سے عملے کے لوگ آ رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ، کچھ مسکراتے ہوئے۔

''آیئے جی آیئے''۔ وہ ہاتھ پھیلائے دو قدم ان کی طرف بڑھا اور پھر واپس اسلم کی طرف بھاگا۔

''یہ ہیں حضور شاہ جی! ہمارے ٹکٹ بابو۔ اللہ خوش رکھے، بڑے نیک آدمی ہیں۔''

اسلم نے ہاتھ ملایا۔

''اور یہ ہے جی بشیرا سنگل مین اور پھاٹک مین اب سیدھا ہو کے چل رے بشیرے نئے صاحب سے مل رہا ہے اور چلا بھی نہیں جاتا''۔

اسلم نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

''اور حضور یہ باقی سب بھی آپ کی رعیت ہیں۔ یہ پانی بھرنے والا، یہ جھنڈی والا، یہ بھنگی، یہ میٹ''۔

''اور تم کون ہو؟'' اسلم پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں جوناب کا خادم کانٹے والا ہوں۔ اللہ دتا نام ہے گاڑیاں شنٹ بھی کراتا ہوں۔ اس سٹیشن پر سب سے پرانا آدمی ہوں جوناب، پندرہ برس ہو گئے ہیں یہاں مجھے۔ جو صاحب بھی آتے ہیں ان کا تابعدار ہوں، اب دیکھتے کیا کھڑے ہو''۔ اس نے اسلم کی ''رعیت'' کو ڈانٹا نکالو اندر سے سامان''۔

اور وہ سب چنگ سے اندر کو بھاگے۔

اسلم اس کی چرب زبانی پر حیران ہوتا دفتر کی طرف

چلا وہ یہاں بطور سٹیشن ماسٹر تبدیل ہو کر آیا تھا۔ جب اس نے جگہ کا جائزہ لیا تو کافی مایوس ہوا چھوٹا سا سٹیشن، معمولی سا پلیٹ فارم، اس پر دو کمرے، ایک سٹیشن ماسٹر کا اور دوسرا ٹکٹ بابو کا۔ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں سوئچ بورڈ اور تار کا سامان بھی تھا اور بابو کے کمرے میں ٹکٹوں کی شیلف کے علاوہ متفرق رجسٹر بھی رکھے تھے، پلیٹ فارم ویٹنگ روم وغیرہ کی سجاوٹ سے پاک تھا اور اس کی بجائے پیپل کا ایک بڑا درخت تھا جس کے نیچے پرندوں کی بیٹ سے بھرے ہوئے چند بنچ رکھے تھے، ساتھ پانی کا نل تھا جس کے پاس ہی کھمبے کے اوپر شیشے کے چوکور ڈبے میں ٹوٹی ہوئی چمنی والا لیمپ تھا۔ اس کے اوپر ایک تیر لگا تھا جس پر قبلہ لکھا تھا۔ سارے سٹیشن کی یہی کائنات تھی، گاڑی کے گزرنے کی ایک لائن پلیٹ فارم کے ساتھ تھی اور دوسری ویسے ہی ساتھ بچھائی تھی جو گاڑیوں کے کراس کے وقت استعمال ہوتی تھی یا شنٹنگ کے کام آتی تھی۔

اسلم تھوڑی دیر دفتر میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا۔ کام کچھ زیادہ تھا سارے دن میں دو گاڑیاں آتی تھیں، ایک شام اور ایک صبح، شام والی گاڑی کے ساتھ دوسری گاڑی کا کراس بھی ہوتا تھا۔ دونوں گاڑیاں مخلوط تھیں، یعنی بنیادی طور پر تو مال گاڑیاں تھیں مگر ان کے ساتھ چار پانچ ڈبے مسافروں کے بھی لگ جاتے تھے، سٹیشن چھوٹا سا تھا۔ قریب منڈی بھی کوئی نہ تھی اس لئے وہاں سے زیادہ سامان لادا نہیں جاتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ صبح اور شام کے کام کے علاوہ باقی دن فارغ گزرے گا۔

اتنے میں اللہ دتا اندر آ گیا۔ بڑی پلیٹ میں کچھ مالٹے اور سنگترے لا کر بڑی خاطر سے اس نے اسلم کے سامنے رکھے اور خود پاس کھڑا ہو کر مکھیاں ہلانے لگا۔

''ارے اللہ دتا! یہ کیوں لے آئے؟''

''جوناب تھوڑی دیر تک تو ہمارے مہمان ہیں اس کے بعد آپ افسر اور ہم ماتحت، آپ ہماری کوئی چیز کھائیں گے تو ہم بھی دنیا میں سر اٹھا کر چل سکیں گے''۔

اسلم مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور سنگترا اٹھا کر کھانے لگا۔ اس نے پہلی دفعہ غور سے اللہ دتا کو دیکھا۔ وہ گٹھیلے جسم کا ٹھگنا سا آدمی تھا۔ عمر کوئی چالیس سال، سر کے بال کافی گھنے، چھوٹا سا ماتھا جس کے نیچے قدرے کھبی ہوئی بے حد چمکدار آنکھیں۔ چوڑے دہانے پر خوشامدانہ مسکراہٹ بڑی تیزی سے نمودار ہو جاتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ کندھوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی گردن اور نیچے چوڑا سا جسم۔ اسلم سنگترے کھاتا رہا اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر حالات بتاتا رہا کہ یہاں فلاں سال میں فلاں سٹیشن ماسٹر تھا، اس کے بعد فلاں آیا کس کے وقت گاڑی کا حادثہ ہوا۔ کس زمانے میں ریلوے وزیر کا دورہ ادھر سے ہوا وغیرہ۔

اسلم کھا چکا تو اللہ دتا کہنے لگا۔ ''حضور! ذرا کوٹھی بھی ملاحظہ کر لیں''۔

کوٹھی کے لفظ پر اسلم مسکرایا مگر اٹھ کر اس کے ہمراہ کوارٹر دیکھنے چلا گیا۔ وہ دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی کیونکہ اس سے پہلی جگہ اس کے پاس بہتر کوارٹر تھا۔ ''مگر اتنے چھوٹے سٹیشن پر ہو بھی کیا سکتا ہے''۔ اس نے سوچا اور نظر دوڑانے لگا۔ دو کمرے سامنے چھوٹا سا برآمدہ، تنگ سا آنگن جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ سارے مکان پر انجن کے دھوئیں کا گہرا رنگ تھا۔ اسلم کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک دروازہ دوسرے کمرے میں آ کھلتا تھا اور دوسری طرف ایک بند کھڑکی تھی۔

''اچھا تو یہ باہر کھلتی ہے''۔ اور وہ کھولنے لگا۔

''نہیں جوناب!'' اللہ دتا بولا۔ ''یہ باہر نہیں کھلتی، ساتھ میرا کوارٹر ہے، یہ اسی میں کھلتی ہے۔ اس کی چٹخنی بھی اُدھر ہی ہے اس طرف سے نہیں کھل سکتی۔ میں ہمیشہ سے صاحبوں کے ساتھ رہا ہوں تا کہ ہر طرح سے خدمت کر سکوں''۔

اسلم متعجب ہوا کہ کانٹے والے اور سٹیشن ماسٹر کے مکان کو ملایا کیوں گیا ہے اور وہ بھی ایسے کہ کھڑکی کانٹے والے کے مکان میں کھل جاتی ہے۔

''جوناب! کوئی پندرہ سال پہلے حاجی علی احمد صاحب سٹیشن ماسٹر آئے تھے۔ ان کی عیالداری بہت تھی اس لئے میں اپنا کوارٹر چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا اور انہوں نے بیچ میں کھڑکی بنوالی تھی''۔

اسلم کے دل میں پہلے خیال آیا تھا کہ اس کو میخ لگا کر بند کر دے گا مگر اب اس نے سوچا کہ یہ اچھی تجویز ہے جب وہ بیوی بچوں کو لے آئے گا تو ممکن ہے اسے بھی ساتھ والے کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اسلم کچھ دیر کوارٹر دیکھتا رہا پھر بولا۔

''کیوں بے اللہ دتا! یہاں کوئی قلی وغیرہ کھانا بنانا بھی جانتا ہے؟''

''نہیں حضور ایسا تو کوئی آدمی نہیں، مگر اللہ نے چاہا تو کوئی تکلیف نہ ہوگی میری بیوی دونوں ٹیم آ کر کھانا بنا دیا کرے گی۔ آپ کی خدمت بھی کرے گی اور بیگم صاحبہ کی بھی، ہم تو پرانے خدمت گار ہیں حضور!''

وہ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے پھر اللہ دتا نے لپا جھپ بستر لگا دیا اور خود چلا گیا۔ اسلم کچھ دیر لیٹا رہا۔ گھر کی فضا غیر مانوس تھی، خالی خالی کمروں میں سامان کے بنڈل بے ترتیبی سے پڑے تھے جیسے گھر نہ ہو کوئی مسافر خانہ ہو۔ وہ سگریٹ جلا کر چت لیٹا ہوا کبھی چھت کی کڑیوں پر جالے یا گانٹھ کے نشان دیکھنے لگتا اور کبھی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر پر نظریں گاڑے بیوی بچوں کے متعلق سوچنے لگتا۔

شام کو اسلم شہر کی سیر کے لئے نکلا عام رواج کے برعکس یہاں کا ریلوے سٹیشن بالکل گاؤں کا حصہ تھا اور سٹیشن ماسٹر اور عملے کے کوارٹروں کے ساتھ ہی گاؤں کی گلیاں آتی تھیں، وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑتا گیا زیادہ تر کچے مکانات تھے جن میں سے کسی کی ایک آدھ پکی دیوار بھی تھی۔ کچھ گلیاں ان کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی آزاد منش نالیاں، جن کی چوڑائی حیرت انگیز طور پر سمٹتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ کہیں متروکہ جائداد کا ناکارہ ملبہ، کہیں دیواروں پر اپلے چپکے ہوئے۔ کہیں کوڑے کا ڈھیر یا پانی کا جوہڑ اور اس کے گرد ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے۔ کسی چھوٹی سی کوٹھری میں مونگ پھلی اور برفی کی دکان جس کی اہمیت ساتھ لٹکے ہوئے لیٹر بکس سے بڑھ گئی تھی۔ ایک گلی سے نکلا تو آگے بازار تھا جس میں پندرہ بیس دُکانیں تھیں، نیلی کیتلیوں اور میلی پیالیوں والی چائے کی دُکان، بھونے پھل اور دال چنے کی دُکان، سبزی کی دُکان جہاں پکوڑے بھی بنتے تھے، لوہار کی دُکان، موچی کی دُکان، حکیم صاحب کی دُکان جہاں کاپیاں، پنسلیں اور جنتری بھی ملتی تھی، ٹاٹ کے پردے کے نیچے ایک حجام بھی تھا اور اسی طرح کی چند اور دُکانیں۔

سٹیشن ماسٹر نیلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مزے مزے سے چل رہا تھا کہ پھل کی ایک کافی بڑی دُکان نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے چھوٹے بازار میں پھل کی اتنی بڑی دُکان کیسے آ گئی۔ ایک دم پھل والا ہڑبڑا کر اٹھا۔

''سلام جوناب!''

اسلم بڑا حیران ہوا۔ ''ابے تُو! تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''حضور! یہ بھی پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے، تنخواہ کی آمدنی سے تو گزارا نہیں چلتا۔ ساتھ یہاں کام بھی کرنا پڑتا ہے''۔

''اور سٹیشن کی ڈیوٹی کا کیا کرتا ہے؟''

''جی ہے حضور! میری شوکت ماشکی کے ساتھ۔ جب میں نہیں ہوتا وہ بیٹھتا ہے۔ دونوں جوناب کے نوکر ہیں۔ مالکوں کی مہربانی سے گزر بسر ہو جاتی ہے''۔

''ہوں!'' اسلم نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔
''حضور! دُکان پر آئے ہیں، کچھ پھل تو چکھتے جائیں''۔
پھل کھانے کے بجائے اسلم دتو کی آنکھوں میں ٹمٹماتی ہوئی چمک دیکھنے لگا۔ ''نہیں میاں! مجھے نماز کو دیر ہو رہی ہے''۔ کہتا ہوا اسٹیشن ماسٹر آگے بڑھ گیا۔
اگلے دن صبح کی گاڑی چلوا کر اسلم فارغ ہوا تو ملاقاتی آنے شروع ہوئے۔ چھوٹے شہر میں سرکاری ملازم کی کافی عزت ہوتی ہے، کچھ غرض مند اور کچھ علاقے میں اونچی ناک رکھنے والے لوگ ضرور ان سے راہ و رسم رکھتے ہیں، اسلم بھی اس رواج کو جانتا تھا اس لئے جو بھی آیا اس سے خندہ پیشانی سے ملتا رہا۔ دو نمبردار ملنے آئے، ملک چودھری اور ہر قسم کے لوگ باری باری آئے، اسکول ماسٹر، سرپنچ اور امام مسجد ملنے آئے، یونین کونسل کے ممبر بھی دو چار آدمیوں کی جلو میں آئے۔ خاندانی حکیم صاحب بھی چھتری سمیت آئے۔ جب بھی کوئی ملاقاتی آتا تو دتو پہلے اطلاع دینے آتا اور دو چار جملوں میں اس کا تعارف کرا دیتا۔ پھر اسلم ان سے ملتا۔ پچھلی ملازمت کا ذکر ہوتا، آئندہ قیام کے لئے اچھی امیدوں کا اظہار کیا جاتا اور پھر ہر ''خدمت'' کا وعدہ کر کے لوگ چل دیتے۔
سب سے آخر میں دتو ایک چٹ لایا جس پر لکھا تھا
''ملک رحمت علی تاجر''۔
''کون ہے یہ؟'' اسلم نے پوچھا تو دتو تعریفی انداز میں بولا۔
''یہاں کا مشہور کاروباری ہے جناب! اور افسروں کا بڑا خدمتگار ہے۔ سارے سٹیشن ماسٹر اس پر بڑی مہربانی کرتے رہے ہیں، یہ بھی ان کی تابعداری کرتا ہے، بہت اچھا آدمی ہے جناب!''
''بلالاؤ''۔
چالیس پچاس برس کا بھاری بسر کم آدمی اندر داخل ہوا دوفٹ کا طرہ، سیر بھر کی مونچھیں، صاف ستھری اچکن، لٹھے کی سفید دھلی ہوئی دھوتی، نیچے سے زری والی جوتی کی چپچدار نوکیں جھانکتی ہوئیں اور ہاتھ میں بوٹے والی چاندی کی چھڑی، وہ اسلم سے بڑے آداب سے ملا۔ باتیں شروع ہوئیں تو اسلم کو معلوم ہوا کہ وہ علاقے کا زمیندار ہے۔ سوڈا کمپنی کا ایجنٹ بھی ہے۔ شہر کی سگریٹ اور کھاد کی ایجنسی بھی اسی کے پاس ہے، ڈپو بھی اسی کا ہے اور چند ایک چھوٹے موٹے کاروبار اور بھی کرتا ہے۔
''آپ نئی جگہ آئے ہیں، بچوں کے آنے پر ایک بھینس بھجوا دوں، جب خشک ہو جائے گی، دوسری بھجوا دوں گا؟''
مگر اسلم نے انکار کر دیا۔
وہ جانے لگا تو دتو نے بڑے ادب سے اس کی لاٹھی اٹھا کر اسے دی۔ پھر دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا، ساتھ ہی باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسلم نے ویسے ہی دروازے میں سے جھانکا تو ملک صاحب اور دتو بڑے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔
دو تین روز بعد شام کی گاڑی ذرا لیٹ تھی۔ کراس والی گاڑی کھڑی رہی اور اسلم مصروف رہا اس لئے شام کو بہت دیر سے فارغ ہونے کے بعد گھر لوٹا۔ باورچی خانے میں دتو کی بیوی اللہ وسائی کھانا پکا کر گھر جا چکی تھی۔ وہ روزانہ آ کر کھانا بناتی تھی۔ دتو کے ساتھ مل کر کھلاتی تھی اور پھر باورچی خانے کا کچھ کام کرنے کے بعد چلی جاتی تھی، اسلم کا خیال تھا کہ مہینہ پورا ہونے پر اسے کچھ تنخواہ دے دے گا۔ اللہ وسائی تیس بتیس سال کی بھرپور عورت تھی جو صورت سے زیادہ اپنے جسم سے دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی، شکل بھی بُری نہ تھی، رنگ کیسا بھی کیوں نہ ہو گول چہرے کو کون کافر بُرا کہہ سکتا ہے۔ اسلم نے اسے دو چار مرتبہ ایک آدھ نظر دیکھا اور

بس، اس سے زیادہ کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

آج دیر ہونے کی وجہ سے وہ جا چکی تھی اور دتو کھانا کھلانے لگا۔ اتنے میں اللہ وسائی نے بچہ بھیج کر دتو کو اپنے کوارٹر میں بلایا وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بڑا خوان تھا جو اس نے اسلم کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا لے آئے دتو؟''

''جوناب! آج ملک رحمت علی یہ چھوڑ گیا تھا''۔

''کیوں لیا تھا مجھ سے پوچھے بغیر؟'' اسلم غصے میں بولا۔

''حضور! مجھے تو پتا نہیں اللہ وسائی گھر پر تھی اسی کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اکثر لاتا رہتا ہے حضور! افسروں کا تابعدار ہے''۔

''کیوں لاتا رہتا ہے؟''

''آخر حضور افسر بھی تو مہربانی کرتے ہیں، اس کا منوں سامان جاتا ہے کئی دفعہ اوپر تلے ہو جاتا ہے تو ہم نے کبھی پوچھا بھی نہیں، اب یہ تھوڑی تابعداری بھی نہ کرے تو کیا بات ہوئی بھلا''۔

اسلم اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔

''کان کھول کر سن لو دتو! میں رشوت کھانا حرام سمجھتا ہوں اور ملک رحمت علی سے صاف کہہ دو کہ مجھ سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھے، نہ ہی مجھے اس کی خدمت کی ضرورت ہے''۔

دتو ایک دم حیران سا ہو کر اسلم کو دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی بہت ہی عجیب چیز ہے۔

''حضور! یہ کون سی رشوت ہے۔ سبھی سٹیشن ماسٹر یہ کرتے آئے ہیں۔ بڑے بوڑھے داڑھیوں والے بھی جو پنج وقتی نمازی تھے''۔

''چلو بک بک نہ کرو۔ میرے داڑھی نہیں ہے اور میں رشوت بھی نہیں لیتا۔ یہ مٹھائی اٹھا کر لے جاؤ اور اسے واپس کر دو''۔

وہ غصے سے مڑ کر اندر چلا گیا۔ اللہ دتا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھال اٹھا کر گھر کو چل دیا۔

چند روز تک اسلم کام کا جائزہ لیتا رہا تو اسے معلوم ہوا کہ چھوٹی موٹی بے قاعدگیاں ہوتی رہتی ہیں، مٹی کے تیل، فنائل، کوئلے وغیرہ کی کاغذوں میں بہت کھپت تھی گو اصل استعمال بہت کم نظر آتا تھا۔ اس نے وقتاً فوقتاً پڑتال شروع کر دی اور ملازموں کو ٹوکنے لگا۔ اللہ دتا اب کچھ دب سا گیا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی نسبتاً کم تھی۔ دوسرے قلیوں اور ملازموں پر بھی [illegible] تھا۔ اس کی شخصیت میں جو انگارے سے دہکتے تھے ان پر ہلکی سی راکھ کی تہہ چڑھ گئی تھی۔

ایک دن اسلم اچھے موڈ میں تھا اتنے میں کہیں سے اللہ دتا نمودار ہو گیا۔

''ارے دتو پانی تو پلا بھاگ کے''۔

دتو جھٹ سے گلاس لے کر بھاگا لیکن تھوڑی دیر بعد ناکام واپس لوٹا۔ مٹکے سب خالی تھے اور پانی کا نل خراب تھا۔ اس کی مرمت ہو رہی تھی۔

''ارے ستیاناس! مجھے تو بڑی پیاس لگی ہے۔ اچھا، جا بھاگ کر انجن والے سے پانی لے آ۔ گاڑی بھی قسمت سے کھڑی ہے''۔

دتو حیران رہ گیا۔ ''جوناب! وہ تو گرم ہوگا''۔

''تو کیا ہوا ابھی رکھ دیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا''۔

''لیکن جوناب اگر اجازت ہو تو پھلوں کے کسی ٹوکرے میں سے سنگترے نکال لوں، گاڑی جو کھڑی ہے''۔

''ایں؟'' اسلم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''حرامزادے! مجھے چوری کا مال کھلاتا ہے۔ خبردار! جو

ایسی بات پھر کی۔ بھاگ یہاں سے اور جا کر انجن سے پانی لا"۔

دتو ایک دم غائب ہوگیا۔

چند دن گزر گئے۔ اسلم نئی جگہ جم چکا تھا۔ مقامی لوگوں سے کچھ راہ و رسم ہوگئی تھی۔ اپنے ملازموں کے کام کا بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ نئی جگہ کی اجنبیت بھی ختم ہوگئی تھی اور اب وہ بیوی بچوں کے بغیر کچھ اداسی محسوس کرتا تھا۔ دفتر میں فارغ بیٹھے ہوئے یا رات کو اندھیرے کمرے میں چت لیٹے ہوئے وہ اکثر حساب لگاتا رہتا کہ اس کی لڑکی کے امتحان میں ابھی اتنے دن باقی ہیں، وہ فارغ ہو تو فوراً بیوی کو گھر لے آئے تاکہ گھر میں رونق ہو اور اللہ وسائی کی تنخواہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو۔

ایک شام پہلی گاڑی آ چکی تھی لیکن کراس کرنے والی کچھ لیٹ ہوگئی تھی۔ ڈرائیور اور گارڈ سے وہ کاغذات لے چکا تھا اور دونوں سے باہر کی خبروں پر تبصرہ کر کے اب قریباً سب موضوع ختم کر چکا تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد کی ابتدائی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی اور اب بیشتر لوگ یا تو کسی جگہ بیٹھ چکے تھے یا کھڑکیوں کے قریب ٹہل رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ سفر کرنے والے زنانہ ڈبوں کی کھڑکیوں سے لگے گاڑی چلنے کی دعا کر رہے تھے۔ اکا دکا فقیر اِدھر اُدھر گھوم کر ایک ایک مسافر سے کئی کئی بار ناگواری کا انکار سن چکے تھے۔ کئی کئی پھیرے لگانے کے بعد خوانچے والوں کی پھرتی مدھم پڑ گئی تھی اور قلی اپنے پیسے گننے میں مصروف تھے۔ اسلم نے ٹیلی فون پر جا کر پچھلے سٹیشن سے بات کی تو پتا چلا کہ ابھی گاڑی کے آنے میں کافی دیر ہے اور وہ پلیٹ فارم پر گھومتا ہوا گاڑی کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ وہاں اسے شک سا ہوا کہ لائن کا کانٹا ٹھیک نہیں بدلا گیا لیکن آگے جا کر دیکھا تو وہ ٹھیک تھا اور وہ واپس مڑا۔

پلیٹ فارم سے ملحق لائن پر گاڑی کھڑی تھی۔ کراس کرنے والی گاڑی دوسری لائن پر آنے والی تھی۔ وہ دوسری گاڑی دیکھنے کے لئے اس پٹری پر ہولیا اور لکڑی کے سلیپروں پر اُچک اُچک کر چلتا ہوا افق میں دھواں ڈھونڈنے لگا۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ واپس آرہا تھا۔

ایک دم اسلم ٹھٹکا۔ گاڑی کے دوسری طرف ایک ڈبے کے پاس پہیوں کے نیچے سے دتو پھل کا ایک ٹوکرا شوکت ماشکی کو دے رہا تھا۔ شوکا اسے پکڑ کر تیزی سے شہر کی طرف بھاگا۔ اسلم نے آواز دی مگر اسی وقت انجن بھاپ چھوڑنے لگا اور اس کی آواز شور میں دب گئی۔ پورا سراغ لگانے کے لئے اسلم فاصلہ دے کر شوکے ماشکی کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑا تعاقب کرنے پر اس کے خدشات درست نکلے۔ شوکا ماشکی بازار میں دتو کی دُکان پر پھل لے گیا تھا۔ اتنے میں گاڑی کی وسل سنائی دی اور اسلم واپس بھاگا۔

سٹیشن پر پہنچا تو گاڑی رُک چکی تھی۔ اس نے بھاگم بھاگ کارروائی پوری کی، دونوں گاڑیوں کو چلوایا۔ اگلے سٹیشنوں پر روانگی کی اطلاع دی اور پھر اطمینان سے دتو کی تلاش کی مگر وہ اور شوکت ماشکی دونوں غائب تھے۔

شام کے کھانے پر اسلم دتو پر برس پڑا۔ "اُلو کے پٹھے، بدمعاش، حرامی! گاڑی میں سے پھل چراتے شرم نہیں آتی۔ حرکتیں تم کرتے ہو اور نام میرا بدنام ہوگا"۔

مگر دتو تو صاف مکر گیا۔ "کیسا پھل حضور! کون سی گاڑی؟"

"شوکا سور کدھر ہے؟" اسلم دہاڑا۔

"وہ تو جو ناب! ماتم ہوگیا ہے، اُدھر گیا ہے"۔ دتو سکون سے بولا۔

"کہاں ماتم ہوا ہے؟ بلاؤ اسے"۔

"وہ تو صاحب ڈھوک پر گیا ہے، یہاں سے چار کوس دور"۔

اسلم نے طیش میں آ کر برتن پھینک دیئے۔ دتو کو

اپنی زبان میں ہر گالی دے ڈالی اور صبح سویرے پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ سنا کر اسے باہر نکال دیا۔ پولیس کا نام سن کر دتو گھبرایا کان لپیٹ کر چل دیا۔

رات اسلم چارپائی پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا کہ دتو کے خلاف کیا کارروائی کرے کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی نصیحت ہو، وہ آج تک جہاں بھی رہا تھا اس نے حسن کارکردگی اور دیانتداری میں بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن اگر اب اس کا ماتحت عملہ آزادی سے من مانی کرتا رہا تو خواہ مخواہ بدنام ہو جائے گا۔ اس نے سوچا کہ کل سے اللہ وسائی اور دتو کا داخلہ گھر میں بند کر دے اور اپنی بیوی کو تار دے کر بلا لے۔ لڑکی اتنے دن اپنے ماموں کے ہاں رہ سکتی ہے، اس قسم کے پروگرام بناتا وہ سو گیا۔

دھرتی کے گہرے سینے میں سے کوئی مدھم سی گونج اُبھری جو آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ اسلم بیدار ہوا تو وہ دروازے کا کھٹکا تھا۔ نیند سے لدی ہوئی آنکھوں میں چھوٹی سی درز ہوئی تو روشنی کی کرنیں گھومتے ہوئے دماغ سے جا ٹکرائیں اور اسلم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔

اس نے سر اٹھایا تو لیمپ کے پاس اللہ وسائی کا چہرہ نظر آیا...... دونوں کوارٹروں کی درمیانی کھلی تھی۔ اس میں اللہ وسائی لیمپ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی، اسلم کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور الٹے ہاتھ سے کھڑکی بھیڑ کر آہستہ آہستہ اسلم کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ لیمپ کی روشنی میں جسم کے ابھار بھرپور تھے، سر کے بال ڈھیلے ڈھالے تھے، چمکتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے اللہ وسائی؟'' اسلم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ آگے آئی۔ آہستگی سے میز پر لیمپ رکھا اور سڈول بازو سینے پر رکھ کر مسکرانے لگی۔

مرد کسی ایسے وقوعے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہو اور اسے اچانک سپردگی میں ڈوبی ہوئی عورت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو یہ اس کی زندگی کا ایسا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی خالص شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے اس کا ردعمل سوچ، بناوٹ اور پالیسی سے خالی ہوتا ہے اور اس کے سارے ماضی کا نچوڑ اس ایک لمحے میں ٹپک پڑتا ہے، ان معاملات میں ناتجربہ کار سیدھا سادہ مرد کسی سحر زدہ کی طرح بھاگ نکلتا ہے مگر اس میدان کا شاطر مزے سے ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ اسلم بھی اللہ وسائی کا مطلب سمجھ گیا اور اس کی شخصیت کے سارے اجزا غیر شعوری طور پر اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے کلبلانے لگے۔

''اس وقت کیوں آئی ہو؟'' اسلم نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''میں نے کہا''۔ وہ ہنسی۔ ''آپ تھک گئے ہوں گے، ذرا پاؤں دبا آؤں''۔ اور وہ پائنتی کی طرف بڑھی۔

''نہیں نہیں''۔ اسلم چھلانگ لگا کر چارپائی سے کودا۔ ''مجھے کوئی ضرورت نہیں، کوئی تھکاوٹ نہیں، تم جاؤ''۔

وہ کونے میں جا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

اللہ وسائی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے، جیسے پتلا بادل رینگتا رینگتا چاند کو ڈھانپ لے۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھیں بجھ سی گئیں۔ جسم ڈھیلا پڑا اور چہرے پر شکست اور مایوسی چھا گئی۔

''بابو جی! آپ...... دتو کو پولیس کے حوالے نہ کریں۔ ہمارا تو کاروبار ہی گاڑی سے چلتا ہے۔ آپ...... رات کو جب چاہیں...... کھڑکی پر تھاپ دے

دیں، میں آ جاؤں گی...... پہلے بھی کئی افسروں کی اسی طرح سیوا کرتی رہی ہوں......"

مرد کا لمحہ گزر چکا تھا اور اب اسلم میں افسر بیدار ہو گیا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے، تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ دفع ہو جا فاحشہ کتنی۔ خبردار جواب اس گھر میں قدم رکھا۔ کل صبح میں دیکھتا ہوں تم اس کوارٹر میں کیسے رہتے ہو؟ کمینے ذلیل......" اور وہ گالیاں دیتا رہا۔ اللہ وسائی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے، اور وہ ایک دم لیپ اٹھا کر چلی گئی۔ کھڑکی دھم سے بند ہو گئی۔

گھپ اندھیرے میں اسلم گم سا ہو گیا۔ مٹھائی کے ٹکڑے پر جس طرح چیونٹیاں چہار طرف رینگتی ہیں، اسی طرح اس کے ذہن پر احساسات کے تانے بانے ایک دوسرے کو روندتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ تھوڑی پشیمانی کافی حیرت اور قدرے پچھتاوا اس کے لاشعور میں گڈمڈ تھے مگر بظاہر وہ سخت غصے میں تھا اور اس کی اخلاقی حسیات بُری طرح مجروح تھیں کہ اللہ وسائی نے اسے اس قماش کا آدمی کیوں سمجھا، ایک دم وہ طیش کھا کر اٹھا اور کھڑکی پر گھونسا مار کر چلایا۔

"سوّر کے بچے دتو! کل دس بجے تک یہ کوارٹر خالی کر دو ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا اور نوکری سے نکلوا دوں گا"۔

اسے یقین تھا کہ دتو وہاں موجود ہے۔

اسلم واپس آ کر چارپائی پر لیٹا مگر اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کی شریفانہ زندگی اور نیک نامی کی شہرت بار بار آ کر جھنجھوڑتی اس قسم کی کسی حرکت کی وجہ سے بدنامی کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھتا۔ اسلم متوسط طبقے کی مضبوط اخلاقی تنظیم کا پروردہ تھا جس کی زندگی میں شادی سے پہلے جنس کی تسکین کے مواقع اوّل تو آئے ہی نہیں اور اگر چند ایک امکان کی حد میں آئے بھی تو وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا اس لئے اس کی اخلاقی یکسانیت میں اس تلاطم سے صدمہ پہنچنا قدرتی تھا۔ وہ دیر تک بستر میں پہلو بدلتا رہا پھر اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا جس سے اعصاب کو کچھ تقویت ہوئی اور وہ پھر آ کر لیٹ گیا۔

صبح اسلم ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ باورچی خانے سے برتن کھڑکنے کی مخصوص آواز نہیں آ رہی تھی اور گھر میں خاموشی تھی۔ اسے بستر پر لیٹے لیٹے پتا چل گیا کہ آج اللہ وسائی کام پر نہیں آئی۔ گاڑی کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا اور وہ آرام سے تیار ہونے لگا۔

"پروا نہیں"۔ وہ شیو کا برش داڑھی پر زور سے رگڑتے ہوئے بڑبڑایا۔ "چند دن سٹیشن کی دکانوں سے کام چل جائے گا اور پھر گھر کے سب لوگ آ جائیں گے"۔

نہانے کے بعد جسم پر تولیہ رگڑتے ہوئے اس نے سوچا کہ بیوی کو خط لکھ کر جلد از جلد آنے کی تاکید کرے تاکہ یہ سب جھمیلے ختم ہوں، کپڑے پہن کر وہ گھر سے ذرا جلدی نکلنے لگا کہ سٹیشن پر ناشتہ کرے گا مگر دروازے پر ہی ملک رحمت علی مل گیا۔ اپنی چمکیلی چھڑی اٹھا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ادب سے سلام کیا۔

"آئیے ملک صاحب!" اسلم نے خوش خلقی سے کہا۔ "آپ آج سویرے سویرے کدھر گھوم رہے ہیں؟"

"بس جی، ویسے ذرا سلام کو حاضر ہو گیا تھا"۔

ملک رحمت علی نے قدرے محتاط جواب دیا۔ دونوں طرف سے مزاج پُرسی ہوئی اور اسلم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ذرا اسٹیشن پر جا رہا تھا، کوئی کام تو نہیں کیا؟"

"نہیں جناب! کام تو نہیں۔ آپ کا بھی وقت قیمتی ہے لیکن اگر چند لمحے رُک جائیں تو جلدی جلدی ایک چھوٹی سی عرض کر لوں"۔

"جی فرمائیے"۔

ملک رحمت علی نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا

اور بات کرتے کرتے جھجک گیا۔
"کوئی خاص بات ہے کیا؟" اسلم اس کی جھجک دیکھ کر بولا۔
"جی نہیں...... خاص نہیں...... لیکن ذرا...... اندر چلے چلیں تو مجھے اطمینان رہے گا"۔
اسلم ناگواری سے اسے اندر لے آیا۔
"جی...... وہ......" اس نے گلا صاف کیا۔ "میں حاضر ہوا تھا کہ دتو کو معافی دے دیں۔ نادان ہے، بے وقوف ہے نوکروں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں، مالک کا تو کام ہی معافی دینا ہے"۔
اسلم نے تیز آنکھوں سے ملک رحمت علی کو گھورا۔
"دتو آپ کے پاس گیا تھا؟"
"جی وہ تو سویرے سے میرے گھر بیٹھا رو رہا ہے، مجھے جگایا بھی اسی نے ہے۔ دراصل غریب آدمی ہے۔ عرصے سے پھل کا کاروبار اسی طرح کرتا ہے، اس کو دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے اور گاؤں والوں کو آسانی سے اچھا پھل مل جاتا ہے۔ دونوں کا بھلا ہے۔ یہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں نے ہی اسے یہاں نوکر کرایا تھا۔ پندرہ برس سے اسی سٹیشن پر کام کر رہا ہے۔ کبھی کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی۔ دنیا کے کاروبار تو اسی طرح چلتے ہیں"۔
اسلم نظر جما کر ملک رحمت علی کی بات سنتا رہا جو چھڑی سے فرش کریدتا ہوا ایسے دھیمے دھیمے بات کر رہا تھا جیسے گاڑی سے پھل چرا کر بیچنا کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں۔
"مگر ملک صاحب! میں یہاں کا انچارج ہوں اور جانتے بوجھتے ہوئے پھل چرانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟"
"ہاہاہا"۔ ملک رحمت علی خوشامد سے ہنسا اور لٹو کی طرح چھڑی گھمانے لگا۔ "آپ بہت سادے اور شریف آدمی ہیں مگر......" اسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تھوڑا آگے جھکا۔ "...... آپ جاننے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں؟ اگر وہ اپنا ضمیر گندہ کرتا ہے۔ آپ کی بلا سے آپ کیوں اس کیچڑ میں آتے ہیں۔ آپ نے کون سا ساری عمر یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ چھ مہینے سال کی بات ہے۔ پھر کوئی دوسرا افسر آ جائے گا۔ آپ یہ چیزیں روک بھی دیں گے تو پھر دوبارہ شروع ہو جائیں گی۔ میں دتو کو سمجھا دوں گا کہ جب تک آپ یہاں ہیں، وہ ذرا احتیاط سے کام لے اور ہاتھ روک کر رکھے"۔
اب اسلم سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ کھڑا ہو گیا۔
"دیکھئے ملک صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے محکمانہ انتظام میں دخل نہ دیں، میں دتو کو کہہ چکا ہوں کہ میں اس کے خلاف افسرانِ بالا کو رپورٹ کروں گا اور اگر ضرورت پڑی تو شاید پولیس کو بھی کیس دینا پڑے، ابھی سٹیشن پر جا کر ذرا انکوائری کر لوں تو کچھ فیصلہ کروں گا۔ بہرحال یہ تو ہوتا رہے گا مگر اسے کوارٹر آج ہی خالی کرنا پڑے گا۔ اس معاملے میں مَیں کسی کی بات نہیں مان سکتا"۔
ملک رحمت علی بڑی توجہ سے اسلم کی بات سنتا رہا مگر اس کی آنکھوں میں ایک تمسخر چھپا ہوا تھا جو مونچھوں کی ہلکی سی حرکت سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ اس نے اسلم کے غصے کو اور بڑھا دیا اور وہ باہر کی طرف چلنے لگا مگر ملک رحمت علی اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور اسلم کو رکنا پڑا۔
"جناب مجھے غلط سمجھے"۔ ملک رحمت علی آہستگی سے بولا۔ "میرا مقصد ہرگز آپ کے کام میں دخل دینا نہ تھا۔ میں تو ہمیشہ سے افسروں کا تابعدار اور خدمت گزار رہا ہوں، آپ آئندہ بھی مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ پائیں گے اور......" اور اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا...... "میں نہیں چاہتا تھا کہ دتو لوگوں سے اُلٹی سیدھی باتیں کرتا رہے......"

تھی یا کوئی اور؟ بہرحال وہ پوچھنا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس طرح بات پھیلنے کا زیادہ احتمال تھا۔ تین دن وہ اسی الجھن میں پڑا رہا اور ادھیڑ بن کی وجہ سے فیصلہ نہ کر سکا کہ دتو کو کوارٹر سے باہر نکالے یا نہیں۔

چوتھے روز جب گاڑی آ کر رکی تو اس میں سے عثمان اترا۔ اسے ریلوے بورڈ نے انکوائری کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے پاس اسلم کی بھیجی ہوئی رپورٹ تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے کئی لوگوں کے دستخطوں سے ایک لمبی عرضی تھی جس میں اسلم کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے زبردستی اللہ وسائی کو ناجائز تعلقات پر مجبور کیا اور دتو کو اس سلسلے میں تنگ کرنے کے لئے کوارٹر خالی کرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ عرضی پر ملک رحمت علی کے دستخط نہ تھے مگر اس کے مختارِ خاص، منشی اور ملازموں کے تھے۔ ساتھ ہی دتو، شوکا ماشکی اور شہر کے چند اور لوگوں کے بھی دستخط تھے جنہوں نے اسلامی اخلاق کے نام پر حکومت سے نیک افسر بھرتی کرنے کی استدعا کی تھی۔

دوسرے دن انکوائری شروع ہوئی۔ عثمان نے دتو کے بیان لئے۔ اللہ وسائی کے بیان لئے، عرضی پر جن لوگوں کے دستخط تھے ان کو بھی بلا کر پوچھا۔ ملک رحمت علی سے بھی طویل بات چیت کی اور بعد ازاں سارا معاملہ اس کے ساتھ بھی زیر بحث آیا۔ یہ سارا سلسلہ تین دن چلتا رہا۔

اس اثنا میں یہ بات شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دتو شوکا اور ملک رحمت علی ہر جگہ لوگوں کو اپنی کہانی سناتے جو انہوں نے عرضی میں لکھی تھی اور بڑے فخر سے کہتے کہ انکوائری انہوں نے کرائی ہے اور اب چند دن بعد سٹیشن ماسٹر تبدیل ہو جائے گا۔ چھوٹے سے قصبے میں اتنی بڑی بات پر خاموشی کیسے رہتی۔ لوگوں کے فقرے کندھے اُچک اُچک کر ایک دوسرے تک گئے اور عورتوں کی بظاہر معصوم کھسر پھسر کے ذریعے سات تہہ خانوں میں چھپی ہوئی کنواریوں تک کو اصل قصے سے بہت زیادہ باتیں معلوم ہو گئیں۔ اللہ وسائی شہر میں نکلتی تو مرد اسے نفرت سے دیکھتے۔ جوان لڑکوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور عورتیں ''دفع، دفان'' کرنے کے باوجود آنکھوں کے کونوں اور پلو کی آڑ سے اسے دور تک دیکھتی رہتیں۔

سٹیشن ماسٹر اتنے دن باہر نہ نکلا۔ وہ زیادہ تر اپنے کوارٹر میں رہتا، جہاں عثمان اس کے پاس ٹھہرا تھا اور اس بات پر خوش تھا کہ اس کی رپورٹ پر دتو کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ اب دتو کو کوارٹر سے نکالنا بے کار تھا کیونکہ انکوائری میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور پھر دتو خود ہی تبدیل ہو کر چلا جائے گا۔ گو ملک رحمت علی شہر میں ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ وہ دتو کے ساتھ ہے اور کوئی مائی کا لال اسے تبدیل نہیں کر سکے گا، وہ شہر کے لوگوں سے بھی بار بار کہتا کہ سرکاری نوکر باہر کے لوگ ہوتے ہیں، آج یہاں، کال وہاں، مگر ہم سب کو تو یہاں رہنا ہے اس لئے سب دتو کی حمایت کریں، خواہ مخواہ کیوں باہر والوں کی وجہ سے آپس میں ناچاقی ہو''۔

انکوائری ختم ہو گئی۔ عثمان چلا گیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں مدھم پڑنے لگیں، ایک ہفتے بعد اوپر سے آرڈر آ گیا۔ انکوائری میں اسلم بے قصور ثابت ہوا تھا اور دتو کو فہمائش کی گئی تھی کہ اگر اب اس کے خلاف پھل چرانے کی شکایت آئی تو اسے برطرف کر دیا جائے گا۔ اسلم کو تھوڑا ملال ضرور ہوا کہ دتو کا تبادلہ کیوں نہیں ہوا۔ پھر بھی وہ خوش تھا کہ وہ بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ کرسی کی پشت پر پھیلتے ہوئے اس نے زوردار انگڑائی لی اور بڑبڑایا۔ ''بالآخر حق کی فتح ہوتی ہے''۔ اس نے آرڈر کی کئی ایک نقول کرا کے سٹاف کو بانٹ دیں۔ سٹیشن پر مختلف جگہوں پر چسپاں کر دیں اور شہر کے معتبر لوگوں کو بھجوا دیں، ایک نقل بذریعہ ڈاک ملک رحمت علی کو بھجوا دی اور بڑے سکون سے گھر واپس آ گیا۔

لگا کر پانی پینے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کے گریبانوں سے ہوتا ہوا پیٹ پر گرتا تر کر رہا تھا۔

اسلم تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلیفون پچھلے سٹیشن سے ملایا تو گاڑی چل چکی تھی۔ اپنی میز سے اُٹھ کر اس نے ٹکٹ بابو کے رجسٹر پر سرسری سی نظر ڈالی، ٹکٹ بابو ایک دیہاتی کو یقین دلا رہا تھا کہ کرایہ ایک روپے پندرہ آنے ہی ہے مگر دیہاتی کو اصرار تھا کہ وہ ہمیشہ ایک روپیہ بارہ آنے ہی دیتا ہے۔

''اوئے بابا!'' اسلم دہاڑا۔ ''ٹکٹ لینا ہے تو لے ورنہ چل ہٹ یہاں سے''۔

بوڑھے دیہاتی نے تین آنے رکھ دیئے جو اس نے پہلے ہی مٹھی میں رکھ چھوڑے تھے اور بڑبڑایا۔ ''توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے''۔

''چل بھاگ''۔ اسلم بولا۔ ''کھڑکی سے پرے ہٹ کر زمانہ دیکھ''۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسلم اُدھر متوجہ ہو گیا۔

گاڑی آ گئی اور اسلم اس کے ہنگامے میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کراس والی دوسری گاڑی بھی پہنچ گئی۔ ٹیلیفون آیا تھا کہ اس کا ایک ڈبا اتار کر پہلی گاڑی سے لگانا ہے۔ کچھ وقت اس میں لگ گیا۔ دونوں گاڑیاں چلی گئیں تو ایک ریلوے انجینئر ٹھیلے پر وہاں پہنچ گئے اور اسلم ایک دو گھنٹے ان کے پاس رہا۔ دوپہر کے قریب وہ فارغ ہوا تو سوچنے لگا کہ دتو کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بکنگ کلرک کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ آیا اس نے دتو کو کل پھل چراتے دیکھا ہے، کلرک نے نفی میں سر ہلایا۔

''کبھی پہلے دیکھا ہے؟''

''جی نہیں''۔

''کبھی اس قسم کی شکایت سنی ہے؟''

کلرک خاموش رہا۔ اسلم نے دو چار سوال اس سے کیئے اور سٹیشن کے باقی عملے سے بھی پوچھا مگر سب کا رویہ اس قسم کا تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسلم کو اندازہ ہو گیا کہ دتو کے خلاف کھل کر بات کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے زیادہ وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک رپورٹ لکھی کہ اللہ دتا کانٹے والا شہر میں پھلوں کی دُکان کرتا ہے اور کل میں نے اسے گاڑی میں سے پھل چراتے ہوئے دیکھا ہے اسے فوراً یہاں سے تبدیل کیا جائے کیونکہ اس کاروبار میں یہاں کے بااثر لوگ بھی شامل ہیں، رپورٹ لکھ کر اس نے ہیڈ کوارٹر بھجوا دی۔

پھر اس نے دتو کو بلوایا کہ اس سے پوچھے کہ کوارٹر خالی ہوا یا نہیں، مگر وہ غائب تھا۔ اسلم نے سوچا کہ اب یہ تبدیل تو ہو ہی جائے گا۔ اس لئے بار بار کیا منہ لگانا دو ایک روز پڑا رہنے دو اسی جگہ اسے، پھر وہ ہی چلا جائے گا۔

دو تین روز گزر گئے۔ دتو صرف ڈیوٹی پر آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ اسلم قریب قریب سارا دن سٹیشن پر گزارتا تاکہ دتو یا اللہ وسائی کا سامنا نہ کرنا پڑے ان دنوں میں اس نے لوگوں کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ گاڑی کے وقت سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں اس کے پاس آ کر بیٹھنے والے درباری قسم کے لوگ غائب ہو گئے تھے۔ بازار میں کوشش سے سلام کرنے والے راہ گیر اب ہاتھ اٹھانے کے بجائے اسے چبھتی ہوئی ٹکٹکی سے دیکھتے، عورتیں اسے سڑک پر آتا دیکھتیں تو کسی گلی میں مڑ جاتیں یا سڑک کے دوسرے کنارے ہو جاتیں، جن لوگوں سے اس کا سرکاری طور پر واسطہ پڑتا تھا وہ کچھ عجیب سے محتاط نظر آتے۔

اسلم جانتا تھا اس کا سبب کیا ہے، دتو ضرور لوگوں میں کوئی افواہ پھیلا رہا ہے مگر وہ کیا ہے اس کا اسے علم نہ تھا۔ نہ معلوم وہی بات تھی جو ملک رحمت علی نے اسے کہی

"مجھے کوئی پروا نہیں کہ وہ کیا بکتا ہے"۔ اسلم نے جلدی سے بات کاٹی۔

ملک رحمت علی کی آنکھوں میں تمسخر کا ننھا سا شرارہ کانپا۔ "ابھی تو بات میرے اور اس کے درمیان ہے اور میں نے اسے سختی سے منع کیا ہے کہ کسی سے ذکر نہ کرے لیکن...... اگر حالات نہ سدھر سکے...... تو ظاہر ہے میں اس کو روک نہیں سکوں گا"۔

"مگر صاحب میں نے آپ سے کب کہا کہ آپ اسے روکیں، اسے بکنے دیں جو وہ کہتا ہے"۔ اسلم نے ایک دفعہ پھر اٹھنے کی ہلکی سی کوشش کی۔

"جی نہیں آپ نے تو نہیں کہا مگر ہمارا ابھی تو کوئی فرض ہے نا کہ آپ کی عزت کا خیال رکھیں، میں سچ کہتا ہوں کہ آپ اسے معاف کر دیں تو بات بالکل باہر نہ نکلے گی"۔ اس نے معنی خیز نظروں سے اسلم کو دیکھا۔

"بات کون سی چھپی ہے؟" اسلم بولا۔ "میں ابھی جا کر کھلی انکوائری کروں گا اور سب کو پتا چل جائے گا کہ وہ چور ہے"۔

"جی نہیں......" اس نے پھر گلا صاف کیا۔ "میرا مطلب دوسری بات سے ہے، وہ ابھی تک میرے سینے میں ہے اور ان شاء اللہ راز رہے گی۔ دتو کا منہ میں خود بند کرلوں گا۔ میرا کہنا وہ ٹال نہیں سکتا"۔

اسلم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ آنکھیں نیچی کر کے بولا۔ "دتو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے...... دیکھئے میں تو یقین نہیں کرتا مگر اس کا کہنا ہے...... کہ...... کل سہ پہر کو اس کی بیوی جب باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی...... تو...... آپ نے......" (اس نے گلا صاف کیا) "یعنی...... کچھ زبردستی کی کوشش کی"۔

اسلم ایک دم سرخ ہو گیا۔

"یہ کیا بکواس ہے ملک صاحب؟"

"جی اب مجھے تو علم نہیں"۔ ملک رحمت علی مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ "یہ دتو ہی کہتا تھا"۔

"مگر یہ بکواس ہے...... بہتان ہے...... اس کی بیوی فاحشہ ہے بدمعاش ہے وہ تو...... وہ تو رات کو خود میرے کمرے میں چلی آئی تھی اور میں نے اسے دفع کیا تھا"۔ اسلم بے چارگی سے چلایا۔

"ہاہاہا"۔ ملک رحمت علی زور سے طنزیہ ہنسا۔ "آج کل تو یوسف زلیخا کے قصے نہیں ہوتے نا بادشاہو!"

"مگر آپ نے کیسے یقین کرلیا اس کی بات پر؟" اسلم جزبز ہو کر بولا۔ "وہ جھوٹا ہے، کمینہ ہے، بدکردار ہے"۔ اور غصے میں اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

ملک رحمت علی آنکھوں میں دھیمی دھیمی مسکراہٹ لئے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چھڑی سنبھالی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلا۔ نکلتے نکلتے تھوڑا سا رکا۔ گردن موڑی اور معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں آپ کا خیرخواہ ہوں جناب! میری بات مان لیں، آپ یہاں نئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ اس لئے دتو جو کہے گا وہ مانی جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو بات راز رہ سکتی ہے...... ورنہ......"

اور وہ باہر نکل گیا۔

اسلم کا خون اس دھمکی پر کھولنے لگا۔ "تم سب ذلیل اور کمینے ہو، میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا"۔ ہوا میں دروازے کی طرف گھونسے چلاتا ہوا وہ پکارا اور میز سے فونٹین پین اٹھا کر جیب میں گھسیڑتا ہوا نکل گیا۔

ابھی سٹیشن سے کچھ دور ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا۔ دیہاتی لوگ اپنی گٹھریاں سنبھالے پلیٹ فارم کے کنارے کے قریب کھسک آئے تھے۔ دو چار قلی ادھر ادھر بے کار سے گھوم رہے تھے۔ عورتیں صندوقوں پر بیٹھی بچوں کو اپنے پاس روک رہی تھیں، ایک دو خوانچے والے ترازو کے پلڑوں میں سودا سجائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دو تین بچے نل سے منہ

اب اسلم شہر میں نکلتا تو خواہ مخواہ لوگوں سے بات کرنے ٹھہر جاتا اور بات کو ہیر پھیر کر انکوائری کی طرف لاتا۔ پھر بتاتا کہ وہ خود بے قصور ثابت ہو گیا ہے اور یہ سب دتو اور ملک رحمت علی کی شرارت تھی۔ وہ یہ سب کچھ بڑے فخر سے بتایا کرتا۔ کیونکہ پچھلے کئی سال سے پھل کی چوری ہوتی تھی اور دوسرے قواعد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اور یہ سب اس نے آ کر روک دیا تھا۔ مگر لوگوں کے ردعمل سے اسے صحیح اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ اسے بے قصور سمجھتے ہیں یا ابھی تک اللہ وسائی کا عاشق خیال کرتے ہیں، کچھ دن بعد اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ لوگوں کے سلاموں میں اب اس کے لئے وہ احترام نہیں تھا اور ملنے والوں کی بے تکلفی میں بھی ایک پردہ سا تھا۔

چند روز بعد اسلم ڈیوٹی پر تھا۔ صبح کی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی کہ اسے گارڈ کے ڈبے میں رشید نظر آیا۔ یہ اس کا اسکول کا دوست تھا اور اب ریلوے میں کام کرتا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اسلم دوڑا گیا اور جا کر رشید کے گلے لگ گیا۔

''ارے ظالم! بڑے دن بعد نظر آئے۔ کہاں گم رہتے ہو؟'' اسلم نے اسے تھپکی دی۔

''میاں تمہاری شہرت کے غبار تلے چھپا تھا۔ ہم غریبوں کو کون جانتا ہے؟''

''کیسی شہرت؟'' اسلم نے پوچھا۔

''اچھا اتنے بڑے معرکے بھی مارتے ہو اور ہم سے بھی پوچھتے ہو؟''

''چلو بکواس نہ کرو اور آ کر چائے پیو''۔

''چائے پینے کون آیا ہے؟ ہم تو تمہارا حرم دیکھنے آئے ہیں''۔

دونوں ہنسنے لگے، اسلم بھی مذاق کا جواب مذاق سے دیتے ہوئے بولا۔ ''تم جیسے نامحرم ہمارے حرم میں نہیں آ سکتے''۔

''ارے واہ!'' رشید اس کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا۔ ''انکوائری افسر تو نامحرم نہیں ہیں اور ہم نامحرم ہیں؟ ایں......''

اسلم جھینپ گیا اور رشید قہقہہ مارنے لگا۔ وہ کمرے کے پاس پہنچ چکے تھے اور اندر جا کر چائے پینے لگے۔

رشید نے چائے کی لمبی چسکی لی، سٹول گھسیٹ کر ٹانگیں اس پر رکھیں کرسی کی ٹیک پر سر لٹکا کر آنکھیں موند لیں اور گھونٹ نگل کر بولا۔ ''بڑی عمدہ چائے ہے یار! سچ بتانا اس نے بنا کر بھیجی ہے؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اسلم نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ''اس نے کس نے؟''

''اللہ قسم عثمان بڑی تعریف کر رہا تھا اس کی، کہتا تھا کہ بڑا ہاتھ مارا ہے ظالم نے۔ سچ مانو وہ تو ابھی تک نشے میں ہے''۔

اسلم ''فضول بات'' کہہ کر چائے پینے لگا۔

''ایک بات بتاؤ اسلم!'' رشید پیالی رکھ کر بولا۔ ''سکول کے زمانے میں تو تم بڑے صوفی، مولوی، پرہیزگار، عبادت گزار اور نہ معلوم کیا کیا تھے مگر بھئی اب کے تو تم نے کمال کر دیا''۔

''میں تو اب بھی صوفی ہوں''۔

''ہاں ہاں ضرور مگر......'' رشید انگلی سے میز بجاتا ہوا گانے لگا۔

''مجھ سے پہلی سی عبادت مرے اللہ نہ مانگ''۔

اسلم بھی ہنسنے لگا۔ رشید کافی دیر تک اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسلم پہلے تو اسے خالص مذاق سمجھتا رہا مگر بعد میں رشید نے اسے سنجیدگی سے بتایا کہ ہیڈ کوارٹر پر عام لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ عثمان خود بھی ان معاملوں میں تیز ہے اس لئے اسلم نے عثمان کو بھی اللہ وسائی سے مستفید کرا دیا ہے، جس کی وجہ سے اس نے اپنی

رپورٹ میں اسلم کو بے قصور بتا دیا ہے۔

اسلم کے تن سے ایک دم جان سی نکل گئی۔ اس کی آنکھیں پیالی میں گڑی رہیں، رنگ سرخ ہو گیا اور دماغ میں بلبلے اٹھنے لگے۔ اس نے ایک دم چائے کا بڑا سا گھونٹ نگلا۔ گرم سا گولا دیواروں کو دھکیلتا ہوا نیچے کو سرک گیا اور وہ آنکھیں جھپک کر رشید کی غلط فہمی دور کرنے لگا۔ دونوں کافی دیر تک سنجیدگی سے بات کرتے رہے، رشید تو قائل ہو گیا مگر اس کا خیال تھا کہ محکمے کے عام لوگوں کے دل سے یہ خیال نکالنا قریباً قریباً ناممکن تھا کیونکہ ساری انکوائری کے باوجود ابھی تک اللہ دتا وہیں تھا۔

''وہ تو ملک رحمت علی کے رسوخ کی وجہ سے ہے''۔ اسلم بولا۔

''اب کسی کو کیا معلوم کہ وہ تمہارا رسوخ ہے یا ملک رحمت علی کا''۔

اسلم نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔

''یار! تم نرے ہونق ہو''۔ رشید بولا ''کیوں خواہ مخواہ فکر کرتے ہو؟ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ اگر بالفرض تم نے کچھ کیا بھی ہے تو کیا برا کیا ہے؟ سبھی یہ کچھ کرتے ہیں۔ جو پکڑے گئے وہ مجرم ٹھہرے، جو چھپے رہے وہ نیک رہے۔ تم کیوں پروا کرتے ہو۔ بس یہ ہے کہ آئندہ محتاط رہو''۔

اسلم سارا دن رشید سے بات چیت کرتا تھا مگر اس کا دماغ ماؤف سا تھا۔ جیسے وہ صرف اوپر کی سطح سے سوچ رہا تھا اور نیچے سب کچھ سُن ہے۔

شام کی گاڑی سے رشید چلا گیا۔ اسلم نے بڑی بے دلی سے کاغذات مکمل کئے ضابطے کی باقی چیزوں سے فراغت حاصل کی اور پھر من من بھر کے قدم گھسیٹتا اپنے پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھا تو بکنگ کلرک نے پیچھے سے آواز دی۔ اسلم نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک خط دکھا رہا

تھا۔

''یہیں لے آؤ''۔ اسلم نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور ڈھیلا سا کھڑا ہوگیا۔

کلرک خط لایا۔ اسلم نے دیکھے بغیر لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس کا دل کسی کام پر آمادہ نہ تھا۔

کمرے میں جا کر اس نے لیمپ روشن کیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ سوچنے لگا۔ رشید کے مذاق محکمے کے لوگوں کے اندازے، شہر کے لوگوں میں احترام کی کمی، دتو کا پھل چرانا، اللہ وسائی کا آدھی رات کو کمرے میں آنا۔ یہ سب خیالات اس کے ذہن میں یوں باری باری سر اٹھا رہے تھے جیسے تیز بارش میں پکے فرش پر بلبلے اِدھر اُدھر سے نمودار ہوتے ہیں، تھوڑا تیرتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ سوسائٹی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ کردار کیا ہے؟ یہ میرا طرز عمل ہے یا میرے متعلق لوگوں کا تاثر ہے؟ میں بدی خود کرتا ہوں یا سوسائٹی مجھ سے کراتی ہے؟ نہ معلوم کتنے ہی سوال آندھی کے بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں آئے اور ان کو دوسرے بگولے دھکیل کر لے گئے۔ کبھی اللہ وسائی کے جسم کے پیچ وخم چپکے سے سر اٹھاتے اور ایک ہلکا سا پچھتاوا اس کے دماغ کی دیواروں پر لرزنے لگتا کہ جب لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں تو اس نے خود یہ موقع کیوں گنوایا؟ اور اگر وہ دنیا کی نظروں میں بدکردار ہے تو اس کی اپنی نیکی کس کام کی؟

کافی دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھا رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر جابجا تاریکی کے گڑھے پڑے تھے اور وہ بت کے مانند بے جان بیٹھا تھا۔ معاً اسے خط کا خیال آیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا نکال کر لفافہ چاک کیا۔ کڑکڑاتا ہوا کاغذ کھولا تو اس کی بیوی کی تحریر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

میرے سرتاج سلامت رہو!

کل میں عثمان کی بیوی سکینہ سے ملی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ عثمان صاحب کسی انکوائری کے سلسلے میں تمہارے پاس آئے تھے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ تمہارے خلاف بھی ایسے الزام ہو سکتے ہیں اور پھر سچ بھی ہو سکتے ہیں۔ سکینہ کہہ رہی تھی کہ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ تمہارے کانٹے والے کی بیوی سے ناجائز تعلقات ہیں، یہ انکوائری میں ثابت ہوگیا تھا۔ مگر عثمان نے صرف تمہیں بچانے کی خاطر یہ رپورٹ دی کہ الزام غلط ہے حالانکہ اسے انکوائری میں یقین ہوگیا تھا کہ تمہارے اس عورت......''

''عورت'' کا لفظ پھولنے لگا۔ سطریں ہولے سے تیرنے لگیں۔ الفاظ ایک جھٹکے سے درہم برہم ہو گئے اور آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

خط میز پر رکھا تھا۔ سامنے لیمپ تھا۔ خط کے دونوں طرف اسلم کی کہنیاں ٹکی تھیں، ہاتھوں میں سر تھما ہوا تھا اور شیشے کے سے شفاف قطرے لیمپ کی روشنی میں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے ٹپ ٹپ خط پر گر رہے تھے۔

نامعلوم اسلم کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ لیمپ کے شعلے نے دو تین بے چین سی انگڑائیاں لیں۔ ایک دو بھبکے لئے اور تڑپ کر بجھ گیا۔

کمرے کی تاریکی میں ٹپ ٹپ کی آواز ٹھہر ٹھہر کر اُبھرتی۔ پھر وقفہ زیادہ ہوتا گیا اور پھر یہ آواز بند ہوگئی۔ کافی دیر گزر گئی...... اندھیرے میں کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ چارپائی چرچرائی جیسے کوئی اٹھا ہے۔ پاؤں کی گھسٹتی ہوئی چاپ کھسکی۔ دیوار ٹٹولنے کی آہٹ ہوئی۔ ایک ہاتھ کھڑکی سے ٹکرایا۔ دو تین لمحے خاموش رہی اور پھر کھڑکی پر تھاپ کی آواز تاریکی میں گونجنے لگی۔

✿